مرد کو بھی مرد بنانے والی چھ اکسیریں

اکسیر نمبر ۱

اکسیر نمبر ۱ ۔ اکسیر ... سے نئی زندگی ... کمزور ... رنگ ... کے اندر جوش ... [illegible]

قیمت ۴۰ گولی چار روپے ... نمونہ ...

اکسیر نمبر ۱۲

اکسیر نمبر ۱۲ ۔ ... کی ... طاقت ... بڑھاتی ہے ... [illegible]

قیمت ...

اکسیر نمبر ۵۰

اکسیر نمبر ۵۰ ... [illegible]

قیمت ... گولی ... روپے

... گولی چار روپے

اکسیر نمبر ۴۰

اکسیر نمبر ۴۰ ... بکثرت احتلام ... [illegible]

قیمت ایک روپیہ ... نمونہ چار آنے

اکسیر نمبر ۳۴

اکسیر نمبر ۳۴ جریان کی ... آرام آجاتا ہے۔

قیمت ۳۴ ۔ الف ... نمونہ ...

قیمت ۳۴ ب ... نمونہ ...

طلاء نمبر ۱۲

طلاء نمبر ۱۲ ... [illegible]

قیمت ... روپے ... نمونہ ...

اشوکری

اشوکری ... شباب کی ... [illegible]

قیمت ... گولی چار روپے

رسالہ امراض مخصوصہ مردان

[illegible]

رسالہ امرت

[illegible]

طلاء نمبر ۱

طلاء نمبر ۱ ... [illegible]

قیمت ...

... امرت دھارا ... لاہور ... [illegible]

۱۹

زمانہ

جلد ۴۲ — جنوری سنہ ۱۹۲۴ء — نمبر ۱

مسلمان اور علوم ہند

ابھی ہجرت کا پہلا ہی قرن اور خلیفہ ثانی عمرؓ فاروق کا عہد حکومت تھا کہ عربوں کو ہندوستان کے ساتھ آمد و رفت و تعلقات پیدا کرنے کی نہ صرف خواہش ہوئی بلکہ عملی کوشش شروع کر دی۔ مورخین کا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ کی بنیاد اسی غرض خاص سے رکھی تھی کہ ہندوستان و ایران کے بحری راستوں پر قبضہ ہو۔ اس ملک سے رابطہ پیدا کرنے کی ان کوششوں کو آپ کے جانشینوں عثمان و علی (رضی اللہ عنہما) اور خاندان بنی امیہ کے تاجداروں نے بھی باوجود اندرونی انقلابات و خانہ جنگیوں کے برابر جاری رکھا، مگر جبتک کہ ولید اول کے عہد حکومت میں ولایت سندہ کو محمد بن قاسم نے فتح کر لیا اس ملک کی زبان اور ادبیات سیکھنے کا انہیں موقع ملنا ممکن نہ ہوا۔ اسکے بعد بھی تقریبًا نصف صدی تک فاتحین مفتوحین کے خزاین علوم کیطرف توجہ کرتے نہیں نظر آتے جسکی سیدھی سادی کھلی وجہ یہی تھی کہ ابتک انہیں انکی قدر و قیمت کا پہچاننا ہی نہ آتا تھا۔ انکے خاص علوم کے وہ شعبے بھی جنکی وہ سب سے زیادہ عظمت و وقعت کرتے تھے یعنی تفسیر قرآن اور احادیث نبوی ہنوز ضبط تحریر میں نہ آئے تھے اور جس طرح ازمنہ قدیم میں ویدوں کی تعلیم و تلقین بے وساطت تحریر زبانی ہوا کرتی تھی اسی طرح ابتک مسلمانوں کے یہ علوم بھی محض حافظہ کے زور سے بے مدد کتاب زبانی ہی پڑھائے جاتے تھے۔ جس زمانہ کا بیان ذکر ہے اس زمانہ میں یہ لوگ لکھنے پڑھنے سے فقط بے اعتنائی ہی نہیں برتتے تھے بلکہ اوسے بہت

۱۰ راگست سنہ ۱۹۲۳ء کو یہ مضمون ڈھاکہ یونیورسٹی کی انجمن تاریخی کے سامنے پڑھا گیا تھا۔

زمانہ

جلد ۴۱ جنوری سنہ ۱۹۲۴ء

مسلمان اور علوم ہند

ہنوز ہجرت کا پہلا ہی قرن اور خلیفۂ ثانی عمرؓ فاروق کا عہد حکومت تھا کہ عربون کو ہندوستان کے ساتھ آمد و رفت و تعلقات پیدا کرنے کی نہ صرف خواہش ہوئی بلکہ عملی کوشش شروع کردی مورخین کا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ کی بنیاد اسی غرض خاص سے رکھی تھی کہ ہندوستان و ایران کے بحری راستون پر قبضہ ہو۔ اس ملک سے رابطہ پیدا کرنے کی ان کوششون کو اُنکے جانشینون عثمان و علی (رضی اللہ عنہما) اور خاندان بنی اُمیہ کے تاجدارون نے بھی باوجود اندرونی انقلابات و خانہ جنگیون کے برابر جاری رکھا، مگر جبتک کہ ولید اول کے عہد حکومت مین ولایت سندہ کو محمدؓ بن قاسم نے فتح کرلیا اس ملک کی زبان اور ادبیات سیکھنے کا اونہین موقع ملنا ممکن نہوا۔ اسکے بعد بھی تقریباً نصف صدی تک فاتحین مفتوحین کے خزاین علوم کیطرف توجہ کرتے نہین نظر آتے جسکے سیدھی سادی کھلی وجہ یہی تھی کہ ابتک اونہین انکی قدر و قیمت کا پہچاننا ہی نہ آتا تھا۔ اُنکے خاص علوم کے دو شعبے بھی جنکی وہ سب سے زیادہ عظمت و وقعت کرتے تھے یعنی تفاسیر قرآن اور احادیث نبوی ہنوز ضبط تحریر مین نہ لائے تھے اور جس طرح ازمنۂ قدیم مین ویدون کی تعلیم و تلقین بے وساطت تحریر زبانی ہوا کرتی تھی اُسی طرح ابتک مسلمانون کے یہ علوم بھی محض حافظے کے زور سے بے مدد کتاب زبانی ہی پڑھائے جاتے تھے۔ جس زمانہ کا یہان ذکر ہے اُس زمانہ مین یہ لوگ لکھنے پڑھنے سے فقط بے اعتنائی ہی نہین برتتے تھے بلکہ اوسے بہت

۱۰ اگست ۱۹۲۳ء کو یہ مضمون ڈھاکہ یونیورسٹی کی انجمن تاریخی کے سامنے پڑھا گیا تھا۔

دیوفانتوس اون کی نظر سے گزری تھین ابن الادمی کے نقشجات نجومی کی تمہید مین جنہین القاسم نے ۳۰۸ھ ہجری مطابق ۹۲۰ عیسوی مین شائع کیا لکھا ہے کہ خلیفہ منصور مذکور کے زمانہ مین ایک اپنے فن کا ماہر کامل ہندوستانی جوتشی خلیفہ کے دربار مین پہنچا اور مساوات سیارگان کے نقشے معہ کسوف وخسوف و عروج بروج کے بیانات کے اپنے ہمراہ لایا اور کہا کہ یہ نقشجات ایک ہندوستانی راجہ کے حسابات سے ماخوذ ہین جسکا نام عربی مصنفون کی رسم خط مین بگڑ بگڑا کر فیغر ہوگیا ہے۔ خلیفہ نے اس موقع کو غنیمت جانکر اور اس اتفاق حسنہ کو نعمت غیر مترقبہ سمجھکر اس کتاب کے ترجمہ اور اشاعت کا حکم صادر کردیا کہ ستارون کے متعلق تمام امور مین عربون کی رہنما ہو۔ چنانچہ یہ کام بزرگ محمد بن ابراہیم الفزاری کے سپرد کیا گیا جسکا ترجمہ نجومون مین آجتک سندہند یا ہندسند بزرگ کے نام سے معروف ہے۔

ابن الادمی کی رائے مین اسکے معنی الدھر الداھر (گردش کرنیوالا زمانہ) اور مسعودی اور بعض دوسرے لوگون کی رائے مین دھر الدھور (زمانون کا زمانہ) ہین۔ چونکہ سندہند اور برہمہ گپتا کے برہمہ یا برہمہ سدہانت کے نظام متحد ہین ہم بے خوف یہ نتیجہ نکال سکتے ہین کہ اول الذکر آخر الذکر پر مبنی ہے۔ یہ برہمہ گپتا ساتوین صدی عیسوی کے نصف اول مین ورا ہمہرا کے بعد سب سے چمکتا ہوا ہندی جوتشی تھا۔ الفزاری کی یہ تصنیف جو ہندی نظام نجومی سے ماخوذ تھی چھٹے عباسی خلیفہ المامون کے زمانہ تک برابر مسلمانون مین متداول رہی - اس خلیفہ کے حکم سے محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے اسکا خلاصہ کیا جو اسوقت سے لیکر آجتک سندہند خرد کے نام سے مشہور چلا آتا ہے - یہ خلاصہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ مذکور کے واسطے اوسکی شاہزادگی کے زمانہ مین کیا گیا تھا۔ اس مصنف نے اسی قسم کے نقشجات نجومی خود بھی ترتیب دیے جن مین ہندی نقشجات کی ترمیم و اصلاح کا دعویٰ کیا ہے - وہ بڑے نقشجات بھی جنکو زمانہ مابعد مین ابن الادمی نے مرتب کیا اور القاسم نے تکمیل کو پہنچایا ہندی نجوم ہی کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے۔ نجومی نقشجات کا ایک اوران سے بیشتر مجموعہ وہ ہے جسے المامون کے زمانہ مین بغداد کے نجومی حبش نے مرتب کیا۔ اسی طرح سندہند پر مبنی متعدد اور نقشجات کی تیسری صدی ہجری مین اشاعت کی گئی جن مین سے فضل بن حاتم ناطری اور ابوالحسن بن مصباح کے مولفات خاص طور پر قابل ذکر ہین -

ابوریحان بیرونی نے الآثار الباقیۃ کے دیباچہ مین جو اپنے تصنیفات کی فہرست دی ہے

برا سمجھتے تھے اور اپنی مقدس معلومات کے سرمایہ کو کتاب کے حوالہ کرنا خطرناک جانتے تھے۔ اس نفرت و خوف کے اسباب و وجوہ بھی تھے مگر اُن کے بیان کرنے کا یہ محل نہین۔ ہجرت سے تقریبًا ڈیڑھ سو برس تک اُنکے علم بے کتابت ہمپایۂ جہالت کی یہی حالت رہی۔ علماے اسلام کی ہر قسم کے کتابی علم سے سخت نفرت اور برہمنون کے ویسے ہی قوی اور گہرے تعصبات پر نظر رکھی جائے جو غیر ہندو تو خیر ہندو خود نیچ ذات ہندوان کو بھی اپنے مقدس خزانون کے پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے تو فاتحان سندا یک عرصہ تک اس دولت سے ناواقف رہنے پر ہدف ملامت نہین بنائے جا سکتے۔

بنی اُمیہ کی حکومت کے خاتمہ اور بنی العباس کی سلطنت کے آغاز کے ساتھ جنھون نے علوم کی پرزور محبت اپنے برگزیدہ و روشن دماغ جد امجد حضرت ابن عباس سے میراث مین پائی تھی جہالت و تعصب کی گھنگھور گھٹائین جلد کافور ہو گئین، علم و حکمت کا آفتاب چمکنے لگا۔ خاندان عباس کے پہلے فرمان روا ابوالعباس سفاح کو صرف قریب ڈھائی سال کے حکومت کرنا نصیب ہوا۔ علوم و فنون کی سرپرستی تو رہی ایکطرف اُس عظیم الشان سلطنت کے ضبط و استحکام کی بھی مہلت نہ ملی جو یون اچانک اُسکے ہاتھ لگ گئی تھی ۔ مگر اس خاندان کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور دوانقی کے عہد دولت مین جبکہ مسلمانون نے اول اول غیر زبانون کا سیکھنا اور اُنکے ادبیات کا مطالعہ شروع کیا تو یونانی فلسفہ و طب کے ساتھ ہی ساتھ اور اوسی مقدار مین اُنکی توجہ ہندوستانی علوم فنون کیطرف مبذول ہوئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی طب، نجوم، جبر و مقابلہ، اور حساب کا مطالعہ اونھون نے یونان کے علوم مذکورہ سیکھنے سے بہت پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے ہاتھون مین ان علوم نے جو نشو و نما پائی اور ترقی کی اُسپر اس واقفیت نے گہرا اثر ڈالا۔ انہین علوم اور دیگر ادبیات ہند کے عربی فارسی اور اردو مین منتقل ہونے کی تاریخ مین اسوقت بہ اختصار آپکے سامنے پیش کرنا چاہتا ہون۔

نجوم | عرب ہندی نجوم اور علوم اعداد سے اس سے بہت پہلے واقف ہو چکے تھے کیونکہ یونانی نجومیون اور ریاضی دانون کی تصانیف اُنکی نظر سے گذر چکی تھین ہندوستان مین جو تین نظام نجومی رائج تھے اُن تینون سے عرب خاندان عباس کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور دوانقی ہی کے زمانہ مین وقوف حاصل کر چکے تھے یعنی اس سے بہت پہلے محمد ابو الوفا بزجانی کی چوتھے صدی ہجری کی لکھی ہوئی شرح

اُسمین برہم گپتا کے سدہانت کے عربی ترجمہ سند ہند پر بھی ایک رسالہ کا ذکر کیا ہے۔

ہندوستان کے باقی دو نظامون یعنی آریہ بھٹہ اور ارکہ کے نظامون سے بھی عرب بالکل ناواقف نہ تھے۔ آریہ بھٹ کی ذرا بگڑی ہوئی عربی شکل ارجبھر سے عرب مصنف بخوبی آشنا معلوم ہوتے ہین۔ رہا یہ کہ آریہ بھٹ سے ارجبھر کیونکر بن گیا تو اسکی توجیہ نہایت آسان ہے۔ آریہ کے الف ممدودہ کو مقصورہ سے اور آخری یائے مفتوح کو جیم ساکن سے بدلا تو ارج ہو گیا۔ یہ تغیر عربون نے نہین کیا بلکہ خود ہندی زبانون مین ارج بجائے آریہ کے کثرت سے آتا ہے۔ بھٹ کی آخری تائے مفتوح کو ساکن کیا تو بھٹ ہوا۔ (ٹ) اور (ڑ) کا ہندوستانی زبانون مین کثرت سے مبادلہ ہوتا ہے لہذا بھٹ سے بھڑ بنا جیسا کہ مرہٹی لفظ بھڑجی مین یہان تک تو سب کایا پلٹ ہندوستان ہی مین ہوئی۔ ڑے کا رے سے مبادلہ بھی اگرچہ ہندوستان مین ایک عام بات ہے مگر اس لفظ مین یہ تغیر بظاہر عربون ہی نے یہ مجبوری کیا کیونکہ ڑے انکی زبان مین ہے ہی نہین۔ ارکہ کو عرب ارکند کہتے ہین اور یہ خرابی ہندی مین ہنوز رائج ہے۔ بیرونی کی تصنیفات مین ہمین پھر ایک رسالہ "قانون ارکند کا جدید نسخہ" "برہم گپتا کے کھنڈ کہادیکہ کا عربی ترجمہ" کے نام سے ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سنسکرت کی تصنیف مذکورہ کا عربی ترجمہ بیرونی کے زمانہ تک موجود تھا مگر مترجم کے نام اور زمانہ کے متعلق بیرونی بھی ہمین اوسی طرح تاریکی مین چھوڑتا ہے جس طرح اس سے پہلے تھے۔

آریہ بھٹ اور برہم گپتا کے علاوہ اسی زمانہ مین یعنی منصور، رشید اور مامون اور اوسکے قریبی جانشینون کے زمانہ مین اور بھی بہت سے ہندی منجمون کی تصانیف کے عربی مین ترجمے ہوئے۔ **عیون الانباء فی طبقات الاطباء** مین ایک درجن سے زیادہ ایسے نام موجود ہین مگر اسطرح خراب خستہ، لولے لنگڑے اور عربی خط مین ایسے مسخ شدہ کہ انکی سنسکرت اصلون کا یقینی طور پر کھوج چلانا خصوصاً اوس شخص کے لیے جو زبان سنسکرت اور ہندی نجوم کی تاریخ سے ناواقف ہو قریباً ناممکن ہے۔ مثلاً اوس ہندی منجم کا نام جس سے ابو معشر جعفر بن محمد بلخی نے وہ معلومات اخذ کی ہین جنھین وہ اپنی تصنیف **کتاب الالوف** مین ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور جنکو وہ ہندی فلسفیون اور ریاضی دانون مین سب سے سربرآوردہ بتاتا ہے عربی رسم الخط سے اکثر ہندی حروف اور کل اعرابون کے مفقود ہونے کے سبب سے بہت سے مختلف طرزون سے پڑھا جا سکتا ہے۔ عربی مصنف اسکا نام کنکمہ لکھتے ہین جسے ہم

کنکہ، کنکہ، کنکہ وغیرہ وغیرہ پڑھ سکتے ہین۔ صاحب طبقات الاطبا اس گمنام و نشان ہندی فلسفی کو زمانہ قدیم کے سب سے زیادہ ذی علم لوگون مین بتاتا ہے جو اپنے زمانہ مین اجرام سماوی اور حرکات سیارگان کے علم مین اپنا نظیر نرکھتا تھا۔ اوسکی تصنیفات کی نسبت اسی مصنف کا بیان ہے کہ سب کا عربی مین ترجمہ ہوچکا ہے، اور یہ کہ ان مین سے اوسکی کتاب النموذار (جنم پترون کی کتاب) کتاب القرانات الکبیر (سنجوگون کی بڑی کتاب) اور کتاب القرانات الصغیر (سنجوگون کی چھوٹی کتاب) خاصکر سزاوار ذکر ہین۔ اور بھی بہت سے ہندی حکیمون، طبیبون، اور نجومیون کے اسی طرح بگڑے ہوئے نام جنکی تصانیف کے زمانہ زیر بحث مین عربی ترجمے کیے گئے مصنف مذکور نے صنجہل، باکھر، راجہ، داہر، انکر، زنکل، جبر، جاری، جودر، منکہ وغیرہ بتایا ہے اور کہتا ہے کہ ان مین سے ہر شخص بہت سی کتابون کا مصنف اور نجومی نظریون کا موجد تھا۔

اب ظاہر ہے کہ جبتک انسان ان ترجمون اور اصلی کتابون دونون سے بخوبی واقفیت نہ رکھتا ہو اور یون دونون کے مقابلہ و موازنہ پر قادر نہو ان مسخ شدہ لفظون کی سنسکرت اصلون کا پتہ چلانا ناممکن ہے۔ مگر ان ظاہرالاتخیل معمون کی سنسکرت کے ساتھ تطبیق سے ہمارا قاصر رہنا کوئی معقول وجہ اس امر کی نہین ہوسکتی کہ اتنے بہت سے مسلمان مورخون کی شہادت پر شک وشبہہ کیا جائے جو اپنے راستبازی و راستگوئی مین ضرب المثل ہین اور جنکے بیانات کی محرک وہ خواہش بھی نہین ہوسکتی جو ناظرین مین سے بعض حضرات شاید میرے سر تھوپنے پر مائل ہون، علاوہ ازین فہرست مذکورۂ بالا مین آخری نام تو ایک ایسے شخص کا ہے جو مدتون خلیفہ ہارون الرشید کا طبیب خاص تھا اور اسلیے کوئی عاقل اوسکے وجود سے انکار کی جراءت نہین کرسکتا۔

مابعد کے زمانون کیطرف آتے ہین تو ہماری مڈبھیڑ اوس اعجوبۂ روزگار ابوریحان بیرونی سے ہوتی ہے جس نے مثل ابومعشر اور محمد ابن اسمٰعیل تنوخی کے ہندوستان مین رہکر اور برہمنون سے میل جول پیدا کرکے سنسکرت زبان سیکھی۔ سنسکرت کی بہت سی تصانیف کا عربی مین ترجمہ کیا کئی ایک عربی کتابون کا اپنے پنڈت دوستون سے سنسکرت مین ترجمہ کرایا اور خود ہندی علوم خصوصاً نجوم پر جسکا وہ سب سے زیادہ دلدادہ تھا متعدد کتابین لکھین۔ اوسکے گل سرسبد یعنی کتاب الہند کا زیادہ تر حصہ نجوم اور حسابات نجومی ہی کے نذر ہے۔

برہمہ سدہانت پر ایک رسالہ کے علاوہ جسکا نام جوامع الموجود لخواطر الہنود فی حساب التنجیم ہے اور قانون الارکند کے سوا جسکا ذکر اوپر آچکا اوس نے وراہمہر اکی مشہور کتاب لگھو جاتکہ (چھوٹا جنم پترا) کا ترجمہ کیا۔ جرمن عالم سخاؤ نے کتاب الہند کی تمہید مین اس مصنف کی بائیس کتابون کی جو فہرست دی ہے اوس مین ہین کئی رسالے اسی مضمون پر ملتے ہین۔

دہلی کے متقی بادشاہ سلطان فیروز شاہ تغلق کو سنسکرت اور اُسکے ادبیات سے جو دلچسپی تھی اُسکا حال مولینا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ مین یون تحریر فرمایا ہے "اس زمانہ (یعنی مدت قیام نگر کوٹ) مین لوگون نے حضور کے کانون تک یہ بات پہنچائی کہ یہان جوالا مکھی (زانبدہ رو دے) نامی مندر مین پرانے زمانہ کے برہمنون کی لکھی ہوئی ایکہزار تین سو کتابون کا ذخیرہ ہے۔ اعلیحضرت نے ان کتابون کو منگوا کر اکثر کا فارسی مین ترجمہ کرایا۔ اور منجملہ ان کے نجوم کی ایک کتاب کو دربار کے مشہور شاعر عز الدین خالد خانی نے دلائل فیروز شاہی کے نام سے فارسی مین منظوم بھی کیا۔ ۱۰۰۰ ہجری مین شہر لاہور مین مینے اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھا مگر اسقدر تحسین و آفرین کے لائق نہ پایا۔ فیروز شاہ کے حکم سے ترجمہ کی ہوئی دوسری کتابین بھی مینے پڑھی ہین بعض ان مین سے موسیقی پر ہین بعض فن کشتی گیری پہ باقی اور مختلف مضامین پر ہین مگر زیادہ تر ردی اور نکمی ہین"۔ ملا عبد القادر بدایونی کی اس مذمت کا منشا خشک مغزی و تعصب معلوم ہوتا ہے کیونکہ مصنف سیر المتاخرین لکھتا ہے کہ سلطان فیروز شاہ دلائل فیروز شاہی کو پڑھکر ایسا خوش ہوا کہ اوس نے مصنف کو ایک گران بہا صلہ اور وسیع جاگیر عطا فرمائی، یہ کتاب اوسے ایسی پسند تھی کہ بار بار پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ مآثر رحیمی کا مصنف بھی اس کتاب کا ان لفظون مین مداح ہے "فقیر مطالعۂ آن کتاب نمودہ ام۔ الحق کتابیست مشتمل بر اقسام حکمت علمی و عملی"

اکبر کے زمانہ کے ترجمون کی جو لانبی فہرست بدایونی نے دی ہے اُسمین نجوم کی کسی کتاب کا ذکر نہین پایا جاتا مگر ہمین یقین ہے کہ بدایونی نے اُنہین ترجمون کی فہرست دی ہے جن سے اوسے بلا واسطہ یا بواسطہ ذاتی تعلق تھا۔ بخلاف اسکے آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی، چند، گنگادھر، مہیش اور مہانند کی مدد سے ملا شیری نے سنسکرت کی ایک ضخیم کتاب تنجیم کا فارسی مین ترجمہ کیا۔ اصل کتاب اور مصنف کا نام قلم انداز کرکے فارسی ترجمہ کا نام ابو الفضل نے نتیجۂ جدید میرزائی بتایا ہے۔ آگے چلکر نجوم کی ایک اور مفید تصنیف کتاب تاجک کی نسبت لکھتا ہے کہ محمد خان گجراتی نے بحکم شاہنشا

سکا فارسی مین ترجمہ کیا۔

کاشمیر مین سلطان زین العابدین نے جو محکمۂ ترجمہ قائم کر رکھا تھا اس سے شائع ہونیوالی کتابون کی ناقص فہرستون مین بھی علم نجوم کی کسی تصنیف کا ذکر نہین آتا مگر چونکہ یہ دارالترجمہ بہت زمانہ تک برابر ایک بڑے ہندو دان کی زیر نگرانی قائم رہا اور اسکے تمام کارکن بھی بڑے بڑے پنڈت تھے، اسلیے نہایت بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگون نے اپنے ادبیات کی اس بارور شاخ سے سراسر غفلت برتی ہو،

(باقی) فدا علیخان رامپوری ایم اے (علیگ)

ہندوستان کی مستورات بلحاظ تعلیم

نام فرقہ	ناخواندہ	خواندہ	انگریزی دان
ہندو	۱۰۵۹۰۵۹۰۴	۸۱۴۸۱۰	۲۳۶۵۹
سکھ	۲۲۶۲۳۲۷	۱۷۲۸۰۰	۲۳۸
جینی	۵۸۰۵۰۹	۲۲۱۲۰	۲۰۹
بدھ	۵۱۱۷۷۲۸	۳۱۷۴۴۸	۱۳۸۳
پارسی	۱۷۷۵۵	۳۱۲۱۸	۸۳۴۷
مسلمان	۳۱۴۴۶۰۰۵	۱۳۷۸۰۰	۳۹۴۰
عیسائی	۱۶۱۳۱۷۷	۲۵۲۲۹۵	۱۱۲۹۴۳

جناب نظرؔ لکھنوی مرحوم

مجکو نظرؔ آنجہانی کی قدمبوسی سے فیضیاب ہونے کا موقع اُسوقت نصیب ہوا جبکہ وہ اخیر مرتبہ دفتر زمانہ کانپور مین قیام پذیر تھے اور رسالۂ زمانہ و اخبار آزاد کی ادارت مین اپنی بے مثل دماغی قابلیت کے ذریعہ قرار واقعی مدد دے رہے تھے یہ اگست یا ستمبر ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔ وہ محض حُسن اتفاق تھا کہ اڈیٹر صاحب زمانہ سے ملنے کے لیے جانے پر مین مرحوم سے بھی مل سکا۔ ملنا کیا تھا؟ شاید زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر تک چند ایسے کلمات کا سن لینا جو اُنکی زبان سے وقفہ کے ساتھ ادا ہو جاتے تھے کیونکہ اُسوقت مرحوم اپنے ادارتی کام کی انجام دہی مین حد درجہ منہمک تھے۔ البتہ اُس سرسری ملاقات سے اتنا ضرور ہوا کہ مجکو مرحوم سے روشناس ہونے کے لیے کافی وقت ملگیا اور دلپر ایک ایسا اثر پڑا جو اہلِ کمال کے قربت سے صرف چند لمحون مین بھی یقیناً پڑ جایا کرتا ہے۔ مجھے اِسوقت جہانتک خیال ہے۔ نظرؔ مرحوم ایک دُبلے پتلے، گندمی رنگ کے، میانہ قد بزرگ تھے۔ اُنکے بشرہ سے شرافت۔ متانت اور ذہانت کے آثار نمایان طریقہ پر آشکارا تھے اور ساتھ ہی اُسمین مسلسل غور و فکر سے پیدا ہو جانے والی نمود کا بھی شائبہ نظر آتا تھا۔

نظرؔ مرحوم لکھنو کے مردم خیز خطہ مین پیدا ہوئے تھے۔ اُنکا سنہ ولادت ۱۸۶۶ء تھا اور اُنکا تعلق ایک ایسے معزز کایستھ خاندان سے تھا جسکے ممبر لکھنؤ کے شاہی زمانہ مین اچھے اچھے عہدون پر مامور رہ چکے تھے۔ لیکن جو اعزاز کہ خاندانی عزت و قدامت کے بناؤ پر حاصل ہوتا ہے وہ حقیقی اعزاز نہین ہوتا اور نہ دنیا کی ممتاز ہستیان محض ایسے اعزاز کے حصول پر قانع ہوسکتی ہین وہ اپنے لیے خود ہی عزت و ناموری کے ایسے خاص ذرائع پیدا کر لیتی ہین جن سے بالا اُنکی خاندانی شہرت کے آسمان کو بھی چار چاند لگ جاتے ہین۔ نظرؔ مرحوم کے نسبت بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے وہ ایسے مقام مین پیدا ہوئے تھے جسکے ساتھ آتشؔ و ناسخؔ، و دبیرؔ و انیسؔ،

آسیر و جلال جیسے اُستادان سخن کے حلقات وابستہ رہ چکے ہین اور جو اسوقت بھی "شہر سخن کی سر زمین" کہلائے جانے کا بڑی حد تک سزاوار ہے۔ مرحوم نے اسی سرزمین کے ادبی آب و ہوا مین پرورش پائی تھی انکو قدرت کی جانب سے ایک اثر پذیر دل عطا ہوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی نشو و نما کی حالت مین ہوتے ہوئے اُس آب و ہوا کے لطف آگین اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے کتاب علوم کے ساتھ ساتھ اُن کی نکتہ سنج طبیعت نے اپنا قدرتی رنگ دکھانا شروع کیا۔

جناب آغا منظر لکھنوی مرحوم بڑے پایہ کے شاعر تھے وہ اسقدر محتاط تھے کہ اُن سے تلمذ حاصل کرنا ہر شاعر کا کام نہ تھا نظر کی عمر صرف (۱۷) سال کی تھی جبکہ لکھنو کے کسی خاص مشاعرہ مین اُنھون نے بھی اپنی غزل پڑھی۔ یہ غزل منظر صاحب کی دوہری اصلاح سے مزین تھی گویا اُنھون نے اُسی وقت سے ہونہار نوعمر شاعر کو اپنے زمرۂ تلامذہ مین داخل کر لیا تھا قابل اُستاد نے اپنے وسیع تجربہ کے رو سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ اُنکی نظرِ انتخاب ایسے نوجوان پر پڑی ہے جو آیندہ کسیوقت اُنکی نیکنامی مین کافی اضافہ کریگا اور حضرت منظر کا یہ خیال کسیطرح بھی غلط ثابت نہین ہوا۔ نظر مرحوم نے اُنھین سے اکتساب فن بھی کیا اور اکتساب کمال بھی حتےٰ کہ اپنی نازک خیالی و پختہ مشقی کے بدولت وہ بالآخر خود بھی ایک کامیاب اُستاد نکلے۔ ان باتون سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم اوائل عمر ہی کے زمانہ سے کسقدر طباع و ذکی واقع ہوئے تھے اسی طباعی و ذکاوت فطری نے آگے چلکر دنیائے ادب مین وہ وہ گل نمایان کیے کہ آج نظر مرحوم کا شمار لکھنو کے نامی اساتذہ مین یقیناً کیا جاسکتا ہے جسکے وہ ہمہ وجوہ اہل تھے۔

سب سے پہلا علمی کام جسکو نظر آنجہانی نے ایک مستقل صورت مین شائقین علم و ادب کے سامنے پیش کیا وہ "خدنگ نظر" نامی ماہوار رسالہ کا اجرا تھا۔ یہ رسالہ ستمبر ۱۸۹۷ء مین لکھنو سے شایع ہوا کئی سال ہوئے کہ مجھے اتفاق سے اس پرچہ کی چند پرانی کاپیان مل گئی تھین اور جو میری غفلت سے تھوڑے ہی دنون بعد ضایع بھی ہوگئین۔ یہ رسالہ دراصل اُردو غزلیات کا ایک ماہانہ گلدستہ تھا۔ اُسوقت ملک مین اس قسم کے گلدستون کو نکالنے کا رواج بھی تھا مگر خدنگ نظر مین بعد کو کچھ نثر کے مضامین بھی چھپنے لگے تھے۔ جناب آغا منظر مرحوم نے بھی اس رسالہ کو کامیاب بنانے مین خاصی مدد دی تھی غزلیات کی فراہمی کے لیے اُنھون نے مشاعرون کے انعقاد کا کافی

بندوبست کیا تھا۔ غرضکہ اسباب کی پوری کوشش کی گئی تھی کہ شعرائے وقت کا کلام زیادہ سے زیادہ پیمانہ پر دستیاب ہو سکے اور "خدنگ نظر" ایک چوٹی کا رسالہ ہو۔ وقت کے لحاظ سے پرچہ بھی واقعی شاندار تھا۔ لیکن ان سب باتون کے باوجود بھی وہ چند سالون سے زیادہ نہ رہ سکا نظر مرحوم کو اسکے بند ہو جانے کا تاعمر قلق رہا۔ خیر ازان بعد وہ ۱۹۰۲ء مین رسالہ زمانہ (کانپور) کے سب اڈیٹر مقرر ہو گئے اور میری ناچیز رائے کے موافق نظر صاحب کے علمی مساعی سے جسقدر زمانہ کی ابتدائی شہرت مین اضافہ ہوا اُسی نسبت سے اُنکی ذاتی شہرت کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

جنوری ۱۹۱۰ء مین انڈین پریس الہ آباد سے اُردو کا مشہور ماہوار رسالہ "ادیب" بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلا۔ نظر مرحوم اُسکے اوّل اڈیٹر تھے ادیب کی یاد سے دل مین ابتک کسی قدر ٹیس ضرور ہو جاتی ہے اسکو اُردو زبان کی بدنصیبی ہی کہنا چاہئے کہ ایسا اچھا اور ہونہار پرچہ ساڑھے تین سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا اور اُس سے نظر صاحب کا تعلق تو صرف ڈیڑھ سال کے قریب رہا۔ اُنھون نے جس غیر معمولی قابلیت کے ساتھ رسالہ کو ایڈٹ کیا تھا اُسکی شہادت ادیب کے اوراقِ کہنہ سے آج بھی مل سکتی ہے۔ بہرحال یہ کہنا بیجا نہو گا کہ نظر مرحوم کی جس ادبی شہرت کا آغاز "خدنگ نظر" کے اجرا سے ہوا تھا اور بعدہ جسکی ترقی مین رسالہ زمانہ کی سب اڈیٹری نے معقول مدد دی تھی۔ وہ بالآخر ادیب کے زمانۂ ادارت مین قریب قریب اپنی حد تکمیل کو پہونچ چکی تھی ادیب سے الگ ہو جانے کے کچھ دنون بعد یعنی ۱۹۱۲ء مین وہ پھر زمانہ کے دفتر مین چلے گئے اور اس مرتبہ اُنکا قیام وہان تقریباً دو سال تک رہا۔ اُنکی موجودگی سے پرچہ مین ایک قابل قدر دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔ اڈیٹر صاحب زمانہ کی ندرت آفرینیون کی شمولیت سے ایسا ہونا بالکل ایک قدرتی امر تھا۔ اُسوقت رسالہ زمانہ مین دو ایک نئے عنوانون کا اضافہ بھی کیا گیا تھا۔

۱۹۱۴ء مین نظر صاحب بسلسلۂ ملازمت نولکشور پریس لکھنو مین چلے گئے اور وہان سے نکلنے والے روزانہ اودھ اخبار کو ایڈٹ کرنے لگے۔ اس اخبار سے مرحوم کا تعلق سال گذشتہ تک رہا علمی مشاغل مین مصروف رہنے والے اشخاص کی زندگی اور بالخصوص شاعر کی زندگی

بالعموم ایک سخت محنت کی زندگی ہوتی ہے۔ شاعر کے لیے ایک نامور شاعر بنجانا کوئی آسان کام نہین ہے اسکے لیے اُسے اپنا لہو پسینہ ایک کر دینا پڑتا ہے۔ شاعر کی مثال اُس چیز سے دیجا سکتی ہے جو جلتے پر بھی خوشبو دیتی ہے۔ شہرہ آفاق انگریز مصنف اسمائلز کا بھی قول ہے۔

"شاعر کا تاج، شہید کا تاج ہوا کرتا ہے" اسکے علاوہ اگر اُسے کسب معاش کی فکر دامنگیر ہو تو پھر اُسکی جانکاہیون کا کیا ٹھکانا! نظر صاحب کی حالت مین بھی صرف یہی ساری باتین وقوع پذیر نہین ہوئی تھین بلکہ مزید برآن انکو اپنے عزیز ترین اقربا کی بیوقت موت کا غم بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر دو ڈھائی برس سے مرحوم کی صحت زیادہ خراب رہنے لگی۔ اس خرابی نے ضیق النفس کی صورت اختیار کی اور وہ بالآخر اس عارضہ کے سبب ۱۰ راپریل ۱۹۲۳ء کو آٹھ بجے صبح صرف ۵۶ سال کی عمر مین یکایک انتقال فرما گئے۔ اُردو کے موجودہ انحطاط کے زمانہ مین یہ اُمید نہین کی جاسکتی کہ نظر صاحب کی قبل از وقت وفات سے جو مخصوص جگہ بزم ادب مین خالی ہو گئی ہے وہ جلد ہی پُر ہو سکے۔ جناب محشر لکھنوی نے ذیل کے دلچسپ شعر مین مرحوم کی تاریخ وفات لکھی ہے۔

کلک محشر نے لکھا سالِ وفات شاعرِ کامل نظر سے چھپ گیا

مجھ ہیچمدان کی یہ بساط نہین کہ نظر جیسے فاضل ادیب و مایہ ناز سخنور کے علمی کارنامون پر تبصرہ کر سکون۔ مرحوم سے میرا کوئی خاص تعارف نہین تھا۔ البتہ مجھے اُنکی ذات بابرکات سے ایک غائبانہ عقیدت ضرور تھی۔ ایسی عقیدت کی اقتضا سے مجبور ہو کر مین اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہین رہ سکتا مرحوم کی زندگی کا بیشتر حصہ ایک ایسے زمانہ سے تعلق رکھتا تھا جبکہ اُردو شاعری کی دنیا مین غزل گوئی کا عام رواج تھا اور جبکہ کسی شاعر کا صاحب دیوان ہونا ہی ایک بہت بڑی بات خیال کیجاتی تھی*۔ غزل کی صنف فی الواقع ایسی صنف ہے جو اپنی معنوی خصوصیت کے اعتبار سے عشق حقیقی یا عشقِ مجازی والے مختلف جذبات کے ساتھ ایک گہرا تعلق رکھتی ہے اور عشق کا خاصہ سوز و درد ہے۔ بس ظاہر ہے کہ ایک غزل گو شاعر کے دل مین سوز و درد کا مادہ

---

* یہ نہین کہا جاسکتا کہ ایسا رواج یا خیال اسوقت بالکل مفقود ہو گیا ہے لیکن دنیائے ادب فی الجملہ شعرائے نامدار سے کچھ اور زیادہ باتون کی اُمید رکھتی ہے۔ محرر

جسقدر زیادہ ہوگا اُسی قدر شاعر کے کامیابی بھی یقینی ہے ان باتون کے لحاظ سے نظر مرحوم کی طبیعت خاص طور پر موزون واقع ہوئی تھی وہ ازل ہی سے ایک درد مند دل لیکر آئے تھے، وقت کی ناگواریا بالخصوصیت نے بھی اُنکے دل پر اپنا اثر ڈالا تھا وہ غزلگوئی کیطرف رجوع ہوئے اور کثرت مشق کے ساتھ ساتھ اُنکے درد و سوز والے دلی جذبات مین بھی یوماً فیوماً اضافہ ہوتا گیا دنیاوی آلام و مشکلات نے بھی اس اضافہ مین کافی حصہ لیا تھا - یہانتک کہ ادھر چند سالون سے تو وہ اپنی زندگی کو وبال سمجھنے لگے تھے - اسطرف رفتار زمانہ سے متاثر ہوکر مرحوم نے نیچرل رنگ مین بھی طبع آزمائی کرنا شروع کر دیا تھا، گر یہان بھی اُنکا فطرتی رجحان بعض اوقات اپنی انتہائی نمود کی حالت مین نظر آجاتا تھا و نسبتاً غزل ہی زیادہ کہتے تھے اور واقعی بات تو یہ ہے کہ اُنکی غزلین ہر پہلو سے دلچسپ ہوا کرتی تھین۔ اُنھین اس صنف مین درجہ کمال حاصل تھا۔ اس لحاظ سے اسوقت انکا ہمسر شاید ہی کوئی قرار دیا جا سکے کم از کم میرا خیال تو یہ ہے کہ نظر مرحوم فن غزل گوئی مین یکتائے عصر تھے۔

ہم ابھی تبلا چکے ہین کہ نظر صاحب کی نیچرل نظمون مین بھی تغزل کا عنصر بیشتر غالب رہتا تھا اور راست گوئی مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ جب کبھی اُنھون نے ایسی نظمون کی تصنیف مین اپنی مقررہ روش سے متجاوز ہونے کی کوشش کی تو انمین وہ تاثیر نہین پیدا ہوسکی جو دل کے پوشیدہ ترین جذبات کو متحرک کر سکے۔ لیکن اس سے مرحوم کے اُستادانہ اقتدار مین کوئی فرق نہین آتا۔ خدائے[1] سخن مرزا غالب دہلوی سے دبیر یا انیس لکھنوی کے طرز پر مرثیہ گوئی کی فرمائش کی گئی تھی تو آپ نے مشکل سے دو تین بند لکھے اور پھر یہ کہکر معذرت خواہ ہوئے کہ "مجھے ایسی مشق بہم پہونچانے کے لیے اب کسی دوسری عمر کی ضرورت ہے" بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ایک خاص رغبت رکھتا ہے اور اُسی کے مطابق لگاتار سعی و محنت کرنے پر اُسکو بالآخر درجہ کمال حاصل ہوجاتا ہے - نظر مرحوم مین بھی یہی بات تھی - اشعار ذیل ملاحظہ ہون؛

بہار مین ہے یہ ناز آفرین ادائے بہار (۱) قدم زمین پہ رکھتی نہین ہوائے بہار
غضب ہے شعلہ فشان گرمئ ادائے بہار جدھر سے آگ لگی لے اُڑی ہوائے بہار

[1] مولانا حالی مرحوم غالب مرحوم کے خطوط کے حوالہ سے اس روایت کی کافی ذمہ دار ہو چکے ہیں۔ ایڈیٹر

وہ ایک تم کہ سراپا بہار ناز تھی گل
وہ ایک میں کہ نہیں صورت آشنائے بہار

بلا سے پتے ہی پتے چمن میں مرجاؤں
کسے امید ہے پھر آئے یا نہ آئے بہار

زمین پہ لالہ و گل سے آشکار ہوا
چھپا نہ خاک میں جب حسن خود نمائے بہار

تعلق گل و شبنم ہے راز الفت بھی
انھیں ہنسائے حیا تک ستم انھیں رلائے بہار

وہ ایک دن جو کھلا اور کھل کے مرجھایا
یہ ابتدائے بہار اور انتہائے بہار

جہاں میں کیسے کھلے ہیں اب یہ لالہ و گل
دل نظر نہیں مدت سے آشنائے بہار

(۲)

کہاں ہیں جرعہ کش لطف ابتدائے بہار
وہ آ سکے ابر کے ٹکڑے چلی ہوائے بہار

وہ جھوم جھوم کے چار و طرف گھٹا چھائی
ہوا نے کھول دی وہ زلف مشکسائے بہار

وہ شور رعد سے سارا جہان گونج اٹھا
ہوئی وہ دھوم سے پھر آج ابتدائے بہار

زا کر رہی ہے وہ بجلی گرج رہا ہے وہ ابر
بجا رہی ہے وہ ساز طرب ہوائے بہار

پیام موسم گل لیکے ابر آیا ہے
ترانہ سنج ہیں مرغان خوشنوائے بہار

چمک رہی ہے یہ ابر سیاہ میں بجلی
چڑھا ہوا ہے کسوٹی پہ یا طلائے بہار

ہے تن پہ کیسے لباس بوسیدہ
نئے لباس درختوں کو پھر پنھائے بہار

چمن میں ابر نے چھینٹے کرن سے کھائی
خزاں کی فصل کی کشتوں کو پھر جلائے بہار

یہ اشعار مرحوم کی دو نظموں سے منتخب کئے گئے ہیں۔ یہاں اقتباس نمبر ۲ کے اشعار میں بھی کافی شگفتگی موجود ہے اور ان میں بہار (یا برشگال ؟) کے مناظر کے ایک عمدہ تصویر کھینچی گئی ہے لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ شاعر نے اپنے زور تخیل سے جو تاثیر اقتباس نمبر ا کے اشعار میں پیدا کر دی ہے وہ یہاں مفقود ہے اسکی وجہ محض یہی نہیں کہ نمبر ۲ والے اشعار میں تغزل کا رنگ کم ہے یا تاثیر کا وجود صرف طرز تغزل کے ساتھ ہی وابستہ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ دراصل مرحوم میں اس خاص بات کا نمونا ہے۔ جو کسی بڑے شاعر کے طبعی خاصہ کے موافق نظم کے کسی خاص شعبہ میں کافی تاثیر و دلکشی پیدا کر سکتی ہے۔ مرحوم کے دو مسدسوں کے دو دو منتخب بند

اور ملاحظہ ہوں ۔

(۱)

ہوا تمام اُمیدوں کا خاتمہ یکسر　　کسی سے اب نہ توقع نہ ہے کسی پہ نظر
جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا نہیں ہے خبر　　مرے پہ دیکھیے ملتا ہے اب کفن کیونکر
کہاں گئے مری بگڑی سنوارنے والے
پکار لو مجھے لالہ پکارنے والے
تھو تھو کر اس اُجڑے مکان کا تھا یہ چراغ　　بہار پر تھا اسی تونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ　　تمام عمر دل ناتوان ہے اور یہ داغ
فغانِ بلبل جان دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

(۲)

برادرانِ وطن کا پیامِ غم سن لو　　حکایتِ ستم و قصۂ الم سن لو
سنے نہ ہوں جو زمانہ میں وہ ستم سن لو　　غریب قوم کا احوال بیش و کم سن لو
جہاں سے رخصت بیمار ہے خدا حافظ
جنازہ قوم کا تیار ہے خدا حافظ
یہ تیرے نام کا ہر پاس اُنکو اے بھارت　　کہ جان جائے نہ جائے مگر تری عزت
ہے تیری عظمتِ دیرینہ کی اُنھیں غیرت　　وطن پر دور ہیں لیکن ہے اُنہیں وہ ہمت
مٹینگے ان پہ جو بگڑی بنا کے اُٹھینگے
مٹانیوالوں کو اپنے مٹا کے اُٹھینگے

یہاں بھی وہی بات ہے نمبر (۱) والے اشعار کا مضمون مرحوم کے طبعی خاصہ سے مطابقت رکھتا ہے اور بس اُسکو نظم کرنے میں اُنھوں نے اپنے غیر معمولی کمال کا زور دکھایا ہے۔ اشعار کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُن کے دکھ بھرے دل سے خود بخود نکلے پڑتے ہیں پس ایسی صورت میں اُنکا اثر میں ڈوب کر نکلنا بالکل لازمی ہے۔ مرحوم کی یہ نظم ایک نوحہ ہے جو اُنھوں

نے اپنے نواسہ کی وفات حسرت آیات پر لکھا تھا کوئی اولاد نرینہ نہونے کی حالت مین یہی نواسہ انکا سب کچھ تھا۔ اُسکے مرنے سے شاعر کے دل پر جو کچھ گذری اُسکا ادا کرنا اس سے بہتر اور زیادہ موثر طریقہ پر ناممکن معلوم ہوتا ہے نمبر ۲ والے بند اُس نظم سے ماخوذ کیے گئے ہین جو جنوبی افریقہ کی گذشتہ ستیاگرہ کے موقع پر مظالم جنوبی افریقہ کے عنوان سے لکھی گئی تھی۔ اسمین مرحوم نے جذبات نگاری کے غم آمیز پہلوؤن تک محدود نہ رکھا۔ بلکہ خاص معیار سے تجاوز کرنے کی کوشش کی ہے اور اسلیے نظم مین وہ زور نہین پیدا ہو سکا جسے "قومی اسکول" کا کوئی خاص شاعر اسمین ضرور ہی پیدا کر دکھاتا۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مین نظر مرحوم کو اُنکے انداز خاص و نیز ان کی بیشتر نظمون کی بنیاد پر اُسی طرز سخن کا اُستاد سمجھتا ہون جس کے مقلدین مین اساتذہ قدیم کے اسمائے گرامی شامل کئے جا سکتے ہین یون تو نظر جیسا با کمال سخنور ہر صنف مین طبع آزمائی کرنے اور اپنی فکر رسا کے جوہر دکھانے کی صلاحیت رکھ سکتا ہے در حقیقت مرحوم کے اُستاد فن ہونیکا یہ بھی ایک بین ثبوت ہے۔

نظر صاحب کی نظمین اپنا ایک مخصوص طرز رکھتی تھین۔ اُنکی بندش نہایت صاف، چُست، دلکش اور معنی خیز ہوتی تھی۔ اُنکی تشبیہین بالکل عام فہم ہوا کرتی تھین اُنکے ہر ہر شعر کو پختہ مشقی اور قادر الکلامی کا نمونہ کہنا چاہیے۔ سادگی مین متانت پیدا کرنا مرحوم شاعر کے لیے ایک معمولی کام تھا۔ اُنکے جذبات مین پاکیزگی تھی۔ اور خیالات مین بلندی۔ انھون نے اپنی نظمون مین عموماً اور غزلیات مین خصوصاً عامیانہ باتون کو شامل نکر کے شاعری کی عزت کو ہر پہلو سے برقرار رکھا۔ شاعری کا اعلے معیار ہی ہمیشہ اُنکے پیش نظر رہا۔ اور یہ بھی ایک بہت بڑا سبب ہے اُس رنگینی و دلفریبی کا جو اُن کے کلام مین پائی جاتی ہے مین خود غزل نہین کہتا مگر حسن اتفاق سے جب کوئی عمدہ غزل سامنے آجاتی ہے تو پھر اُسے مزہ لے لیکر ہی پڑھا کرتا ہون۔ غالب، مومن، شیفتہ، حسرت (موہانی) کی غزلیات میرے لیے مستقل دلچسپی کی چیزین ہین اور مجھے یہ کہنے مین ذرا بھی تامل نہین ہو سکتا کہ نظر مرحوم کی غزلیات بھی مجکو بالکل اُسی طریقہ پر لطف اندوز کرتی ہین بیان اسقدر عرض کر دینا نہایت ضروری سمجھتا ہون کہ مجھے اپنے اس بیان سے نظر مرحوم کے اُس کلام کی تحقیر اصلا منظور نہین جو اُنھون نے

دیگر اصناف کے شاعری مین ارشاد فرمایا ہے

۱　مرحوم صرف شاعر ہی نہ تھے وہ نثر بھی لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ نظم کیطرح اُنکی نثر بھی نہایت واضح روان اور دلکش ہوتی تھی سلیس فقرات اور عام فہم محاورات کا استعمال نثر مین جان ڈالدیا کرتا ہے۔ نظر کی نثر مین بھی تمام وکمال یہی خوبیان ہین۔ مختصراً اُنکی تحریر کو اُردو زبان کا ایک اچھا خاصہ نمونہ سمجھنا چاہیے۔ تنقید نگاری تو مرحوم کی خصوصیت تھی۔ یہ تنقیدین اُنکی علمی قابلیت، شاعرانہ واقفیت اور مضمون آفرینی کا مرقع ہوا کرتی تھین۔ اور اسمین ذرا بھی کلام نہین کہ وہ اُردو کے خزانۂ ادب مین مستقل قدر وقیمت کی چیزین ہین مجھکو رسالۂ زمانہ کے قابل اڈیٹر کی راے سے اس امر مین کلّی اتفاق ہے کہ مرحوم بلاشبہ اپنے طرز کے ایک بہترین تنقید نگار تھے۔

اب ہم محترم ناظرین کے تفنن طبع کے لیے نظر صاحب کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کرتے ہین جس کا انتخاب رسالۂ زمانہ کی متعدد جلدون سے کیا گیا ہے۔

درد اُٹھاتھا نہ ایسا قلب شیدا مین کبھی　　یہ ہجوم غم ہوا ایسا نہ دنیا مین کبھی
اشک خونی بارہا ٹپکے تھے آنکھون سے مگر　　اس قدر سرخی نہ تھی خون تمنا مین کبھی
خشک ہوتا ہے وہ دریاے محبت آہ آہ　　جسکی طغیانی رکی دم بھر نہ دنیا مین کبھی
ہوگیا آغوش مادر بھی جدا آج اے نظر　　اب ملیگی ایسی راحت بھر نہ دنیا مین کبھی

یہ اشعار اُس نظم سے لیے گئے ہین جو وفات مادر کے عنوان سے شایع ہوئی تھی اُنکی محبت ضرب المثل ہے۔ اُسکی موت سے جو یاس انگیز کیفیت دلپر طاری ہوئی ہے اُسے اِن اشعار مین نہایت سادہ مگر درد آمیز اور موثر طریقہ پر دکھلایا گیا ہے۔ دوسرے شعر مین تغزل کا گہرا رنگ ہے اور آخری شعر کو حسرت و یاس کا ایک جاندار مرقع کہنا بیجا نہو گا۔

گردش دہر بھی اک گردش پیمانہ ہے　　ذرّے ذرّے مین ترا جلوۂ مستانہ ہے
اِک طبیعت کی اوداسی کا اثر ہے اتنا　　ساری دنیا تگم یاس مین ویرانہ ہے
حالت محفل عشرت ہے رقم سب اسمین　　ایک دفتر کے برابر پر پروانہ ہے
پرتو مہر کجا ذرّہ ناچیز کجا　　کیون یہ دل حسرتی جلوۂ جانانہ ہے

تیرے ملنے کی وہ تقریب جو ہے یاد ابتک
جس سے کہتا ہون وہ کہتا ہے اک افسانہ ہے

جس غزل کے یہ اشعار ہین وہ ۲۵ مارچ سنہ ۱۹[illegible]ء کو لکھنؤ کے ایک نامی مشاعرہ مین پڑھی گئی تھی حقیقتاً غزل کی غزل مرصع ہے پہلے شعر مین معشوق حقیقی کے جلوہ مستانہ کی شمولیت کے اعتبار سے گردش دہر کو گردش پیمانہ ثابت کر دکھانے مین شاعر نے غضب کی ندرت آفرینی سے کام لیا ہے تیسرا شعر بھی عدیم المثال ہے محفل عشرت کی دائمی عبرتناک حالت کا انکشاف کرنے کے لیے پر پروانہ کا دفتر بھی نہایت موزون ہے پانچوین شعر کی سادگی اور اسکے مفہوم کی دلچسپی قابل غور ہے افسانہ کے استعمال سے تقریب ملاقات کی انتہائی دلکشی کا پتہ چلتا ہے اور اس دلکشی سے اسباب دلکشی کی گوناگونی کا اظہار ہوتا ہے۔

ہر قدم پر باغ عالم مین بچھا ہے دام حسن
کون ایسا ہے جسے ذوق گرفتاری نہین

میری حالت دیکھکر کیون تمنے ٹھنڈی سانس لی
بیکسون پر رحم آئین ستمگاری نہین

اسکو رحم آنے کہان یہ نا امیدی مین امید
دلکو خوش کرنا ہے شغل گریہ وزاری نہین

ہر طرف سے یہ صدا آتی ہے ملک حسن مین
یہ وہ دنیا ہے جہان رسم وفاداری نہین

دوسرا شعر طرز تغزل کی ایک نادر مثال ہے غم دوست عاشق اپنے معشوق کی اداے بیجا پر مٹا ہوا ہے اور اسکو آئین ستمگاری کے یاد دلاکر اپنے اوپر رحم کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ آخری شعر کا مضمون اگرچہ فرسودہ ہے۔ لیکن حسن بندش نے شعر کو کہین سے کہین پہونچا دیا۔

اس ناکامی سے بس قلب مضطر ہو گیا
اب ترا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

آپ کا بیمار غم اور ضعف کی مجبوریان
ساری دنیا کا خلاصہ ایک بستر ہو گیا

مذکورہ بالا ہر شعر مین شان تغزل بھی ہے اور جدت طرازی کی نمود بھی۔

دلکی حالت نہین سنبھلنے کی
اب یہ دنیا نہین بدلنے کی

دیکھ لو سیر دم نکلنے کی
یہ ہوا اب نہین ہے چلنے کی

دل سوزان کو شمع کیا کہیئے
اسکو حسرت کہان ہے جلنے کی

دوسرے شعر میں "سانس لینے کی تشبیہ" ہو چلنے "سے دنیا اور اُسی کی رعایت سے "دوسیرہ" کا لفظ لانا کس قدر تناسب آمیز ہے۔ آخری شعر میں حد درجہ کی نازک خیالی سے کام لیا گیا ہے، دل سوزاں کو شمع پر فوقیت دی گئی ہے کیونکہ دل میں جلن کے ساتھ ہی جلنے کی حسرت بھی موجود ہے۔

اُمید زیست کیا ہو اُس مریضِ رنج و حرماں کی
دوا پیدا نہیں دنیا میں جسکے دردِ پنہاں کی

خزاں انجام ہے جسکی بہارِ چند روزہ کا
بہت روتا ہوں صورت دیکھکر گلہائے خنداں کی

یہ دو چیزیں ہیں جنکو ہمنے آنکھیں کھولکر دیکھا
سفیدی صبحِ محشر کی سیاہی شامِ ہجراں کی

سُنا ہوگا شرارِ عشق سے دوزخ بھی کانپ اُٹھا
مجھے دیکھو کہ ایسی آگ اپنے دل میں پنہاں کی

نظر اب جلکے کرنا چاہیئے آبادِ مرقد کو
بہت ہے منتظر اپنی زمیں گورِ غریباں کی

سب اشعار تاثیر سے مملو ہیں نظر مرحوم نے اپنے دل کی درد انگیز حالت کا نقشہ نہایت کامیابی کے ساتھ کھینچا ہے غزل کیا ہے غمزدہ شاعر کے احساسات باطنی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ مرحوم نے اپنے مخصوص شاعرانہ لہجہ میں بالکل سیدھے سادے الفاظ کے ذریعہ اپنی بیتی کہہ سنائی ہے۔ آخری شعر گویا اپنے اوپر کے چاروں اشعار کا خلاصہ ہے جسکے بعد اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بے پروبالی ہوئی ہے باعثِ شادی مجھے
خانۂ صیاد میں حاصل ہے آزادی مجھے

زندگی کا لطف تھا زندہ دلی تک اے نظر
مر گیا جب دل تو یکساں ہیں غم و شادی مجھے

پہلے شعر میں بے پروبالی کے تعلق سے قفس میں بھی آزادی کا دکھلانا بالکل اچھوتا خیال ہے دوسرے شعر میں شاعر نے اپنی نسبت سے ایک فلسفیانہ نکتہ کو منظوم کر ڈالا ہے۔ طرزِ بیان قابل داد و ستایش ہے۔

سوزانِ غمِ جاوید سے دل بھی ہے جگر بھی
اک آگ کا شعلہ کہ اُدھر بھی ہے ادھر بھی

اپنی شبِ ہجراں میں نہیں دخلِ تغیّر
باطل ہے بیانِ فلسفۂ شام و سحر بھی

وہ شمع نہیں ہے کہ ہو اک رات کی مہماں
جلتے ہیں تو بجھتے نہیں ہم وقتِ سحر بھی

اب پاس ہے ایسی کہ نہ وہ رنگ نہ تاثیر
باقی دمِ گریہ ہے نظر خونِ جگر بھی

مذکورۂ بالا اشعار میں شعریت بھی ہے اور مرحوم کی انتہائی مذہبیت کا شائبہ بھی پھر سادگی اور صفائی تو اُن کے شاعری کے لیے دو لازم و ملزوم اُمور ہیں۔

آسمان سے چلے وہ قطرۂ آب — جن سے پیاسی زمین ہو سیراب
چمن و سبزہ زار ہوں شاداب — اور پیدا ہوں بحر میں گرداب
ساری دنیا کو پالنے والے
جان مردوں میں ڈالنے والے

سخت تھا انتظارِ بارشِ آب — قطرہ قطرہ تھا گوہرِ نایاب
تابشِ مہر تھی جہاں کو عذاب — دل تڑپتے تھے صورتِ سیماب
ابر نے کی جو قطرہ افشانی
ساری گرمی پہ پھر گیا پانی

یہ دونوں بند قطرات باران والی مسدس سے لیے گئے ہیں اور اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ نظر جیسا اوستاد فن اپنے نیچرل رنگ کی نظموں میں بھی کس قدر دل آویزی پیدا کر سکتا تھا اگرچہ ایسی نظموں کا لکھنا شاعر کے فطرتی خاصہ کے خلاف تھا۔

مجھے باوجود تلاش کوئی ایسی نظم نہیں ملی جسکو ہر پہلو سے "سیاسی" کہہ سکیں لیکن مرحوم کی طبیعت کے اصلی رنگ کو دیکھتے ہوئے مجکو اس امر پر کوئی تعجب بھی نہیں ہوتا اُنکو قومی شاعری کے اس شعبہ سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی اور نہ اُنھوں نے اس طرز میں نظم کہنا مناسب سمجھا لیکن یہاں پر مجھے مشہور فرانسیسی عالم رینن (Raenan) کا قول بے اختیار یاد آجاتا ہے وہ کہتا ہے کہ "فرانکو جرمن جنگ میں جرمنی کو فتح دلانے والا نہ تو مالٹکے تھا اور نہ بسمارک۔ بلکہ اس فتح کا سہرا گوئٹھے، کینٹ، ہیگل، وغیرہ کے سر ہے جنھوں نے اہل جرمن کی دماغی حالت کو ترقی دی تھی" اس لحاظ سے نظر مرحوم کی نظموں کا مطالعہ قومی خیالات کو بلند بنانے میں فی الواقع مدد دے سکتا ہے، اگر نگاہ تعمق سے دیکھا جائے تو کسی قوم کی ادبی ترقی ہی اُس کی دیگر انواع و اقسام کے ترقیوں کی بنیاد قرار دیجا سکے گی اور نظر جیسے مستند ادیب کے علمی کارنامے قدرتاً ادب آموز ہیں۔

مجکو افسوس ہے کہ ابھی یہ کارنامے یکجائی صورت مین دستیاب نہین ہو سکتے مرحوم کی وفات پر ۱۳ اپریل ۱۹۳۳ء کو ایک ماتمی جلسہ لکھنؤ مین منعقد کیا گیا تھا جسمین مرحوم کے کلام کو چھپوانے کی بھی تجویز پاس کی گئی تھی یہ کام جسقدر جلد تکمیل پذیر ہو سکے بہتر ہے۔ میری رائے مین اسکے ساتھ ہی یقین ہے کہ حامیان اُردو بالعموم اور احبائے نظر بالخصوص ایسا کرکے اپنے اُس آخری فرض سے جلد ہی سبکدوش ہونے کی کوشش کرین گے جو مرحوم کے تعلق سے اُن پر عائد ہوتا ہے یہی طریقہ ہے اُس قابل قدر صاحب کمال کی تکمیل قدردانی کا جس نے اُردو زبان کے خدمت مین ہمہ تن مشغول رہتے ہوئے اپنی ساری عمر بے سر و سامانی کی حالت مین گذار دی۔

اقبال ورما سحر (ہنگامی)

عشق و موت

اُس سہانی رات کو چھٹکی ہوئی تھی چاندنی — ماہِ کامل دے رہا تھا اپنی پوری روشنی
خلد کے صحن معطر مین خراماں عشق تھا — دیکھتا تھا ہر طرف پڑتی تھین نظرین جا بجا
سامنے ہی صحن مین تھا اک درخت پُر بہار — جسکے نیچے پھر رہی تھی موت، تنہا بیقرار
اور یہ کہتی تھی ہر دم عشق سے کرکے خطاب — جا یہان سے، یان ترا کیا کام او خانہ خراب
یہ جگہ ہے دو گھڑی میرے ٹہلنے کے لیے — ظلمت اُٹھانے کے لیے ہر جی بہلنے کیلیے

عشق نے پھیلائے پر اُڑنے کو اور رو کر کہا — ہاں تو ہے تیرا زمانہ جو کہے تو ہے بجا
تیری ہستی اسطرح ہے جسطرح سے اک شجر — ڈالتا ہے دھوپ کیوقت اپنا سایہ خاک پر
بس یونہی اس غیر فانی روشنی مین عمر بھی — اک شجر ہے، اور تو ہے اُسکا سایہ واقعی
لیکن اس سایہ کو کب ممکن ہے عالم مین بقا — جب شجر گرتا ہے، ہو جاتا ہے سایہ بھی فنا
تو فنا ہو جائیگی، مجکو بقا ہے بیگمان — تا ابد ہر چیز پر یونہین رہون گا حکمران

(ترجمہ از وڈزورتھ سن) — نظر مرحوم

مسئلہ کینیا

مسٹر مانٹیگو کے دورِ وزارت مین ہندوستان کی قسمت کا ستارہ چمکا اور اسبات کی اُمید بندھی تھی کہ غالباً انگریزی حکومت اب ہمارے ملک کے ساتھ انصاف برتے گی لیکن مسٹر مانٹیگو کا وزارت ہند سے مستعفی ہونا تھا کہ یہ روشنی بھی ماند پڑگئی اور حکومت کی بیڈھنگی رفتار کا سلسلہ پھر قائم ہوگیا اور محصول کا جسطرح اضافہ ہوا وہ . بالآخر مسئلہ کینیا پر برٹش گورنمنٹ نے جو فیصلہ صادر کیا اُس نے ہندوستان کی آنکھین کھولدین۔

کینیا جسکا دوسرا نام برٹش ایسٹ افریقہ ہے بحر عرب کے ساحل پر واقع ہے اُسکا مشرقی حصہ محض ریگستان ہے جو اس تذکرہ سے خارج ہے جنوبی حصہ سرسبز وشاداب ہے۔ لبِ ساحل تقریباً دس میل کی چوڑائی تک ہموار میدان ہے اسکے بعد جون جون مغرب کی جانب آپ جائین ملک کی شکل بدلنی شروع ہوتی ہے اور آپ پہاڑی حصہ پر چڑھتے ہین پہاڑی حصہ بتدریج بلند ہوتا جاتا ہے۔ کینیا کا دارالحکومت سمندر سے ۵ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس حصہ کا سب سے بلند مقام سمندر سے ۹ ہزار فیٹ کی اونچائی پر ہے۔ اسکی مغربی حد وکٹوریا نیانزا ہے اسکا کل رقبہ ۲۴۶۰۰۰ مربع میل ہے ملک کا پہاڑی حصہ جو یورپین اقوام کیلئے مخصوص کیا گیا ہے رقبہ مین تقریباً ۵۰ ہزار میل ہے یعنی کل ملک کا ۱/۵ حصہ۔ یہ حصہ سب سے زیادہ سرسبز وشاداب موسم کے لحاظ سے نہایت خوشگوار اور آب وہوا کے خیال سے بہت اچھا ہے بخلاف اسکے لبِ ساحل کا میدان ہر طرح سے اس سے کمتر درجہ کا ہے۔ نہ اسکا موسم اسقدر اچھا نہ پیداوار اعلیٰ قسم کی ہے۔ پہاڑی حصہ مین گیہون آلو، پھلیان، قہوہ، سَن وغیرہ کافی مقدار مین پیدا ہوتا ہے۔ ترائی مین اور لبِ ساحل بجز ادنےٰ درجہ کی جوار اور تلون کے کچھ پیداوار نہین ہوتی۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے کینیا کے اصلی افریقی باشندون کی آبادی ۲۴۰۳۰۰۰ ہے۔ ہندوستانیون کی آبادی ۲۲۸۳۱ اور

یورو پین آبادی ۹۰۲۵ ہے تقریباً ۱۰ ہزار عرب بھی کینیا مین بستے ہین، انگریزون کی آبادی طبقہ
پرمشتمل ہے۔ یعنی اعلے حکام۔ عیسائی مشنری۔ تجار۔ ڈاکٹر اور بیرسٹر وغیرہ زراعت پیشہ لوگو ن
کی تعداد بھی کافی ہے ہندوستانی بالعموم ادنے مرتبہ کے حکام عمل والے۔ کاریگر سوداگر وغیرہ ہین
بعض اچھے مرتبہ کے تاجر اور آزاد پیشہ لوگ بھی ہین اصلی افریقی باشندے بالعموم کسان
اورچرواہے ہین اوران کی حالت نیم وحشی لوگون کی سی ہے ہندوستانی جو کینیا مین جاکر بسے ہین۔
زیادہ تر گجراتی کاٹھیاواڑ اور بمبئی کے مسلمان بوہرے ہین۔

ہندوستانیون کا سلسلہ تجارت کینیا سے صدیون سے چلاآتا ہے۔ انگریزون کا کینیا مین
جبو قت نام ونشان بھی نہ تھا اسوقت سے ہندوستانی اس ملک مین آباد تھے۔ بلکہ خود انگریز
محقق و مدبر اسبات کا اعتراف کرتے ہین کہ اگر ہندوستانی کینیا مین پہلے سے نہ بسے ہوتے
تو انگریزون کے لیے اس ملک مین قدم جمانا غیر ممکن ہوتا" تقریباً ۴۰ سال ہوئے جب انگریزون
نے وہان اپنا دخل کیا اور حکومت کی بنیا ڈالی۔ اسوقت سے ہندوستانیون نے اس نیم وحشی
ملک مین تہذیب وتمدن کی راہین کھولنے مین انگریزون کا کافی ہاتھ بٹایا سرونسٹن چرچل جیسا
اسبات کا اعتراف کرتا ہے کہ بغیر ہندوستانیون کی امداد کے یوگانڈا ریلوے کا بنانا یا مختلف
موقعون پر افریقی باشندون کی بغاوت کا دبانا بغیر ہندوستانیون کی امداد کے غیر ممکن ہوتا۔ گذشتہ
زمانہ کے جنگ مین بھی جرمنون کے مقابلے مین ہندوستانی فوج کا کافی خون بہا اور ساما ن
حرب وسامان رسد سب برابر زمانہ مین ہندوستان سے ہی مہیا ہوتا تھا۔ شروع شروع مین جب
انگریزی عملداری مشرقی افریقہ مین قائم ہوئی تو اسوقت برابر یہی خیال تھا کہ اس ملک کی حکا
ومعاشرت کو ہندوستان کے ہی سانچے مین ڈھالا جاوے اور اسکو ہندوستان کی واف
آبادی کی گنجایش کے لیے مخصوص رکھا جاوے۔ چنانچہ حکومت کی باگ زیادہ تر ہندوستا
ہی کی سول سروس کے حکام کے ہاتھون مین دیجاتی تھی انڈین پینل کوڈ وہان جاری
کیا گیا تھا۔ سکہ بھی ہندوستانی ہی رائج تھا۔ لیکن جب حکومت کا تسلط جانے کی دشواریان
ذہین تہذیب وآئین کا دور قائم ہوگیا تو انگریزون کو وہان کی آب وہوا موافق آنے لگی اور ک
کے سرد اور پہاڑی حصے کے دلفریب مناظر انکی طبیعتون کو لبھانے لگے۔ یعنی نیت مین فتور

اور یہ خیال پیدا ہوا کہ کینیا کو بھی مثل دوسری انگریزی نوآبادیون کے فرنگی سانچے مین ہی ڈھالنا چاہیے اسے بھی یوروپین قومون کے لیے ہی مخصوص رکھنا چاہیے نیت بدلنے کے ساتھ ہی حکومت کی پالیسی بھی بدل گئی اور ہندوستانیون کی تذلیل و تحقیر کا سلسلہ شروع ہوگیا سنہ۱۹۰۵ء مین کینیا کی حکومت کی نگرانی صیغہ خارجہ کے ہاتھون سے نکالکر وزیر نوآبادیات کے سپرد کیگئی اور اسی وقت سے ہندوستانیون کے مصائب کا دکھڑا شروع ہوا۔

پہلا وار ہندوستانیون پر یہ ہوا کہ ان کو کینیا کے سرد اور پہاڑی حصہ مین بسنے اور ملکیت خریدنے سے باز رکھا گیا گو قانوناً نہین تاہم انتظاماً یہ طے پایا کہ سرکاری زمین صرف یوروپین لوگون کے ہاتھ فروخت کیجاوے۔ اسوقت تک یہ موقع ہندوستانیون کو حاصل تھا کہ اگر کوئی یوروپین اس زمین کو ہندوستانی کے ہاتھ نقل و بیع کرنا چاہے تو ہندوستانی اُسے خرید کرسکتا تھا سنہ۱۹۱۹ء مین یہ دروازہ ہندوستانیون پر بند کردیا گیا۔ سنہ۱۹۲۰ء مین لارڈ ملز وزیر نوآبادیات نے ایک مکمل اسکیم ایسی پیش کی جسکی رو سے کالے اور گورے کی پوری پوری تفریق قائم ہوسکے مثلاً ہر یوروپین فرد بالغ کو انتخاب کونسل مین ووٹ کا حق دیا گیا۔ لیکن ہندوستانی اس سے قطعی محروم رکھے گئے یہ بھی تجویز کیا گیا کہ ہندوستانیون کو شہرون اور قصبون کی عام یوروپین آبادی سے قطعی علیحدہ کردیا جائے ہندوستانی آیندہ اس آزادی کیساتھ کینیا مین داخل نہونے پائین جسطرح کہ ابتک ہوتے رہے بلکہ ان کے داخلے پر قیود اور پابندیان عائد کردیجائین سرد اور پہاڑی حصہ کینیا مین وہ کسی حالت مین نہ لینے پائین بلکہ یہ محض یوروپین اصحاب کے لئے مخصوص رکھا جائے۔ قانونی کونسل مین دو ہندوستانی بھی بھیجے جاسکین۔ لیکن رجسٹر انتخاب جداگانہ ہو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ گورنمنٹ ہند نے بذریعہ ایک سرکاری مراسلے کے ان تمام تجاویز کی پوری مخالفت کی جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ برائے چندے ان تجاویز پر عمل نہ کیا گیا اور یہ داخل دفتر کردی گئین - اس عرصہ مین لارڈ ملز کی جگہ مسٹر ونسٹن چرچل نے لی اور اُنھون نے اس مسئلہ کو از سر نو چھیڑا انکی تجاویز بمقابلہ لارڈ ملز کی تجاویز کے پھر غنیمت تھین بجز کینیا کے سرد اور پہاڑی حصہ کو یوروپین اصحاب کے لیے مخصوص رکھنے کے اُنھون نے اور تمام معاملون مین فیصلہ ہندوستانیون کے موافق کیا یعنی لارڈ ملز کی

دیگر تجاویز کو رد کر دیا۔ اسی عرصہ مین امپیریل کانفرنس کا وہ یادگار رزولیوشن منظور ہوا جسمین بجز جنوبی افریقہ کے تمام نوآبادیون مین ہندوستانیون کے ساتھ قطعی برابری کے سلوک کا وعدہ کیا گیا تھا ان تمام باتون پر غور کرتے ہوئے ہندوستانیون کو اس امر کی اُمید بجا تھی کہ مسئلہ کینیا مین فیصلہ ان کے موافق ہوگا۔ اسی سال کے شروع مین جب مسٹر ونسٹن چرچل بھی وزارت سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ اور وزارت نوآبادیات مین نیا وہ تھا وہ ڈیونشر ٹن کے نام سے ایک سمجھوتہ طے ہوا جسمین اُنھین تجاویز کو منظور کیا گیا تھا جو مسٹر چرچل نے پہلے پیش کی تھین جب یہ خبر کینیا کو یوروپین باشندون کو پہنچی تو انھون نے برٹش حکومت پر طرح طرح سے دباؤ ڈالنا شروع کیا حتی کہ علم بغاوت برپا کرنیکی بھی صاف صاف دھمکی دی۔ یہ صورت دیکھکر ہماری سرکار کے ہوش وحواس بجا نہ رہے اور یہ کوشش شروع ہوئی کہ کینیا مین اپنے ہم قومون کو کسیطرح راضی کیا جائے چنانچہ ان نمایندون کو ولایت بلایا گیا کینیا کے ہندوستانیون نے بھی اپنا ایک ڈپوٹیشن پیش کرنے کی اجازت چاہی ان لوگون کو بھی وہان پہونچنے اور عرض ومعروض کرنے کی اجازت ملگئی ہندوستان سے بھی ایک ڈپوٹیشن جسکے رکن مسٹر شاستری مسٹر کامت مسٹر جمنا داس دوارکا داس تھے ولایت پہونچا۔ تقریباً ۳ ہفتہ تک گفت وشنید اور غور ومباحثہ ہوتا رہا بالآخر ۲۳ جولائی کو برٹش گورنمنٹ نے اپنا فیصلہ صادر کیا اور دو روز بعد پارلیمنٹ نے بھی اسپر مہر منظوری ثبت کر دی۔ برٹش گورنمنٹ کے فیصلہ کی قرار دادین حسب ذیل ہین۔

(۱) کینیا مین برطانوی حکومت کی غرض اور مقصد اور اسکی پالیسی کا منشا مشرقی افریقہ کے اصلی باشندون کی بہبودی اور ترقی کے ساتھ وابستہ ہوگا چونکہ انگریزی حکومت یقین کرتی ہے کہ مشرقی افریقہ کے بیکس اور نادان اصلی باشندون کی سرپرستی اور ولایت کا اہم فرض اسپر عائد کیا گیا ہے لہذا اولین فرض حکومت کا یہ ہوگا کہ تمام معاملات مین وہ سب سے پہلے افریقی باشندون کی بہبودی اور ترقی کے خیال کو مد نظر رکھے اور اسکے بعد ان قومون اور لوگون کے حقوق کی نگہداشت کرے جو وہان جا کر بسے ہین۔

(۲) چونکہ ابھی افریقی باشندون مین اسیاست کی اہلیت موجود نہین ہے کہ وہ اپنے برے بھلے کو سمجھ سکین اور اپنے حقوق کی نگہداشت کرسکین، اور چونکہ انکی نگہداشت اور سرپرستی منصفانہ اور بے غرضانہ طریق سے صرف برطانوی حکومت ہی کرسکتی ہے لہذا وہ اس اہم فرض کی ذمہ داری ان لوگون کے اختیار مین جو وہان جاکر بسے ہین خواہ وہ انگریز ہون یا ہندوستانی نہین دے سکتی لہذا کینیا کو حکومت خود اختیاری عطا کرنے کا سوال موجودہ حالت مین نہین اٹھتا اور آئندہ خاص صورتین پیدا ہونے کی حالت مین طے کیا جاسکتا ہے۔

ان دو بنیادی اصولون کے طے کرنے کے بعد انگریز اور ہندوستانی کے قضیہ کے متعلق حکومت برطانیہ حسب ذیل فیصلہ صادر کرتی ہے۔

(۱) کینیا کی قانونی کونسل مین انگریزی حکام کی کثرت رکھی جاویگی یوروپین باشندون کے ۸ نمایندے منتخب ہوکر بھیجے جاوینگے ہندوستانیون کے ۵ نمایندے ہونگے۔ عربون کو ایک جگہ دیجاویگی اور اصلی افریقی باشندون کی نیابت کے لیے ایک عیسائی پادری نامزد کیا جاویگا۔ طریق انتخاب جداگانہ ہوگا اور یوروپین اور ہندوستانی ووٹرون کے رجسٹر علیحدہ علیحدہ رکھے جاوین گے۔

(۲) کینیا کا پہاڑی اور سرد حصہ یوروپین اصحاب کے لیے مخصوص رکھا جاویگا حتی کہ نقل و بیع آراضی بھی انگریز اور ہندوستانیون کے درمیان ممنوع رکھی جاویگی۔

(۳) بالفعل ہندوستانیون کا داخلہ فوراً مسدود کیا جاویگا لیکن تجاویز پیش کیجاوینگی جنکی رو سے افریقی باشندون کی بہبودی اور ترقی کے خیال سے ہندوستانیون کے بلا روک ٹوک داخل ہونے کی روک تھام کیجاویگی۔

(۴) شہری آبادیون مین ہندوستانیون کو انگریزون سے قطعی علیحدہ نہ بسایا جاویگا۔ لیکن حفظان صحت کے خیال سے ایسے قاعدے بنائے جاوینگے کہ جنسے دونون قومون کے مخلوط ہونے سے جو اندیشے ذہن مین آتے ہین ان کا انسداد ہوسکے۔

اس فیصلہ کا تمام دار و مدار بیچارے افریقی باشندون کی بہبودی کے سر تھوپا گیا ہے لیکن

یہ راز اب طشت از بام ہو چکا ہے کہ آسٹریلیا نیوزیلینڈ وغیرہ مین جہان جہان انگریز صاحبان نے نوآبادیان قائم کین وہان کے اصلی باشندون کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس قدر دور جانے کی بھی ضرورت نہین خود انھین مشرقی افریقہ کے اصلی باشندون کے ساتھ جو زیادتیان کیگئی ہین جسطرح انکا رزق یعنی زمین چھینی گئی ان کو جبریہ مزدوری پر مجبور کیا گیا انپر ٹیکس کا بار بڑھایا گیا اور اسکی آمدنی کو انکی بہبودی کے لیے نہین بلکہ یورپین آبادی کے آسائش اور آرام پر صرف کیا گیا اسکی رام کہانی طویل اور دردناک ہے سر رابرٹ ہملٹن سابق چیف جسٹس کینیا نے دوران مباحثہ پارلیمنٹ مین تقریر فرماتے ہوئے اسکا پردہ کافی طور سے فاش کیا تھا لیکن پھر بھی اس دیدہ دلیری کو دیکھیے کہ ہندوستانیون پر زیادتیان اور کالے گورے کی تفریق ان مظلوم افریقی اصلی باشندون کے نام سے کی جاتی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مشرقی افریقہ کے یورپین آبادی کو حکومت خود مختاری نہین دیگئی بھلا پوچھیے کہ اس سے ہندوستانیون کو کیا تسکین ہو سکتی ہے۔ اگر ان کو حکومت خود مختاری دیبھی دیگئی ہوتی تو وہ اس فیصلہ سے اور زیادہ غیر منصفانہ فیصلہ کیا کر سکتے تھے سمجھ مین نہین آتا کہ ایسی حالت مین ہندوستانیون کو باوصف ان کی کثرت تعداد کے کونسل مین کم جگہین دینی اور یوروپین لوگون کو باوصف انکی قلت تعداد کے زیادہ جگہین دینی اور پہاڑی اور سرد حصے کو یورپین آبادی کے لیے مخصوص کرنے مین بیچارے اصلی باشندون کی بہتری اور بہبودی کا کونسا راز مضمر ہے گو قانوناً محض ہندوستانیون کا داخلہ مسدود نہین کیا جاویگا لیکن عملاً یہ تمام نوآبادیون مین تجربہ ہو چکا ہے کہ قواعد اسطرح سے عمل مین لائے جاتے ہین کہ ہندوستانیون اور ایشیائیون پر دروازہ بند کیا جاتا ہے اور یوروپین آسانی سے داخل ہو جاتے ہین اسیطرح ہندوستانیون کے علیحدہ بسانے کے معاملے مین گو قانوناً اور اصولاً یہ فیصلہ ہمارے موافق سہی لیکن حفظان صحت کے قواعد غالباً ایسے بنائے جاوینگے کہ جنسے وہی نتائج نکلینگے جو مد نظر تھے۔

قصہ مختصر یہ کہ باوجود اسکے کہ ہندوستانی کینیا مین بہ نسبت انگریزون کے پیشتر سے آباد ہین انہون نے اسے سرسبز اور شاداب بنانے اور نیم وحشی ملک مین تہذیب و تمدن کی راہین نکالنے مین انگریزون سے کم حصہ نہین لیا باوجود اسکے کہ شروع شروع مین خیال بھی تھا کہ کینیا

کو ہندوستانی سانچے مین ڈھالا جاویگا اور اسکو ہندوستان کی وافر آبادی کی گنجائش کے لیے مخصوص رکھا جاویگا جب ملک کے سرد اور پہاڑی حصہ کی پر فضا آب وہوا دلفریب مناظر نے یورپین طبیعتون کو لبھایا ان کی نیتین بدل گئین خود غرضی نے انصاف کی آنکھون پر پٹی باندھ دی لارڈ ایلگن اور لارڈ ملز کے زمانہ مین ہندوستانیون پر قیود اور پابندیان لازم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا گورنمنٹ ہند کی کوششون کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ مسٹر ونسٹن چرچل کی تجاویز نے اس سمجھوتہ کی راہ نکالی جو لارڈ ونٹرٹن کے نام سے مشہور ہے لیکن کینیا کے یوروپین آباد کی شورش نے حکومت برطانیہ کے ہوش وحواس بجانہ رہنے دیئے۔ بالآخر وہ فیصلہ صادر ہوا۔ جسکی بے انصافی اور حق ناشناسی کو گو طرح طرح کے فریب انداز عصمت وپاکدامانی کی تہ مین چھپایا جاتا ہے لیکن حقیقت حال پکار پکار کر افشائے راز کر رہی ہے۔

ابتک ان مظالم کی فریاد کی شنوائی نہ ہونے کا عذر کہ جو آئے دن ہندوستانیون پر خود مختار انگریزی نوآبادیون مین ڈھائے جاتے رہے حکومت برطانیہ کی جانب سے یہ پیش ہوتا رہا کہ نوآبادیان خود مختار ہین اور ہم مداخلت کے مجاز نہین ہین کینیا کے فیصلہ کی حیاسوز دیدہ دلیری نے کم ازکم اس کفر کو تو توڑ دیا کیونکہ نہ کینیا خود مختار ہے اور نہ بیجا مداخلت کا عذر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرنا کیا چاہیے۔ یہ تو اب کافی طور سے ظاہر ہو گیا کہ محض عرض معروض دلیل وبحث کا طریقہ باوجود کافی کوشش کے کامیاب نہین ہوا مشرقی افریقہ کے انگریزون کی بغاوت کی ایک دھمکی نے تمام گفت وشنید اور دلیل وبحث کو بالائے طاق رکھدیا اور گورنمنٹ نے مشکلون کا سامنا دیکھکر انصاف کا خون کرنے مین تکلف نہین کیا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہم ایسی دھمکی کہ جیسی یوروپین فرقے نے دی نہین دے سکتے تاہم یہ خارج ازبحث نہین کہ اگر ہم بھی حکومت برطانیہ کے راستہ مین مشکلات پیدا کرین تو غالبًا مشکلات کا وزن برابر دیکھکر سرکار انصاف کرنے پر آمادہ ہو جاوے اب سوال یہ ہے کہ ہم کیا مشکلات اسکے راستہ مین پیدا کر سکتے ہین اس سلسلے مین جو تجاویز ابتک پیش کی گئی ہین اور جن پر تمام پارٹیون اور مختلف خیال کے لوگون مین اتفاق رائے ہے وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) برٹش امپائر کی آیندہ نمائش مین حصہ لینے سے انکار کیا جائے۔

(۲) نوآبادیون مین ہندوستان سے مزدورون کا جانا قطعی ممنوع ہو جائے

(۳) جیسا سلوک نوآبادیون مین ہندوستانیون کے ساتھ کیا جاتا ہے بعینہ ویسا ہی سلوک نوآبادیون کے یوروپینون کے ساتھ ہندوستان مین برتا جائے۔

(۴) انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

ان تجاویز کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ آئینی جدوجہد کے دائرے کے باہر نہین اور اسلیے گورنمنٹ یہ نہین کہہ سکتی کہ چونکہ ان سے خلاف ورزی قانون ہوتی ہے اور امن وامان مین خلل پڑتا ہے۔ لہذا اس تحریک کا دبانا لازمی ہے۔ اول الذکر تین تجاویز کا عمل درآمد تو کونسلون اور اسمبلی کے ذریعہ سے ہوگا۔

آخر الذکر البتہ ان کے دائرے سے باہر ہے اسکے علاوہ اسمین ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ ہم اسکو پوری طور سے کامیاب نہ بنا سکے تو الٹا نقصان پہونچ جانیکا اندیشہ ہے پچھلے دو مرتبہ کا تجربہ بتاتا ہے کہ باوجود عظیم کوشش کے اسمین پوری کامیابی نہین ہوئی تاہم اگر دو تین شرطین پوری نہ ہو سکین تو ایک مرتبہ پھر اسکا ارادہ کرنا بے معنی نہوگا۔ اول شرط تو یہ ہے کہ بجائے اسکے کہ ہر انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے صرف چند چیزون کا بائیکاٹ ہو لیکن بائیکاٹ پورا ہو۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے دیسی کارخانہ جات اور تجارت کے اصحاب کا عہد و پیمان لے لین کہ وہ موقع کو غنیمت جانکر انہین دیسی اشیاء کی قیمت زیادہ نہ کرین گے اور اصحاب کی کوشش نہ کرینگے کہ لامحدود فائدہ اٹھائین تیسرے یہ کہ بائیکاٹ کی تحریک کے کامیاب بنانے کے دھن مین لوگون کے ساتھ زبردستی نہ کیجاوے اگر یہ شرطین پوری ہو سکین اور ان کا پورا ہونا دشوار سہی لیکن غیر ممکن نہین تو انگریزی قوم کو ہوش مین لانے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہین ہو سکتا کہ انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ رہا یہ امر کہ یہ تجاویز مشکل العمل ہین اور کوئی گارنٹی اصحاب کی نہین دیجا سکتی کہ انہین کامیابی ہوگی سو اس قسم کا اعتراض تو جب آپ آگے قدم بڑھائین گے اور کوئی نیا راستہ اختیار کرینگے ہمیشہ کیا جا سکتا ہے اگر اسکا کوئی جواب ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ جب عرض و معروض کا طریقہ قطعی ناکام ہو گیا تو اب کیا کیا جاوے خاموش ہو جانے اور ساکت کھڑے رہنے کے تو کوئی

مستعد ہین اور نہ قوم اسکے لیے تیار ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ معاملہ اہم اور دشوار ہے پہلی شرط کامیابی کی یہ ہے کہ تمام اندرونی اختلافات دور کئے جاوین اور ملک کی سب پارٹیان اور گروہ دل اور متحد ہوکر اس کام کا بیڑا اٹھائین اور اس امر کو پوری طرح سے ذہن نشین کرلین کہ کسی ایک فریق کی انفرادی کوشش کارگر نہین ثابت ہوگی اور اگر ایسا ہوسکے تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آیندہ تین سال مین ملک مین ایسی سیاسی صورت پیدا ہوجاے گی کہ گورنمنٹ کو لیے مصالحت کرنا اور انصاف برتنا لازمی ہوجاے گا۔

پھر نہ صرف مسئلہ کینیا اور انگریزی نوآبادیات کے ہندوستانیون کے مشکلات کا سوال حل ہوجائیگا بلکہ سوراج کی منزل ہمسے نہایت قریب تر ہوجاے گی۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم متفق و متحد ہوکر خطرے اور دشواریون سے قطع نظر کرکے آگے قدم بڑھانے کے لے تیار ہوجائین۔

کشن پرشاد کول

لارڈ مارلے مرحوم لبرل مدبر نے جو گذشتہ ایام مین فوت ہوئے تھے اپنی وصیت مین جو اب شائع ہوئی ہے ایک قابل ذکر درخواست کی ہے۔ انھون نے اپنی تمام خط وکتابت اور ڈائریان اور نوٹ اپنے بھتیجے کے نام چھوڑے ہین۔ آپنے خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر کوئی شخص میری یا کسی اور شخص کی سوانحعمری لکھنے لگے تو اس کو ان کے استعمال کی اجازت نہ دیجاے۔ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ لارڈ مارلے خود مسٹر گلیڈ اسٹون اور رچرڈ کوبڈن کی سوانحعمریون کے مصنف تھے تو ان کی اس خواہش سے حیرانی پیدا ہوتی ہے۔

انگلستان کے مشہور انشا پرداز بیکن کے مضامین کا ایک مجموعہ جو ۲۲۵ سال قبل کا چھپا ہوا اور دوسرا ایڈیشن تھا گذشتہ ماہ مین ۲۰۰ پونڈ مین فروخت ہوا ہے۔

دُنیاوی بہشت

جس دنیا مین ہم رہتے ہین اُسکی بابت لوگون کے دو خیال ہین۔ کچھ لوگ اس دنیا کو بہشت نظیر کہتے ہین اور کچھ اسکو دوزخ نما تصور کرتے ہین لیکن درحقیقت یہ نہ بہشت ہے اور نہ دوزخ بلکہ جیسا ہم اسے بناتے ہین ویسی بنجاتی ہے۔ جو لوگ اس مین لطف ڈھونڈھتے اور دلچسپی پیدا کرتے ہین اُنکے لیے یہ بہشت ہے اور جو یہان حیوان کیون زندگی کاٹتے اور موت کے منتظر رہتے ہین اُنکے لیے دوزخ ہے۔

وہ قومین جو دنیا کو عشرت گاہ سمجھتی ہین اور اسمین اپنے لطف اور دلچسپی والے سامان مہیا کرتی ہین خوشحال ہوتی ہین اور جس سرزمین پر انکی بود و باش ہوتی ہے آراستہ بارونق بن جاتی ہے۔ برخلاف اسکے وہ قومین خوشحال نہین ہین جو دنیا سے دلچسپی نہین رکھتین اور زندگی کو زندگی نہین سمجھتین۔ اُنکے گھرون اور ملکون مین بھی رونق نہین ہوتی۔ ہندوستان کسی زمانہ مین نہایت سرسبز زرخیز اور خوشحال تھا۔ یہان بیشمار دولت تھی اور خوردنی اشیاء کی افراط تھی۔ سارا ملک دلچسپ مناظر و سبزہ زار سے پر تھا یہانتک کہ کچھ لوگ اُسکو بہشت نظیر کہتے تھے۔ سبب یہ تھا کہ یہان کے باشندے اُن اُصولون پر چلتے رہے جنکا مدعا زندگی کا بہترین استعمال کرنا اور دنیا کو دلچسپ بنانا تھا لیکن جسوقت سے اس خیال مین کمی آنے لگی، ترقی اور آرایش کے سامانون سے دلچسپی نہ رہی اور مایوسی اور مردہ دلی نے زندہ دلی کی جگہ لینی شروع کردی اُسیوقت سے وہ جنت بھی دوسرونکے حصے مین آگئی یہانتک کہ ساری دولت اور حیرت انگیز چیزون کا ذخیرہ جاتا رہا اور وہی سرزمین جو بہشت تھی دوزخ بن گئی۔ ہندوستان کا انقلاب بتاتا ہے کہ کسی مُلک کی زرخیزی اور خوشحالی قدرت کے فضل اور زمین کی حالت پر منحصر نہین ہے بلکہ اُسکا دار و مدار لوگونکے خیال اور طرز عمل اور حُسن کوشش ہے۔

قدرت کی رحمت کی بارش سب پر یکسان ہوتی ہے اور ہر زمین محنت و توجہ سے زرخیز و سرسبز

ہوسکتی ہے لیکن بے توجہی سے سرسبز زمین بھی اوسر بنجاتی ہے۔

"فردوس برین" (نام کتاب) مین ایک دنیاوی جنت کا حال ہے جو ہوبہو ایسی تھی جیسی آسمانی جنت اور اس دھوکے مین آکر لاکھون آدمی نے اپنے ضمیر اور اخلاق کے خلاف کام کر ڈالے۔

اس بہشت کی نسبت خیال ہے کہ آسمانی بہشت کے نقشہ پر تعمیر کی گئی تھی (جسکا بیان حدیث مین ہے) وہان ویسے ہی محلات تھے جیسے آسمانی بہشت مین ہین اور کوثر اور شراب طہور کے حوض بھی موجود تھے، یہانتک کہ نور آلہی بھی پیدا کر دیا گیا تھا اور طیور کو خدا کا نام لینا اور بہشتیون کو پھل وغیرہ وغیرہ لاکر دینا بھی سکھا دیا گیا تھا۔ حسین عورتین حورون کے لباس مین پیش کی گئین تھین، غرض وہ تمام باتین تھین جو آسمانی بہشت کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہین

اگرچہ یہ سب چیزین ایک بدکردار بادشاہ کی خواہشات نفسانی کے لیے جمع کی گئی تھین اور وہ طرح طرح کے نامہذب افعال و ناکردنی گناہون کا ذمہ دار تھا لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا بہشت نظیر بن سکتی ہے اور یہان وہ سب لطف اور دلچسپیان پیدا کی جاسکتی ہین جنکو ہم بہشت مین پانے کی امید کرتے ہین۔ یہ مصنوعی بہشت، لوگون کو گمراہ کرنے اور دھوکا دینے کے لیے بنائی گئی تھی اور اسکا مقصد چند آدمیون کی خواہشات پورا کرنا اور دوسرون کو غارت اور برباد کرنا تھا اس لیے وہ برباد ہوگئی اور اُسکے باشندے دوزخ مین پہونچے لیکن اگر کسی ملک یا شہر کو امن وامان قائم کرنے، زندگی کو پُر لطف بنانے اور مذہب کے مقصد پورا کرنے کے لیے بہشت نظیر بنایا جائے تو امید ہے کہ وہ دراصل جنت بن جائیگا۔ اور وہان کے باشندے زندگی کا بہترین استعمال کرکے آرام و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرسکین گے مگر ایسی حالت صرف اسوقت حاصل ہوسکتی ہے جب لوگ ایمانداری، مساوات اور حُسن سلوک کے قائل ہون سب کے ساتھ برادرانہ اور مساویانہ سلوک کرین۔ کسی کو کسی کی حق تلفی گوارا نہو کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ سب ایک دوسرے کی ہمدردی کرنے اور رحمدلی سے پیش آنے کے عادی ہون

"دنیا کو بہشت بنانا زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد ہے۔ اور اسکو بہشت بنانا کوئی مشکل کام نہین"

یہان تمام چیزین موجود ہین جو بہشت مین بتائی جاتی ہین۔ صرف لوگونکی مردہ دلی دور کرکے اُنکو زندہ دل بنانا ہے۔ اگر لوگون کی مردہ دلی دور ہو جائے اور وہ دنیا مین دلچسپی لینے لگین اور انکو اس بات کا یقین ہو جائے کہ چند اصولون پر چلنے سے انکا سارا دکھ دور ہو جائیگا اور وہ بیماری مفلسی۔ تفکرات،

اور غم سے نجات حاصل کرکے لطف حاصل کرنے کے لیے کافی وقت اور موقعہ پا سکین گے تو ایسا کون شخص ہے جو دنیا کو بہشت بنانے کے لیے کوشان نہ ہوگا۔ مین سمجھتا ہون کہ کوئی شخص تفکرات اور مصائب کو پسند نہین کرتا۔ لیکن وہ سمجھتا ہے کہ وہ لاچار ہے اور ان دکھون کا دور کرنا قدرت کے ہاتھ مین ہے۔ یا کم از کم اسکی قدرت سے باہر ہے۔ اگر ہم چھوٹے ہی پیمانہ پر بہشت کا نمونہ دکھاوین اور زندگانی مسرور کی عملی تمثیل پیش کر سکین تو جا بجا اُنکی نقل ہونے لگے گی اور ہمارا مطلب پورا ہو جائیگا ہم دیکھتے ہین کہ جب کوئی نیا فیشن چلتا ہے تو وہ مقبول عام ہو جاتا ہے اور اسکی بخوبی تقلید ہونے لگتی ہے اور چونکہ ہماری تحریک بھی دلچسپی سے خالی نہین اسلیئے وہ بھی مقبول عام ہوگی۔

شاید یہ بتلانا غیر دلچسپ نہ ہوگا کہ بہشت کیسی جگہ ہے اسمین کیا لطف ہین اور یہ کہ ہماری دنیا کسطرح بہشت نظیر بن سکتی ہے۔ ناظرین اس بات کو جانتے ہونگے کہ بہشت کا تعلق مذہبی روایتون سے ہے اور چونکہ ہر مذہب کی روایتین جداگانہ ہین اسلیئے ہر مذہب مین بہشت کا بیان مختلف ہے۔ تاہم یہ بیانات ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ہین اور ان سے تین نقشے تیار کیئے جا سکتے ہین۔

نقشہ اول مین بہشت کو ایک دنیا سمجھنا چاہیئے صرف اسقدر خیال رکھنا چاہیئے کہ بہشت کے باشندے خوش اور صابر ہین اور اس دنیا کے باشندے غیر مطمئن اور دکھی۔ بہشت مین تمام چیزین عمدہ اور خوبصورت ہین اور یہان کی ہر چیز اسکے مقابلے مین بدصورت اور ناپائیدار۔ خاص بات بہشت کے اندر یہ ہے کہ وہان کاروبار، شور و غل نہین ہے۔ وہان سکون اور اطمینان کی حکومت ہے۔ ضرورت کی ہر چیزین بغیر محنت کے حاصل ہوتی ہین۔ وہان ترددات و تفکرات کا نام نہین اور وہان کے رہنے والے تمام وقت لطف اور دلچسپی مین گذارتے ہین۔ کوئی جھگڑا ہے نہ فساد، اور سب لوگ رتبہ مین برابر ہین اور سب کے لیے سب کچھ میسر و موجود ہے۔ نہ کوئی بیمار پڑتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ وہان ہر ایک چیز سے مسرت و اطمینان حاصل ہوتا ہے اور یہی سب چیزون کا ماحصل ہے۔

اگرچہ بہشت کے متعلق مختلف مذاہب مین کچھ نہ کچھ اختلاف ہے لیکن بہشت کے مسرت انگیز وجود کے متعلق سب کا اتفاق ہے، اور ہر مذہب کا قول ہے کہ موت کے بعد بہشت مین صرف وہی لوگ داخل ہوتے ہین جو اس دنیا مین نیک زندگی بسر کرتے ہین اور خدا کی عبادت کرکے اسکے احکام بجالاتے ہین۔

دوسرے نقشہ مین بہشت پہلے نقشہ سے مختلف ہے۔ یہ بہشت ایک سادہ خطہ ہے جہان کی تمام

اور تمام ساز و سامان سادہ ہین۔ اور بہت تھوڑی چیزین ہین اور وہ صرف ایسی ہین جنکی خدا پرست یا تارک الدنیا لوگون کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہان کے باشندے پہاڑی سبزہ زار اور خوبصورت جھونپڑون مین رہتے ہین۔ یہان کا منظر قدرت کی بہار ہے جسکا تصور پہاڑی مقام۔ سبزہ زار۔ بہتے دریا اور سہانے وقت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ لوگ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہین اور زیادہ تر وقت خدا کی عبادت اور غور و خوض مین صرف کرتے ہین لیکن کبھی کبھی وہ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہین اور دلچسپ تقریرین اور دوستانہ مباحثات کرتے ہین۔

تیسری بہشت کا نقشہ پہلے دونون سے مختلف ہے۔ یہان بجز لطف کے دریا کے اور کچھ نہین ہے نہ زمین ہے نہ آسمان ہے۔ صرف ایک پگھلا ہوا مادہ ہے جو پانی کی طرح بہتا ہے اور جسمین ہر شخص جا کر دریا کا ایک قطرہ بنجاتا ہے اور آنند کے ساتھ موجزن رہتا ہے۔ یہان کی زندگی اسقدر مگن ہوتی ہے کہ آدمی کبھی نہین اکتاتا! اور اسکو کسی اور چیز کی خواہش نہین ہوتی۔

یہ تین نقشے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہین اُس بہشت کی نقل ہین جو آسمان پر ہے، جہان خدا رہتا ہے اور جہان دنیا کے لوگ مر کر اپنے افعال و اعمال کا حساب دینے جاتے ہین۔ لیکن مین دنیا سے علیحدہ بہشت کی ہستی کی بابت کوئی سچا اعتقاد نہین رکھتا، تاہم، مین بہشت کے خیال کو پسند ضرور کرتا ہون اور چاہتا ہون کہ دنیا مین اس کا نمونہ دیکھنے مین آئے۔

میرا خیال ہے کہ یہ ساری باتین یہان بھی میسر آسکتی ہین) ، اور اسی دنیا مین تینون قسم کی بہشت بن سکتی ہے اور ہر شخص زندگی کے حصے مقرر کر کے تینون بہشتون کا لطف اُٹھا سکتا ہے۔ ہان اسکے لیے ہم کو اپنے مکانات پاک صاف رکھنا ہونگے، ہر چیز آراستگی و سہولیت کے لحاظ سے قرینے سے رکھی جائے اور ہر کام مین خوبصورتی اور محبت مدنظر ہو زندگی، سکون۔ اطمینان و آزادی کے ساتھ بسر کیجائے تو ہماری دنیا کی حالت بہت کچھ بدل سکتی ہے۔ اگر ہم مین سے ہر ایک ان باتون کا خیال رکھے اور اپنے دوست احباب سے خلوص دل سے ملے اور اپنی پرائیویٹ اور پبلک زندگی مین اعلیٰ معیار بہت کو پیش نظر رکھے تو دنیا مین ایک عجیب قسم کی رونق ہو جائے اور روحانیت برسنے لگے۔

صفائی۔ خوبصورتی۔ سکون۔ محبت۔ استقلال۔ زندگی اور اخلاق پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہین اور وہ آدمیون کو پاکبازی کی طرف راغب کر کے دنیا کو بہشت جیسا دلچسپ بنانے مین بہت کچھ مدد دیسکتے

ہین۔ دنیاکے بہشت بننے کے لیے کچھ ضرورت نہین کہ وہان زروجواہر کے محلات ہی ہون بلکہ وہان امن و چین کی ضرورت ہے۔ ہر جگہ جہان جھگڑا فساد۔ بیماری بدقلمی نہو بہشت کا نمونہ دیکھنے مین آسکتا ہے۔ بہشت اسوجہ سے بہشت ہے کہ وہان محبت۔ لطف اور امن وچین ہے۔ اگر یہ چیزین وہان سے ہٹادی جائین تو وہی بہشت دوزخ ہوجائے۔ مذہبی پیشواؤن کا قول ہے کہ پاک زندگی بسر کرنے سے ہمکو موت کے بعد بہشت نصیب ہوگی۔ مین کہتا ہون زندگی ہی مین پاکبازی سے بہشت میسر ہوسکتی ہے اسلیے جو بہشت کے خواہان ہین انکو چاہیے کہ اپنے زندگی کے مقصد اور مدعا کو ادنی دولت یا ہیچ شہرت یا ناپائدار لذت نفسانی پر قائم نہ کرین بلکہ علم اور اعلی قوتین حاصل کرنے کی فکر کرین اور ہر گھر کو اپنا گھر سمجھکر بارونق اور خوشحال بنانے کی کوشش کرین۔ ہمکو اپنی دنیا ایسی بنانی چاہیے جو بہشت کے مانند ہو اور جہان اُن قواعد اور قوانین کی بخوبی پیروی ہوتی ہو جو بہشت کے قائم رہنے کیلیے ضروری ہین۔

ہریرام

نصائح کبیر

میرے دل! تُنے دیار محبت کے رازون کو نہ پایا تو جہالت مین آیا اور جہالت مین ... لیا۔

اے میرے دوست تمنے اس زندگی کے ساتھ کیا کیا۔ تمنے اپنے سر پر پتھرون کے بھاری بوجھ کو اٹھا لیا ہے۔ مگر تم جانتے ہو کہ کون اسے ہلکا کریگا؟

تمہارا دوست دریا کے دوسرے کنارے پر تمہارا منتظر ہے۔ مگر تم خیال نہین کرتے کہ اس تک کسطرح پہنچ سکوگے کشتی ٹوٹ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی تم کنارے پر بیٹھے ہوئے ہو اور لہرین یقین برباد کر رہی ہین۔

تم کیسے ہو تمہارا کوئی مونس نہین، تمہین اپنے اعمال کی سزا بھگتنی پڑیگی۔

کبیر اسکی مدد ڈھونڈ جو تجھے ہمیشہ مدد دینے کے لیے تیار ہے۔

کبیر

ا ...ارسول بدہ

بھاشا اور اُسکے نورتن

(از منظور الحق کلیم اعظم گڈھی)

بکرما جیت اور اکبر کی نورتن کیطرح بھاشا شاعری کی بھی نورتن ہے۔ اس نورتن میں چند بردائی (۲) سور داس (۳) تلسی داس (۴) کیشو داس (۵) بھوشن کوی (۶) بہاری لال (۷) متی رام (۸) دیودت (۹) بھارتیندو ہریشچندر شامل ہیں۔

یہ وہ باکمال ہستیاں تھیں جو آسمان ادب پر پُرنور ستاروں کیطرح چمکیں اور اپنی ضیا باریوں سے ہندوستان کے گوشے گوشے کو چمکا دیا۔

ہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں ان کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام پیش کرتے ہیں اور انشاءاللہ آئندہ بھی اس سلسلے کے قائم رکھنے کی کوشش کرینگے۔

۱۔ چند بردائی

جسطرح اُردو شاعری کے باوا آدم ولی مانے جاتے ہیں اُسی طرح بھاشا شاعری میں چند بردائی گنے جاتے ہیں۔ پرتھی راج راسو ان کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے ان کی پیدائش ۱۱۲۶ء میں بمقام لاہور ہوئی[1] یہ قوم کے بھاٹ تھے لڑکپن ہی میں اجمیر گئے اور اپنی ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے پرتھی راج کے درباریوں میں شامل ہوگئے۔ ابتداً ایک معمولی درباری کی حیثیت تھی لیکن رفتہ رفتہ تقدیر نے درجۂ وزارت تک پہنچا دیا

جب پرتھی راج کو دہلی کا راج ملا تو اسکے ساتھ ساتھ دہلی چلے آئے اور آخر دم تک دہلی ہی میں رہے۔ انجام کار محمد غوری کی قید میں گرفتار ہوئے۔ سنہ ۱۱۹۳ء میں یہی قید قیدِ حیات سے نجات کا ذریعہ بنی۔

ان کی تصنیفات میں سے پرتھی راج راسو جو تقریباً ۲۵۰۰ صفحہ کی کتاب ہے مشہور ہے اسمیں جنگ

---

[1] بموجب تحقیقات راجہ شیو پرشاد ستارہ ہند کانگڑہ۔

تکار۔ آئین حکومت۔ بسنت۔ جنگل۔ سواری۔ برسات۔ شادی۔ راج تلک اور پرتھی راج کی ستایش کے مقامات خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہین انکی زبان پر پراکرت کا اثر زیادہ ہے ملاحظہ ہو۔

کوی کب چندن سو ادھو نرندم	कवी कवि चन्दसुमाधौ नीरदंम
سرتان بھٹم مدھو ماد ایندم	सुरंतान भद मधू माद हूंद कवीएक भंडी
کوی ایک بھنڈی بھی ڈمبھی پرمانم	कवी एक भंडी भि डिंभी प्रमान
کتی تار جھنکار ودیا سجانم	किती तार झंकार विदया सुजानम
بدہم منتر پتری پڑھے وید بانی	विधं मंत्र पत्री पढ़े वेद वानी
تنم بھٹ کونم جو پوجے گیانی	तिनं भट कोनं जुपुज्जै गियानी
پڑھے ترک بترک چونسٹھ ودیا	पढ़े तर्क वितर्क चौंसदि विदया
تنم روپ کے بھید چوراس سدیا	तिनं रूप के भेद चौरस सदया

چند بردائی اسمین اوہ راج کا حال بیان کرتا ہے کہ یہ شہاب الدین محمد غوری کا ایک بھانٹ تھا جو شراب کے نشہ کا اہتاب تھا یعنی باوجود اہل کمال ہونے کے بدنام بھی تھا وہ ایک بھانڈ کے مانند تھا اور خرافاتی بھی۔ وہ تارون کی جھنکار یعنی ستار بجانے کے فن مین ہوشیار تھا۔ سنسکرت پر عبور تھا اور آسانی سے پڑھتا تھا۔ ان صورتون مین ایسا کون ہو سکتا ہے جو اسکی پوجا نکرے علم کے چونسٹھ اقسام مین سے ہر ایک کا ماہر تھا اور سنیکڑون طریقہ سے پڑھتا تھا اور انکی چوراسی قسمون کو خوب جانتا تھا یعنی ہر علم پر کابل عبور تھا

سرس کاویہ رچنا رچون کھل جن سنت ہنسنت	सरस काव्य रचना रचूं खल जन सुनन हंसन्त
جیسے سیندھور دیکھ مگ سوان سوبھاو بھوسنت	जैसे सेंधुर देख मग स्वान सो भाव भुसन्त
توپی سوجن بست گن لیجے تن من پھول	तोपाते सुजन निमित्त गुन रचिये तन मन फूल
جو کا بجے جے جان کے کیون ڈارئے دو کول	जूका भेजिय जान के क्यों डारिये दु कूल

برے خصائل کی بابت لکھتے ہین کہ مین چونکہ شاعری کرتا ہون اور نیچ خیال والے ہنسکر ہنستے ہین جس طرح ہاتھی کو راستہ مین دیکھکر قدرتاً کتے بھونکنے ہین اس صورت مین اچھے لوگون کو چاہیے کہ اوصاف حمیدہ مین خوشی

۱۔ نام شاعر ۲۔ سلطان ۳۔ بیان ۴۔ شراب ۵۔ نشہ ۶۔ ماہتاب ۷۔ خرافات ۸۔ مشہور ۹۔ کھیلنا ۱۰۔ پرمعنی ۱۱۔ شاعری ۱۲۔ ہنسنے مین ۱۳۔ ہاتھی ۱۴۔ کتی

کے ساتھ ترقی کرتے رہین کیا کوئی جوبن کے خوف سے اپنے ریشمی دوپٹہ کو پھینکدیا ہے ۔

تشبیہات اور تمثیلات نے اسمین جان ڈالدی ہے اس قسم کے مضامین جتنے بھاشا شاعری مین ہین اور کسی زبان مین نہیان نہین ۔ ایک موقع پر پرتھی راج کے لڑکپن کی حالت دکھاتے ہین

پاگ براجت سیس پر جڑ کلش جوت نہارے	पाग विराजत सोस पर जर कलजोत निहय
مانو میرو کے سکھر پر بیٹھا اہیش پت آئے	मान्‍ो मेरु के शिखर पर रह्यो अहिपत आय
تا پر طرہ سوبھت رات کہت سوبھ کوی ناتھ	तापर तुर्रा सुभत अत कहत सोम कवि नाथ
منو سورج کی سیس پر پھیلن دھرے دو ہاتھ	मान्‍ो सूर्ज के सीस पर धपिन धरे धन हाथ
شرون براجت سوات سُت کرت نہ بنے بکھان	श्रवन विराजत स्वात सुत करत न बने बखान
کمل پتر پر رہے جو اوس اوڈگن آن	कमल पत्र अमज रहे ओस उडुगन आन
کنٹھ مال موتین کی سوبھت سوبھ بشال	कंठ माल मोतीन की सः भत सोभ विशाल
میرو سکھر پارس پھرت جان نچھتر مال	मेरु शिखर पारस फिरत जान नछतिन माल
مس بھینے سبھنک مکھ نپٹ براجت نور	मिस भीनने सुभवन्क मुख निपट बिराजत नूर
منو بیر اور کام کے اُگے آن انکور	मनो बीर अरु काम के उगे आन अंकूर

پرتھی راج کے سر پر زر بفت کی پگڑی نہایت خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور اُسمین ایسی روشنی معلوم ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ میرو پہاڑ کی چوٹی پر ناگ کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا ہے ۔ اسکے اوپر طرہ خوبصورتی پیدا کر رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بہ ہیئت جو تمام ستارون کے گرو ہین سورج کے سر پر ہاتھ مین کمان لیے ہین کان مین موتی کے آویزے ایسی خوشنمائی پیدا کرتے ہین کہ جیسے کنول کے پہلے نکلے ہوئے پتے پر شبنم کے ستارے پڑے ہون گلے مین موتیون کا مالا بھلا معلوم ہوتا ہے ۔ اسکو چہرہ یون کا مالا نہ سمجھو بلکہ میرو پہاڑ کی چوٹی پر پارس پھر رہا ہے سبزہ آغاز ہونیکی وجہ سے چہرے پر عجیب نور برس رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بہادری اور جذبات کی انکور نکل رہے ہین ۔

غور کیجیے تشبیہ و تمثیل کی قوت سے نفس مضمون مین کس قدر دلکشی پیدا ہوگئی یہی دلکشی ہے جسکی بدولت چند بردائی آج بھی بھاشا شاعری کا مسلم الثبوت اُستاد تسلیم کیا جاتا ہے ۔

منظور الحق کلیم اعظمگڈھی

جواہرات عالم

(۴)

(کوہ طور)

سنہ ۱۶۳۵ء مین شاہجہان نے اپنے لیے ایک عجیب و غریب تخت شاہی تیار کرایا۔ جسکا نام تخت طاؤس رکھا گیا یہ تخت اسم با مسمے تھا کیونکہ شکل و شباہت مین یہ بالکل مور کی صورت کا بنا ہوا تھا۔ ایک عظیم الشان طلائی پر بیش قیمتی جواہرات سے مرصع تیار کیا گیا تھا اور مور کے اصلی قدرتی رنگ نہایت موزون طریقے سے میناکاری سے قائم کئے گئے تھے۔ اسکی گردن بلند اور اسکا سر نشست کی جگہ سے کچھ ہی نیچے تھا۔ پشت کے جانب مصنوعی دم کے نگین پر پھیلے ہوئے تھے بعینہٖ اس طرح جیسے کہ ناچتے وقت مور اپنے پر پھیلا دیتا ہے۔ اور یہ بہت بڑے جواہرات کے نقش و نگار عین وسط مین لگائے گئے تھے۔ اس کے متعلق یہ ایک عام روایت ہے کہ ایک ہیرا مشہور عالم کوہ نور تھا۔ مگر وثوق سے اسکے بارے مین کچھ نہین کہا جا سکتا ہے اور دوسرے ہیرے کا نام "کوہ طور" تھا یہ کبوتر کے انڈے کے برابر تھا۔ اسکا رنگ نہایت شوخ چمکدار اور زرد تھا قریب ایک صدی کے یہ نادر و نایاب ہیرا تخت طاؤس مین جڑا رہا۔ اسنے بڑے بڑے دربار اور عظیم القدر جشن دیکھے اور اسکی شہرت چار دانگ عالم مین پھیل گئی۔ کہتے ہین کہ منجملہ اور زر و مال کے اسکے حصول کے حرص کیوجہ سے بھی نادر شاہ درانی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب ہوئی تھی۔ آخر حملہ ہوا اور سلطنت مغلیہ پر زوال آگیا۔ اور نادر شاہ فاتح و کامیاب ہوکر دہلی مین داخل ہوا بہت سے اور بیش بہا جواہرات کے ساتھ کوہ طور کو بھی اپنے ساتھ ایران لیگیا۔

اپنے تمام مال غنیمت مین نادر شاہ تخت طاؤس کو سب سے زیادہ بیش قیمت اور قابل قدر

سلسلہ کے اول مضامین زمانہ بابت اکتوبر۔ نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء مین شایع ہو چکے ہین۔

سمجھتا تھا اور اسے وہ اپنے احباب اور معزز مہمانون کو نہایت فخر و مباہات کے ساتھ دکھاتا تھا۔ مشہور فرانسیسی سیاح ٹیورنیر بھی اسکی آب تاب چمک دمک اور عجیب و غریب ساخت دیکھکر محو حیرت ہوگیا تھا اور تمام عالم مین اس تخت کی اسقدر شہرت ہوگئی تھی کہ دور دور از ممالک سے سیاح اسکے دیکھنے کے لیے ہندوستان آیا کرتے تھے۔

فرانس کے کئی سیاحون نے اسکا تذکرہ بھی اپنے سفرنامون مین لکھا ہے۔ لیکن تخت طاؤس کی عجیب و غریب داستان اُسیوقت سے شروع ہوتی ہے جب یہ نادر شاہ کے ہاتھ آیا۔ جب نادر قتل ہوا ہے تو اُسوقت ایک فرانسیسی سپاہی جو اپنی فوج سے بھاگ آیا تھا اُسکے قریب تھا۔ تخت طاؤس اور اسکا بیش بہا کوہ طور اسکی نظر سے بھی گذر چکا تھا اور اسکو اس تخت کا کل حال معلوم تھا۔ نادر کے قتل کے بعد ملک مین بد امنی و بدنظمی پھیل گئی ہر طرف ایک ہلچل مچگئی اور بغاوت کا دور دورہ ہوگیا۔ اس طوائف الملوکی کو دیکھکر یہ سپاہی ایک روز رات کو جبکہ بارش کی وجہ سے ساری فضا طوفانی ہورہی تھی تقریباً بھیس بدلکر شاہی محل مین پہنچگیا اور تخت کے کمرے مین جاکر کوہ طور کو تخت سے نکال لایا اور رفتہ رفتہ اس ہیرے کو لیکر مدراس پہونچا جہان اسنے کوہ طور کو ایک انگریز بحری کپتان کے ہاتھ بیس ہزار روپیہ مین فروخت کرڈالا۔ اس انگریز کو اس قیمتی پتھر کی قدر معلوم تھی۔ اور اسنے فرانسیسی سپاہی کو سرقہ کے الزام کی دھمکی دیکر اسکو بہت ہی کم قیمت پر خرید لیا اور پھر اسے لندن لے گیا جہان ایک یہودی جوہری کے ہاتھ بارہ ہزار پاونڈ (ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ) کو فروخت کیا۔ حسن اتفاق سے اُنھین دنون مین انگلستان مین خواجہ رفیع نامی آرمینیہ کا ایک مشہور و مالدار جوہری آیا ہوا تھا یہ اصفہان مین رہتا تھا اور وہین اسنے کوہ طور کا ذکر سنا تھا اور اب اسکے خریداری کا شایق تھا چنانچہ اسنے فروخت کی بات چیت کرکے اسکو خرید لیا کس قیمت پر یہ سودا ہوا اسکی تحقیق نہین ہوسکی ہان اتنا معلوم ہے کہ یہودی جوہری نے کوہ طور کو ترشوا ڈالا تھا اس تراش کے بعد اسکا وزن ۱۹۴ قیراط رہگیا تھا۔ بہرحال خواجہ رفیع اسکو انگلستان سے ایمسٹرڈم لیگیا جہان عشق و محبت کے جھگڑون مین مبتلا ہوگیا۔ ایمسٹرڈم مین اُس زمانہ مین اُسکا شاہزادہ آرلف ORLOFF اپنے ملک سے جلاوطن ہوکر آیا تھا۔ شاہزادہ موصوف ۱۷۳۴ء مین پیدا ہوا تھا اور بہت ہی شکیل و خوبصورت بہت توانا اور جوانمرد تھا۔ ملکہ کیتھرین

دوم اُسکے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونے سے پیشتر ہی شاہزادہ آرلف کے دام محبت مین گرفتار ہو چکی تھی اور ایک عرصہ سے یہ محبت قایم بھی رہی چنانچہ ایک مدت دراز تک ملکہ کے دل اور سلطنت کا اصلی حکمران بھی شاہزادہ رہا ملکہ کے لڑکے کاونٹ ابن سری BOB...SHAKI COUNT کا باپ بھی یہی شاہزادہ آرلف تھا۔ مگر آخر کار ملکہ کا دل شاہزادہ موصوف سے پھر گیا اور وہ شاہزادہ پاٹم کن POTEMKIN کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس رقیب نے ملکہ کے دل سے آرلف کی دیرینہ محبت کا نقش مٹا دیا اور اس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو گئین ان دونون عشاق مین سلطنت عشق کے واسطے جنگ و جدل ہونے لگی ۱۷۷۳ء مین آرلف ایک سازش کا شکار ہو گیا اور ملکہ نے اسکے واسطے کریمیا مین رہنے کا حکم دیا۔ بالفاظ دیگر یہ اسکے جلاوطنی کا حکم تھا شاہزادہ آرلف کو قدرتاً یہ ذلت گوارا نہوئی اور وہ اپنے وطن مالوفہ کو خیرباد کہکر کئی سال تک ممالک یورپ کی سیر کرتا رہا کہ شاید اسی طرح اسکا غم غلط ہو جائے مگر ملکہ سے عشق حقیقی تھا اسلیئے اسکے محبت مین کمی ہونے کے بجائے آتش عشق و شوق اور بھی تیز ہو گئی۔ گو ہر طرف مایوسی کا سامنا تھا لیکن دل مین ہنوز یہ امید باقی تھی کہ شاید ملکہ کا جوش محبت پھر کسی وقت تازہ ہو جائے اور اُسکو پھر سرفرازی کا موقعہ ملے۔ یہی آرزو اور یہی ارمان اسکی زیست قایم کئے ہوئے تھا بہر حال وہ ہر وقت ملکہ کی نظر نوازش کا منتظر اور متلاشی رہتا۔ اور اسی فکر مین غلطان و پیچان رہتا کہ کسی طرح اسکی معشوقہ دلنواز کی توجہ پھر اسکے حال پر مبذول ہو۔ غرض اسی حال مین وہ ایک جلاوطن اور معزول و معتوب شخص کی حیثیت سے امسٹرڈم پہونچا اس شہر مین مشہور و معروف جوہری خواجہ رفیع سے اسکی ملاقات ہوئی خواجہ نے اسکی درد و الم کی داستان سنکر کوہ طور کے طلسماتی اثرات کا مبالغہ آمیز تذکرہ کیا اور مشرق کے عمل تسخیر کی جو یورپ مین ناپید ہے اسقدر تعریف کی کہ آرلف امید شوق کو طور کی خریداری پر آمادہ ہو گیا۔ آرلف اہل غرض تھا وہ اپنے گم گشتہ عشق کے تجدید کے لیے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھنا چاہتا تھا اور اسکے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہتا

آرلف کو معلوم تھا کہ ملکہ کو جواہرات و زیورات کی بڑی شوقین ہے اسکو یہ موقعہ غنیمت معلوم ہوا اور اس خیال سے ۔ شاید اس بیش بہا تحفہ کے ذریعہ سے اسکو اپنی کھوئی ہوئی دولت واپس مل جائے اس ہیرے کو خرید لیا اسکا تذکرہ بیگ کے ایک مراسلہ مورخہ ۱۷۷۴ جنوری ۔

مین بھی موجود ہے۔

خواجہ نے آرلف سے کوہطور کے نوے ہزار پونڈ (ساڑھے تیرہ لاکھ روپیہ) نقد لئے اور یہ معاہدہ بھی کرلیا کہ اگر آرلف کی مراد بر آئی تو وہ تمام زندگی خواجہ کو چار ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ دیتا رہے گا۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ آرلف ملکہ کے عشق مین کس درجہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

بہرحال مشتاق آرلف کوہطور کو لیکر امید و بیم کی حالت مین روس واپس آیا۔ دربار شاہی مین ملکہ کی باریابی کا مستدعی ہوا حسن اتفاق دیکھئے کہ کمترین کے دل مین اسوقت پاٹم کن کی طرف سے کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی پاٹم کن کے مزاج مین غصہ بہت تھا جسکے باعث ملکہ سے کبھی کبھی ان بن ہو جاتی تھی۔ غرض اس عارضی شکر رنجی کا فائدہ آرلف کو پہونچا اور ملکہ نے اپنے قدیم عاشق زار کو شرف ملاقات بخشا اور اس بیش بہا تحفہ سے بہت خوش ہوئی کوہطور نے واقعی جادو کا کام کیا اور آرلف پھر اپنے پرانے ممتاز منصب پر عزت و حرمت کے ساتھ بحال ہو گیا اور اور پاٹم کن گمنامی مین جا گرا۔ اس تاریخ سے کوہطور کا نام "آرلف" قرار پایا اور یہ روس کے شاہی جواہرات مین شامل ہو گیا۔ اسکی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور عصائے شاہی کے موٹھ پر اسکو لگایا گیا اسکے اوپر ایک خوبصورت طلائی عقاب بنایا گیا تھا اسی مین یہ ہیرا جڑا دیا گیا۔

غرض اسوقت سے اسکا شمار یورپ کے بیش قیمت پتھروں مین ہو گیا افسوس ملکہ کی محبت آرلف کے ساتھ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ اور چند ہی سال بعد شاہزادہ پاٹم کن نے پھر اسکے دل پر اپنا سکہ جما دیا اسمرتبہ آرلف ہمیشہ کے لیے معتوب ہو گیا مگر اس معزولی کا اثر اسکے قلب پر ایسا گہرا پڑا کہ ملکہ کے عشق مین متوالا ہو کر دیوانہ ہو گیا۔ اور آخرکار اسی حالت مین ۱۷۸۳ء مین فوت ہو گیا۔

یہ پتھر ایک عرصہ دراز تک اسی نام سے موسوم رہا اور روس کا عصائے شاہی اسکا مسکن رہا بڑے بڑے جشن سلاطین مغلیہ و شاہان روس اسکی نظروں سے گذرے اور دونون تے اسی فخر و مباہات کی جگہ دی روس کے کئی شہنشاہ قتل بھی ہوئے مگر یہ ہیرا یکے بعد دیگرے بادشاہون ہی کے ہاتھ مین رہا۔ بدنصیب زار نکولس آخری شہنشاہ روس کے تخت نشینی کے وقت بھی یہ موجود تھا اور اسکے قتل کے بعد جب بغاوت و بدامنی نے روس کے تخت شاہی کو خون مین

دریامین غرق کردیا!

خزانہ شاہی کے جواہرات مین کوہ نور بھی شامل تھا۔ اب یہ کہان ہے؟ اور کس کے قبضے مین ہے؟ ہم اسکا جواب دینے سے قاصر ہین۔ خدا معلوم انقلاب روس مین یہ عجیب وغریب تاریخی ہیرا کس کے ہاتھ لگا۔ مگر ایسا بیش بہا جواہر مستقل طور پر چھپا ہوا نہین رہ سکتا ہے۔ آئندہ کبھی نہ کبھی پھر نمودار ہوگا۔ دیکھئے اسوقت اسکی گذشتہ تاریخ کا لوگون کو پتہ لگتا ہے یا نہین؟

رام سرن نگم

لازم ہے سوچ سمجھ کے پیش و پس کرو   جو ہو سکے نہ کیون بشر اسکی ہوس کرے (میرانیس)

"دنیا مین عزت سے زیادہ نازک کوئی چیز نہین۔ وہ شیشہ ہے جو سنگ اندازی سے نہین بلکہ سنگ اندازی کے ارادہ سے بھی چور چور ہو جاتا ہے!"

(مصنف سیرۃ عائشہ رض)

قناعت سے کم رتبۂ عالی نہین ہوتا   عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہین ہوتا (انیس)

"خوشامد جھوٹے موتیون کا ایک چمکتا ہوا ہار ہے"

"وہ آنسو بے بہا ہین جو دوسرون کی مصیبت پر نکلین۔"

"کسی کام مین ناکامی فتح کی تیاری ہے"

"ایک انسان کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جان دیکر بھی قرض سے سبکدوش ہو"

شاعرِ ناکام کی یاد مین

آہ ۔ وہ بہت جلد رخصت ہوگیا ۔ اُس شہاب ثاقب کی مانند جو فضا مین نمودار ہوتا ہے ۔ اور بیشتر اسکے کہ دنیا اُسکی پُرتنویر شعاعون کیطرف متوجہ ہو ۔ وہ غائب ہوجاتا ہے ۔ وہ بھی افق حیات پر ظاہر ہوا اور عین اُسوقت کہ اُسکے موزون نغمون سے اہلِ درد کی محدود دنیا معمور ہونے کو تھی ۔ وہ چل بسا ۔ جب تک اس عالم فانی مین رہا ۔ اُسنے کسی کا دل نہ دکھایا ۔ وہ تنہائی کا شائق اور خلوت کا دلدادہ تھا اور پُررونق صحبتون سے گریز کرتا تھا ۔ ندی کے ساحل شکستہ کا ایک ویران اور ناہموار گوشہ اُسکا دلپسند مقام تھا ۔ وہان سرد آہون اور پُردرد نالون سے اپنے تخیل کی محفل آراستہ کرتا اپنے جذبات کو لفظون کا جامہ پہناتا اور کسی نامعلوم حسن کے قدمون پر سر ڈالدیتا ۔ یہ اُسکا معمول تھا ۔ قدرت نے اُسے ایک فیاض ، مگر افسردہ اور نیم مُردہ دل عطا کیا تھا ۔ لوگ اُسکی طرف کم متوجہ ہوتے تھے اور یہ اچھا تھا کیونکہ یہ آدم کے فرزندون کی کجرویون سے گھبراتا اور اُن کی دل آزار چالون سے ڈرتا تھا ۔ اسکے دوست تھوڑے تھے ، دشمن کوئی بھی نہ تھا ۔ اُسکی مختصر سی زندگی اُن تاریکیون سے پاک تھی جو گناہ بنکر حیات انسانی پر چھا جاتی ہین اور ضمیر کو مدھم کردیتی ہین ۔ یہ ضرور تھا کہ اُسنے کہین محبت کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اپنی کہانی کسیکو نہ سنائی ۔ اُسکی ناکام محبت کا افسانہ ایک راز سربستہ رہا اور اُسکے ساتھ ہی زمین کی گہرائیون مین دفن ہوگیا ۔

رخصت ہونے والے شاعر نے اپنے بعد کوئی نشان بھی ایسا نہ چھوڑا ۔ جس سے پتہ چل سکتا کہ اُسکے درد آشنا دل نے کس کے آغوشِ حسن مین پرورش پائی تھی ۔ وہ اُداسیون کی اقلیم مین پیدا ہوا افسردگیون کی فضا مین بڑھا ۔ مایوسیون نے اُسے اپنا بنا لیا اور موت نے اُسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا جب اُسنے ہوش سنبھالا اور بچپن کی مسکراہٹ سے نکلکر جوانی کی آہون مین قدم رکھا تو وہ محبت کی حسرتون کے ہجوم مین گھر گیا ۔ زندگی کی نامرادیون نے اُسے آمادہ کیا کہ اپنے ارمانون کو پُراندوہ شعرون کی المناک صداؤن کے پردے مین چھپا دے ۔ اور تلخ زندگی کی تلخ فرصتون کی بے رونقی کو اس مشغلۂ محبوب سے

آباد رہے۔ چنانچہ بدقسمت نوجوان تنہائے درد کی ترتیب مین محو ہو گیا۔ اُسکی مصروفیتون نے اُسے فرصت ہی نہ دی کہ زندگی کی خوشگواریون سے بہرہ یاب ہوتا۔ اور عالم شباب کی اُمنگون کی کامرانی سے مسرت حاصل کرتا موت نے وقت کی ایک قلیل سی مدت اُسکے سپرد کی تھی۔ چاہتا تو اُسے شادمانی کے قہقہون مین بسر کرتا۔ مگر اُسکے حزن پسند دل نے خوشی کے قہقہون پر سرد آہونکو ترجیح دی اور رُودتا رُلاتا چلا گیا۔

دنیا مین عیش بھی ہے اور غم بھی۔ حیات فانی کی پر بہار منزل نے جب اُسے جوانی کی منزل پر پہونچا دیا۔ تو دونون چیزین پیش کرکے اختیار دیا کہ جس چیز کو چاہے اپنی رفیق زندگی بنالے۔ نوجوان شاعر نے کچھ دیر کے لیے اپنے دل کی گہرائیون مین ٹٹولا۔ ایک آہ کی۔ اور غم کو منتخب کر لیا۔ اُسوقت سے ایسکر مرنے دم تک اُسنے اپنی زندگی کے ہر لمحے کو آنسوؤن کی لگاتار بارش سے شاداب رکھا۔ اور اپنے تھوڑے سے عمر حیات کو اشک فشانیون مین ختم کر دیا۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ اگر وہ محبت نہ کرتا تو اچھا تھا مگر ایسا ہوتا ہی کیون۔ قضا و قدر سے ایک کام اُسکے سپرد کیا تھا اور وہ اُسے کرتا تھا۔ سوائے خدا کے کوئی صحیح اندازہ نہین لگا سکتا۔ کہ وہ کہان تک کامیاب ہوا۔ مگر عالم تنہائی کی خموشی شاہد ہے کہ اُسنے اپنی ننھی سی عمر کے لمحونکو خون کے آنسوؤن سے رنگین کر دیا۔ جب اُسکی روح گریان جسم کی پابندیون سے آزاد ہو رہی تھی۔ اگر اُسکا کوئی آشنا پاس ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اپنی حیات ناکام کی عبرتناک داستان اُسکو سُنا دیتا مگر اُسکی موت وحشت غربت مین ایسی جگہ واقع ہوئی جہان کوئی بھی موجود نہ تھا۔

اب وہ ایک تودۂ خاک ہے۔ جسکے تباکا مسئلہ بگولون کی تند اور تیز گردشون کے سپرد ہے صحرا کی بسیط فضا اُسکی بے وقت موت پر وقف ماتم ہے۔ اور اسکی خاک کا ہر ذرہ بشکوہ سنج بربادی ہے۔

امیر حسن نازؔ بی۔ اے۔ علیگ (جامعہ)



محبت کا گنہگار

(۱)

مسٹر شیام لال دہلی کے مشہور بیرسٹر تھے۔ خوش وضع، خوش اخلاق۔ ان کی شادی امرت سر کے رئیس پنڈت شب چندر کی صاحبزادی روپ وتی سے ہوئی تھی۔ بوٹا سا قد۔ گورا رنگ۔ دلفریب نقش ونگار، اس سے جو ملتا وہی اسکا دلدادہ بنجاتا۔ لیکن اس میں ایک عیب بھی تھا اوچھی نہ تھی، اپنے دل میں شوہر کی پرستش کرتی تھی، لیکن زبان سے کلمۂ محبت نہ کہہ سکتی تھی۔ جدائی کی گھڑیاں کتنی تلخ اور رنجدہ ہوتی ہیں اس امر کو محسوس کرتی تھی لیکن شوہر کے روبرو ظاہر نہ کرسکتی تھی وہ اسے بیوی کی شان سے گرا ہوا تصور کرتی تھی، مگر شیام لال کی طبیعت اسکے برعکس واقع ہوئی تھی۔ وہ دنیاوی آدمی کی مانند محبت کے اقرار الفت کے دعدے اور پیار کی باتیں زبان سے سننے کے خواہشمند تھے۔ رنگین طبیعت آدمی تھے، اکثر مقدمون کی فائلین چھوڑ کر اندر چلے جاتے۔ اور روپ وتی سے پیار کی باتین کرنے لگتے، اس کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھون مین لیتے اور محبت کے باب کھول دیتے.........

"مین سوتا ہون تو تمہین خواب مین نظر آتی ہو، جاگتا ہون تو تمہارے ہی متعلق سوچتا ہون، کچہری مین تمہاری یاد میرا حوصلہ بڑھاتی ہے ورنہ مقدمون کی پیروی بھی نہ ہوسکے۔ مین تم سے بہت محبت کرتا ہون مگر تم ہو کہ پتھر کی مورتی کی طرح زبان تک نہین ہلاتین، آخر تم بھی تو بتاؤ، تمکو مجھ سے کتنی محبت ہے؟"

روپ وتی کچھ کہنا چاہتی، مگر حیا زبان پکڑ لیتی، پھر کوشش کرتی لیکن ناکام رہتی، آخر اُس کا چہرہ سُرخ ہوجاتا۔ گویا اُس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے، تب وہ اپنی محبت بھری نگاہین خاوند پر ڈالتی، اور زبان کا کام آنکھون سے لینے کی کوشش کرتی۔ شیام لال کچھ نہ سمجھتے۔ روپ وتی ہنس کر گردن جھکا لیتی اور آہستہ سے جواب دیتی، "آپ کا کام ختم ہوگیا؟" اس پر شیام لال سٹ پٹا کر باہر نکل جاتے اور کاغذات کو زمین پر پٹک دیتے

اسی طرح کئی سال گزر گئے، شیام لال کی طبیعت بیقرار رہنے لگی، اسمین شک نہین کہ روپ وتی

اسنے محبت کرنی بھی، لیکن شیام لال کی اس سے تشفی نہ ہو سکتی تھی، وہ حقیقی محبت کے اسقدر خواہشمند نہ تھے جیسے کہ اظہارِ محبت کے۔ اکثر سوچتے رہتے کہ ایسی حسین عورت پاکر بھی خوشی نہ ملی، اُجالے پاکر میں اس قدر افسردگی ہوئی، اس کا گمان بھی نہ تھا۔ صورت دیکھکر ریجھ گئے تھے، لیکن اب غلطی کا احساس ہوا، وہ بجلی مانگتے تھے۔ مگر اُنکو دیوی ملی، حسین ملاحت تھی، وضاحت تھی۔ مگر شوخی اور شرارت نہ تھی، حالانکہ وہ اسی شئے پر جی جان سے فدا تھے۔

روپ وتی کی زبان جسقدر شرمیلی تھی، اُس کی آنکھیں اُس سے دس گنا زیادہ تیز تھیں، معاملے کو فوراً بھانپ لیتی تھی، جب شیام لال کی طبیعت ڈانواڈول ہوئی تو روپ وتی سب کچھ سمجھ گئی، اُسکی آنکھ کھلی لیکن اسوقت جبکہ وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ تاہم اُسکی وضعداری میں فرق نہ آیا۔

ساون کا مہینہ تھا، شیام لال نے روپ وتی سے کہا، "کہو تو جھولا ڈلوا ئیں جھولو گی؟"

روپ وتی نے جواب دیا۔ "یہیں ہارمونیم نہ لے آؤ، اتنی دور کون جائیگا"

تم کچھ گا کر سناؤ گی"؟

مجھے گانا کب آتا ہے"؟

"میں محبت کا پوجاری ہوں، ساون میں باغ دلہن بنجاتا ہے، وہاں گئے بغیر دل نہیں مانتا"

"تم کس سے محبت کرتے ہو؟"

"ساری دنیا میں صرف تم سے"

"آپ جوآئیں میں منع نہیں کرتی"

شیام لال مایوس ہوکر چلے گئے، تھوڑی دیر بعد روپ وتی کے دلمیں خیال آیا، میں نے اچھا نہیں کیا، معلوم نہیں اُنکے دلمیں کون کون سی اُمنگیں اُٹھ رہی تھیں، اُنپر پانی پھر گیا، کس گرمجوشی سے آئے تھے لیکن میری سردمہری نے ملول کر دیا۔ میرا بھلا کس جگہ میں ہوگا۔ یہ سوچکر نوکر کو بلوایا۔ اور کہا۔

"موٹر تیار کرو میں موہن باغ کو جاؤنگی"

نوکر نے جواب دیا "موٹر بابوجی لے گئے ہیں"

"بند بگھی ہے؟"

"وہ اسٹیشن پر گئی ہے"

"اور تانگہ؟

"وہ بیکار پڑا ہے"

روپ وتی نے سوچا مجھے انھیں منانا ہے تو بگھی کی کیا ضرورت ہے۔ پیدل چلونگی اور اپنے قصور کی معافی مانگوں گی میرا غرور، اُنھوں نے ابتک بنایا ہے لیکن میں نے انکی قدر نہیں کی،

آج انکی آنکھوں سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اتنا سوچکر اُس نے ایک معمولی سی ساڑی پہنی، اور نوکر کو ساتھ لیکر موہن باغ کو روانہ ہوئی۔ لیکن وہان جاکر دیکھا تو اسکی آنکھیں کھُل گیئں، شیام لال نشۂ عشق مین سرشار حسن کی پوجا میں محو تھے۔ روپ وتی کے سینے میں گویا کسی نے برچھی آ مار دی، اُلٹے قدموں واپس آئی اور چارپائی پر لیٹ گئی،

روپ وتی ہنستی بھی تھی اور روتی بھی تھی، ہنستی اسلیئے تھی کہ شیام لعل ظاہری محبت پر فدا تھے، مگر حقیقی الفت سے قطعی نا آشنا جس طرح ناداں بچہ دستی کو دودھ پر ترجیح دیکر سمجھتا ہے کہ مین نے دانائی کا کام کیا۔ اسی طرح شیام لال نے روپ وتی کی حقیقی محبت کی تہ کو نہ پاکر نمایشی محبت کو قبول کیا، روتی اسلیئے تھی کہ مین نے اپنا اثاثہ لٹا دیا لیکن ہوش کب آیا، جب گھر خالی ہوگیا، شوہر کی بیوفائی سے اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ ایسی بیمار ہوئی کہ بچنے کی آس نہ رہی تاہم اُسے فکر کچھ نہ تھی، کیونکہ اب وہ موت کو حقیقی زندگی سمجھتی تھی اور اس مجازی زندگی کا ایک ایک دن اُسے دوبھر معلوم ہوتا تھا۔

ایک دن رات کے وقت شیام لال سوئے ہوئے تھے کہ جھٹکے کی آواز سے بجلی کا پنکھا بند ہوگیا۔ روپ وتی جاگ رہی تھی، اسمین اٹھنے کی ہمت نہ تھی، لیکن اس خیال سے کہ خاوند کی نیند خراب نہ ہو بمشکل تمام اُٹھی اور ہاتھ کا پنکھا لیکر شیام لال کے منہ پر جھلنے لگی، شیام لال کی آنکھ کھُل گئی، لیکن وہ خاموش پڑے رہے، روپ وتی لمبے کمزور ہاتھوں سے پنکھا جھلتی رہی،

دفعتہً شیام لعل کے رخساروں آنسو کے چند قطرے گرے، انھوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور روپ وتی کا ہاتھ پکڑ کر بیتابانہ انداز سے بولے۔

"روپ وتی، روتی کیوں ہو؟"

روپ وتی سر جھکا کر بولی :۔ اپنی قسمت کو،

"بیوقوف ہوئی جو تم بچ جاؤ گی"

"یہ ناممکن ہے"

"کیون ؟"

"زندہ رہنے کی خواہش ہی نہین"

شیام لال کو پسینہ آنے لگا، اپنے کرتوت آنکھون کے سامنے آ گئے تاہم ہمت کرکے بولے۔

"تمہین کیا ہو گیا ہے ؟"

روپ وتی بیٹھی تھی تن کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔ "مین ہندوستانی عورت ہون، ہندوستانی عورت خاوند کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ سکتی ہے، لیکن خاوند کو کسی قیمت پر بھی دنیا قبول نہین کر سکتی، جبتک تم میرے تھے میری زندگی شیر و شکر کی دھار تھی، لیکن اب تم نے اُسمین زہر ملا دیا ہے، اُسے مین نے آجتک چھپائے رکھا ہے، مگر اب چھپانے کی ضرورت نہین، میرا غرور تم ہو، جب تم ہی چھن گئے، تو غرور کیسا! اور جب غرور نہ رہا، سر اونچا رکھنے کی جرأت نہ رہی، تو زندگی کس کام کی، پرماتما اب تو اُٹھا لے"

کیا پُر حسرت الفاظ تھے، شیام لعل کے دلمین کسی نے نشتر چبھو دیا، خوشامدانہ لہجے مین بولے "مین تمہاری طرف سے لاپروائی کا گنہگار ہون، معاف کرو"

اسوقت شیام لال کے چہرے پر معصومیت کا رنگ نمایان تھا، اسلیے روپ وتی کو بہت پیارے معلوم ہوئے چاہا کہ ضبط کرون، لیکن نہ ہو سکا، لرزتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر بولی "پیارے........"

اس ایک لفظ مین محبت کی مکمل داستان پوشیدہ تھی، شیام لال پر گویا کسی نے جادو کر دیا تھا یہ وہ روپ وتی کے منہ سے سُننا چاہتے تھے،

محبت سے بیتاب ہو کر اُنھون نے روپ وتی کو گلے سے لگایا۔ اس سے پہلے ایسے مواقع پر روپ وتی گردن جھکا لیتی تھی، لیکن آج اِس نے محبت بھرے فقرون سے اُن کی دیرینہ آرزوؤن کو پورا کر دیا،

شیام لال سورگ مین پہونچ گئے،

روپ وتی نے سمجھا اب حالات تبدیل ہو گئے ہین، بچ رہون، تو اچھا ہے، شیام لعل نے سوچا، ایسی عورت دنیا مین نہین ملیگی، مر گئی تو کیا ہو گا، اس خیال سے وہ علاج پر زیادہ توجہ کرنے لگے، روپ وتی

گوارا تو ہونے لگا۔ لیکن انسان کچھ سوچتا ہے۔ خدا کو کچھ اور منظور ہوتا ہے، روپ وتی کی حالت روبصحت تھی کہ قسمت نے پانسہ پلٹ دیا،

شام کا وقت تھا وہ چارپائی پر بیٹھی سبزی کتر رہی تھی، کہ نوکر نے ڈاک لاکر میز پر رکھ دی، اسمین سے ایک خط کسی عورت کا معلوم ہوتا تھا، روپ وتی کو کچھ شبہہ گزرا اُس نے سبزی چھوڑ کر خط کھولا۔ شبہہ یقین کی صورت اختیار کر گیا، شیام لال کی محبت متزلزل ہو چکی تھی، یہ اسکا زبردست ثبوت تھا،

شام کو شیام لال گھر واپس آئے۔ تو روپ وتی کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی، اُنھون نے بہت چاہا کہ وجہ دریافت کرین، لیکن روپ وتی نے کوئی جواب نہ دیا، آدھی رات تک منانے کی کوشش کرتے رہے مگر روپ وتی نے ایک نہ سُنی، آخر وہ تھک کر سو گئے، ایک بجے کے قریب نوکر نے جگایا اور کہا

"بی بی جی کی طبیعت بہت خراب ہے، اُٹھکر دیکھیے"

شیام لعل گھبرا کر اُٹھے اور آنکھین ملتے ہوئے بولے:-

کیاہے؟"

اچھا حال نہین"

شیام لال نے بی بی پر جُھک کر دیکھا تو سناٹے مین آگئے اور روکر بولے۔

"روپ وتی کیسی طبیعت ہے" ڈاکٹر کو بلاؤن؟"

روپ وتی کی حالت نہایت غیر ہو رہی تھی، رُک رُک کر بولی۔۔۔ اب وقت نہین رہے"

اب وقت نہین کیا مطلب؟"

"روپ وتی نے اشارہ سے نوکر سے کہا کہ باہر چلے جاؤ، جب وہ چلا گیا تو بولی:" مین نے زہر کھالیا ہے"

"شیام لعل کی آنکھین کُھلی رہ گئین۔ حیرت کے انداز سے بولے"

"یہ کیون؟"

"مین تمہارے بغیر نہین رہ سکتی"

شیام لال کچھ اور نہ پوچھ سکے۔

روپ وتی نے کہا۔ "ایک عرض ہے؟"

شیام لال نے بھرائی ہوئی آواز مین جواب دیا۔ "کہو"

"آخری دفعہ مجھے پیار کرلو، تمہیں پیار کرتی ہوئی مرون، یہ میری آرزو ہے"
شیام لال ڈھارین مار مار کر رونے لگے، روپ وتی نے کہا "روتے کیون ہو، میری بات مانو وقت تھوڑا ہے"
شیام لال نے اس کھانڈے کے کھلونے کو پیار کیا، روپ وتی نے بھینچ بھینچ کر شیام لال کو گلے لگایا، آخر جب تھک گئی تو بولی "
"اب بدن مین آگ لگ گئی ہے"
شیام لعل رونے لگے، تھوڑی دیر بعد روپ وتی ان کی گود مین سر رکھے ہوئے چل بسی "
شیام لعل غش کھاکر زمین پر گر پڑے +

کہتے ہین کسی چیز کی قدر اسوقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ہاتھ سے نکل جاتی ہے، روپ وتی جبتک زندہ تھی، شیام لال کی نگاہون مین اسکی قدر نہ تھی، لیکن جب وہ مرگئی، تب اسکی خوبیان یاد آنے لگین" شیام لال نے روپ وتی کو کھو کر اسکی قدر جانی، اتنا ہی نہین. ان کو اس سے بھی — جسکے باعث روپ وتی نے اپنی قیمتی جان اپنے شوہر پر قربان کردی، نفرت ہوگئی، یہانتک کہ اسکا منہ دیکھنے کے بھی روادار نہ رہے، جس طرح مٹھائی زیادہ کھانے سے طبیعت اُکتا جاتی ہے، اسی طرح شیام لال شیاما کی صورت سے بیزار ہوگئے، حالانکہ اس کا اسمین سرِ مو قصور نہ تھا، لیکن دنیا کے ڈھنگ نرالے ہین یہان گنہگار بے قصورون سے نفرت کرتے ہین، اور دھرماتما لوگ شیطان سیرت آدمیون کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے ہین،

مگر یہ تقوی و زہد زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا جون جون وقت گزرگیا، روپ وتی کی یاد پرانی ہوتی گئی، شیام لال شیاما کی طرف متوجہ ہونے لگے، اسکے والدین نے موقع غنیمت جانا۔ اور سال کے خاتمہ سے پہلے ہی ان کے ساتھ شیاما کی شادی کردی،

اس کے واقعہ کو دو سال گزر گئے، ساون کا مہینہ تھا، آسمان پر بادل منڈلاتے تھے، زمین پر مخملی فرش بچھ گیا تھا، یہ وہی موسم ہے، جب حُسن نکھرتا ہے اور عشق کا دیوتا پھولون کے تیر چلاتا ہے۔

جب شاعر کے دل کا سوتا کھلتا ہے اور مصور کا قلم کسی رنگین نظارے کیلئے بیتاب ہوتا ہے، ایسا البیلا موسم خالی کیسے چھوڑا جا سکتا ہے
شیام لال اپنی دلہن شیاما کے پاس جا کر بولے:۔
"شیاما! جھولا ڈلواؤں، باغ چلو گی؟"
شیاما نے مسکرا کر جواب دیا "وہاں کیا ہے؟"
ساون کے مہینے میں باغ دلہن بنجاتا ہے، "میں محبت کا پوجاری ہوں، وہاں گئے بغیر دل نہیں مانتا"
شیاما نے شیام لال کیطرف انکھیوں سے دیکھ کر کہا "تم کس سے محبت کرتے ہو"
"ساری دنیا میں صرف تم سے"
شیاما نے زور سے قہقہہ لگایا اور ہنسکر بولی "جھوٹ"

میں اسیوقت دیوار سے ایک تصویر گری، اور اسکا چوکھٹا اور شیشہ دونوں ٹوٹ گئے اُس کے باہر اور تصویریں تھیں، لیکن پیچھے روپ وتی کی تصویر تھی، جسے شیام لال نے احتیاطاً اس طور سے پوشیدہ رکھا تھا کہ شیاما کی اسپر نظر نہ پڑے، شیام لال کو اُسے دیکھتے ہی وہ دن یاد آگیا، جب یہی الفاظ اُسنے روپ وتی سے کہے تھے، خیال آیا، میری محبت کیسی اوچھی ہے، وہ تو دل سے مجھے چاہتی تھی لیکن میں نے اُسکی قدر نہ کی، میں زبان کے الفاظ میں محبت ڈھونڈھتا تھا، لیکن وہ اس سے بالا تھی، دیر تک شیام لعل تصویر کیطرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہے، اور پھر آہستہ سے بولے، "میں محبت کا گنہگار ہوں"
شیاما نے یہ دیکھا تو ڈر گئی، اور آگے بڑھکر کہنے لگی۔ "کیوں" ! کیا ہوا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے"؟" لیکن شیام لال بحر فکر میں غوطے کھا رہے تھے، پاگلوں کی طرح بولے:۔
"میں محبت کا گنہگار ہوں"
شیاما نے ڈاکٹر بلوائے لیکن کچھ فائدہ نہوا، شیام لال کی طبیعت حالت روز بروز خراب ہونے لگی، آخر ایک دن جب شیاما اُن کے بستر کے پاس سو رہی تھی تو شیام لال نے ہنسکر کہا "روپ وتی تو آگئی، تو میرا اسقدر کیوں خیال کرتی ہے"
"میں محبت کا گنہگار ہوں"
شیاما چونک اُٹھی، اور اُس نے گھبرا کر شیام لال کی نبض پر ہاتھ رکھا، وہ بہت مدھم تھی

پاؤن ٹھنڈے، بالکل سرد، اُس نے سر پیٹ لیا،
شیام لعل نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے ایک مرتبہ پھر کہا:-
"مین محبت کا گنہگار ہون" اور اسی فقرے کے ساتھ روح پرواز کر گئی،

سردار احمد پیلی بھیت

لغات اُردو

اُردو زبان کے قواعد وضوابط مُدوّن کرنے کی ضرورت بہت عرصے سے محسوس ہو رہی ہے اور وقتاً فوقتاً اسکی کوشش بھی ہوتی رہی ہے لیکن ابتک قواعد اُردو کی کوئی ایسی مکمل کتاب نہین لکھی گئی جو مبتدیان اُردو کو زبان کے ماله وما علیہ سے پورے طور پر واقف کر دے اسکولون مین قواعد کی جو کتابین پڑھائی جاتی ہین نہ وہ بجائے خود مکمل ہین نہ اُردو تعلیم کے لیے زیادہ مفید اور اطمینان بخش کہی جا سکتی ہین۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی کتابین زیادہ تر ایسے اصحاب کی تصنیف ہین جو اہل زبان نہین ہین اہل زبان کی مدد بغیر یہ کام ہو بھی نہین سکتا اور اگر ہوتا ہے تو وہ اطمینان بخش نہین ہوتا۔

اس صورت مین ملک کو خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کا ممنون ہونا چاہیے جنھون نے برسون کی محنت اور دماغ سوزی کے بعد "لغات اُردو" کے نام سے مصادر اُردو کا ایک قابل قدر سلسلہ شائع کیا ہے اس سلسلے کی دو جلدین چھپ چکی ہین اور تیسری جلد زیر اشاعت ہے جلد اول مین مصادر مفرد کے لغوی و اصطلاحی معانی- محاورہ اور محل استعمال کو مثالین دیکر بتایا گیا ہے اور دوسری جلد مین مصادر مرکبہ ان مصادر افعال کے لغوی و اصطلاحی معنی اور محل استعمال کی تصریح کیگئی ہے۔ فاضل مصنف نے مبتدیان اُردو کی آسانی کے لیے مصادر مرکبہ کو دو قسمون مین منقسم کر دیا ہے اور دوسری جلد مین ان مصادر کی قسم اول کی تصریح کی گئی ہے تیسری جلد مین قسم دوم کا بیان ہوگا۔ مصادر کے آغاز سے پہلے دیباچے کے طور پر اصول و قواعد اور ضروری باتون کو بھی عام فہم زبان مین سمجھا دیا گیا ہے بہرنوع یہ سلسلہ نہایت مکمل و کار آمد ہے اور اس قابل ہے کہ اُردو مدارس کے کورس مین داخل کیا جائے ہماری ٹکسٹ بک کمیٹیون کو ان سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

حقیقت عشق

کسی نے جو بیگانۂ عاشقی تھا — باصرار وامق سے اک بار پوچھا
تجھے شوق عزلت گزینی کا کیون ہے — تجھے ذوق صحرا نشینی کا کیون ہے
یہ کیا ہے کہ اسدرجہ بیتاب ہے تو — شرارہ ہے، برق و سیماب ہے تو
سسکتا کبھی ہے تڑپتا کبھی ہے — تری زندگی روکش جانکنی ہے
کوئی تیرا مونس نہ کوئی ہے ہمدم — فقط ایک دل ہے سو وہ کشتۂ غم
ہمیشہ تجھے آبدیدہ ہی دیکھا — ترے رنگ رُخ کو پریدہ ہی دیکھا

کہا اُس سے وامق نے کیا پوچھتا ہے — مرے درد دل کا عجب ماجرا ہے
مین بیرون یہ بیٹھا ہوا سوچتا ہون — کہ عذرا کو ایسی جگہ لیکے پہونچون
جہان آدمی زاد ہو مثل عنقا — وہ ایسا لق و دق ہو سنسان صحرا
وہان اسطرح محو نظارہ مین ہون — کہ عذرا ہو موجود لیکن نہ دیکھون
یہانتک کہ عذرا سے عذرا جدا ہو — تصور مین صورت گری کا مزا ہو
مٹے اسطرح امتیاز من و تو — کہ دونون کا جلوہ بھی واحد عیان ہو

طبیعت مین جبتک دوئی کا اثر ہے — ہے سامان جنگ اور جدائی کا ڈر ہے
محبت اُسی وقت ہوتی ہے کامل — محبت کا جب خود محبت ہو حاصل
محبت ذریعہ ہو ترک خودی کا — وسیلہ ہو بے نفس کی زندگی کا
تعین کا پردہ اُٹھے درمیان سے — تعلق رہے جسم سے اور نہ جان سے
پھر اُس ذات مطلق سے ہو جائے واصل — جہان وصل و ہجران ہین اوہام باطل

جعفر علیخان اثر لکھنوی

فصلِ بہار

آئی بہار پھر نئے ساماں کئے ہوئے
یعنی متاعِ حسن کو ارزاں کئے ہوئے

اترا ہے صحنِ باغ میں پھولوں کا قافلہ
پھر جنتِ نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

ہے دستیاب غازۂ روئے شباب پھر
گل جلوہ گر ہے "چہرہ گلستاں کئے ہوئے"

پھر ضبط آزما ہے کلی کا نمودِ حسن
وارفتۂ تبسمِ پنہاں کئے ہوئے

غنچوں کی طرفہ چاک گریبانیاں ہیں پھر
کیفیتِ جنوں کو نمایاں کئے ہوئے

پھر امتحانِ صبر پہ نرگس ہے مستعد
تیغِ نگاہِ تیز کو عریاں کئے ہوئے

پھر شعلہ بار ہے نفسِ برقِ بیقرار
سطحِ فلک کو بزمِ چراغاں کئے ہوئے

کیفِ نشاطِ فصل سے پھر ذوقِ خستہ ہے
دلکش نوائے مرغِ خوش الحاں کئے ہوئے

سوزِ دروں سے ہے تپش اندوز لالہ پھر
داغوں کو اپنے شعلۂ عریاں کئے ہوئے

مشعل بدست جگنوؤں کا ہے ہجوم پھر
سروِ چمن کو سروِ چراغاں کئے ہوئے

پھر درسِ معرفت ہے زبانِ طیور پر
پتوں پہ شرحِ معنیٔ قرآں کئے ہوئے

لذت شناس آہ مگر میں نہیں، کہ ہوں
افتادگی سے عیش کا ارماں کئے ہوئے

یہ جوشِ فصلِ گل، یہ مرا گوشۂ خمول
بیٹھا ہوں اپنے گھر کو بیاباں کئے ہوئے

اب ولولے کہاں کہ ترنم نوا رہوں
غالب کو اپنے ساتھ غزلخواں کئے ہوئے

وہ ہی نہیں کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
"سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے"

وہ "نوبہارِ ناز" ہی جاتا رہا کہ تھا
ظلمت کدے کو میرے شبستاں کئے ہوئے

کیا لطف دلفریبیِ فصلِ بہار کا اگر
ہو صیدِ دل کو ناوکِ حرماں کئے ہوئے

سید محمد فاروق شاہجہاں

سکونِ عدم

وہ ہجوم آرزو، وہ اضطرابِ دلخراش
عمر بھر منت کشِ صد کاہشِ بیجا رہا

زندگی بھر جستجوئے مدعائے دل رہی
مدعائے دل مگر میرا اسد اغتفار رہا

نامرادِ آرزو رہ کر گذاری زندگی
کامیابِ آرزو ہونیکا اک سودا رہا

ایک مدت تک رہا میں شکوہ سنجِ عقل و ہوش
اک زمانہ تک مجھے تقدیر کا شکوا رہا

ہر قدم میرے لیے تھا اک فریبِ آرزو
اس دورا ہے میں ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہا

عمر بھر یونہی رہا واماندۂ مقصود میں
فکرِ لاحاصل میں جانِ ناتوان کھوتا رہا

نامرادی نے بہت مجکو جھنجوڑا بار بار
میں مگر اک خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہا

لاکھ تدبیرون پہ بھی حاصل سکونِ دل نہ تھا
الغرض مضطر رہا جبتک کہ میں جیتا رہا

ہاں بہت ممنون ہون میں تیرا مرگِ ناگہان!
تیری غمخواری سے اطمینان اب حاصل ہوا

اب نہیں دلکو مرے وہ اضطرابِ مستقل
گوشۂ مرقد میں اب حاصل سکونِ دل ہوا

موجِ حرمان سر سے جب گذری تو بیڑا پار تھا
ڈوب کر اُبھرا تو میں آسودۂ ساحل ہوا

تشنگین وہ اضطرابِ شوق کی کیفیتین
اب دلِ مضطر سکونِ عیش کا حامل ہوا

اب نہیں دلمین طلسمِ شوق کی نیرنگیان
کھل گئی اب آنکھ سحرِ آرزو باطل ہوا

اب نہیں جوشِ تمنا باعثِ سرگشتگی
خاک مین ملکر مین گویا فائزِ منزل ہوا

آ مین رکھ لون تجھکو اپنے دلمین اے کنجِ عدم!
تیری خلوت مین مجھے حاصل سکونِ دل ہوا

سیدؔ از چاندپوری

کلام حسرت

آنکھوں میں نورِ جلوۂ بے کیف و کم ہے خاص
جب سے نظر پہ اُنکی نگاہِ کرم ہے خاص

کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرتِ کرشن
اقلیمِ عشق آپکے زیرِ قدم ہے خاص

حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص

روزے کا حکم عام نہیں
عاشقوں پر یہ کچھ حرام نہیں

ظرفِ رندان کی آزمایش ہے
بزمِ ساقی میں دورِ جام نہیں

فتنۂ عشوہ گفتگو ہے تری
محشرِ ناز ہے خرام نہیں

جلوہ فرما ہو اب اِدھر بھی تو کیا
کوئی مشتاق زیرِ بام نہیں

کبھی اقرار ہے کبھی انکار
کچھ تری بات کو قیام نہیں

ہم بھی رکھتے ہیں کس سے چشمِ کرم
رحم کا ان کے دل میں نام نہیں

کاٹ دی تُو نے سب کی قیدِ حیات
ایک نخچیر زیرِ دام نہیں

کر دیا تو نے پختہ کارِ ستم
اب کوئی شوق دل میں خام نہیں

دل کے جامِ زمردیں کے لیے
کیا مئے شوق لالہ فام نہیں

عید میں بھی شراب سے انکار
کچھ یہ حسرت کا ماہِ صیام نہیں

نوٹ۔ جن جن بزرگوں سے فقیر کو فیض پہنچا ہے ان میں سے اکثر کی جانب دیوان ہفتم میں کہیں نہ کہیں اشارہ موجود ہے (جو زیرِ طبع ہے) بزرگانِ دین کے علاوہ ایک دفعہ سری کرشن کا بھی نام آیا ہے۔ حضرت کرشن علیہ الرحمۃ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور رہبر دونوں کے پیر حضرت سید عبد الرزاق بانسوی قدس سرہ العزیز کے مسلکِ عاشقی کا پیرو ہے۔ مسلکِ عشق ہے پرستشِ حُسن : ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب (حسرت)

بزم سخن

اس نمبر سے ہم اپنے معزز ناظرین کی تفریح طبع کے لیے اس نئے باب کا افتتاح کرتے ہیں اور انشاء اللہ اسی عنوان کے تحت میں ہر ماہ خاص خاص مشاعروں کے انتخابات پیش کرتے رہینگے۔

اُردو شاعری ہمیشہ سے مشاعروں کی ممنون احسان ہے اور آج بھی انھیں ادبی محفلوں کی بدولت ہندوستان میں شعر و سخن کا مذاق روبہ ترقی ہے اسلئے انکی سعی عمل کی داد نہ دینا، ایک ادبی گناہ ہے!

ہمکو امید ہے کہ شائقین ادب اس "ادبی اضافہ" کو پسند فرمائینگے۔ اور اس عنوان کے قائم رکھنے میں، اپنی حوصلہ افزا اعانت سے دریغ نہ فرمائیں گے، ایڈیٹر

انتخاب مشاعرہ حلقۂ ادبیہ کانپور

ہمارے کرم دوست جناب احسن کے زیر نگرانی کانپور حلقۂ ادبیہ ملک کی ادبی خدمت میں معقول حصہ لے رہا ہے، ہر ماہ ایک مشاعرہ اور ایک مشاعرہ ہوا کرتا ہے، ماہ نومبر کے مشاعرہ کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

حضرت احسن شمسی ناظم حلقۂ ادبیہ کانپور

وداعِ زندگی میں کیوں یہ شرطِ جانستاں رکھدی
کہ بعدِ مرگ بھی قیدِ حیاتِ جاوداں رکھدی

مری امید سے رونق بھی ظلمتخانۂ دل کی
شبِ غم تونے آخر شمع اس گھر کی کہاں رکھدی

مرا ہر ہر نفس اک داستانِ درد بنجاتا
مگر تقدیر نے قیدِ زبانِ بے فغاں رکھدی

گراں کیوں شکوۂ غم اسنے یہ احسان کیا کم ہے
کہ میرے دل کے آئینے میں اک تصویرِ جاں رکھدی

مری ہستی مری صیاد ٹھیری باغ عالم میں
کہ آزادی میں بھی ظالم نے قیدِ آشیاں رکھدی

زیب حسن باطل نے آئین بے خانمان رکھا — کہین دو پھول دیکھے اور طرح آشیان رکھدی

جناب حافظ اشرف علیصاحب حافظ کانپوری

کہین مخفی بس کچھ دیر حرم پہ جلوہ فرمائی — خدا نے حسن کی دولت جہان چاہی وہان رکھدی
رہ دریا حبیب مسدود کرنا تھی مرے مالک — تو پھر بیکار کیون تو نے مرے منہ مین زبان رکھدی

جناب جگر کانپوری

نالی کیطرح رگ رگ مین تاثیر فغان رکھدی — یہ کتنے دل کے ہر ذرے مین غم کی داستان رکھدی

جناب ثاقب کانپوری

ہمین تو بیخودی عشق مین مقصود سجدہ تھا — یہان یہ ہوش تھا کسکو کہ پیشانی کہان رکھدی
رہ الفت مین ثاقب پختہ کاری کا یہ عالم تھا — نہ اٹھی عمر بھر اس در سے پیشانی جہان رکھدی

جناب زکی صاحب کچھوچھوی

محبت نے خموشی مین بھی تاثیر فغان رکھدی — سکوت بے سبب نے کھولکر سب داستان رکھدی
الٰہی قلب مین کیون گرمی سوز نہان رکھدی — جلی جاتی ہے جان تو نے یہ چنگاری کہان رکھدی
جلی بلتی ہے پھر زندگانی اسکو کہتے ہین — گھلا کر جان میری تو نے اک سوز نہان رکھدی
یہ سرگردانی غم اور یہ سرگشتگی یارب — مری تقدیر مین کیا گردش ہفت آسمان رکھدی

جناب راز صاحب چاندپوری

بتا کیون بزم رسوائی مین میری داستان رکھدی — لے او داستان گو تو نے یہ دولت کہان رکھدی
بقدر لذت غم طاقت فریاد بھی بخشی — خدا نے شکر نعمت کے لیے منہ مین زبان رکھدی
الٰہی تیری رحمت کیا نہین اس شہرت کے قابل تھا — مری قسمت مین کیون رسوائی کون و مکان رکھدی
مری خود رفتگی دیکھے تو کوئی اُنکے کوچہ مین — جبین شوق سجدہ مین یہان رکھدی وہان رکھدی

جناب ہادی دیلوری

مری ہر آہ مین الفت نے وہ طرز فغان رکھدی — کہ جسکو سُنکے سب نے اپنی اپنی داستان رکھدی
دو روزہ زندگی اور سوز غم اتنا مرے مالک — اس آئینہ مین کیون تصویر مرگ ناگہان رکھدی
نہ طاقت ضبط کی ہے اور نہ مین فریاد کے قابل — خدا نے کیون مرے منہ مین زبان بے فغان رکھدی

تصور مین رہیگی حشر تک تصویر ناکامی ؛ محبت نے مرے حق مین یہ قید جاودان رکھدی

جناب روحی اڈیٹر شگوفہ

دعا جب بے اثر ٹھیری تو پھر حکم دعا کیون تھا — مری باتون سے نفرت ہو تو کیون منھ مین زبان رکھدی
پہنچنے والے آخر منزل مقصود تک پہونچے — مرے حصے مین ناکامی نے گرد کاروان رکھدی
عجب عالم تھا اپنی بیخودی شوق کا روحی — ہمین قبلہ نظر آیا جبین ہمنے جہان رکھدی

---

۲۱ دسمبر کو بابو کرشن سہائے صاحب بھکاری وکیل کانپور کے دولتخانہ پر ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی ہم اُس مشاعرے کی دو بہتر غزلین ناظرین زمانہ کی تفریح طبع کے لیے شائع کرتے ہین ۔

جناب مولانا سعید رزمی بھوپالی

کب تک خیال کوشش اخفاء راز کا — پردہ اُلٹ بھی دے کہین بزم مجاز کا
پردہ سمجھ رہے تھے جسے تیرے راز کا ! — آئینہ تھا وہ جلوۂ حیرت نواز کا
حیرانیون مین کٹ گئی اپنی تمام عمر — سمجھے نہ ہم فریب طلسم مجاز کا
ہر ذرّہ دے رہا ہے مجھے درس زندگی — ممنون ہو نہین ذوق حقیقت طراز کا
خاموشیون کو موت سمجھتے ہین اہل ہوش — ہے نام زندگی دل ہنگامہ ساز کا
رزمی خدا کے واسطے خاموش بھی ہو اب
کچھ بھی خیال ہے تجھے افشائے راز کا

جناب جگر مرادآبادی

آخر کھلا یہ راز طلسم مجاز کا — اک شعبدہ تھا غفلت بیگانہ ساز کا
اللہ رے اوج عشق کی شان نیاز کا — کونین ایک ذرہ ہے خاک نیاز کا
عالم نہ پوچھ کشمکش ضبط راز کا — ہر سانس ہے پیام غم جانگداز کا
دھوکا قدم قدم پہ تری بزم ناز کا — کیا سخت مرحلہ تھا طلسم مجاز کا
واللہ رے اثر نگہ مست ناز کا — ہر پردہ ارتعاش مین ہے دل کے ساز کا

دل کیا ہے؟ نقشِ حسنِ حقیقت طراز کا
آئینہ کیا ہے؟ عکس ہے آئینہ ساز کا

صوفی نے جسکو شاہدِ مطلق سمجھ لیا
اک پرتوِ لطیف تھا حسنِ مجاز کا

محشر میں سب حقیقتِ اعمال کھل گئی
دہوکا چلا نہ بندگیِ بے نیاز کا

نکلا نہ ایک لفظ بھی ہم شکل و ہم محل
دیکھو تو اختلاف سخن ہائے راز کا

تنہائی فراق میں کیوں گریہ کیجئے
اے دل یہ وقتِ خاص ہے راز و نیاز کا

کیفِ شباب و سرخوشیِ بادۂ حیات
کیا دور تھا تری نگہِ مستِ ناز کا

خود جلوۂ جمال تھا اپنا نگاہبان
بیکار ہی تو خوف تھا افشائے راز کا

آنکھیں بھی لگ گئی ہوئی، اک حشر بیخودی کا
اے واے بر نیاز جو حسن ہو نیاز کا

کس لطف سے کٹیں شبِ غم کی مصیبتیں
مشکور ہوں محبت افسانہ ساز کا

ناگاہ سامنے نظر آیا جمالِ دوست
میں شکوہ سنج تھا غمِ ہستی گداز کا

تو محوِ بیخودی ہی رہا ورنہ بے خبر
پنہاں تھا ناز جن میں عالم نیاز کا

پیراہنِ جنون سے، تنِ عشق ڈھک لیا
یہ اک طریقِ خاص ہے اخفائے راز کا

تصویرِ بے لباس میں ہوائے شوق
ایسے میں کسکو ہوش نشیب و فراز کا

کتنی حقیقتیں ہیں نہاں تجھ میں بے خبر
پردہ اُٹھا کے دیکھ حریمِ مجاز کا

کب تک اُٹھاتے رہیے حجابات تو بتو
ایک ایک رازِ عشق میں محشر ہے راز کا

ہر شے کو تیرے سامنے پاتا ہوں سجدہ ریز
کیا فیض ہے بلندیِ ذوقِ نیاز کا

مجھ سے گنہگار پہ یہ بارشِ کرم
منہ دیکھتا ہوں رحمتِ عاجز نواز کا

مجھکو وصال و ہجر سے کیا واسطہ جگر
عاشق ہوں، اک تبسمِ دیوانہ ساز کا

رفتار زمانہ

لبرلونکی شکست

پچھلے ماہ ہندوستان کا سب سے اہم واقعہ کونسل انتخابات مین لبرلون کی شکست ہے، اس مرتبہ سوراج پارٹی نے کانگریس کے نام اور مہاتما گاندھی کی آڑ لیکر پبلک سے اپیل کی اور ہر صوبہ مین اس پارٹی کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ مدراس و پنجاب کے علاوہ باقی ہر صوبہ مین سوراجیہ پارٹی کی بہت کافی تعداد صوبہ واری کونسلون مین موجود ہو گئی ہے۔ اور صوبہ متوسط مین تو انکی قطعی کثرت ہے لیجسلیٹو اسمبلی مین بھی انکی معقول تعداد داخل ہو گئی ہے۔ صوبہ آگرہ اودھ کے سب نشستین انکے قبضہ مین آگئی ہین۔ بعض جگہ تو لوگون پر انکا اسقدر رعب غالب رہا کہ بہت ہی معمولی لیاقت کے امیدوارون کے سامنے قابل لوگون کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ نامزدگی کے پرچے تک داخل کرتے۔

ہر جگہ لبرل پارٹی کے بڑے سے بڑے شخص سوراجیہ پارٹی کے معمولی سے معمولی امیدواران کے سامنے شکست کھا گئے۔ بنگال مین سر سریندر ناتھ بنرجی، جنکو کانگریس کے بانیون مین سمجھنا چاہیے۔ اور جو کسیوقت بنگال کے بے تاج کے راجہ کہلاتے تھے۔ ایک گمنام امیدوار سے ہار گئے۔ اور بھی بڑے بڑے مدبران کا جنکی لیاقت، حب الوطنی اور ایثار کا سکہ جما ہوا تھا یہی حشر ہوا۔ بمبئی مین ڈاکٹر پرانجپے (وزیر تعلیم) صوبہ متوسط مین مسٹر کیلکار، پنجاب مین مسٹر منوہر لال۔ صوبہ متحدہ مین، پنڈت گوکرن ناتھ مصر، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، بابو ایشور سرن وغیرہ سبھی اسمرتبہ معمولی امیدوارون کے مقابلے مین رہ گئے۔

اسمین شک نہین کہ اس مرتبہ ہندوستان کے سیاسی تاریخ مین پہلے مرتبہ عوام الناس نے ووٹ کے حق سے فائدہ اُٹھایا، اور کہا جاسکتا ہے کہ ابھی انتخاب کنندگان کو چشم بصیرت حاصل نہین.

ہوئی ہے اور نہ انھیں کوئی علم و تجربہ ہی ہے کہ جسکے بدولت وہ کھوٹے کھرے کی جانچ کر سکیں، یہ بھی سچ ہے کہ سوراج پارٹی نے کامیابی حاصل کرنے کیلئے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور اچھی بُری کوئی چال و ترکیب اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن اسمیں بھی کلام نہیں ہے کہ نیک و بد جو کچھ ہوا عوام الناس کے دسایا فریبانی سے ہوا اور اہل ملک نے صاف و صریح طور پر لبرل پارٹی سے اپنی بے اعتمادی ظاہر کی اور کہیں بھی انکو کامیابی نہیں ہوئی۔ غیر تعلیم یافتہ طبقوں کا کیا ذکر یونیورسٹی گریجوئیٹوں کا فیصلہ بھی ہر جگہ لبرلوں کے خلاف ہی ہوا کیا پنجاب کیا بنگال۔ کیا بمبئی کیا آگرہ و اودھ اور کیا صوبہ متوسط ہر صوبہ میں یونیورسٹی کی نشست پر لبرل امیدواروں کے مقابلے میں سوراجی یا آزاد خیال ممبروں کو ترجیح دی گئی ہے۔ ہم ملک کو اس نتیجہ پر مبارکباد نہیں دے سکتے ہیں۔ مگر اسپر افسوس کرنا فضول ہے، ہاں موجودہ صورت حال پر غور و فکر کرنیکی اشد ضرورت ہے۔ اور ہمکو امید ہے کہ لبرل پارٹی کے رہنمایان اس حالت سے مایوس و بد دل ہونیکے بجائے اس پر مناسب غور کرکے آیندہ کے لیے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔

یوں تو تقسیم بنگال کے وقت ہی سے کانگریس میں نرم و گرم پارٹی کی بنیاد پڑ گئی تھی لیکن مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم سے قبل ملک سیاسی حیثیت سے کانگریس والی کانگریس میں تقسیم تھا۔ تعلیم یافتہ جماعت عموماً کانگریس کی حامی تھی اور صاحبان جائداد و مالکان آراضی زیادہ تر اسکے مخالف تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے ریفارم اسکیم کے سلسلے میں مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کی تشریف آوری نے یہ غضب ڈھا دیا کہ اپنی اصلاحات سے قبل ہی حامیان کانگریس کے دو ٹکڑے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں لارڈ مارلی نے اعتدال پسندوں کو رضامند رکھنے کی پالیسی جاری کی لیکن وہ ہندوستان سے ہزارہا کوس دور تھے۔ دس برس بعد مسٹر مانٹیگو نے اسپر مزید ترقی کی اور سات سمندر پار کرکے ہندوستان میں بہ نفس نفیس تشریف لاکر ہندوستانی ممبروں میں باہمی نفاق کا بیج بوگئے۔ ہم اسکو اپنے مدبروں کی ناتجربہ کاری کہیں گے کہ اُنھوں نے محض فروعات پر جھگڑا برپا کر دیا۔ اور ایک ناقص و نامکمل ریفارم اسکیم پر اسطرح ٹوٹ پڑے۔ جیسے کوئی بھوکا نان شبینہ کے چند ٹکڑوں پر جان دیدے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر مانٹیگو خاص خاص رہنمایان ملک سے ریفارم بل کو منظور کرنے اور اسے کامیاب بنانے کا پہلے ہی سے وعدے لے گئے تھے۔ خیر کچھ ہو یہ امر مسلمہ ہے کہ جب

تمام خاص مدبرین اس اسکیم کے جزئیات کے اسقدر قائل ہوگئے کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے اسکے خلاف ایک حرف بھی شکایت کا سننا گوارا نہ کیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور بعض دیگر لیڈران اسکیم کی توسیع چاہتے تھے۔ مسٹر مانٹیگو کو اسمین مشکلات معلوم ہوئیں۔ ہمارے بہت سے رہنمایان ملک انکے ہم نوا ہوگئے اور اس خوف سے کہ کہیں زیادہ مانگنے مین یہ مراعات بھی نہ ملیں۔ زیادہ مانگنے کی ہمت ہی نہ کرسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کانگریس کے موقعہ پر ملک سے دو صدائیں بلند ہوئیں۔ برٹش گورنمنٹ نے پھر وہی پالیسی اختیار کی جسکی بنیاد لارڈ مارلے ڈال گئے تھے۔ اور جس پر

اب مسٹر مانٹیگو نے اپنی عمارت بلند کی۔

کانگریس کے مقابلے مین لارڈ منٹو نے مسلم لیگ کی پیٹھ ٹھونکی۔ مسٹر مانٹیگو نے لبرل فیڈریشن قائم کرادی۔ غرض ملک کے بعض قابل ترین رہنما یہ سمجھ بیٹھے کہ اسوقت ملک کے پولٹیکل نجات حاصل کرنے کے صرف وہی ٹھیکہ دار ہین اور ریفارم کے متعلق اندرونی واصلی حالات صرف انہین کو معلوم ہین۔ اور اگر خدانخواستہ اس اسکیم کو اہل ملک نے رد کردیا۔ تو پھر شاید سالہا سال تک ہندوستان کیلئے ریفارم کا نام ہی انگلستان مین نہ لیا جائیگا۔ وہ سمجھے کہ عام مدبران کانگریس اپنے انتہاپسندی کے دھن مین ریفارم کو غارت وبرباد کردینگے اور اس اسکیم کو ہرصورت سے بچانا ان کا فرض مقدم ہے۔ بہرحال ریفارم کی اہلیت ثابت کرنے کے دھن مین ہمارے لبرل مدبرین کا نقطۂ خیال خواہ مخواہ سرکاری ہوگیا۔ ادھر ملک مین مسائل پنجاب وخلافت وغیرہ کا زور ہوا۔ ادھر مہاتما گاندھی نے اپنی تحریک نان کواپریشن جاری کی۔ کانگریس نے ریفارم اسکیم سے بالکل کنارہ کشی کرلی۔ اور ملک مین پولٹیکل افراط وتفریط کے نظارے پیش ہونے لگے۔ ملک مین قطعی طور پر دو پارٹیان ہوگئین۔ اور ہرطرف فرقہ بندیون کا اثر محسوس ہونے لگا۔ اول انتخاب کو کانگریس نے بائیکاٹ کیا۔ سب جگہ زمیندار اور لبرل اصحاب ہی کونسلوں میں داخل ہوگئے۔ اکثر صوبون مین خالص لبرلون کی کافی تعداد بھی کونسلون مین منتخب ہوئی لیکن ان کو ہرجگہ وزارت قبول کرنے مین کوئی پس وپیش نہ ہوا۔ بہتر ہوتا کہ جن صوبون مین کونسل کی کثرت انکے ساتھ نہ تھی انمین لبرل مدبرین وزارت قبول نہ کرتے اور گورنمنٹ کے نکتہ چینی کے فرائض انجام دیتے۔ ملک کو اسطرح انکے طرز عمل کا بہترین اندازہ ہوسکتا۔ مگر لبرل حضرات نے صرف یہی نہین کیا کہ ہرجگہ عہدے قبول کئے بلکہ تنخواہون کے متعلق بھی انھون نے انگلو انڈین نقطۂ خیال اور سول سروس کے معیار کو اپنا بنالیا۔

یہی وجہ ہے کہ صوبہ آگرہ و بمبئی و بنگال وغیرہ کے وزراء نے پانچ ہزار روپیہ ماہوار سے ایک حبہ بھی کم لینا گوارا نہ کیا۔ (بنگال میں مسٹر سندر ناتھ نے اپنی تنخواہ کے ایک جزو کو تعلیمی وظائف کے لیے وقف کر دیا لیکن اس سے ہمارے عام نکتہ چینی پر کوئی اثر نہیں پڑتا) ہندوستان اپنے غریب ملک کے محبان وطن کو سمجھنا چاہیے تھا کہ جب تک وہ خود اپنے لیے کم تنخواہیں منظور نہ کریں گے اسوقت تک وہ اُن عہدوں کی تنخواہیں کم نہ کر سکیں گے۔ جنکو انگریز لوگ اپنی میراث سمجھے ہوئے ہیں۔ سفر خرچ کے متعلق بھی یہی قصہ پیش رہا اور یہ افسوسناک نظارہ دیکھنے میں آیا کہ کونسل ممبران ایک میل چلے ہوئے بغیر ہی ڈبل فرسٹ کلاس چارج کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اسمبلی وغیرہ کے ممبروں نے روزانہ الاؤنس وغیرہ کی کمی کی تجویز کو بھی اسی ذہن میں پاس نہیں ہونے دیا کہ کہیں انکی شان میں فرق نہ آجائے۔ صوبہ آگرہ و اودھ میں سر ہارکورٹ بٹلر کا ایسا جادو چل گیا کہ مسٹر چنتامنی اور پنڈت جگت نرائن صاحب بالکل گورنمنٹ کے ہمنوا ہو گئے اور موقعہ بموقعہ گورنمنٹ کا راگ الاپنے لگے اور نوبت بایں جا رسید کہ حضرات کو دو عملی کے بجائے متحدہ گورنمنٹ نظر آنے لگی۔ افسوس بعض خفیف رعایتوں کے تسلط میں انہوں نے لوکل گورنمنٹ کے تشددانہ پالیسی کی ذمہ داری بھی اپنے سر اوڑھ لی۔ اب کیا تھا حکام وقت کی پوری بیت ہو گئی اور ملک اور مدبرین کی درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی!

عام خیال ہے کہ نمائندگان کونسل نمائندے کے نقطۂ خیال ہی کو پیش نظر رکھتے تو حکام بالا کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوتا۔ مگر ہمارے لبرل اصحاب نے ہر معاملہ کو حاکمانہ نقطۂ نگاہ ہی سے دیکھا اور عوام الناس کے دلوں سے دور ہوتے گئے۔ اسی طرح ہمارے ملکی سورماؤں نے جنکے پولیٹیکل فتوحات کے ڈنکے بجے ہوئے تھے۔ بالکل ہتھیار ہی ڈال دیے اور جن عہدوں پر جو صاحب مقرر یا منتخب ہوئے وہ احساس ذمہ داری کی نئی روایات قائم کرنے کی فکر میں لگ گئے مثلاً کونسلوں کے وائس پریسیڈنٹ صاحب نے بھی یہ فیصلہ کر دیا کہ انکو گورنمنٹ کی شکایات میں علانیہ لب کشائی نہ کرنا چاہیے۔ افسوس کہ جو لوگ ملک کے قائم مقام ہو کر کونسلوں میں داخل ہوئے تھے وہ کونسلوں میں پہنچکر ملکی جذبات کے ترجمانی کے فرض بھول گئے۔ مہاتما گاندھی کو جنکی عزت اسوقت تمام دنیا میں ہو رہی ہے گورنمنٹ نے قید کر دیا لیکن ہماری کونسلوں نے زیادہ تر سکوت ہی اختیار کیا۔ ہزارہا محبان وطن جیل چلے گئے لیکن کونسلیں عرصہ دراز تک اس ہولناک نظارے کو اطمینان ہی سے دیکھتی رہیں۔ بلکہ گورنمنٹ کا ساتھ دینے کے خیال سے پولیٹکل قیدیوں کی رہائی کے اکثر تجویزیں بھی رد ہو گئیں۔ کونسل اور ملک کے باہر بھی ہمارے بعض مدبرین گورنمنٹ کے ڈھول بجاتے رہے چنانچہ

شرم اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آنریبل مسٹر شاستری جیسے محب وطن سے بھی اس بارے مین سخت غلطیان ہوئین اور انھون نے ہندوستان کے باہر جاکر تحریک نان کوآپریشن کی فضول تاویلین اور مہاتما گاندھی وغیرہ پر سراسر غیر ضروری نکتہ چینیان کرنے کی ضرورت محسوس کی - حالانکہ برطانوی نوآبادیون وغیرہ مین اسکا ہرگز کوئی موقعہ نہ تھا۔ اگر تحریک نان کوآپریشن کی مخالفت کرنا تھی تو اسکا میدان ملک ہی کے اندر موجود تھا۔ باہر جاکر اندرونی اختلاف رائے پر زور دینا سخت معیوب ہونا چاہیے تھا۔[1] بہرحال ایسی ہی بہت سی باتون سے ملک کے عوام الناس ان مدبرون سے قطعی مایوس اور بددل ہوگئے۔ کانگریس کے مقابلے مین لبرل حضرات کی یہ ضد کہ ریفارم کے توسیع اور ترقی کے بارمین کوئی مزید تحریک پارلیمنٹ مین نظام عمل کے میشی کیوقت نہ کیجائے۔ اہل ملک کو بہت ہی شاق گذری تھی انکا وقت بیوقت گورنمنٹ کا ساتھ دینا اور بھی ناگوار ہوا۔ اسکے ساتھ ہی عالی ایثار کے موقعون پر جو فروگذاشتین لبرل حضرات کیطرف سے ہوئین انھونے عوام کو اور بھی بدظن کردیا۔ انکی قابلیت اور آزاد خیالی کے کارنامے پس پشت پڑ گئے۔ اُنکی محنت وجفاکشی اور ایمانداری بھی نظرانداز ہوگئی اور گورنمنٹ کا ساتھ دینے کے جرم مین اسمرتبہ انتخابات مین عوام الناس نے ہرجگہ انپر اپنی بے اعتمادی کا علی الاعلان ثبوت دیا ہے۔ سوراج پارٹی نے اس عام ناراضی کا پورا فائدہ اُٹھایا اور چونکہ نظری ریفارم ایکٹ کے آغاز پر لبرل حضرات سے ہوئی تھی اسی تنگ دلی اور کوتاہ اندیشی کے اسمرتبہ یہ اصحاب مرتکب ہوئے۔ پولیٹکل جدوجہد کی ابھی ابتدا ہے۔ ہر طبقہ کے محبان وطن کا ایک ہی نصب العین ہے اسپر بھی پارٹی بندی کی بدترین خرابیان ملک مین پیدا ہوگئی ہین - حالانکہ حصول مدعا سے قبل ان پارٹیون کی گنجایش ہی کیا ہے؟ ابھی تو سوراج کی منزل دور ہے سلک کو یقیناً اسوقت سب رہنماؤن کی مشترکہ کوششون کی ضرورت ہے۔ مزید حقوق کی لڑائی مین تو سب شریک ہوسکتے ہین - بعد کو جب کامل اختیارات مل جائینگے اور حکومت خود اختیاری کی نوبت آئیگی اُسوقت البتہ مختلف خیالات اور مختلف طرز عمل کی کشمکش اور آزمایش کا موقعہ ہوگا - مگر یہان اول تو لبرل حضرات حامیان نان کوآپریشن کو دشمن ملک سمجھکر ان سے "دور باش" کہتے رہے۔ اب انکی باری آئی ہے اور انھون نے بھی لبرل اصحاب سے پورا انتقام لیا اور زمیندارون وغیرہ سے بھی سوا انکی مخالفت ضروری سمجھی! - افسوس!

---

[1] اس طرح کی لبرل مدبرین کے غلطیان رویہ اور بھی کئی مثالین دیجاسکتی ہین

علمی خبرین اور نوٹ

امسال دنیا کا مشہور نوبل انعام آئرلینڈ کے نامور شاعر ایٹس کو ملا ہے۔ پہلے خیال تھا کہ اسمرتبہ پھر یہ اعزاز ہندوستان کے حصے مین آئیگا۔ نوبل سویڈن کا ایک ماہر کیسٹری تھا جس نے ڈائنامٹ کے ایجاد سے بیشمار دولت پیدا کی تھی۔ اور اسکو بنی نوع انسان کیلئے وقف کرگیا۔ اس سے ہر سال چالیس ہزار پاؤنڈ (چھ لاکھ روپیہ) کے پانچ انعامات تقسیم ہوتے ہین۔ انعام پانیوالون کے لیے کسی خاص ملک کی قید نہین ہے۔ ممالک یورپ کے چند علما کی ایک کمیٹی ہے جو انعامات کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس کمیٹی کی سفارش پر شاہ سویڈن انعامات تقسیم کرتے ہین۔ انعامات ادبی جذبات۔ علم طبیعات اور کیسٹری کی مفید دریافتون اور دنیا کے امن قائم رکھنے کی سب سے زیادہ کوشش کرنیوالون کو دیے جاتے ہین۔ ہندوستان مین ابھی تک صرف علامہ ٹگور کو یہ انعام ملا ہے جسے اُنھون نے بولپور دارالعلوم کو دیدیا ہے۔

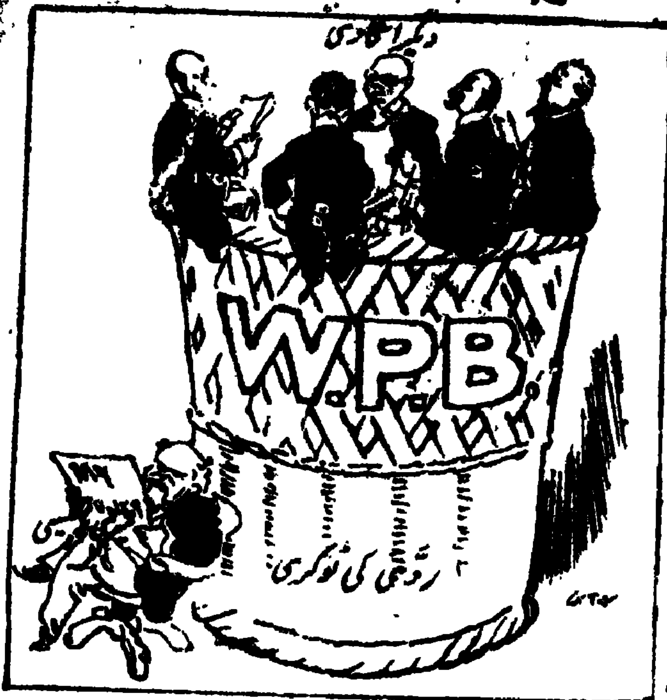
اکثر ناظرین نے یورپ کے اخبارون کے ترقی کے افسانے سنے ہونگے۔ انگلستان کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار ڈیلی میل ہے جسکی اٹھارہ لاکھ کاپیان روزانہ شایع ہوتی ہین۔ لکھوکھا آدمی اسمین کام کرتے ہین۔ ستر ہزار روپیہ مالیت کا روزانہ کاغذ صرف ہوتا ہے اور تین ہزار روپیہ کی سیاہی روزانہ خرچ ہوجاتی ہے۔ ہندوستان مین گنتی کے چند اخبار ہونگے جنکی اشاعت دس ہزار سے زائد ہو۔

منشی پریم چند صاحب نے حال مین ایک اور طولانی ناول گوشۂ عافیت نامی ختم کیا ہے۔ جو دارالاشاعت لاہور سے شایع ہوگا۔ پریم پچیسی اور پریم بتیسی کے پہلے ایڈیشن بھی قریباً اختتام پر ہین اور انکے دوسرے ایڈیشن دارالاشاعت لاہور مین زیر طبع ہین۔ ہندی مین منشی صاحب کی آٹھ دس کتابین شایع ہوچکی ہین اور ان کی کئی کئی ایڈیشن ختم ہوچکے ہین۔

مرقع عالم

دنیا کے خاص خاص واقعات کے متعلق یورپ کے مشہور مشہور اخبارات مین ہر ماہ بڑے بڑے سبق آموز وعبرت انگیز کارٹون شایع ہوا کرتے ہین - ہم ناظرین زمانہ کے تفنن طبع کے لیے بیان پر ہم چند تصویرین درج کرتے ہین یہ تصاویر مضحکے پیرایہ مین زبان حال سے دنیا کے بعض اہم واقعات کا مرقع پیش کر رہی ہین -

پہلے کارٹون مین فرانس اور دیگر اتحادیون کے باہمی تعلقات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ دوسرے کارٹون مین انگلستان کے مختلف پولٹیکل پارٹیون کے عقائد و اصولون کا اشارہ ہے۔



اتحادیون کی کانفرنس



برطانوی مدبرون کے مشاغل



سوشلزم (سرمایہ داروں سے) مین آپ تک پہونچ ہی جاونگا

امر تنبیہ بر تشش

پارلیمنٹ مین لبرل کنسرویٹو اور مزدور پیشہ سب پارٹیون کے ممبران تعداد مین منتخب ہوئے ہین. مگر کسی پارٹی کی بہت زیادہ کثرت نہین ہے۔ ۸ جنوری کو پارلیمنٹ کا افتتاح ہے جب تینون پارٹیان ایکدوسرے سے برسرپیکار رہینگی۔ اس کارٹون مین اسی نظارہ کے دکھلانے کی کوشش کیگئی ہے

نیچے کارٹون مین سوشلزم اور سرمایہ دارون کے درمیان جدوجہد کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔



انگلستان کا پولٹیکل دنگل

ہمارے پاس روزانہ نمونوں اور فہرستوں کی طلبی میں ہزارہا خطوط آتے ہیں۔ اور انکی فرمائشات کی تعمیل کی بابت بڑا کام ہمارے کام میں بہت بڑی سہولیت ہو جائے۔
اگر آپ اپنے خطوط میں

SAMPLE SECTION

لیجئے دیکھئے استعمال تو کریئے صاحب   کانچ ہیرے کی ذرا جانچ تو کریئے صاحب
یوں تو بنتے ہیں سبھی اپنے منہ میاں مٹھو   شکوہ تعریف بلے آپ ہی کریئے صاحب



ہماری نیک صلاح

اگر آپ تندرست رہنا چاہتے ہیں -؟
اگر آپ میں کسی طرح کی بھی کمزوری ہے -؟
اگر آپ کو دھات کی کوئی بھی بیماری ہے -؟
اگر آپ کسی قسم کے بخاروں میں مبتلا ہیں؟
اگر آپ میں دماغی کمزوری ہے؟
اگر آپ کو رات کو نیند نہیں آتی؟
اگر آپ کا ہاضمہ اور حافظہ خراب ہے؟
اگر آپ کسی بیماری کی سبب سے پیلے پڑ گئے ہیں؟

تو ڈیڑھ سو برس کی آزمودہ
مصری جیون پربھا گٹکا

دن میں دو بار ٹھنڈے پانی یا دودھ کے ساتھ کچھ روز متواتر استعمال کیجئے۔ ہم شرطیہ کہہ سکتے ہیں کہ جسمانی اور دماغی کمزوریوں کیلئے یہ جادو کیطرح اثر کرنیوالی ویک ناسنر کی دوا ہے۔ دماغی کمزوری جسمانی کمزوری کا نمونہ کی کمزوری۔ بیماری کے بعد کی کمزوری۔ کھانا ٹھیک طور پر ہضم نہ ہونے سے پیدا ہونیوالی کمزوری۔ زیادہ پڑھنے سے پیدا ہونیوالی کمزوری۔ تھکاوٹ کی کمزوری۔ " مادہ " کی زیادہ اخراج سے پیدا ہونیوالی کمزوری کو بہت جلد دور کر دیتی ہے۔ خون کی کمی۔ پیٹ کی خرابی۔ بواسیر۔ عورتوں کا ٹھیک ٹھیک حیض کا نہ آنا یا حیض کا جلد جلد اور زیادہ ہونا۔ بچہ والی عورتوں کو دودھ کم آنا وغیرہ شکایتوں کے لیے یہ دوا رام بان کا سا اثر کرتی ہے۔ تیر بہدف کا کام کرتی ہے۔ اردو۔ ہندی۔ سنسکرت۔ گرمکھی اور انگریزی دوا کے استعمال کا پرچہ دوا کے ساتھ بھیجا جاتا ہے
سولہ دن دونوں وقت استعمال کرنے لائق دوا کی قیمت عہ ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

[illegible]

ذات [illegible]

[illegible]

شاہین کا ری نارا [illegible]

[illegible] اردو کی [illegible] قیمت

[illegible] دہلی کی [illegible]

قیمت [illegible]

[illegible] قیمت ۱۲

[illegible] قیمت

[illegible] ملک کا

[illegible] قیمت [illegible]

[illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

مکالمات [illegible] قیمت ۸ر

[illegible] فارسی [illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

نصائح جہانگیریہ یعنی نامور جہانگیر کے مشہور [illegible]

کلام کا اردو ترجمہ قیمت ۶ر

[illegible] قیمت ۸ر

[illegible]

[illegible]

حسن سرود کامل [illegible] مرحوم کا مشہور [illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

امتحان وفا [illegible] کے

ایک مشہور افسانے کا ترجمہ قیمت ۶ر

جہان آرا بیگم مشہور [illegible] جہان کی سوانح عمری قیمت [illegible]

[illegible] قیمت ۳ر

[illegible] ادبی [illegible]

[illegible]





[illegible]

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

[illegible]

کونین گولیاں

[illegible]

ڈاکٹر ایس کے برمن لمیٹڈ ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

[illegible]

[illegible]

رجسٹرڈ نمبر ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

نمبر ۲	فروری سنہ ۱۹۲۴ء	جلد ۴۲

فہرست مضامین

تصاویر (۱) آرائش گیسو (۲) سر آرائش (۳) فردوس نو۔

دفتر زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

زمانہ

جلد ۴۲ فروری ۱۹۲۴ء نمبر ۲

ترقی زبان

دنیا مین علم وادب کی ترقی کے لیے چند اسباب کا ہونا ضروری ہے جنمین امن اور اطمینان کا درجہ بہت بلند ہے۔ قدیم یونانیون نے علم الاصنام، فنون لطیفہ، علم وادب مین جسطرح ترقی کی تاریخ اسکی شاہد ہے۔ تمام بیرونجات کے رہنے والے کاشت کرتے تھے اور انکی محنت ومشقت کا ثمرہ فقط ایتھنز کے بیس ہزار باشندون کا حق تھا۔ جو معاش سے بے فکر ہوکر علم وادب طب۔ تاریخ وجغرافیہ اور علم نجوم کے مسئلون پر بحث ومباحثہ مین منہمک رہتے تھے۔ اسی طرح رومتہ الکبرے کے باشندے بھی صنعت ودستکاری کے کامون مین اطمینان سے مشغول رہتے تھے اور تمام محصولات کا بار ومحنت شاقہ کی تکلیف غربا (پلیبئین) کو برداشت کرنی پڑتی تھی۔ رومتہ الکبریٰ کی تباہی کے بعد جب ملک اٹلی مختلف ریاستون مین منقسم تھا۔ تو وہان بھی یہی حالت تھی۔ چنانچہ مائیکل انجلو ڈانٹے۔ جیسے مصنفین اور شعرا اور لیونارڈو ڈاونچی (LEONARDODAVINCCI) جیسے صناع، اور نقاش نہایت کامیاب اور مشہور ہوئے۔

ایک بڑی وجہ جس سے علم وفن مین نمایان ترقی ہوتی ہے وہ مصنفین۔ صناعون اور نقاشون کی سرپرستی ہے۔ اہل یورپ کی تمدنی ترقی کا راز اسی مین مضمر تھا۔ اکثر امرا، اور روٴسا ایسے لوگونکو ذریعہ معاش سے بے فکر کردیتے تھے۔ اس فیاضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسوقت یورپ علم وادب کے میدان مین نہایت جوش وخروش اور سرعت سے گامزن ہے۔

زمانہ

جلد ۴۲ — فروری سنہ ۱۹۲۴ء — نمبر ۲

ترقی زبان

دنیا میں علم و ادب کی ترقی کے لیے چند اسباب کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی امن اور اطمینان کا درجہ بہت بلند ہے۔ قدیم یونانیوں نے علم الاصنام، فنون لطیفہ، علم و ادب میں جس طرح ترقی کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ تمام بیرونجات کے رہنے والے کاشت کرتے تھے اور ان کی محنت و مشقت کا ثمرہ فقط ایتھنز کے بیس ہزار باشندوں کا حق تھا۔ جو معاش سے بے فکر ہو کر علم و ادب، طب، تاریخ و جغرافیہ اور علم نجوم کے مسئلوں پر بحث و مباحثہ میں منہمک رہتے تھے۔ اسی طرح روم الکبریٰ کے باشندے بھی صنعت و دستکاری کے کاموں میں اطمینان سے مشغول رہتے تھے اور تمام محصولات کا بار، محنت شاقہ کی تکلیف زیادہ تر پلیبئین کو برداشت کرنی پڑتی تھی۔ روم الکبریٰ کی تباہی کے بعد جب ملک اٹلی مختلف ریاستوں میں منقسم تھا۔ تو وہاں بھی یہی حالت تھی۔ چنانچہ مائیکل انجلو اور ڈانٹے جیسے مصنفین اور شعرا اور لیونارڈو ڈاونچی (LEONARDODAVINCCI) جیسے صناع اور نقاش نہایت کامیاب اور مشہور ہوئے۔

ایک بڑی وجہ جس سے علم و فن میں نمایاں ترقی ہوتی ہے وہ مصنفین، صناعوں اور نقاشوں کی سرپرستی ہے۔ اہل یورپ کی تمدنی ترقی کا راز اسی میں مضمر تھا۔ اکثر امرا اور روسا ایسے لوگوں کو ذریعہ معاش سے بے فکر کر دیتے تھے۔ اس فیاضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت یورپ علم و ادب کے میدان میں نہایت جوش و خروش اور سرعت سے گامزن ہے۔

گوئٹے جرمن زبان کا بہت زبردست مصنف، شاعر، ڈراما نویس اور نقاش تھا۔ اس کی ترقی اور شہرت محض امرا کی سرپرستی سے ہوئی۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت مسرف واقع ہوا تھا۔ اس کے دوست ہمیشہ اسکا قرض اتارنے مین مصروف رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اسکا نہایت عزیز دوست کونٹ لکمبرگ جب مرگیا تو اس کی بیوہ نے اپنی مالی مشکلات کے باوجود گوئٹے کا قرض اتارنا ضروری خیال کیا اور جب تک اسکا فیصلہ نہ ہوگیا، اطمینان سے نہ بیٹھی۔

خلفائے بنی اُمیہ اور بنو عباس کے زمانے مین شاعری اور دیگر علوم و فنون نے بہت عروج حاصل کیا۔ شعرا خراج تحسین وصول کرنے کے علاوہ بڑی بڑی گرانبار رقمون سے مالا مال کردیے جاتے تھے۔ کوئی شاعر سونے سے تلتا تھا تو کسی کا منہ جواہرات سے بھرا جاتا تھا۔ غرض جتنی فارغ البالی شعرا، مصنفین اور ماہران موسیقی کو بنو عباس خصوصاً ہارون الرشید، مامون الرشید اور معتصم باللہ وغیرہ کے عہد حکومت مین نصیب ہوئی۔ اس کی مثال ہندوستان کے مغل شہنشاہون کی فیاضی کے سوا روئے زمین پر نہین ملیگی۔ بنو امیہ کے عہد حکومت مین حجاج بن یوسف اگرچہ حد درجہ کا ظالم صوبہ دار تھا۔ تاہم اس نے علما اور فضلا کے ہر طرح کا امن، اطمینان اور دیگر آسائشین بہم پہنچادی تھین۔ چنانچہ کوفہ اور بصرہ مین قرآن کریم اور حدیث کا باقاعدہ مطالعہ حجاج ہی کے زیر سایہ تکمیل کو پہونچا۔ حجاج پرانے استادون کے کلام کو نہایت عزت اور عقیدت مند نگاہون سے دیکھتا تھا۔ اور نئے شعرا کی بے حد حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ خاندان بنو امیہ کے خلفا مین کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور تھی۔ ولید بن عبد الملک کا شوق نغمہ جنون کے درجے تک پہونچ گیا تھا۔ سلیمان بن عبد الملک خوبصورت لونڈیون اور عمدہ اور نفیس غذا کا اسقدر دلدادہ تھا کہ آخر اسکی موت بھی زیادہ کھانے ہی کی وجہ سے لاحق ہوئی۔ اسی طرح خلیفہ عبدالعزیز علم دین کا بہت بڑا دلدادہ تھا چنانچہ اس کے زمانے مین مذہبی اور علمی ترقی معراج تک پہونچ گئی تھی۔ خلفا چونکہ خود اعلیٰ درجے کے شاعر ہوتے تھے۔ اسلیئے وہ ہمیشہ دوسرون کے کلام کی خوبیون کو قابل ستایش سمجھتے تھے اور انھین انعام و اکرام سے مالا مال کردیتے تھے۔ اور خلفائے بنی عباس کا عہد حکومت تو تمدن کے لحاظ سے "عہد طلائی" شمار ہوتا ہے۔ اس دور کی ادب نوازی اور سخن پروری کا کیا پوچھنا۔

اہل عرب ایک غیر عرب کو عجمی (گونگا) کہتے تھے کیونکہ انکو اس بات کا زعم ہے کہ غیر ملک کا کوئی شاعر عربی زبان پر قدرت حاصل نہین کرسکتا۔ لیکن اس کے باوجود عباسیون کے زمانے مین مختلف ملکون کے لوگ سرزمین عرب و عراق مین وارد ہوئے اور اپنے علم و فضل کی بدولت بڑی بڑی جاگیرون کے مالک قرار دیے گئے

تکلیمہنا میں فارسی وعربی کے مشہور پروفیسر نکلسن اپنی کتاب تاریخ ادبیات عرب "LITERARY HISTORY OF THE ARABS" میں رقمطراز ہیں کہ ان خلفا اور سلاطین کے وزرا بھی ادبی مشاغل اور علما اور فضلا کی سرپرستی پر اندھا دھند روپیہ نثار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ابن العمید وزیر اعظم سلطان رکن الدولہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ شخص فن زبان دانی اور مراسلہ نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ لوگوں میں یہ عام طور پر مشہور تھا کہ "فن مراسلہ نگاری عبدالحمید سے شروع ہوا اور ابن العمید پر ختم ہوگیا"۔ ابن العمید کے طفیل اسکا ایک دوست اسمٰعیل بن عباد عربی زبان کا ایک بہت زبردست مصنف۔ عالم جید اور فاضل اجل ہوا۔ تا وزیر اردشیر جو سلطان ابو نامر بہاء الدولہ کا وزیر اعظم تھا۔ ایک حلقۂ ادبیہ اپنے خرچ پر قائم کیا۔ جہاں تمام ملک کے سلن۔ فقہا۔ ادبا اور شعرا باہم مبادلہ خیالات کرتے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے حقوق اور مناصب کا رتبہ موجودہ زمانے میں کیمبرج یا آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے کسی کالج کے فیلو[1] کے برابر ہوتا تھا۔

قدیم اور زمانۂ وسطیٰ میں ہندوستان میں بھی یہی حالت تھی۔ فنون لطیفہ۔ موسیقی۔ ناٹک۔ نقاشی۔ اور سنگ تراشی نے اسوقت تک ترقی کی۔ جب تک سلاطین۔ اور امرا۔ ان لوگوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ مہاراجہ بکرماجیت والی اوجین کے نورتن۔ اور کالیداس وغیرہ خوب مشہور و معروف ہوئے۔ گپت خاندان کے تمام مہاراجگان فنون لطیفہ میں ماہر ہونے کے علاوہ قدرشناس بھی تھے۔ اسی طرح ابوالفضل فیضی۔ حکیم ہمام وغیرہ اپنے اپنے بادشاہوں کے مرہون منت تھے۔ اکبر کے زمانے میں عبدالرحیم خان۔ خان اعظم نے لاکھ روپیہ صرف ایک شعر کی قیمت میں شاعر کو دیکر اُسے مالامال کر دیا تھا۔ اسکی علمی سخاوت کے بے شمار فسانے صفحات تاریخ کی زینت ہیں۔

ملکوں میں زبان کی ترقی ہمیشہ حکومت کی سرپرستی سے ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے

---

[1] ان کی سالانہ آمدنی دوسو پاونڈ سے لیکر تین سو پونڈ تک ہوتی ہے۔ اس سے علاوہ انکو روٹی کمن۔ دودھ اور رہنے کیلئے مکان بھی ملتا ہے۔ یہ عہدہ سات سال تک کیلئے ہوتا۔ اگر اس عرصہ کے اندر اسکو کوئی تعلیمی ملازمت نہ ملے تو وہ فیلوشپ سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ کالج کی مجلس انتظامیہ کے رکن ہوتے ہیں۔ اور ماسٹر بورڈنگ وغیرہ کے منتظم اور صدر کا انتخاب انہیں سے ہوتا ہے۔ اور یہی ایک مجلس شوریٰ منتخب کرتے ہیں اس تمام کونسل کا م کا انتظام ایک عہدیدار کے سپرد ہوتا ہے۔ (جو برسر (BURSOR) کہلاتا ہے۔

کہ موجودہ حکومت ہند نے ہندوستانی زبانوں کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ رکھا ہے۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ حکام وقت اس بدبخت ملک کو اپنا وطن نہیں سمجھتے۔ لیکن دوسری طرف جب خیال کیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ حکومت کیا کر سکتی ہے۔ سب سے بڑی مشکل جو حکام اور اکابر قوم کو پیش آرہی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کونسی ہے۔ حکومت برطانیہ نے اپنے ابتدائی ایام میں اردو کی طرف توجہ مبذول فرمائی تھی۔ لیکن چند ہی سال کے بعد کئی اور زبانیں اردو کے مقابلے میں کھڑی ہوگئیں یا کھڑی کردی گئیں۔ آخر حکومت کس کس زبان کی سرپرستی کرے۔ اردو۔ ہندی۔ پنجابی۔ بنگالی۔ گجراتی۔ سندھی۔ مارواڑی۔ مرہٹی۔ تلنگی۔ تامل۔ کنٹری۔ کھسی وغیرہ سینکڑوں زبانیں اپنے اپنے وزنی سرمایہ ادبیات کو ساتھ لیے ہوئے ایک ہی راستے پر گامزن ہیں۔ سب سے پہلے ایک مشترکہ زبان تسلیم کرلی جائے۔ اور اسکا سہل طریقہ یہ ہے کہ ہندی اردو کے جھگڑوں کی بجائے جو ایام گذشتہ میں موجودہ ہندو مسلم فساد سے بھی زیادہ خطرناک صورت اختیار کر رہے تھے۔ خاموشی سے اکابر قوم کی ایک مجلس عامہ و مخصوصہ میں اس بات کا فیصلہ کرلیا جائے۔ اور پھر حکومت سے پرزور طریق پر استدعا کی جائے۔

عوام الناس پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنی زبان کی سرپرستی کریں۔ کیونکہ مصنفین اپنی قوم پر احسان کرتے ہیں۔ اس کے عوض انکو کم از کم ذریعۂ معاش سے تو بے نیاز کردیا جائے۔ اسوقت یورپ اور امریکہ کے لوگ اس امر کو محسوس کرتے ہیں کہ ایک انشا پرداز تلاش روزگار کیلئے تو محتاج نہو یہی وجہ ہے کہ اسوقت مغربی ممالک میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جسے علمی و ادبی مشاغل کے سوا دنیا کے دوسرے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ حتی کہ اکثر مصنفین اپنے عقائد کے اعتبار سے تمام دنیا کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ انکے نزدیک وطن پرستی تعصب اور بغض پھیلانے کا نام ہے۔ مشہور و معروف جرمن شاعر گرٹے[1] نے اپنے آپ کو کبھی جرمنی کا باشندہ نہیں بتایا۔ اس کی رائے تھی کہ مصنفین کو مذہبی تفرقات۔ نسلی امتیازات۔ فوجی مہمات وغیرہ سے الگ تھلگ رہ کر نسل انسانی کے اخلاقی۔ روحانی اور تمدنی سود و بہبود کیطرف متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ اسطرح ممالک خود بخود سدھر جائینگے۔ اور یہی وجہ تھی کہ گرٹے کی تصنیفات نے جرمنی کے باشندوں میں حب الوطنی اور قومیت کی زبردست روح پھونکدی کہ آخر تمام المانی ریاستیں ایک شہنشاہی کے زیر اثر منسلک ہوگئیں۔

---

[1] JOHANN VOLFGANG WON GQZHEE

موجودہ زمانے مین ہندوستان مین جتنے بھی مصنفین ۔ شاعر ۔ صناع اور نقاش ہین ۔ معدودے چند کے سوا سبھون نے ان کامون کو محض ایک تفریحی شغل سمجھ رکھا ہے ۔ بہت کم ایسے آزاد ہونگے جنکی بسر اوقات تصنیف و تالیف کے ذریعے سے ہوتی ہو ۔ مثال کے طور پر آپ اردو کے مشہور عالم ڈاکٹر اقبال ہی کو لیجئے ۔ کیا یہ بات ملک کیلئے باعث ننگ و شرم نہین ہے کہ ایسا زبردست شاعر ابتک فکر معاش سے مستغنی نہین ہوا ہے حالانکہ چاہئے تھا کہ اسرار خودی ، رموز بیخودی ، اور پیام مشرق وغیرہ کے اڈیشن لاکھون کی تعداد مین چھپتے اور فروخت ہوتے تاکہ جو وقت موصوف اپنے قانونی پیشے مین صرف کرتے ہین ، شعر شاعری مین صرف کرکے ملک و قوم کیلئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ۔

دوسرے مین ایک اور صاحب کا ذکر کرونگا ۔ جنکے نام سے بھی شاید اردو دان جماعت اچھی طرح واقف نہین ہے ۔ اگر اردو دان طبقہ کیطرف سے انکی حوصلہ افزائی ہوتی تو ضروریات زندگی سے وہ بے نیاز ہو سکتے اور اسوقت وہ ایک بہت بلند پایہ مصنف و مترجم ہو جاتے ۔ اور ادب اردو کا خزانہ بعض بہترین کتابون کے اعلیٰ ترین ترجمے سے مالا مال ہو جاتا ۔ انھون نے MOORISH EMPIRE IN SPAIN کا ترجمہ اخبار الاندلس کے نام سے شایع کیا ہے اور مقری کی نفح الطیب کا بھی ترجمہ کیا ہے ۔

آخر یہ بدبخت ہندوستان کب تک اپنے مصنفین ۔ شعرا وغیرہ سے بے اعتنائی برتے گا ۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جبتک ہماری علمی و ادبی ترقی نہین ہوتی ۔ ہمارا ملک حکومت خود اختیاری سے ہزارون کوس دور رہیگا ہمارا روئے سخن اسوقت والیان ریاست اور ارباب حل و عقد کیطرف ہے ۔ ہماری استدعا ہے کہ ایک قومی سرمایہ نہایت عالیشان اور زبردست پیمانے پر جاری کیا جائے جسکا مقصد یہ ہو کہ تمام صوبون مین ایک ایک علمی و ادبی درسگاہ قائم کیجائے جسمین ہونہار نو آموز مصنفین کو تصنیف و تالیف کا کام سکھایا جائے اور پھر انکی دستگیری اور سرپرستی کے لیے ریاستون کے زیر اہتمام صوبہ وار دار الاشاعت بھی قائم کیے جائین جنکے مہتمم علمی و ادبی مذاق رکھنے کے علاوہ نقاد فن ہون ۔ اور جتنی نئی کتابین اشاعت کے لیے لکھی جائین ۔ انکی جانچ پڑتال اور خامیون کا موازنہ کرکے حسب لیاقت معقول معاوضے دئے جائین اسطرح ایک اعلیٰ پیمانے پر قومی کتب خانے کی بنیاد ڈالی جائے ۔ اس بارے مین حضور نظام دکن کی فیاضیان ہندوستان کی ادبی تاریخ مین سنہرے حروف سے لکھی جائین گی ۔ جتنے مصنفین کی پرورش اس ریاست کی طرف سے ہوتی رہی ان تمام کی فہرست دینے کی ضرورت نہین ، محسن الملک ۔ وقار الملک

مولینا غلام علی بلگرامی، مولینا شبلی نعمانی سب اسی فیاض ریاست کے ممنون التفات تھے اور مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا گرامی وغیرہم، اب بھی اسی ریاست کے ممنون احسان ہیں۔

ہندوستان کے ہر حصہ میں بہت سی ریاستیں ہیں۔ اگر ہر ایک ریاست سے ایک خاص رقم سالانہ وصول ہوتی رہے۔ اور اس روپیہ کی آمد و خرچ کا انتظام ایک ذمہ دار کمیٹی کے ماتحت ہو تو ہماری رائے میں کوئی وجہ نہیں کہ یہ ملک اخلاقی اور دماغی لحاظ سے ترقی نہ کرے اور باشندوں میں ذوق سلیم پیدا نہ ہو جائے اس سے ملک میں صحیح حب الوطنی پیدا ہو جائیگی اور اس ملک کی گذشتہ عظمت اور شان عود کر آئیگی۔

محمد فضل حق منتظم

تجارت کی کساد بازاری سامان طباعت و دیگر ضروریات زندگی کی گرانی کے باوجود انگلستان میں تصنیف و تالیف کے دمیں کوئی تخفیف نہیں ہوئی بلکہ ۱۹۲۰ء میں سال ماسبق کے بہ نسبت زیادہ کتابیں شائع ہوئیں۔ کل چھ ہزار نوسو اکیانوے (۶۹۹۱) نئی تصانیف چھپیں اور تین ہزار دوسو انسٹھ (۳۲۵۹) کتابوں کے دوسرے ایڈیشن شائع ہوئے پہلی مرتبہ چھپنے والی کتابوں کی تفصیل یہ ہے۔

ناول اور افسانے	۱۰۵۸	شاعری و ڈرامے	۱۸۵
مذہب و روحانیات	۵۷۵	فن تعمیر و دیگر فنون لطیفہ	۱۸۰
تواریخ و سوانح عمریاں	۵۴۰	سیر و سفر وغیرہ	۱۸۰
تعلیمی کتابیں	۳۵۹	کتب متعلق حیوانات	۱۲۸
طبی و جراحی	۲۶۰	قدیم ادبیات و ترجمے	۱۱۶
نثر خالص ادبی تصانیف	۲۴۰	مشرقی زبان کی کتابیں	۱۰۶
سیاسی، اقتصادی اور پولیٹیکل کتابیں	۲۳۸		

مسئلہ سُرخ سپید

آجکل اخباری دنیا مین فیصلۂ کنیا کے متعلق جس غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ ناظرین زمانہ سے پوشیدہ نہین۔ ہمکو یہان اس سے بحث نہین کہ مشرقی افریقہ کی اس چھوٹی سی نو آبادی مین شہری حقوق کی بنیاد مساوات پر رکھی جانی چاہیے یا قومیت پر۔ اس اصول کے مفاد و مضرت سے بھی بطانوی مدبرین ہی زیادہ واقف ہونگے۔ مگر ہم اتنا ضرور عرض کرینگے کہ کنیا کے اس تصفیہ سے سفید اقوام کی وہ پالیسی جسکو وہ ایک عرصۂ دراز سے سرخ و سیاہ قومون کے خلاف عمل مین لا رہے ہین آج عرصۂ دراز سے بالکل طشت از بام ہوگئی ہے۔ سرخ و سیاہ قومون سے ہمارا اشارہ بر اعظم ایشیا اور افریقہ کے قدیم باشندون کی جانب ہے یعنی اس سے وہ لوگ مراد ہین جنکا شمار سفید نام قومون مین نہین کیا جاتا۔

آج روئے زمین پر سفید لوگون کی عظمت و برتری کا جو سکہ بیٹھا ہوا ہے اگر تحقیق کیا جائے جائے تو اسکی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہین۔ اقوام عالم کا نقشہ عہد وکٹوریہ مین اس سے کہین زیادہ مختلف تھا جو آج ہمارے سامنے ہے۔ سنہ ۱۸۳۷ء مین ملکہ وکٹوریہ کی تاجپوشی ہوئی۔ اور اسی زمانہ مین سفید لوگون کو ابھی افراط و تفریط کے دشوار گذار راستہ سے نکلکر ترقی کی شاہراہ عام پر قدم رکھنا شروع کیا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ انکو اس وقت تک اسکا ثمرہ بھی اقتدار نصیب نہین ہوا تھا جتنا آج حاصل ہے۔

افریقہ کے شمالی اور جنوبی صوبجات تو اُن کے قبضہ و تحت مین آئے ہوئے کچھ زیادہ مدت نہین گذری۔ آسٹریلیا مین بندرگاہ ملبورن ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی سے کچھ پیشتر وجود مین آیا ورنہ اس سے قبل وہان صرف معدودے چند سفید اور کارآمد بندرگاہین تھین۔ اور اسی وجہ سے بر اعظم آسٹریلیا عرصۂ دراز تک سفید اقوام کے لیے ایک سربمہر کتاب کے مانند رہا۔ دوسری جانب امریکہ

یہ کیفیت تھی کہ دریائے مسی سپی کے اندرمغربی اضلاع مین جنگلی بیل اپنا عمل دخل جمائے ہوئے تھے، وکٹوریہ کے جشن جلوس سے دس سال کے بعد کیلی فورنیا مین سونے کی کانون نے مشرقی امریکنون کی توجہ کو اپنے جانب مبذول کرنا شروع کیا درحقیقت سان فرانسسکو، لاس انگیز، پورٹ لینڈ اور سیٹل جیسے شہرون کا جو آج اسقدر پر بسر ترقی ہین ایک صدی پیشتر نام و نشان بھی نہ تھا، اور اقوام سفید، اقوام بحر الکاہل کی گہرائیون سے قطعی ناآشنا تھین۔ ایک وہ وقت تھا کہ جاپان چین اور ہندوستان غفلت مین پڑے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے قازن دتنابی، چوبی کونون اور دادابھائی نوروجی جیسے محب وطن اپنی تصانیف کے ذریعہ اہل ملک کو سفید اقوام کے ایک زبردست حملہ سے متنبہ کرنا چاہتے تھے مگر قوم تھی کہ نیند کے خمار مین ان النول نصایح کو دھیان مین نہ لاتی تھی، پھر ایک دور ایسا آیا کہ مارکو پولو کے معرکون کے بعد بحیرۂ قلزم سے دیوار چین تک کا تمام علاقہ سفید رنگ والون کے سبز قدم سے بالکل پاک ہو گیا تھا بلکہ کچھ عرصہ تک وسطی ایشیا مین شاید ہی کوئی سیاح آیا ہو۔

اصل مین یہ صرف گذشتہ نوے برس کی شدید جدوجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ آج سفید لوگون کی شوکت و عظمت کا ڈنکا دنیا کے ہر گوشہ مین بج رہا ہے۔ چنانچہ وکٹوریہ آنجہانی کی چونسٹھ سالہ طویل مدت حکومت ہی مین انگلستان کے مقبوضات پیشتر سے دوگنے ہو گئے تھے اسی درمیان مین روس نے بھی متعدد الحاقات کرکے اپنے حدود کو کافی وسعت دیدی تھی، ادھر امریکہ، اور تمام براعظم افریقہ یک قلم سفید قومون کے زیر اثر آگیا۔

اگر کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ سیاہ و سپید کے مالکون کی اس تیزدستی نے سیاہ و سرخ قومون کی ہستی کو معرض خطر مین ڈالدیا۔ جزائر عرب الہند مین کا رہنے والی قوم کی تباہی پہلے کامل ہو چکی ہے۔ نوری کنگ اور طوبان کی نسلین جزائر الکاہل مین روز بروز تنزلی و بربادی طرف جارہی ہین۔ بلکہ وہ بھی جو ابتک فنا نہین ہوئین گمنامی کے قعر مذلت تک پہنچ گئی ہے۔ تاریخ عالم سے ثابت ہے کہ یہ "حاملان تہذیب" سطح ارضی کے جس گوشہ مین گئے انھون نے وہان کے قدیم باشندون کو اپنا حلقہ بگوش غلام بنالیا، اسکے بعد یہ انپر نہ صرف اپنا دست

پیدا کر دیا۔ بلکہ انہیں بعض مخرب اخلاق جرائم بھی پیدا کرانے کے مرتکب ہوئے مگر رفتہ رفتہ دنیا کے سامنے اس "مہذب گروہ" کی حکمت عملیوں کا پول کھلنے لگا، اور سرخ اقوام میں کچھ بیداری کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

اس اثنا میں افق مغرب پر یکایک تمام سطح غبار آلود نظر آنے لگتا ہے کامل پانچ سال تک "حامیان تہذیب" بنی نوع انسان کو صفحۂ دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے دو سر توڑ کوششیں کرتے ہیں کہ الامان الحفیظ گر دنیا کے اسٹیج کا ایک نظر فریب پردہ ہٹتا ہے اور جنگ عظیم کا ایک دھواں دھار منظر پیش نظر ہو جاتا ہے۔ جدھر نگاہ ایک جسطرف نگاہ اٹھتی ہے سرخ لوگ تنازع حیات کی کشمکش میں مصروف پیکار دکھائی دیتے ہیں۔

جاپانی تو اسی وقت سے اس جد و جہد میں منہمک تھے جبکہ انھوں نے روس کی زبردست استبداد یت کو شکست دیکر مغربیوں کے تکبر و غرور کا شیرازہ بکھیر دیا تھا مگر انکی دیکھا دیکھی دوسری قومیں بھی کمر ہمت چست کر کے اس میدان میں اتر آئیں جنمیں ہندوستانی، ترک، مصری، عرب، انامی، سنگالی، جنوبی، افریقی اور قدیم چینی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ گذشتہ جنگ یورپ اپنے اصلی معنی میں "جنگ فرنگ" قرار دیجا سکتی ہے یعنی ایشیا یا افریقہ کے نقطۂ نگاہ سے ایک طور پر سفید اقوام کی خانہ جنگی تھی گویا "ایک سفید دوسرے سفید سے برتر ہے" یہی وجہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کی غیر متمدن نسلیں اس جنگ عظیم کو مہذب درندوں کی مسخرانہ دیوانگی پر محمول کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں دوران جنگ میں اتحادیوں نے اس پیغام کو دنیا کی کئی سو زبانوں میں بانگ دہل مشتہر کیا تھا کہ انہوں نے یہ لڑائی محض عزت و ناموس کے مقدس اصول کی پاسداری میں اپنے سر لی ہے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ اس اصول کو صلح نامہ وارسلز اور سیورے سے صرف اسقدر تعلق تھا کہ جرمن مشرقی افریقہ اور کیمرون کے دیسی باشندے بھی قیصر جرمن کی گرفت سے رہا کرا دیئے جائیں اور بس۔

اب قابل غور یہ امر ہے کہ کیا ہم خداوندان صلح و جنگ سے بصد ادب دریافت کر سکتے ہیں کہ ایسے متبرک اصول کو کسی خاص جغرافیائی حدود ا لیہ تک محدود رکھنا قانون کے کن دفعات میں درج ہے، انصاف تو اسکا مقتضی تھا کہ جس وقت افریقہ کی نوآبادیوں کی گلو خلاصی کرائی گئی

ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کی بھی رسیان کاٹی ہوتین ہیں جس اصول کا استعمال پولینڈ یا یوگو سلاویہ کے واسطے جائز تھا وہی مسر، چین کہ بھی صادق آنا چاہئے تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ پہلے سفید فام لوگ سرخ قوامہ کے ملکون مین گھس آتے اور وہین نوآبادیان بنا کر اپنی بود و باش اختیار کر لیتے تھے، مگر اب سرخ قومین کہتی ہین کہ انکو بھی ہر طرح سے سفید انسانون کی بستیون مین جانے اور رہنے سہنے کا حق حاصل ہے۔

اسی بنا پر مجلس بین الاقوامی کی قرارداد مین (جسپر تیس سے زیادہ قومون کے دستخط ہوئے تھے) اس شرط پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا کہ دنیا کا نظام حکومت صرف ان دو اصول کے ماتحت ہونا چاہئے۔ اول اقوام عالم کے مابین اشتراک عمل (اقرارنامہ کا پہلا جملہ اسی اعلان کی تائید کرتا ہے) دوم غیر متمدن قومون کی حفاظت جو تہذیب و انسانیت کی بزرگ ترین مہم ہے" (ملاحظہ ہو دفعہ ۲۲)

اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سرخ و سیاہ اقوام مین خودداری اور خود اعتمادی کا عام احساس پیدا ہو گیا اور یہ احساس خود ہی جب اس حد تک پہنچ گیا کہ کسی گوری قوم کا محکوم بنکر رہنا حد سے زیادہ کی سخت توہین ہے تو کثرت سے نسلی اور قومی تحریکین معرض وجود مین آنے لگین، جنہے فضائے خیال مین ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا اور زمانۂ حال کی تاریخ سیاست کو آنیوالی نسلون کے لیے نہایت اہم بنا دیا۔

ان مین سب سے پہلی تحریک "ایشیا کی بیداری" کے لقب سے موسوم کیجاتی ہے جسکی ایک شاخ ہندوستان کا سودیشی اندولن ہوم رول یا "سوراج" نامی ہے۔ ۱۹۱۹ء مین مظالم پنجاب نے ملک کے طول و عرض مین ایک آگ سی لگا دی، حقوق طلبی کی آواز مین تمام ہندوستان مہاتما گاندھی کا ہم آہنگ ہو گیا۔ برطانوی ارباب حل و عقد کو یہ ہندو مسلم اتحاد کا تپلا ایک آنکھ نہ بھایا اور بالآخر انھون نے گاندھی کے جسم نحیف کو پیجا کر قید و بند کے شکنجون مین جکڑ دیا۔ گو آج واقعات نے بہت کچھ رنگ بدل لیا ہے، مگر وہ روح جو اسوقت تک ہر ہندوستانی کے دل و دماغ مین سرایت کر چکی ہے، اسکا کسی صورت نکلنا ممکن نہین،

ہندوستان کے تیس کرور نفوس جنکو گاندھی کے خیالات سے (اصول و طرز عمل کلیۃً)

نہیں ہے، پوری ہو رہی ہے آج بھی بدستور سابق اپنی تحریک کو جاری رکھنے پر آمادہ و مستعد ہیں اور ہر قدم آگے ہی اٹھاتے رہیں گے۔ جبتک کہ اپنی منزل مقصود پر نہ پہونچ جائیں۔

اُدھر "دلدادگان حریت" کی فتح کے ساتھ ہی ترکوں کے رہے سہے ملک پر زبردست قوتیں ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں حتی کہ خود ان کا وطن مالوف بھی بلا خلل و غش غیروں کے قبضہ و تصرف میں آگیا مگر دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف ترکی کا "جان بلب مریض" اپنے ملک کی حمایت کے لیے از سر نو اٹھ کھڑا ہوا بلکہ مصطفیٰ کمال کی تلوار نے اتحادی اور یونانی زنجیروں کو یکسر کاٹ ڈالا،

البانیا (جزیرہ نمائے بلقان) میں والونا کی فتح تسخیر سمرنا سے بھی زیادہ حیرت خیز کامیابی ہے، جنگ فرنگ کے ختم ہوتے ہی اس چھوٹے سے ملک کے حصے بخرے ہو گیے۔ شمالی علاقہ کو سرویا نے دبایا، جنوبی یونان کو ملا، اور وسطی حصہ پر اطالیہ نے اپنے قدم جما لیے۔ مگر باینہمہ البانیا نے صرف آٹھ لاکھ افراد سے متواتر دو برس تک لڑائی کو جاری رکھا اور آخر کار چپہ چپہ زمین دشمنوں سے پھر چھین لی۔

افغانستان نے بھی موقع دیکھکر کابل کی پہاڑیوں پر "علم خود مختاری" بلند کر دیا اور مختلف ممالک میں اپنے سفیر بھیجے۔

ایران نے بھی روس اور انگلستان کی گرفت سے چھوٹ کر کشمکش حیات و ممات سے نجات حاصل کر لی؛

اسی سلسلہ میں زاغلول پاشا نے "آزادی مصر" کا نعرہ بلند کیا، اسپر کچھ عرصہ کے لیے جزیرہ سرانذیپ میں مجبوراً نظر بندی کے ناگوار مناظر کا نظارہ کرنا پڑا۔ مگر اب وہ یوسف مصری اس قید فرنگ سے رہائی پا کر پھر اپنے وطن واپس آگیا ہے جہاں پہونچکر اسنے مصریوں اور قبطیوں کے باہمی ارتباط پر زور دینا شروع کر دیا ہے اور اہل مصر نے بھی بخوبی سمجھ لیا ہے کہ اسی آئینہ میں آزادی کی ملکہ اپنا خوشنما چہرہ دکھائیگی،

ایسے ہی جزائر غلیبا ئن میں انگلینڈ اور قیزن جیسے وطن پرست اپنے ملک کی آزادی کے واسطے کھڑے ہو گئے ہیں باوجودیکہ امریکہ نے ان کے مطالبات کو بے اصل ثابت کرنے میں کوئی ممکن کوشش اٹھا نہیں رکھی مگر یہ بھی اپنی صدائے بے ہنگام پر اسوقت تک

ثابت قدم رہنے کا تہیہ کر چکے ہیں جبتک کہ اپنا مقصد حاصل نہ کرلیں گے۔

امریکہ کی محکوم اقوام میں سے ایک شخص مسٹر گاروِن نامی رونما ہوگیا ہے جو افریقہ کو غیر اقوام کے پنجۂ ظلم سے چھڑانے کا دعویدار ہے بلکہ وہ خود امریکہ کو بھی قدیم سرخ اقوام کا مسکن بتاتا ہے۔ انکا قول ہے کہ یہ سفید لوگ "مہذب غاصب" ہیں جو زبردستی امریکہ پر قابض ہوگئے ہیں۔

اسوقت جماعت تورانی، عربی اخوۃ، مسئلہ خلافت، وطن یہود یا فلسطینیوں کا فلسطین کے [illegible] مختلف النوع تحریکیں بھی جاری ہیں، دنیائے اسلام میں علیحدہ ایک ہلچل مچی ہوئی ہے، [illegible] میں مراکش جو ڈھائی سال سے سرکشف ہیں اور ہسپانیہ کی باقاعدہ فوجوں کو پے در پے شکستیں دے رہے ہیں، کینیا، نٹال، بسوتولینڈ اور فجی میں الگ ہندی نژادوں نے اپنی [illegible] کا جھنڈا اکھڑا کر رکھا ہے غرض بحالت موجودہ دنیا میں ایک درجن سے زائد تحریکیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جنمیں سے ہر ایک کی تاریخ کو اگر مختصر طور پر بھی بیان کیا جائے تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائیگا۔

اگرچہ ہمکو بوجوہ احسن معلوم ہے کہ ہر ملک میں بعض اس قسم کے نادان بھی موجود ہیں جنکو سفید اقوام گربۂ مسکین کے مصداق تصور کرتی ہیں۔ بلکہ انکو خود انکے محبان وطن کے خلاف خیالات پھیلانے کا مفید آلہ بنا رکھا ہے۔ مگر پھر بھی اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا کہ واقعات عالم ہر نقطۂ سرخ و سیاہ اقوام کی عالمگیر بیداری کا موجب ہوتے جاتے ہیں۔ اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اب کسی قسم کی خفیہ ریشہ دوانیاں یا سیاسی سازشیں قدرتی رو کو نہیں روک سکتیں گذشتہ نوے برس میں سفید اقوام کا دنیا کو مطیع و منقاد کرنے کا دور دورہ تھا مگر اب امید ہے کہ شاید آیندہ نوے سال کا وہ زمانہ ہوگا جسمیں سرخ قومیں زندگی کے نیا رکن گردانتے ہیں کہ کر ساحل آزادی کی ہوا کھائینگی۔

بہر نوع دعویداران تہذیب نے جن اصول کا چاردانگ عالم میں اعلان کیا تھا وہی آج خود ان کی عطائے انسانی میں سدراہ ہو رہے ہیں زمانہ کا رخ دیکھتے ہوئے ہم وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ [illegible] وقت دور نہیں جب غلامی کی تمام زنجیریں ٹوٹ کر گر پڑیں گی اور سرخ

اقوام بھی فضائے آزادی مین خودداری کادم بھرنے لگین گی درحقیقت یہ سفید اقوام کا پرُ اسرار دعظ ہی تھا جسنے سرخ رنگ کی قومون مین ایک نئی روح پھونکر اپنا فرض منصبی ادا کرنے کی جرارت وہمت عطا کردی - غالبًا اب وہ وقت آگیا ہے (اور ہمکو اسکے واسطے تیار ہوجانا چاہیے -) کہ انسانیت کی "گول میز" تُو ٹن، گال، امریکن اور برٹن مساوی شرکار کی حیثیت سے آرین، منگول، عرب اور حبشی قومون کے دوش بدوش بیٹھے نظر آئین -

مرزا مظفر حسین (علیگ)

موسیقی

مین اُس نغمہ کا تمنائی ہون جو ایک عطیۂ فطرت ہے - میرا دل اُسکے شوق ایک افسردہ پھول کی طرح مرجھایا ہوا ہے

تو اِن لے نغمہ طراز : ابر نے فخر شراب کی طرح نغمہ پاشی کر - اور قطرات سیمین کی طرح اپنی دلنواز آواز سنا - مین اس چٹیل میدان کے مانند موسیقی کا آرزومند ہون جو تھوڑی سی بارش کا منتظر ہو مجھے نغمۂ خوشگوار کی شراب پینے دو اور بہت زیادہ پینے دو کیونکہ مین ہنوز تشنہ ہون - یہ نغمہ اُس سانپ سے مجھے رہا کر دیگا جسے افکار نے میرے سینہ پر باندھ دیا ہے اور یہ اثر ریز نغمہ رگون کے ذریعہ میرے دل و دماغ مین تحلیل ہوجائیگا - یہ نغمہ اُس گل پژمردہ کی خوشبو ہے جو چاندی کی جھیل کے کنارے کھلا - اور جسکا عطر دوپہر کی تپش نے چوس لیا - کہرے کا پتہ نہ تھا کہ اُسکی پیاس بجھاتا - آخر وہ پھول مرجھا گیا اور اُسکی خوشبو ہوا کے پرون پہ اُڑکر نیلگون سمندر پر چھا گئی -

یہ نغمہ اُس شخص کے مانند ہے جو طلسمی ساغر مین، محبت کے بوسون کی اُبلتی ہوئی پھکار، اور شور مچاتی ہوئی شراب پیتا ہے؛ اور جیسے ایک مست ساحرہ نغمۂ عشق گرتی ہے

(پیمانہ) ورڈزورتھ

جان کیٹس

باغ فطرت کے وہ پھول جو بغیر بہار جانفزا دو دن دکھلا کر راہی ملک بقا ہو جاتے ہیں اپنے شیدائیوں کو عمر بھر کے لیے تشنہ کام رکھتے ہیں، انکے غم میں چمن دہر کے گوشہ گوشہ سے وحشت اور سراسیمگی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کائنات کے بنیادی عناصر میں کوئی تزلزل پیدا ہو گیا ہے کسی ہرے بھرے باغ میں جاکر دیکھو جہاں شاداب اور تر و تازہ پھولوں کا جمگھٹ ہوگا وہاں کچھ ایسی پژمردہ اور بدنصیب کلیاں بھی نظر آئینگی جنکا رشتہ حیات کسی بلائے ارضی و سماوی نے منقطع کر دیا، اور وہ ناشاد نامراد کھلنے سے پیشتر ہی مرجھا گئیں، باغبان انکی قسمت پر رویا کرے، لیکن وہ تو اپنی بہار دکھا چکیں، آج ان کلیوں کا تبسم ناز سرمایہ گلشن ہے، وہ بھی ہنستی ہوئی، باغ دہر سے رخصت ہو جائینگی لیکن اس باغ کی رونق و شادابی میں کوئی فرق نہ آئیگا۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

آج ہم انگلستان کے ایک ایسے نامور شاعر کے حالات قلمبند کرتے ہیں جو ایک گوشہ گمنامی میں پیدا ہوا، لیکن جسنے اپنے حکیمانہ خیالات اور شاعرانہ بلند پروازی کی بدولت ملک کے ہر ممتاز ادیب و سخن سنج سے خراج تحسین وصول کر لیا۔ افسوس کہ عنفوان شباب ہی میں قزاق اجل نے اُسکے متاع زندگی پر حملہ کر دیا، اور ادبی دنیا کا ایک گوہر شب چراغ جسکی ذات سے بہترین اُمیدیں وابستہ تھیں فانی نظروں سے روپوش ہو کر اُس فضائے مقدس کو سدھارا جہاں ہماری ناکام آرزوئیں رہا کرتی ہیں، اُن واقعات اور حالات پر ماتم کرنا بیسود ہے جو انسانی قبضہ قدرت کے حدود سے باہر ہوں۔ مگر اسکی جوانمرگی کا افسوس ہے۔ اس قبل از وقت حادثہ سے جو ادبیات کو نقصان

JOHN KEATS - 1795-1821

عظیم ہو چکا ہے اُسکا صحیح صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ کاش کیٹس بڈھا ہو کر مرتا! اور اُسکے خیالات میں وہ پختگی اور متانت پیدا ہو سکتی جو مدتوں کی مشق کے بعد حاصل ہوتی ہے!

پیدائش اور ابتدائی حالات

جان کیٹس ۲۹ ر اکتوبر ۱۷۹۵ء کو پیدا ہوا، اور لندن کی ایک غیر معروف اسٹریٹ کے متصل ایک اصطبل کو (جسکا انتظام اسکے باپ کے سپرد تھا) اپنے قدوم میمنت لزوم سے عزت بخشی، اس تنگ و تاریک گوشہ میں اس بلبلِ رنگین نوا نے آنکھ کھولی، اور اسی ماحول میں جو کسی عنوان سے شاعرانہ جذبات کو اُبھارنے میں ممد و معاون نہیں ہو سکتا تھا اُسکی ابتدائی نشوونما ہوئی، اُسکی اولین درسگاہ آغوشِ مادر تھی جو دراصل اپنے بچے کی حقیقی معنوں میں عاشقِ زار تھی، اور جس سے کیٹس بھی بیحد محبت کرتا تھا، وہ خود لکھتا ہے۔

"مجھے اپنی ماں خوب یاد ہے، وہ جان سے بہت محبت کرتی تھی، اور صورت شکل میں بھی اُسی سے بہت مشابہ تھی، وہ نہایت غمگسار، اور محبت کرنے والی ماں تھی، اور مجھے یقین ہے کہ اُسکی لیاقت غیر معمولی تھی"

اسمیں شک نہیں کہ جان کے ماں باپ دونوں اپنی اونی حیثیت سے زیادہ تعلیم یافتہ، مہذب، ذہین، اور لائق تھے، وہ فراخ دل حوصلہ مند بھی تھے اور اُنکی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم و تربیت سے مزین کریں، لیکن اُنکے ذرائع محدود اور آمدنی قلیل تھی، ناچار مجبوراً جان کو پادری کلارک کے اسکول میں داخل کر دیا جو اینفیلڈ میں واقع تھا، اور جہاں اُسکے دو ماموں پہلے تعلیم حاصل کر چکے تھے، اسکول کی شہرت اچھی تھی، اور گرد و پیش کے مناظر بھی خوب تھے لیکن ناکامیاں، رسوائیاں، بدنامیاں روزِ ازل سے کیٹس کے لیے مقدر ہو چکی تھیں۔ اسکول میں داخل ہونے کے چند ہی ماہ بعد اُسکو اپنے پدرِ بزرگوار کی اچانک وفات پر صفِ ماتم بچھانا پڑی۔ جسکا وجود اسکی محبت، مسرت اور دنیا کی ضروریات کا کفیل تھا،

اس اسکول کے علاوہ کیٹس کو کسی اور بلند پایہ درسگاہ میں شرکت کی عزت نہیں حاصل ہوئی، نہ وہ کسی کالج میں داخل ہوا اور نہ اسکو کوئی علمی یا اعزازی ڈگری نصیب ہوئی لیکن اُسکے دل و دماغ پر شاعری کا ایک ابدی پرتو تھا، اُسکا قلب ادبی ذوق سے معمور تھا، وہ فطرت کیجانب سے اُن اوصافِ پسندیدہ کا مالک بنایا گیا تھا جو انسان کو ایک مایۂ ناز

شاعر اور ایک عدیم المثال ادیب بنا سکتے ہین، ڈاکٹر ٹیگور نے کبھی کسی کالج مین تعلیم نہین پائی اور نہ کوئی ڈگری حاصل کی لیکن دنیا کو بخوبی معلوم ہے کہ اُنکی شاعرانہ سحر طرازیون کو زمانہ کا فنا کرنے والا زبردست ہاتھ بھی مٹا نہین سکتا۔ وہ خواہ کتنے ہی رنگ بدلے لیکن ٹیگور کے جواہر ریزون کا رنگ کبھی پھیکا نہ ہوگا، اسی طرح کیٹس کی شاعری بھی کسی کالج یا کسی ڈگری کی ممنون نہ تھی۔ وہ فطری شاعر تھا، تعلیمی حیثیت سے صرف پادری جان کلارک کیٹس کا اولین اور آخری معلم تھا جسکی خدمت مین اُسکی عمر کی ابتدائی پانچ سال صرف ہوئے، اپنے بچپن مین وہ خوش خلق، خوش تبسم، حسین، تیز مزاج مشہور تھا کبھی کبھی اُسپر رنج و محن کی تاریک گھٹائین بھی چھا جاتی تھین جو اسکے دل پر غم والم کی بارش کیا کرتی تھین، لیکن وہ ہنس مکھ تھا اور اس پردے مین اسکا دلی انتشار پوشیدہ رہا کرتا تھا۔

کیٹس کو خدا نے تین بھائی اور ایک بہن عنایت کی تھے ان مین باہم نہایت گہری اور مستحکم محبت و الفت تھی جو مرتے دم تک قایم رہی، اور جسکو کوئی دنیا وی خود غرضی نقصان نہ پہونچا سکی، کیٹس کے انتقال کے بعد اُسکے چھوٹے بھائی جارج نے کیٹس کے متعلق اپنی ایک تحریر مین اسطرح لکھا ہے،

"مین اُسکی نیکی اور شرافت کی وجہ سے اُسکا بہت گرویدہ تھا، گو بسا اوقات وہ زیادتی بھی کر گذرتا تھا، اسکول کے زمانہ مین ہم بارہا خوفناک اور خونخوار لڑائیان لڑے، اور میرے ساتھی شہادت دیسکتے ہین کہ ان فسادات کا بانی اکثر مین ہوا کرتا تھا، لیکن اُسکے خیالات بہت اور اُسکا دل صاف تھا"

یون[1] تو کیٹس کی کل زندگی مصائب اور تکالیف کا مجموعہ تھی، لیکن وہ مصیبت جسنے ایک عرصہ کے لیے ہوش و حواس سلب کر لیے اور اُسکو اسقدر رنجیدہ اور مغموم کر دیا کہ اُسکے اعزا

---

[1] ان سطور کو مرتب کرنے مین مندرجہ ذیل کتابون کی امداد حاصل کی گئی ۔

1. ENCYCLOPAEDIA BRITTANNICA.
2. THE ENGLISH POET BY WARD.
3. KEETS BYS COL VIN.
4. SHELLEY BY SYMONDS.

جو احباب اُسکی ماتم گساری اور آہ و زاری دیکھکر کفِ افسوس ملتے تھے، اُسکی مادرِ شفیقہ کی علالت تھی ماں کی تیمار داری مین کیٹس نے وہ حیرت انگیز سرگرمی اور مستعدی ظاہر کی کہ دیکھنے والے تعجب کرتے تھے۔ شب و روز بستر علالت کے متصل کرسی پر بیٹھا رہتا، اپنے ہاتھ سے ماں کو دوا پلاتا کھانا پکاکر کھلاتا دل بہلنے کے لیے قصے پڑھ پڑھ کر سناتا، لیکن جام حیات لبریز ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ بیماری مہلک صورت اختیار کرتی گئی انجام کار فروری سنہ ۱۸۱۰ء وہ نیک خاتون اس دنیا سے کوچ کر گئی

اِس حادثۂ جانکاہ کا تلخ ترین نتیجہ یہ ہوا کہ کیٹس کو مدرسہ چھوڑنا پڑا اور ایک ڈاکٹر کی دکان پر ایک معمولی سی ملازمت اختیار کرنی پڑی، فطرت کی یہ ستم ظریفی قابل داد ہے کہ ایک ایسے ہونہار نوجوان کو جو محض شاعری کے لیے خلق کیا گیا تھا اور جسکے دل مین ادب کی ایک مستقل اور نہ مٹنے والی چاٹ موجود تھی، ایک ایسی جگہ پھینکدیا جائے جہان ٹنکچر آیوڈین TINCTURE IODINE اور کاپر سلفیٹ (COPPER SULPHATE کے علاوہ کوئی مذکور ہی نہو، سلسلہ ملازمت مین بھی کیٹس کا علمی ذوق برابر قایم رہا، وہ اپنے فرصت کے اوقات اسکول مین بسر کرتا رہا۔ اور اپنے مشفق دیرینہ کاوڈن کلارک COWDEN CLARKE کی صحبت مین بیٹھکر اس معصوم مشن مین سرگرم کار رہا جو اُسکی حیات کا مقصد اولین تھا، اسکول کے باغ مین کسی پرسکون کنج مین دونون بیٹھ جاتے اور کتابون کے مطالعہ مین منہمک رہتے کیٹس کی یہ خوش نصیبی ہے کہ پندرہ برس کی عمر مین اسپنسر* سے اُسکا تعارف ہوگیا۔ اُسنے فیری کوئین (FAIRY QUEEN) کا مطالعہ شروع کیا جسنے اُسکی آنکھین کھولدین، اور اُسکے سامنے ایک ایسی وسیع فضا پیش کی جہان وہ دل کھولکر بلند پروازی کر سکتا تھا۔ اسپنسر کے متعلق بعض باخبر سخن سنج حضرات کی رائے ہے کہ اُسکا کلام نہ صرف نوجوانون ہی کو شاعر

---

*: E. SPENSER انگلستان کے دور اول کا ایک نہایت ممتاز شاعر جو سنہ ۱۵۵۲ء مین پیدا ہوا، جسنے بی اے کی ڈگری سنہ ۱۵۷۳ء مین اور ایم اے کی ڈگری سنہ ۱۵۷۶ء مین کیمبرج سے حاصل کی، اُسکی تصنیف "فیری کوئین" ایک نہایت مقبول کلاسک ہے جو اتبک نہایت قدر و منزلت کی نگاہون سے دیکھی جاتی ہے سنہ ۱۵۹۹ء مین اسپنسر کا انتقال ہوا۔

کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے بلکہ شاعرانہ حسیات کو ابھار کے غیر شاعر کو شاعر بنا سکتا ہے، چنانچہ کیٹس کے محبوب دوست چارلس براؤن کا قول نہایت مستند ہے کہ "فیری کوئین" ہی وہ کتاب تھی جسنے کیٹس کے خوابیدہ اور پنہان محسوسات مین تلاطم برپا کر دیا اور وہ خود شعر کہنے لگا یہانتک کہ آگے چلکر شاعری اُسکی حیات کا جزو لاینفک بنگئی۔

لندن کی زندگی یہان سے کیٹس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اور یہ وہ دور ہے جسنے گمنام کیٹس کو ایک عالم متبحر اور ایک نغز گو شاعر بنا دیا اور اُسکے سر پر شہرت دوام کا ایسا تاج رکھدیا جسکے جواہرات کی چمک صدیون تک چشم بصیرت کو خیرہ کرتی رہیگی۔ جان کیٹس نے اپنا وقت مطالعہ اور تیاری مین صرف کیا تھا۔ لیکن لندن مین قدم رکھتے ہی اسنے اپنے اندوختہ مواد سے کام لینا شروع کر دیا، اور یکے بعد دیگرے متعدد نظمین لکھ ڈالین یہ نہین بتایا جا سکتا کہ اُسکی اولین نظم کونسی ہے گو گمان غالب ہے کہ مسٹر لی ہنٹ LEIGH HUNT کے رہائی کے متعلق اُسنے جو کچھ قلمبند کیا وہی جان کیٹس کا سب سے پہلا ادبی کارنامہ تھا ۳ فروری ۱۸۱۵ء کو لی ہنٹ جب دو سال کی قید سے رہا ہوا تو کاوڈن کلارک نے اس ادیب اور آزاد منش سردار کا شاندار خیر مقدم کیا، وہی شناسائی جلد ایک مستقل دوستانہ صورت مین مبدل ہوگئی اسی زمانہ مین کلارک کیٹس سے ملا، اُسوقت اس نوجوان شاعر نے اپنی اولین فکر منظوم اپنے دوست کیخدمت مین پیش کی جسکی بابت کلارک خود کہتا ہے۔

"مینے خود محسوس کیا کہ شاید یہ اولین موقعہ تھا جب کیٹس نے اپنے خیالات اور جذبات کو نظم کے سپرد کیا) اور مجھے وہ ہوشمند نگاہین اور وہ شرمگین جھجک خوب یاد ہے جو اُسوقت کیٹس پر طاری تھی، محبوب دوستون کی نگاہون مین وہ جاذبیت اور محبت ہوتی ہے جسے صرف موت زائل کر سکتی ہے،

تھوڑے ہی عرصہ بعد کلارک نے بھی این فیلڈ کو خیرباد کہا اور لندن مین آکر آباد ہوا، دونون بچھڑے ہوئے دوست جب ایک جگہ ہوئے تو مطالعے کا سلسلہ شروع ہوا، سب سے پہلے ہومر* کو مطمح نگاہ بنایا جسکو جیپمین

---

* ہومر۔ HOMER یونانی شاعر ہوا گیا ہے ۔۔۔ قبل مسیح کے درمیان بقید حیات تھا اُسکی دو تصنیفین ایلیڈ ILLIAD اور اوڈیسی ODISSEY مشہور ہین ۱۲

CHAPMAN نے اُسی زمانہ میں انگریزی لباس پہنا کر اپنے قومی لٹریچر میں ایک گرانقدر اضافہ کیا تھا۔ کیٹس ہومر کی تصنیف دیکھکر دیوانہ ہو گیا، اور چیپ مین کے[۲] شان میں اُسنے یہ قصیدہ لکھا جو دراصل اُسکی ابتدائی فکر کا نمونہ ہے لیکن نہایت مقبول ہے

"میں زرین ممالک میں بہت سفر کر چکا ہوں،

اور مینے بہت سی عمدہ سلطنتیں اور شاداب ریاستیں دیکھی ہیں!

میں نے بہت سے مغربی جزیروں کے اردگرد بھی چکر لگایا ہے۔

جنپر شعراء اپالو[۱] کے ہم آہنگ ہو کر قابض ہیں۔

مین نے بارہا ایک وسیع مملکت کا ذکر سنا تھا

جسپر گہری ابروؤں والا ہومر حکمرانی کرتا ہے!

لیکن کبھی اُس پاکیزہ اور لطیف نسیم میں سانس لینا نصیب نہیں ہوا یہانتک کہ

چیپ مین[۲] نے بآواز بلند تقریر شروع کردی،

تب اُس نجومی کی سی حالت مجھپر طاری ہوگئی جو آسمان کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور جسکے دائرہ

نگاہ میں یکایک ایک نیا سیارہ آجاتا ہے!

یا بہادر کارٹیز[۳] کی طرح جو اپنی عقاب نما آنکھوں سے

بحر کاہل پر نظریں جمائے ہوئے تھا، اور اُسکے تمام ساتھی ایکدوسرے

پر وحشت اور سراسیمگی کی نگاہیں ڈال رہے تھے! اور ڈیرین[۴] میں ایک فلک نما چوٹی پر

خاموش و ساکت تھے!!!

کلارک نے یہ خوب کیا کہ لی ہنٹ کا تعارف کیٹس سے کرا دیا جسکی وجہ سے اِس ہونہار شاعر کو

---

[۱] اپالو۔ یونانی خدائے موسیقی و شاعری۔ (MEXICO)

[۲] چیپ مین۔ انگلستان کا مستند شاعر جسنے ہومر کی تصانیف کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔

[۳] کارٹیز۔ یہاں کیٹس ایک غلط فہمی میں مبتلا ہوا ہے کہ کارٹیز دراصل میکسیکو کا فاتح تھا، اور یہاں شاعر اُسکو بحر کاہل کا دریافت کرنیوالا تصور کر رہا ہے!

[۴] ڈیرین ایک جزیرے کا نام ہے!

بڑی مدد ملی، اور اُسکی حوصلہ افزائی ہوئی، ہنٹ ایک نہایت خوش خلق اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا، اور اپنے دوستوں پر پروانہ وار فدا ہوتا تھا؛ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے احباب کے وسیع دائرہ میں ایک بت کی طرح پوجا جاتا تھا، اور ہر طبقہ کے لوگ اُسکی بڑی عزت وعظمت کرتے تھے۔ چنانچہ اسکی معرفت کیٹس کو بلٹن، شیلی اور ہیڈن سے شناسائی کا موقع حاصل ہوا اور وہ ایک ایسے ادبی حلقہ میں داخل ہو سکا جہاں بڑے نامور شعرا موجود تھے، شیلی بھی اسی محفل میں ایک رکن تھا، اور دنیائے شاعری میں اُسکی شہرت اور حشمت آج تک قابلِ رشک ہے، کیٹس بذاتِ خود دوست نواز تھا لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ شیلی کی اخلاص ومحبت کے باوجود وہ اُسکا سچا اور دلی دوست نہ بن سکا۔ اور ہمیشہ بے تکلفی سے پرہیز کرتا رہا۔ کیٹس نہایت خوددار اور ذکی الحس تھا، وہ یہی سمجھتا رہا کہ میری کم مائیگی اور بے بضاعتی مجھکو شیلی کی نگاہوں میں ذلیل بنا دیگی، چنانچہ اس غلط فہمی سے کیٹس کا دل کبھی صاف نہو سکا۔

کیٹس کے خاص دوستوں نے اصرار کیا کہ نظموں کا ایک مجموعہ جلد شایع کرایا جائے تاکہ بیرونی دنیا بھی محسوس کر سکے کہ آفتابِ شاعری طلوع ہو چکا ہے، اور جلد ممالک قریب وبعید کو اپنی طلعت ریزیوں سے جگمگانے والا ہے، پس ایک مجموعہ پریس میں دیدیا گیا۔ جو کیٹس نے لی ہنٹ کے نام نامی پر معنون کیا، اور اپنے جذبات کو ان الفاظ میں ادا کیا،

"شان وشوکت اور حسن وجمال فنا ہو چکے ہیں

کیونکہ اگر ہم علی الصباح چہل قدمی کے واسطے نکل کھڑے ہوں

تو ہمکو کوئی خوشبو دار گجرا نظر نہ پڑیگا

جو مشرق میں تبسم سحر کا استقبال کرے!

نرم آواز والی نوجوان اور خوش مزاج پریوں کا کوئی جمگھٹ نہیں جو گندھی ہوئی ٹوکریوں

میں جنگل کی بالیاں

گلاب و یاسمن کے پھول لائیں۔

اور دو اُس شی میں نباتات کی دیوی کے مندر میں چڑھائیں۔

لیکن اتنی ہی بلند پایہ خوشیاں ابتک موجود ہیں

میں اپنی قسمت پر رشک کرتا ہوں

کہ ایسے وقت میں جب خوشگوار اشجار کے سایہ میں
پین[1] کا کوئی متلاشی نہیں۔ میں ایک آزادانہ اور سرسبز عشرت و مسرت کی حالت محسوس کر رہا
ہوں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ میں اِس قدر حقیر ہے مجھ جیسے شخص کو خوش کر سکتا ہوں!

لندن کی فضا میں کیٹس کے خیالات مائل بلندپروازی ہوئے، اور یہ اُسکی خوش نصیبی تھی کہ اُسکو ایسے نامور شعرا اور ادبا کی صحبت حاصل ہوئی جنہوں نے اُسکے ذہن رسا اور فکر عمیق میں چار چاند لگا دیئے اِس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ کیٹس کو شیلی اور ہنٹ کی صحبت میں، وہی جد و جہد کا بہترین موقع ملا اور اُسکو وہ بات حاصل ہوئی جس سے مدتوں کے مطالعہ کے بعد بھی وہ محروم رہتا ہنٹ کے مکان کو فخر تھا کہ وہاں قرآن سعدین تھا یعنی انگلستان کے دو ایسے بہترین شاعر ادبی نشو و نما حاصل کرتے ایک دن افق یورپ پر نیر تاباں کیطرح چمکتے لیکن دونوں جوانی کے عالم میں پیوند خاک بھی ہو گئے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

<u>تعلقات اور خطوط</u> کیٹس ایک رقیق القلب شخص تھا جسکے دل میں رحم ہمدردی اور محبت و الفت کا دریا موجزن تھا، وہ اپنے بھائیوں اور بہن کا سچا پرستار تھا، اور اُنکی تکلیف دیکھکر تڑپ جاتا تھا، سب سے زیادہ وہ اپنے چھوٹے بھائی جارج کا گرویدہ تھا۔ کیونکہ دونوں نے ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی، اور ایک ہی آب و ہوا میں ابتدائی زندگی بسر کی تھی۔ زندگی کے پُر لطف دور میں داخل ہونے کے چند سال بعد جب جارج نے شادی کی اور امریکہ میں آباد ہونے کی ٹھان لی، تیاری شروع کر دی تو کیٹس اپنے بھائی سے ملنے آیا، یہ خیال اُسکو مارے ڈالتا تھا کہ اُسکے مختصر سے خاندان میں بھی تفریق ہونے والی ہے، اور اُسکا عزیز بھائی جیتے جی اُس سے جدا ہونے والا ہے ان جذبات نے اُسکے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ اسی زمانہ میں اُسنے اپنے ایک دوست کو خط لکھا جسکا آخری فقرہ یہ تھا " زندگی تو گذار نا ہے لیکن یہ خیال نہایت اطمینان بخش ثابت ہوا کہ میں مرنے سے قبل چند نظمیں لکھ لونگا "

کیٹس نے اپنے بھائی بہن کے نام جسقدر خطوط لکھے۔ سب میں ایک قسم کا بے خبر مستانہ پن برادرانہ شفقت اور ہنسی خوشی کی لہر موجود ہے، اور لفظ لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکا دل کسقدر خلوص

[1] پین۔ PAN یونان کے عہد قدیم کے ایک دیہاتی دیوی جسکو باغات اور مویشی کی ملکہ کہتے ہیں اُ جسکی ہیئت کذائی نصف انسانی اور نصف حیوانی مانی گئی ہے۔

اور محبت سے لبریز تھا، اور اُسکی تقریر کسقدر تصنع سے دُور ہوتی تھی، ایک خط مین لکھتا ہے:-

"مین تمکو مسلام ہے کہ چار ماہ سے ہمکو جارج اور اُسکی جھیتی بیوی کا کچھ حال معلوم نہین ہوا، خدا جانے وہ اُس دور دراز ملک مین کیا کر رہا ہے! اور کیون خاموش ہے!

مین بھی، اور تمکو خیال آتا ہے کہ جارج گو زندہ ہے، لیکن ہماری نظرون سے عمر بھر کے لیے وحشی ہو گیا۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہین جب مین اُسکے ساتھ مدرسہ مین پڑھتا تھا اور اُسکے کمل و بیماری سے ناز اُٹھایا کرتا تھا"

کاؤڈن اُسکا قدیم ترین دوست تھا لیکن تمام عمر کوئی ایسی وجہ پیدا نہوئی کہ انکے باہمی تعلقات مین کچھ بھی فرق آتا۔ کیٹس کی موت کے بعد بھی کلارک نے عمر بھر اُسی کا کلمہ پڑھا۔

یکہ بیک اُس دائرۂ احباب مین ایک سنگین شکر رنجی ظہور پذیر ہوئی جسکے متعلق کیٹس نے بیلی کو یہ خط لکھا

"چند روز کا ذکر ہے کہ نہایت پریشان کن واقعات پیش آئے، تمنے تو سن لیا ہوگا۔ رینالڈز اور ہیڈن دونون برسر پیکار ہین اور ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ ہیڈن اور ہنٹ کے درمیان مین بھی یہی غیر خوشگوار حادثہ پیش آیا۔ یہ بُری بات ہے، انسانون کو ایک دوسرے کی کمزوریون کا خیال رکھنا چاہیے، دنیا مین کوئی ایسا شخص نہین جسکی کمزوری اور خامی پر ہم حملہ نکر سکین، بہتر سے بہتر انسان مین نیکی کا صرف ایک مختصر سا جز ہوتا ہے۔ ایکقسم کا روحانی خمیر جو حیاتِ انسان مین اُبال پیدا کر دیتا ہے جس سے انسان حرکت کر سکتا ہے نبرد آزما ہو سکتا ہے اور مصائب کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بیلی بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان کی کمزوریان معلوم کی جائین اور بعدہٗ مدافعت کیجائے۔ اسکے بعد بھی وہ اگر تمکو اپنی جانب کھینچے تو رشتۂ محبت کو توڑنا آسان نہین لیکن رینالڈز اور ہیڈن سے ملاقات کرنے سے قبل سے اُنکی خامیان سمجھ لین تھین دونون سے واقف ہونے کی وجہ سے مین دونون مین ملاپ پیدا کر رہا تھا، شاید مین پھر دونون مین محبت پیدا کر سکون اور اس طوفان کے دُور ہونے کے بعد وہ دونون ایک دوسرے کی خوبیان ہی یاد رکھین گے"

داستانِ عشق حُسن و شاعری اِن دو الفاظ مین کیٹس کی تمام دنیا مضمر تھی، اُسنے اِن دونون کی

عمر بھر پرستش کی، اور اُن پر جان تک نثار کر دی، لیکن کیٹس کی بدنصیبی تھی کہ نہ شاعری اُسکو راس آئی اور نہ حسن وعشق مین وہ شاد کام و بامراد رہا۔ پبلک نے اسکی کسی کتاب کا خیر مقدم نہ کیا اسیلیے وہ ہمیشہ مفلس اور تنگدست رہا " رہا کوچۂ عشق" سو اس بازار مین اُسکے دل پر داغ کا کوئی عاشق نواز گاہک نہ پیدا ہوا اُسکا ورد بھرا دل ایسا مٹا کہ خاک تک باقی نہ رہی اُسکو ایسا روحانی صدمہ پہونچا جسنے اُسکو موت کے گھاٹ اوتار دیا۔

اُسنے خود ایک مرتبہ درد آفرین آواز سے کہا تھا۔

"نظم، شہرت، اور حسن ضرور نہایت سخت ہین۔
سبکی موت سخت تر ہے ——— موت زندگی کا ایک بیش بہا انعام ہے!

کیٹس کی داستان محبت نہایت دلچسپ ہے۔ اسلیے ہم اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔ اسکاٹ لینڈ سے واپس ہونے کے بعد جب کیٹس اپنے بھائی[۱] کی تیمارداری مین مصروف تھا۔ تو اُسکے آئینۂ دل مین ایک حسین تصویر نظر آتی تھی جو اسکی تمناؤن کا مرکز بنی ہوئی تھی وہ فینی براؤن[۲] کے دام محبت مین اسیر ہو چکا تھا، فینی براؤن ایک مجسمۂ حسن تھی اور کیٹس پرستار حسن، فینی براؤن سراپا شرارت تھی، اور کیٹس ایک حسن پرست شاعر۔

غرض کیوپڈ کا تیر، کیٹس کے دل وجگر سے پار ہو چکا تھا، اور وہ پروانہ وار سوز محبت سے بیقرار تھا، اُسنے خود ایک نظم مین اپنی دلی کیفیات کی تصویر کھینچی ہے، لکھتا ہے،

"مین موت کو برداشت کر سکتا ہون، یا خدا! لیکن مین اُس سے کنارہ کشی اختیار نہین کر سکتا، ہر وہ شے جو میرے بکس مین موجود ہے، اور جو اسکی یاد تازہ کرتی ہے ایک خونخوار بھیڑیے کا کام کر رہی ہے وہ ریشمی استر جو اُسنے میری سفری ٹوپی مین چھپا ان کیا تھا میرے سر کو جلائے ڈالتا ہے میرا تخیل اُسکے متعلق نہایت خوفناک طریقہ سے صحیح اور روشن ہے، مین اُسکو دیکھ رہا ہون، اُسکی آواز سُن رہا ہون، براؤن[۳] میرے سینہ مین شعلے دہک رہے ہین، اور مجھے حیرت ہے کہ انسانی سینہ

۱ھ TOM KEATS

۲ھ PANNY BRAWNE.

۳ھ BROWN

اسقدر تکلیف برداشت کرنیکا اہل ہے"

لیکن اس عشق کے باوجود کیٹس کے دوستون کا خیال تھا کہ یہ دوشیزہ کیٹس کے لیے ایک مخلص شریک زندگی ثابت نہین ہو سکتی۔ اور یہ اچھا ہوا کہ اس ابتدائی محبت نے شادی وخانہ آبادی کی صورت اختیار نہین کی۔ ان اس دلی تعلق سے اتنا تو ضرور ہوا کہ کیٹس کے جذبات نظم کی صورت مین رونما ہونے لگے لیکن اس درمیان مین اُسنے اپنے بھائی اور دوستون کو جو خطوط لکھے وہ اس چاشنی محبت سے بالکل مبرا ہین اور اگر کہین فینی کا ذکر بھی ہے تو نہایت سرسری اور مختصر۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ اُسکے احباب عموماً اس رشتہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ اس دوشیزہ کو کیٹس کے لیے ناموزون خیال کرتے تھے۔ دنیا مین کوئی ایسا ہمدرد نہ تھا جس کو کیٹس اپنی داستان درد سناتا اور دل کا بخار نکال لیتا۔ اس حالت مین کیٹس کے لیے سوائے اسکے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے جذبات آتشین کو دبائے رکھے اور دل ہی دل مین پیچ وتاب کھاتا رہے۔ اس رازداری کا یہ اثر ہوا کہ کیٹس کے بہت سے دوست اس معمہ سے بالکل بے خبر تھے، حتی کہ سیورن SEVERN جو کیٹس کا ایک نہایت مخلص اور محبوب رفیق تھا مرتے دم تک اس واقعہ سے ناآشنا رہا۔

ناکامی اور موت اس جانگداز ناکامی اور روح فرسا مایوسی کے بعد کیٹس کی حیات کا آخری دور شروع ہوتا ہے جو بدقسمتی سے تاریک ترین ہے اور جسنے اُسکو ہمیشہ خاک ہی کرکے چھوڑا۔ محبت کے طوفانی جذبات پژمردہ ہو چکے تھے اور اُسکے بھائی جارج کی جدائی نے اُسکا آبگینۂ دل بالکل چور چور کر دیا تھا جو اپنی بیوی کے ساتھ امریکہ مین آباد ہو چکا تھا، یہ وہ عزیز بھائی تھا جسپر کیٹس کو اعتماد کامل تھا اور جسکی ہمدردی اور مدد نے اُسکو بارہا روحانی طمانیت بخشی تھی۔ علاوہ ازین اسکاٹ لینڈ کے طول وطویل سفر نے اُسکی ناتوان صحت کو سخت نقصان پہونچایا، اور تپ دق کی وہ مہلک بیماری جو پوشیدہ طور سے اُسکے نظام عصبی مین پیوست ہو چکی تھی نمایان طور سے ظاہر ہونے لگی اور اُسے خود یقین ہوگیا کہ میری موت کے دن دور نہین۔

براؤن کا بیان ہے کہ " ایک شب گیارہ بجے کے وقت وہ مکان مین داخل ہوا، اُسوقت اُسپر ایک خوفناک نشہ کی سی حالت طاری تھی، ایسی حالت جو اُسپر کبھی طاری نہ ہو سکتی تھی، اسلیے اور زیادہ پُرخطر تھی۔ مین نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ کیا تمکو بخار آگیا؟

"ہان ہان! مین آج باہر نکلگیا تھا مجھے سخت زکام ہوگیا لیکن اب اچھا ہون" ہان قدرے بخار ہے۔ پھر مین نے کہا سو رہو، وہ سونے کے کمرے مین چلا گیا، مین بھی اُسکے سونے کے کمرے مین داخل ہوا، تکیہ پر سر رکھنے سے قبل ہی وہ کھانسنے لگا، اور تعجب سے کہنے لگا "یہ خون ہے جو میرے منہ سے نکلا۔ مین اُسکے قریب گیا، وہ چادر پر ایک خون کے قطرے کو دیکھ رہا تھا پھر مجھسے مخاطب ہوکر بولا، برادران اقدا شمع لاؤ مین اس خون کو دیکھون، پھر ایک چھکوت انداز سے مجھے دیکھنے لگا، کیٹس کی اس نگاہ کو مین نہین بھول سکتا۔ مجھے اسکے یہ فقرے بھی یاد رہین گے . . . . ، مین اس خونی رنگ کو خوب پہچانتا ہون، یہ صاف خون ہے، مجھے دھوکا نہین ہوسکتا، یہ خونی قطرہ میری موت کا پیش خیمہ ہے، میری موت آچکی ہے . . . . "

کیٹس کا نخل حیات دو شرر بار شعلون کا تختۂ مشق بنا ہوا تھا، "شعلۂ عشق" جسنے اُسکی قلب و جگر کو اول مجروح کیا اور بعدہٗ جلا کر خاک سیاہ کر ڈالا "آتش مرض" جو رفتہ رفتہ اُسکے جسد خاکی مین لگ رہی تھی، اور کوئی دنیاوی طاقت اسکو ان سے بچا نہین سکتی تھی، خوش مزاجی جو کیٹس کی ایک امتیازی خصوصیت تھی فنا ہو چکی تھی، اور اُسکے دل و دماغ پر ایک ابدی پژمردگی اور افسردگی چھا رہی تھی! براؤن نے ہر ممکن طریقہ سے اپنے دوست کی مدد کی، اُسکو تسلی اور تشفی دی۔ اُسکو صحت کی اُمید دلائی لیکن کیٹس کے قلبی زخم ان دواؤن سے مندمل نہو سکے، گو ظاہرا وہ خوش خوش نظر آتا تھا لیکن اُسکا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا، اُسکے پہلو مین ایک زہر آلود تیر پیوست ہو چکا تھا، وہ ساکت تھا اور خاموش لیکن اُسکے فضائے تخیل مین صرف فینی کے حسین خط و خال کی حکومت تھی جسکی مفارقت اُسکے قلب مجروح کو پاش پاش کیے ڈالتی تھی،

اُسکی علالت نے اطبا کو اول اول دھوکے مین رکھا جنکی رائے یہ تھی کہ اُسکے پھیپھڑے سے خراب نہین ہین اور صرف آرام اور دماغی سکون اُسکو صحت یاب کر سکتا ہے،

نازنین فینی اُسے روزانہ دیکھنے آتی تھی، اور بظاہر یہی ایک سہارا تھا جسپر اُسکی زندگی کا دار و مدار تھا، کچھ عرصہ بعد جب مرض نے اُسپر قبضہ کرلیا، اور اُسکی موت قریب نظر آنے لگی تو تقدیر نے یاوری کی اور دونون عاشق و معشوق ایک ہی مکان مین رہنے لگے، اس قربت سے

کیٹس کو وہ روحانی شادمانی حاصل ہوئی جسکی اُسکو مطلق توقع نہ تھی - وہ ہنٹ کے مکان مین اقامت گزین تھا، تو ایکدن ملازم کی غلطی سے فینی کا ایک محبت نامہ کیٹس کو دو دن بعد کھلا ہوا ملا - اِس ناقابل عفو گستاخی پر وہ نہایت برافروختہ ہوا، اور چاہتا تھا کہ اس مکان کو چھوڑ دے - فینی کو معلوم ہوا تو کیٹس کو اپنے گھر لے آئی اور اُسکی تیمارداری مین ہمہ تن مصروف ہوگئی - چنانچہ اس طریقہ سے اِس حرمان نصیب کیٹس کو فینی کی کاکل مشکین سے مشام نوازی کا موقعہ حاصل ہوا اور اُس عنبر فشان چاردیواری مین سانس لینا نصیب ہوا جسکو پیاری فینی کے خرام ناز نے رشک ارم بنا رکھا تھا :

موسم بہار کی طرح یہ عیش و عشرت کا زمانہ بھی جلد ختم ہوگیا، اور ڈاکٹرون کے مشورے کے مطابق کیٹس کو اٹلی کے سفر کے واسطے طیار ہونا پڑا، اسکو یقین تھا کہ براؤن اُسکا شریک سفر ہوگا لیکن اتفاقاً کیٹس کے خطوط براؤن کے پاس اُس وقت پہونچے جب وہ سیورن کے ہمراہ روانہ ہوچکا تھا، ابتدا اس نوجوان شاعر کی صحت پر سمندر کی ہوا نے بہت خوشگوار اثر کیا، اُسکے چہرے پر سرخی آگئی، اُسکی بھوک بڑھنے لگی اور اُسکی افسردگی خوش طبعی سے مبدل ہوچلی - جنیوا مین ایک ہفتہ تک وہ نہایت تندرست اور بشاش رہا - اور سیورن کو یقین ہوچلا کہ اُسکا دوست جلد صحت کامل حاصل کرکے وطن کو واپس ہوگا لیکن موت گھات مین تھی اور موقع ڈھونڈھتی تھی کہ اسکو اسی زمین مین خاک کا پیوند بنا دون :

ایک ہفتہ بعد یہ مختصر سا قافلہ روم پہونچا اور ڈاکٹر کلارک کے گھر مین مقیم ہوا، ابتک کیٹس کی حالت بہت امید افزا تھی، اور وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ اُسکے وجود مین ایک نمایان اور دلخوش کن تبدیلی پیدا ہو رہی ہے - لیکن اچانک بادِ صرصر کے ایک تیز جھونکے نے اسکی جھلملاتی ہوئی شمع امید کو گل کر دیا، اور بستر علالت پر ایسا گرا کہ پھر اُٹھنے کی نوبت نہ آئی، مرض سل کے تمام خوفناک اثرات سے موجود تھا اور کرب و بےچینی کی شدت سے اُسکی روح تحلیل ہو رہی تھی سیورن نے اپنے غریب الوطن دوست کی خدمت اور تیمارداری مین کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا -

"سیورن! .... مین ...... مجھے اُٹھاؤ .... مین مر رہا ہون

...... مین جلد اور آسانی سے مر جاؤن گا .... خوفزدہ مت ہو ......

دل مضبوط کرو .... اور خدا کا شکر ادا کرو کہ وقت آ گیا "

یہ تھے اُس آخری نغمے کے اجزا جو اس مرغ خوش الحان کی زبان سے نکلے اور جس کے بعد اسکی زبان ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

دنیاے ادب کے لیے کیٹس کی موت ایک ناگوار سانحہ تھی، شیلی کے جذبات پر اس دردناک واقعہ کا ایک خاص اثر پڑا۔ اُسنے اپنے دوست کی وفات پر ایک نہایت پُر درد مرثیہ* لکھا جو انگریزی لٹریچر میں آج تک عدیم المثال شمار کیا جاتا ہے اور جسکو پڑھکر لوگ مسحور و بیخود ہو جاتے ہیں۔ وہ سرد آہ بھرکر کہتا ہے۔

(۱)

" ایڈونیس کا ماتم کرو! وہ مر چکا

رنجیدہ ماں! بیدار ہو! اُٹھو اور گریہ و زاری کرو!

لیکن کیوں؟ آتشین آنسوؤں کو اُنکے جلتے ہوے بستروں میں جذب کرو،

اور اپنے نالہ و شیون کرنیوالے دل کو اُسکی طرح

ایک خاموش اور شکایت کرنے والی نیند میں مبتلا کر دو۔

کیونکہ وہ وہاں جا چکا جہاں سے عقل و حسن کی ریزش ہوتی ہے!

اسکا خواب و خیال بھی دل مین نہ لاؤ کہ محبت آفرین سمندر، اُسکو پھر تر و تازہ ہوا کے سپرد کر دے گا۔

موت اُسکی ملکوتی آواز سے غذا حاصل کرتی ہے، اور ہمارے یاس پر خندہ زن ہوتی ہے،

(۲)

تیرا سب سے چھوٹا اور عزیز بچہ فنا ہو چکا،

جو تیری بیوگی کا آرام تھا!

جو ایک شگفتہ پھول کی طرح بڑھتا، جسکو کسی غمگین دوشیزہ نے پرورش کیا،

اور جسکی غذا بجاے شبنم کے محبت کے آنسو تھے؛

---

* اس مرثیہ کا عنوان (ADONAIS) ہے۔

اے موسیقی سے واقف ماتم دار! اپنے نالہ و زاری شروع کر،

تیرا پنچھی اُمیدوں نہایت حسین تھا اور آخری بھی

وہ پنکھڑیاں جنکی پتیاں شگفتہ ہونے سے قبل پریشان ہوگئیں

اور پھل کے اسید میں ہلاک ہوا — اتباہ ہوگیا ——

پژمردہ گل سیوفرش پڑا ہے —— طوفان ختم ہو چکا —— !!!

ذاتی خصوصیات — لندن میں آنے سے قبل کیٹس ایک غیر معروف باغ کا پھول تھا جسکی عطر باغی سے پبلک کو مستفید ہونیکا کبھی موقعہ حاصل نہین ہوا، یہ محض خوش قسمتی تھی کہ وہ ایسا نونہال جسکو کامل غور و پرداخت بھی نصیب نہوئی اپنے آپکو ایسے حلقہ مین پایا جہان اُس دور کے نامور علما و فضلا موجود تھے، اور جہان شب و روز ادب کے خدمت ہوتی تھی۔ بعض خوش عقیدہ احباب یہی کہتے تھے کہ اُس کے خط و خال مین وہ چمک، دمک موجود تھی جو ہر فرد بشر کو اپنی جانب متوجہ کرلیتی تھی، کیٹس کا ایک دوست ہیڈن اسکے متعلق کہتا ہے کہ کسی کیفیت مین ہونیکر کیٹس مین ایک غیر معمولی شان و شوکت پیدا ہو جاتی ہے، شہد کی مکھیون کی آواز دل خوبصورت پھولون کے نظارون اور آفتاب کی خوبصورت کرنون سے اسکے افسردہ جذبات مین ایک تازگی آجاتی ہے، آنکھون کی طرح رخسار بھی سرخ ہو جاتے ہین۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی حسین اور معصوم دیوی اسکو عالم بالا مین لیے جا رہی ہے۔

کیٹس عورتون کی صحبت مین کبھی خوش نہ ہوتا تھا حالانکہ شاعری کو عورت سے خاص مناسبت ہے لیکن اسکو صنف لطیف سے نفرت بھی نہ تھی، وہ اپنی مان کا ایک سچا خادم اور مستعد پرستار تھا، اُسنے اپنی اکلوتی بہن کو ہمیشہ محبت اور احترام کی نگاہون سے دیکھا۔ اُسنے اپنے بھائی کی بیوی کی ہمیشہ قدر و منزلت کی، وہ خود ایک نازنین کا فراد کے تیر نگاہ سے گھائل ہو چکا تھا اور تمام عمر آتش عشق مین مبتلا رہا، لی ہنٹ، براؤن، ہیڈن، کلارک یہ چار دن کیٹس کے خاص دوست تھے اور اس محدود دائرہ احباب کی روح رواں کیٹس تھا جسنے اپنی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے ہر فرد کو اپنا شیدا بنا لیا تھا، کیٹس ایک غیر معمولی ذکاوت اور جز لیکر دنیا مین آیا تھا اور اُسکے حکیمانہ نکات اور عالمانہ لطائف اگر شائع کیے جائین تو یقین ہے کہ ادبیات مین قابل قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔

تماشائی

بھاشا اور اُسکے نورتن

—— (۲) ——

سُورداس

جس طرح تلسی داس کی شاعری نے ہر ایک ہندو کو رام بھگتی کی طرف مائل کر دیا ہے اُسی طرح سورداس کی دلکش شاعری نے عوام کو سری کرشن جی کا گرویدہ بنا رکھا ہے، سورداس، سری کرشن جی کے مخلص پرستار، اور اطاعت کیش، بندۂ محبت تھے، انکا کلام عاشقانہ جذبات کا مرقع اور واردات قلبی کا آئینہ ہے، مشہور ہے کہ شہنشاہ اکبر کو انکی بھجنیں بہت پسند تھیں اور وہ اکثر لوگوں سے انھیں کے کلام کی فرمایش کیا کرتا تھا، سورداس ۱۵۴۰ء میں دلی کے قریب سیہی[1] میں ایک غریب برہمن رام داس کے گھر میں پیدا ہوئے، ابتدائی میں انکا نام سورج چند تھا لیکن قسمت میں لکھا تھا کہ سور، سور ہوکر کور باطنوں کے لیے شمع ہدایت ثابت ہو، چنانچہ یہی ہوا،

یہ سن شعور تک پہنچتے پہنچتے نابینا ہو گئے[1]، یہ سری بلبھ سوامی کے معتقد اور مذہب بلبھ آچاریہ کے پیرو تھے۔ سری کرشن جی کی بھگتی کو حاصل زندگی سمجھتے تھے، اور ساری عمر اسی سوز و گداز میں بسر کی، آخر کار ۱۶۲۰ء میں بنارس دنیا کے تعلقات سے منہ موڑ کر اس عالم میں چلے گئے جہاں زندگی موت کی کشمکش سے بے نیاز ہے،

سورداس کی بہترین یادگار سور ساگر ہے، جس میں کہیں اپنے بُرے اعمال پر اظہار افسوس ہے کہیں حمد کے ترانے ہیں، اور کہیں عاشقانہ رنگ میں تصوف کے دریا موجزن ہیں، یقیناً بھاشا شاعری میں انکا وہی مرتبہ ہے جو میر تقی کو اردو شاعری میں نصیب ہے۔ غالب نے میر کے متعلق لکھا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ　　　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

---

[1] بہت سی کتابوں میں آپکی جائے پیدائش [illegible] لکھی ہے [illegible] نابینا ہو گئے [illegible]
[illegible]

سورداس کے متعلق بھی کسی شاعر کا قول ہے ۔

تت تت سورا کہی تلسی کہی انوٹھ
بچی کھچی کبیرا کہی اور کہی سب جھوٹھ

तत्व तत्व सूरा कही तुलसी कही अनूठ ।।।
बची खुची कबीरा कही और कही सब झूठ ।

یعنی شاعری کا جوہر سور نے حاصل کیا تلسی داس کے حصہ میں ندرت طبیعت طرازی آئی جو کچھ ان دونوں سے بچ رہا تھا کبیر داس نے پایا۔ اور دونکی شاعری شاعری نہین بلکہ جھوٹی بکواس ہے ،

سور سور تلسی سسی اڈگن کیشو داس
ابکے کوی کھدوت سم جہن تہن کرین پرکاش

सूर सूर तुलसी शशी उडुगन केशवदास ।।
अबके कवि खद्योत सम जहँ तहँ करहिं प्रकाश ।।

یعنی سورداس شاعری کے آفتاب اور تلسی داس ماہتاب اور کیشو داس ستارے ہین اکے زمانہ مین شاعر جگنو کی طرح ہین جو کبھی کبھی چمک اٹھتے ہین ۔

سورداس کا شمار اشٹ چھاپ کے کویون مین بھی ہے لیکن یہ قیاس صحیح ہوگا کہ اشٹ چھاپ مین شامل ہونے سے انکی وقعت بڑھگئی بلا حقیقت یہ ہے کہ انکی شرکت سے اشٹ چھاپ مین چار چاند لگ گئے ، برج بھاشا کی پہلی شان آپ چند بردائی کے نمونہ کلام مین ملاحظہ فرما چکے ہین اب تقریباً .. ۴ سال کے بعد جس رنگ مین جلوہ گر ہے ملاحظہ فرمایئے کتنی دلفریب صورت اختیار کر چکی ہے ،

بندون شری ہری پد سکھ دائی
جاکی کرپا پنگ گر لنگھے اندھرے کو سب کچھ درسائی
بہرو سنے گونگ پونی بولے رنک چلے سر چھتر دھرائی
سورداس پربھو کی شرناگت بار بار نموتے پائی

वन्दौं श्रीहरिपद सुखदाई ॥
जाकी कृपा पंगु गिरि लंघै अंधे को सब कछु दरसाई ॥
बहिरो सुनै गूंग पुनि बोलै रंक चलै सिर छत्र धराई ॥
सूरदास प्रभु करुणासागर बार बार नमो पाई ॥

ہندوون کا عقیدہ ہے کہ خدا کے دو روپ ہین ۔ ایک نراکار (غیر مجسم) دوسرے ساکار (مجسم) اسیطرح سے سری کرشن یا رامچندر جی کو خدا کا اوتار یا ساکار روپ مین ایشور مانتے ہین ۔ ساکار صورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سورداس سری کرشن جی کے تصور مین فرماتے ہین ،

ذیل مین اس خدا کے آرام دینے والے قدمونکی عبادت کرتا ہون جکی مہربانی سے لنج باوجود لنجہونے کے پہاڑ کو

ﻪ اصل ... [illegible] ... کامیاب مستند اور نامی شاعرون کا ... [illegible]
... [illegible] ... سر جھکانا ۔

پھاند جاتے اور اندیشے کو تمام چیزین نظر آنے لگین، بہرا آدمی سننے لگے اور گونگا بولنے لگے غریب اپنے سر پر چتر شاہی لگا کر چلے اُسکے پناہ مین آنکی بس یہی تدبیر ہے کہ بار بار عبادت مین اسکے آگے سر جھکایا جائے ترغیب عبادت کا اس سے بہتر اسلوب کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کی ان طاقتون کا اظہار کیا جائے جسکی وجہ سے ناممکن بات ممکن ہو سکتی ہے کیونکہ انسان فطرتاً اوسی کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتا ہے، جسکی ذات سے اسکی امیدین وابستہ ہوتی ہین،

تقدیر کے متعلق اپنے عقیدہ کو یون ظاہر فرماتے ہین اور پھر کیسی کیسی زبردست مثالون سے اسے ثابت کرتے ہین،

करमगति टारिहु नाहिं टरे॥ — کرم گت ٹار یونا ہین ٹرے

कहँ वे राहु कहाँ वे रवि ससि आनि संजोग परे॥ — کہان وے راہو کہان وے رب ششی آن سنجوگ پرے

गुरु वशिष्ठ पण्डित अति ज्ञानी रचि पचि लगन धरे॥ — گرو بشسٹ پنڈت اتی گیانی رچ پچ لگن دھرے

पिता मरन अरु हरन सिया को बन में बिपत परे॥ — پتا مرن اور ہرن سیا کو بن مین بپت پرے

भारत में भरुहूल को अण्डा घंटा टूटि परे॥ — بھارت مین بھروول کو انڈا گھنٹا ٹوٹ پرے

हरिचन्द से दानी राजा नीच को पानी भरे॥ — ہرشچندر سے دانی راجا نیچ کو پانی بھرے

तीन लोक भावी के बस में सुर नर देह धरे॥ — تین لوک بھاوی کے بس مین سُر نر دیہہ دھرے

सूरदास होनी सो होइहै काहे को सोच करे॥ — سورداس ہونی سو ہوئیہے کاہے کو سوچ کرے،

یعنی جو کچھ تقدیر مین لکھا ہوتا ہے وہ ٹالنے سے نہین ٹل سکتا دیکھو کہان راہو اور کہان چاند سورج دونون مین بڑا فرق ہے مگر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ راہو کے سبب سے چندر گرہن اور سورج گرہن پیدا ہو جاتا ہے بسشٹ جی جو رام چندر جی کے اُستاد تھے اُن سے بڑھکر اور کون پنڈت ہو سکتا ہے اُنھون نے بہت سوچ بچار کر راج تلک کا وقت مقرر فرمایا مگر اسکا اثر دیکھو کہ باپ مرا، سیتا جی کو راون لے گیا اور بن مین سیکڑون قسم کی آفتین آئین، مہابھارت مین بھروول (چڑیا) ایسی کمزور ہستی کے انڈے کو بچانے کے لیے ہاتھی کا گھنٹا (تیری قدرت ہے)، اسپر ٹوٹ پڑا اور ایسے معرکہ عظیم مین اُس ضعیف اور کمزور چیز کو گزند نہ ہونچا

له ایک تارے کا نام ہے جسکی ! ب ہندؤن کا خیال ہے کہ جب یہ سورج یا چاند کو گرفت کرتا ہے تو چندر گرہن یا سورج گرہن لگتا ہے [illegible]

له چاند کی آنا زیادہ [illegible] سوچ بچار کر کے [illegible] ایک چھوٹی چڑیے کا نام [illegible]

ہر شخص پر ایسا ہی یعنی بیشما قسمت کی تحریک کے بموجب ڈوم کے گھر بکا اور اسکا پانی بھرنا پڑا، تینوں لوگوں میں تقدیر کی حکومت ہے آدمی تو آدمی دیوتا بھی قسمت سے مجبور ہیں، سورداس کیوں جان کھپاتے ہو ہونیوالی بات ہوکر رہیگی،

سورداس کا ناصحانہ کلام بھی اسقدر دلکش اور مدلل ہوتا ہے، کہ نصیحت کی تلخی پر طرز ادا کی شیرینی غالب آجاتی ہے، ایک جگہ بُری صحبت سے اجتناب، اور بُرے لوگوں کی تلقین اور تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں،

तजो मन हरि बिमुखन को संग ॥ — چھوڑ من ہری بیکھی کو سنگ

जिनके संग कुबुधि उपजत है परत भजन में भंग ॥ — جنکے سنگ کو بدھ اوپجت ہے پرت بھجن میں بھنگ

कहा होत पय पान कराये बिष नहिं तजत भुजंग ॥ — کہا ہوت پئے پان کرائے بِش نہیں تجت بھجنگ

कागहि कहा कपूर चुगाये स्वान न्हवाये गंग ॥ — کاگ ہی کہا کپور چگائے سوان نہائے گنگ

खर को कहा अरगजा लेपन मरकट भूषन अंग ॥ — کھر کو کہا ارگجا لیپن مرکٹ بھوشن انگ

गज को कहा न्हवाये सरिता बहुरि धरै वह ढंग — گج کو کہا نہائے سرتا بہور دھرے وہ ڈھنگ

पाहन पतित बान नहिं बेधत रीतो करत निषंग ॥ — پاہن پتت بان نہیں بیدھت ریتو کرت نکھنگ

सूरदास खल कारी कामरि चढ़त न दूजो रंग — سورداس کھل کاری کامری چڑھت نہ دوجو رنگ

یعنی اے دل تو خدا سے انکار کرنے والوں اور منافقوں کا ساتھ چھوڑ دے، جنکے ساتھ رہکر بُری عقل پیدا ہوتی ہے (یعنی بُرے کام کی تحریک ہوتی ہے) اونکی صحبت خدا کی عبادت میں خلل انداز ہوتی ہے، اگر تیرا خیال یہ ہو کہ یہ تیری نصیحت سے راہ راست پر آجائینگے تو یہ ناممکن ہے کیونکہ تجکو معلوم ہے کہ سانپ دودھ پلانے سے اپنی زہریلی خاصیت کو چھوڑ نہیں سکتا، کوے کو کافور کا استعمال سفید نہیں کر سکتا گنگا میں نہاکر پاک نہیں ہو سکتا، گدھے کو اگر خوشبودار اوبٹن ملیں اور بندر کو گہنا پہنائیں تو سوائے اسکے کہ گدھا پھر دھول میں لوٹکر خوشبودار اوبٹن کو خاک ملا دے، اور بندر گہنا نوچ توڑکر زمین پر پھینک دے اور کچھ فائدہ نہیں، ہاتھی کو تالاب میں نہلائیں اور اُس سے صاف رہنے کی اُمید رکھیں تو یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ وہ پھر اپنے جسم پر دھول چھڑکیگا، پتھر پر تیر مطلق اثر نہیں کر سکتا تو فضول ترکش کو خالی کر رہا ہے سورداس کہتے ہیں کہ بدطینت کالی کملی کی مانند ہیں جسپر کوئی دوسرا رنگ نہیں چڑھ سکتا اُن کی صحبت

[illegible]

اور نجاست کا دھبہ دہونے سے کچھ فائدہ نہین ہوسکتا،

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی گلستان مین تربیت نا اہل کے متعلق اچھی اچھی تمثالین تحریر کی ہین،
ایک جگہ نہایت واضح اور دلکش انداز مین فرماتے ہین،

خر عیسیٰ اگر بمکہ برند ٭ چون بیاید ہنوز خر باشد
سگ بدریاے ہفتگانہ بشو ٭ چون کہ تر شد پلید تر باشد

فرماتے ہین اگر عیسیٰ علیہ السلام کا گدھا مکہ مین جائے تو اسمین کوئی تقدس نہ پیدا ہوگا، بلکہ وہان سے آنیکے بعد بھی گدھا ہی رہیگا، اور اگر کتے کو سات دریاؤن غوطہ دیتے تو بھی وہ پاک نہین ہوسکتا بلکہ بھیگنے کے بعد اسکی نجاست بڑھ جائیگی،

ایک اور جگہ فرماتے ہین۔

با سیہ دل چہ سود گفتن پند
نرود میخ آہنی در سنگ

یعنی کور باطن کو نصیحت کیا فائدہ پہونچا سکتی ہے، میخ آہنی پتھر مین نہین جاسکتی۔

ذوق مرحوم نے بھی اسی خیال کو اس شعر مین پیش کیا ہے۔

صحبت اہل صفا سے تیرہ دل کب صاف ہون
زنگ سے آلودہ ہوجاتا ہے آہن آب مین

یعنے پاک باطن کی صحبت سے تیرہ دل کو کچھ فیض نہین پہونچ سکتا بلکہ اسکی کور باطنی بڑھجاتی ہے
سورداس کا دل حقایق و معارف کا خزانہ تھا وہ قدرت کے کرشمون کا اظہار ایسے پیرایے مین کرتے تھے کہ سننے والون پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، فرماتے ہین،

अविगत गति जानी न परे	اوی گت گتی جانی نہ پڑے
मन बच अगम अगाध अगोचर केहि बिधि संचरै ॥	من بچ اگم اگادھ اگوچر کی بدھ سنچرے
अति प्रचण्ड पौरुष सों माता केहरि भूख मरै ॥	اتی پرچنڈ پورش سو ماتو کیہر بھوک مرے

۱ قدرت ۲ چال ۳ سمجھ ۴ بات ۵ لامحدود ۶ لامحدود ۷ غیر محسوس ۸ کس طرح ۹ معلوم کر سکے ۱۰ زیادہ ۱۱ بہت زیادہ ۱۲ طاقت ۱۳ مست ۱۴ شیر ۱۲

تجے اودیم اکاش کری بیٹھے اجگر اودر بھرے — तजि उद्यम प्रकाश करि बैठे अजगर उदर भरै ॥

کبھو ترن ڈوبت پانی مین کبھو شیلا ترے — कबहुँक तृण बूड़त पानी में कबहुँक शिला तरै ॥

باگر سے ساگر کری راکھے چوندش نیر بھرے — बागर से सागर करि राखे चहुँ दिशि नीर भरै ॥

پاہن بیچ کمل بکست ہین جل مین اگن جرے — पाहन बिच कमल बिकसाहीं जल में अगिन जरै ॥

راجا رنک رنک تے راجا لے سر چھتر دھرے — राजा रंक रंक तें राजा लै सिर छत्र धरै ॥

سور پتت ترجاے چھنک مین جو پربھو نیک ڈھرے — सूर पतित तरि जाय छिनक में जो प्रभु नेक ढरै ॥

یہ ہی خدا کی شان ہے ادراک سے باہر ہے کیونکہ وہ نہ عقل مین سما سکتا ہے نہ زبان سے بیان ہو سکتا ہے وہ لامحدود اور آنکھون سے پنہان ہے۔ عجیب اسکی قدرت ہے سست اور طاقتور شیر بھوکون مر رہا ہے اور اسکے مقابلہ مین اجگر ایک جگہ پر بیٹھا رہتا ہے اور اپنے رازق کے لیے دوڑ دھوپ بھی نہین کرتا۔ مگر اسکی قدرت اسکے پیٹ بھرنے کا سامان بہم پہنچاوتی ہے۔ کبھی تو تنکا باوجود ہلکے ہونے کے پانی مین ڈوب جاتا ہے اور کبھی پتھر باوجود گرانی پانی پر تیرتا ہے، زمین کے خشک حصہ مین کبھی پانی اس کثرت سے ہو جاتا ہے کہ سمندر موجین مارنے لگتا ہے، لیکن پتھر سے کنول کھلتا ہے۔ گویا پانی مین آگ روشن ہو جاتی ہے، راجہ فقیر ہو جاتا ہے اور فقیر چتر شاہی لگا کر چلتا ہے، سورداس اگر اس سے التجا کرتا رہے، تو فوراً نجات ابدی حاصل ہو جا

اپنی نفس کی سرکشی کا ان لفظون مین اظہار کرتے ہین،

میرا من مت ہین گوسائین — मेरा मन मत हीन गुसाईं ॥

سب سکھ ندھ پد کمل چھانڈ شرم کرت سوان کی نائین — सब सुख निधि पद कमल छाँड़ि श्रम करत स्वान की नाईं ॥

پھرت برتھا بھاجن اولوکت سونے سدن اگیان — फिरत वृथा भाजन अवलोकत सूने सदन अजान ॥

تیہی لالچ کبھو کیسے ہو ترپت نہ پاوت پران — तिहि लालच कबहूँ कैसे हूँ तृप्ति न पावत प्रान ॥

جنہ جنہ جات تہین بھے تراست آسی لکٹ پد تران — जहँ तहँ जात तहीं भय त्रासत [illegible] ॥

کور کور کارن کدبدھ جڑ کتنے سہت اپمان — कौर कौर कारन कुबुद्धि जड़ कितै सहत अपमान ॥

۱ چھوڑ کر ۲ کام کوشش ۳ اوپر سے آئی ہوئی خوراک ۴ پیٹ ۵ تنکا ۶ پتھر ۷ پہنان ۸ چارون طرف ۹ بھر
۱۰ ناسمجھ ۱۱ خزانہ ۱۲ محنت ۱۳ کتے ۱۴ فضول ۱۵ برتن ۱۶ دیکھتا ہے ۱۷ گھر ۱۸ ناسمجھ ۱۹ مطمئن
۲۰ ڈرتا ہے ۲۱ لاٹھی ۲۲ جوتا ۲۳ بے عزتی ہو

تم سروگیہ سکل بدھ پورن اکھل بھون نج ناتھ — तुम सर्वज्ञ सकल विधि पूरण अखिल भुवन निजनाथ॥

تنہی چھانڑ یہ سور مہا سٹھ بھرمت بھرمنی کے ساتھ — तिन्हें छाँड़ि यह सूर महासठ भ्रमत भ्रमनि के साथ॥

مطلب یہ ہے کہ اے خدا میرا دل بالکل ہی نا سمجھ ہے کیونکہ تیرا کنول ایسا نازک پاؤن جو تمام آرام کا خزانہ ہے اسکو چھوڑ کر فضول ادھر اودھر محنت کرتا پھرتا ہے یہ مثل کتے کی ہے جو سونے مکانات مین تمام برتنون کو فضول دیکھتا پھرتا ہے ان لالچون مین پڑکر ہماری بُری روح کس طرح اطمینان کو حاصل کر سکتی ہے جہان جہان جاتی ہے جوتے اور ڈنڈے کے خوف سے ڈرا کرتی ہے محض ایک ایک نوالہ کے سبب کتنی بے عزتی سہتی پھرتی ہے تم (اے خدا) تمام باتون کے جاننے والے اور تمام دنیا کے مالک ہو، سورداس تمکو چھوڑ کر دنیا کے جنجال مین الجھا ہوا مارا مارا پھرتا ہے۔

کتنی پرحقیقت شاعری ہے روح کو اطمینان کل جب ہی نصیب ہو سکتا ہے جب خدا اسکی محبت مین اپنے کو فنا کر دے جب تک اسپر تعینات کے پردے پڑے ہین، روح آلائشون سے پاک نہین ہو سکتی، پھر فرماتے ہین -

ہو من رام نام کو گاہک — हो मन राम नाम के गाहक॥

چوراسی لکھ جیا جون مین بھٹکت پھرت اناہک — चौरासी लख जिया योनि में भटकत फिरत अनाहक॥

بھگت ہاٹ بیٹھ تو تھر ہوئے ہری نگ نرمل لیے — भक्ति हाट बैठ तू थिर है हरि नग निर्मल लेहि॥

کام کرودھ مد لوبھ موہ تو سکل دلالی دے — काम क्रोध मद लोभ मोह तू सकल दलाली देहि॥

کری ہیاؤ سو سوج لاد یہ ہری کے پُر لے جا — करि हियाव सो सौज लादि यह हरि के पुर लै जाहि॥

گھاٹ باٹ کہون اٹک ہوئی نہین سب کو دینہہ نباہ — घाट बाट कहुँ अटक होइ नहिं सब कोउ देहि निबाहि॥

اور بنج مین نا ہین لاہا ہوت مول مین ہان — और बनिज में नाहीं लाहा होत मूल में हानि॥

سورسوامی کو سودا سانچو کہو ہمارو مان — सूर स्वामि को सौदा साँचो कह्यो हमारो मानि॥

مطلب یہ ہے کہ اے دل تو خدا کی یاد کا سودا مول لے کیون فضول ماسوائے اللہ کے جال مین پھنسا ہوا بھٹکتا پھرتا ہے، تُو عابدون کی بازار مین اطمینان سے بیٹھ اور خدا کے صاف اور روشن

---

۱ تمام باتون کے جاننے والے ۲ تمام ۳ گھومتا ہے ۴ فضول ۵ مطمئن ۶ خواہشات نفسانی ۷ غصہ ۸ غرور ۹ لالچ ۱۰ محبت ۱۱ محبت ۱۲ سودا ۱۳ سوداگری ۱۴ فائدہ ۱۵ نقصان -

گھٹنے کو خریدو خواہشات نفسانی، غصہ، گھمنڈ اور دنیاوی محبت کو دلالی مین دے ڈال اور ہمت کرکے اس سودے کو خرید کر خدا کی درگاہ مین پہنچا۔ اس راستہ مین کوئی رکاوٹ اور اٹکک نہین ہے سوا اس سودے کے کسی مین فائدہ نہین ہے بلکہ اور اصل رقم مین بھی گھاٹا آتا ہے، سورداس خدا کا سودا بالکل سچا ہے ہمارا کہنا مان لے۔

سورداس نے عاشقانہ رنگ مین بھی خیال آرائی کی ہے، جذبات بالکل صاف ہین، نہ مبالغہ کی بھرمار ہے نہ دوراز قیاس باتین، سادے سادے لفظ لیکن ایسے جادو بھرے ہین کہ دل بے چین ہوجاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی شاعری مین بھی انکا روے سخن سری کرشن کی طرف ہے، فرماتے ہین،

اودھو یہ ابھلاش[۱] رہی — ऊधो वह अभिलाष रही ॥
شیام سندر کے آون کی کبھون نہ بات کہی — श्याम सुन्दर के आवन की कबहूँ न बात कही
کرت چباؤ[۲] سکل نرناری بھلی پریت نبھی — करत चवाव सकल नरनारि मदनी प्रीत निबाही
ایسو کین چہے من موہن کاہے کو باہنہ گہی — ऐसी कीन्ह चहे मन मोहन काहे को बाँह गही ॥
ماکھن، چاکھن ہارنت ڈھونڈھت پھرت مہی[۳] — माखन चाखन हार नित ढूँढ़त फिरत मही ॥
سورا مولی بکے بن دام یہ من سوچ رہی — सूर अमोल बिके बिन दाम यह मन सोच रही ॥

اودھو کو رازدار بنا کر کہتے ہین کہ میرے دل مین خواہش ہی رہی کسی نے میرے معشوق کے آنے کی خبر کبھی نہین کہی تمام عورت اور مرد بے اعتنائی اور میری مجبوری کا چرچا کرتے ہین کہ ایسی صورت مین محبت نبھ چکی معشوق کو مخاطب کرکے کہتے ہین کیا ایسا کرنا چاہیئے تھا اگر یہی منظور تھا تو پھر کس لیے اقرار وفا کیا تھا، نباہ کا وعدہ کیون بھول گئے، سوت سے چونکہ فطرتاً دشمنی رہتی ہے اسلیے اسکے پاس رہنے پر طنزاً کہہ رہے ہین کہ ہمیشہ مکھن کے کھانے والے ادھر ادھر چھاچھ ڈھونڈھتے پھرتے ہین،
اب یہ سوچ ہے کہ سورداس کا دل باوجود انمول ہونے کے (بازارِ عشق مین) مفت مین بک گیا، عشق کی نیازمندیون کی داستان سنیے، فرماتے ہین،

مائی مین تو وا دن کا جر دئی ہون — माई मैं तो वा दिन काजर दई हों ॥

---

[۱] خواہش [۲] چرچا [۳] چھاچھ

جا دن شیام سندر کے نینن آپنو نین ملیہون — जा दिन स्याम सुन्दर के नैनन आपने नैन मिलइहौं
سن رے سکھی یہی پرتن ہے میری وہ تجھے نہ اور چتیہون — सुन री सखी यह प्रन है मेरो दूजे मो नहिं चितइहौं
سورداس درشن کے کارن کنی ہاتھ مرجیہون — सूरदास प्रभु दरसन के कारन कनी खाइ मरि जइहौं ॥

میں اپنی آنکھون میں کاجل اُسدن دونگی جبدن اپنے معشوق کی آنکھون سے اپنی آنکھیں ملاؤنگی اے سکھی میرا یہی قول ہے کہ میں سوا اپنے معشوق کے کسی اور کو نہیں دیکھونگی، سورداس کہتے ہیں دیدار کی تمنا میں ایکدن کنی چاٹکر مرجاؤنگی، شب غم کی تصویر اور جذبات میں تشبیہ کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔

پیا بن ناگن کاری رات — पिया बिन नागिन कारी रात ॥
کبھون جامنی ہوت جونھیا۔ ڈس اُلٹی ہو جات — कबहुँ जामिनी होत जुन्हैया डसि उलटी ह्वै जात ॥
جنتر پھرت منتر نہیں لاگت۔ گات سُکھا نو جات — जंतर फुरत मंत्र नहिं लागत गात सुखानो जात ॥
سورداس برہن آس بیاکل۔ مُری مُری لہرین کھات — सूरदास बिरहिन भई ब्याकुल मुरि मुरि लहरें खात

معشوق کی جدائی میں اندھیری رات کالی ناگن کی طرح ہے ستارون بھری رات کی وہی کیفیت ہے کہ جس طرح ناگن کاٹ کر الٹ جائے اور اسکے نیچے کا حصہ سفید دکھائی دے، آہ. اس محبت کی ناگن کے کاٹے ہوئے کا منتر ہے نہ جنتر، میرا جسم سوکھا جا رہا ہے، فرقت نصیب سورداس اسطرح وقف اضطراب ہے گویا ناگن نے ڈس لیا ہو اور پیچ و تاب کیساتھ لہرین کھاتا ہو،

نکہیر مرحوم نے بھی کیا خوب فرمایا ہے۔

سانپ بنکر صدمۂ فرقت نے کاٹا ہے مجھے — آرہی ہیں کیسی کیسی لہرین دریا کی طرح

واقعہ ہے کہ سورداس کا کلام بھاشا شاعری کا زیور اور ہندی زبان کا سرمایۂ افتخار ہے ناصحانہ اور عارفانہ انداز بیان کے علاوہ عشق کے سوز و گداز کی ایسی دلکش تصویرین اسکے کلام میں موجود ہیں۔ جو اہل نظر کے لیے حاصل نظارہ ہیں۔

منظور الحق کلیم اعظم گڈھی

لے قول کے اندھیری رات کے ستارون بھری اوجالی رات

جواہرات عالم

(۵) پٹ ڈائمنڈ[۱]

قدرت کے خزانے مین بامرہ نواز جواہرات کی کمی نہین لیکن آجتک جتنے بیش بہا پتھر تماشگاہ عالم مین جلوہ گر ہوئے ہین ان سب مین پٹ ڈائمنڈ کی داستان حیرت خیز و پُر اسرار ہے۔ یہ بڑا اور چمکدار کبوتر کے انڈے کے برابر ہے اور اسکا وزن ۲ ۶۷ ۱۳ قیراط ہے۔ یہ ممتاز ہیرا ۱۷۰۱ء مین گولکنڈہ مشہور ہیرے کی کان سے ۴۵ کوس کے فاصلہ پر ایک غریب قلی کو ملا تھا۔ غریب قلی نے اسے بیش بہا اور نفیس پتھر سمجھکر احتیاطاً اپنے پیر کے زخم مین باندھ لیا تاکہ چشم بد سے محفوظ رہ سکے غرض طرح بحفاظت تمام وہ اس ہیرے کو لیکر مدراس پہونچا اور وہان ساحل پر ایک سرائے مین ٹھیر گیا تدبیر نے مخالفت کی اور وہان اُسنے اپنے ہم جلیسون مین فخریہ طور پر اس ہیرے کا ذکر کر دیا رفتہ رفتہ یہ بات بندرگاہ مین پھیل گئی۔

ایک دن ایک انگریزی جہاز کا کپتان اسے پھسلا کر اپنے جہاز مین لیگیا اور اُس سے بیش بہا ہیرا زبردستی چھین لیا۔ یہی نہین بلکہ اُس غریب کو سمندر مین غرق کر دیا۔ گویا اس غریب قلی کی موت اس ہیرے کی خونی داستان کا پہلا باب ہے۔

ہوس پرست کپتان نے اس ہیرے کو ایک پارسی جوہری جام چند کے ہاتھ صرف ایکہزار پاونڈ (پندرہ ہزار روپیہ) کو فروخت کر دیا اور اس غیر متوقع رقم کو جو اسکی اصلی قیمت سے بدرجہا کم تھی تائید غیبی سمجھنے لگا۔ لیکن یہ مال مفت جبین خون کی بو تھی کپتان کو راس نہ آیا اسنے اس روپیہ کو بہت جلد شراب خواری، قمار بازی اور بُرے کامون مین اوڑا دیا اور بہت جلد مفلس و قلاش بنگیا تنگدستی سے زیادہ تکلیف دہ بات ضمیر کی ملامت تھی جو ہر وقت تفریح کرتا رہتا تھا انجام کار اسنے ہیرے کے حاصل

[۱] اس سلسلہ کے اول چار مضامین زمانہ بابت اکتوبر، نومبر، دسمبر، جنوری ۲۶-۱۹۲۵ء مین شایع ہو چکے ہین

کرینے کے چند ہی ہفتے کے بعد خودکشی کرلی MRL. THOMAS PITT

رفتہ رفتہ اس ہیرے کی شہرت گورنر مدراس مسٹر ٹامس پٹ تک کانون تک پہونچی اور اُسنے ستاسی ہزار روپیہ کو خرید لیا اور پانچہزار پونڈ صرف کرکے اسکو ترشوایا تراش میں جو ریزے نکلے انکی قیمت ساڑھے تین ہزار پونڈ تھی۔ گورنر پٹ اسکو اپنے ہمراہ انگلستان لے گیا مگر اسکے پہونچنے سے پیشتر ہی اس پتھر کی شہرت انگلستان میں پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ایک فصیح البیان شاعر پوپ نے اپنی نظم (Sir Balaam) میں اس ہیرے کا ذکر کیا ہے اور گورنر پٹ کا خوب خوب مضحکہ اوڑایا ہے۔

جبتک یہ ہیرا پٹ کے پاس رہا وہ سخت کشمکش میں مبتلا رہا۔ اسکو ہر وقت یہ خیال رہتا کہ مبادا کوئی اسے چرا نہ لے۔ اسی لیے وہ اس ہیرے کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرتا۔

سنہ ۱۷۱۲ء میں WAFFEN BACK نے جو جرمن سفارت کا رکن تھا اسکے دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر ہیرا دکھانا تو کجا پٹ نے اُسے ملاقات کرنے تک کا موقع نہ دیا۔

پٹ کے شک کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے کسی دوست کو بھی اپنے مکان کا پتہ نہ بتاتا۔ اور ہمیشہ اپنا مکان تبدیل کرتا رہتا۔ تبادلۂ مکان بھی رات کو اور بہت رازداری کے ساتھ کرتا کہ چوروں کو کا پتہ نہ ملے

غرض وہ ہر شخص کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا اور ہر وقت خائف رہتا کہ کہیں دغا سے کوئی عیار اس انمول ہیرے کو اُڑا نہ لیجائے۔ آخر وہ اس بیجا پابندیوں سے تنگ آگیا اور یہ رائے قائم کرلی کہ ایسا بے بہا ہیرا معمولی شخص کے لائق نہیں۔ چنانچہ اسنے انگلستان کے دربار میں فروخت کے سلسلہ جنبانی کی لیکن جب وہاں ناکامی کے آثار نظر آئے تو REGENT D' ORLEANS والی فرانس سے اُسکے خزانچی لو (LOW) کی معرفت فروخت کی بات چیت کی لیکن شاہ فرانس بغیر دیکھے ہوئے کوئی رائے ظاہر نہ کرسکتا تھا - اور پٹ کی یہ حالت تھی کہ وہ ہیرا دکھانا تو درکنار دربار میں خود جانا بھی مصلحت سے دور سمجھتا تھا۔ آخر کار ایک نقلی نمونہ اسکی شکل کا تیار کیا گیا جسکو دیکھکر D' ORLEANS. نے ایک لاکھ تیتیس ہزار پونڈ (بیس لاکھ پچیس ہزار روپیہ) قیمت تجویز کی۔ یہ قیمت کم تھی مگر پٹ کے لیے یہ رقم بہت زیادہ تھی۔

اسکی قیمت کم از کم چار لاکھ اسی ہزار پونڈ تھی لیکن ایک قلیل رقم کے بدلے یہ ہیرا پٹ کے ہاتھوں سے نکلکر فرانس کے شاہی محل مین داخل ہوگیا۔ اسکے جدا ہونے کے بعد پٹ کے مصائب کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ایک حد تک اسکو سکون نصیب ہوا اسنے اس روپیون کو مفید کامون مین لگایا اور رفتہ رفتہ ارل چیتھم Earl Chatham اور اُسکے خاندان کے مستحکم بنیاد اسی ہیرے کی بدولت دنیا مین قایم ہوگئی۔

یہ ہیرا شاہان فرانس کے لباس کا ایک زینت بخش جزو سمجھا جاتا تھا سینٹ سیمن ST. SIMON نے اپنے تذکرات مین اسکا خاص طور پر ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہ پسند ہیرا مقبول عام بھی تھا۔ ریجینٹ REGENT کے بعد لوئی پانزدہم LOUIS XV اور لوئی شانزدہم LOUIS XVI نے اسکو بہت قدر کی لیکن میری انٹوائینٹ MARIE ANTOINETTE اسکو وزنی ہونے کیوجہ سے ناپسند کرتی تھی۔ ملکہ ہوپ کو ہیرا HOPE DIAMOND ترجیح دیتی تھی۔ تاہم خاص شاہی جلوس مین بھی ممتاز سمجھا جاتا تھا۔

آخر ادبار کی گھڑی آگئی اور ۱۷۹۲ء مین یہ ہیرا انقلاب فرانس کی شورشون کی نذر ہوگیا اور جواہرات و قیمتی اشیا بھی برباد ہوگئین جو محل GARDEMEUBLE مین بڑی حفاظت سے رکھی تھین۔ شہر مین لوٹ مار کا ہنگامہ تو گرم تھا ہی رات کے وقت یہ محل بھی لٹ گیا اور وہ تمام سامان اور خزانہ غارت ہوگیا جو اس محل مین محفوظ تھا۔ دوسرے دن بڑا شور و شر ہوا اور وزیر ROLAND نے اعلان کیا کہ شاہی محل مین چوری ہوگئی۔ اس خبر سے وزارت اور اسمبلی کو ایک صدمۂ عظیم پہونچا کیونکہ اسی خزانے پر وہ تکیہ کیئے بیٹھے تھے۔ اس چوری کے انکشاف کے لیے بہت کوشش ہوئی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا دو شخص گرفتار بھی ہوئے جنپر اس چوری کی شرکت کا شبہ تھا مگر اس ہیرے کا پتہ نہ چلا۔ عرصہ تک اس چوری کے متعلق طرح طرح کی افواہین مشہور ہوتی رہین۔ بعضون کا خیال تھا کہ شاہی خاندان والون کی جمہوریت پسندون سے جنگ کے لیے اس خزانے کو اڑا لیا ہے۔ اور بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ جمہوریت پسندون کی جماعت نے یہ چوری کی ہے۔

بڑی کوششون کے بعد اس گم شدہ خزانے کے دو ہیرے برآمد ہوئے۔ جن مین ایک

یہی ہیرا پٹ تھا۔

نمائشاً انکی برآمدگی کی وجہ صرف یہ تھی کہ نہ تو یہ کسی بازار مین فروخت ہو سکتے تھے اور نہ پوشیدہ رہ سکتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک گمنام مراسلے سے اِن دو ہیروں کا پتہ چلا اور بعض یہ کہتے ہین کہ ایک جج کی کوششون سے فرانس کو یہ جواہرات دوبارہ ملے کہا جاتا ہے کہ نپولین نے بھی پٹ کی طرح اس ہیرے کی بدولت ایک کثیر رقم وصول کی۔

اپریل ۱۷۹۶ء مین جب جمہوری سلطنت کو روپیہ کی بہت ضرورت تھی تو اس ہیرے کو جرمن ساہوکاروں سے ایک کثیر رقم قرض لینے کے لیے جرمن بھیجنا پڑا اور وہاں وہ عرصہ تک گرو رہا

ایکبار پھر یہ فرانس مین نپولین کے پاس لوٹا مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پھر ڈچ DUTCH گورنمنٹ کے پاس گرو ہو گیا۔

جب نپولین نے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ مین لی تو اُسنے اس ہیرے کو واپس لیکر اپنی تاجپوشی کیوقت پہنا۔ اور اپنی تلوار کے دستہ مین اسکو جڑوا لیا۔ اس کے وارث لوی نپولین Louis Napoleon کو اسکے پہننے کی حسرت ہی رہ گئی۔ کیونکہ وہ جنگِ فرانس مین شاہانِ جرمنی کے پاس پہونچ چکا تھا۔ اور شاید اب بھی وہین ہے ظاہر ہے کہ یہ خاندان بھی زوال سے نہ بچ سکا۔

رام سرن نگم



قحط الرجال

ہندو مسلم اتحاد کے متعلق اسوقت مسلمان اکابر قوم نے باوجود پیہم اشتعال کے جو روش حسنہ اختیار کی ہے اور جس تدبر اور مآل اندیشی کا ثبوت دیا ہے، اسپر ہندوؤن کو شرمندہ ہونا چاہیئے۔ ابتک انھین یہ دعوے تھا کہ سوراجیہ کے لیے ہم جتنی قربانیان کر سکتے ہین اتنی مسلم فرقہ نہین کرتا۔ وہ ہندوستان مین رہکر ہندوستان کا دانہ پانی کھاکر عرب اور عجم کے خواب دیکھا کرتا ہے، اسے سوراجیہ کی اتنی فکر نہین ہے جتنی پین اسلام کی۔ ایکبار جب مولانا شوکت علی نے کسی خلافت کے جلسے مین کہا تھا کہ اگر مسلمان کو کسی موقع پر صرف ایک روپیہ دینا منظور ہو تو وہ ۱۴؍ خلافت کو دے اور ۲؍ کانگریس کو۔ اس قول کو ہندو اخبارات نے بے جا اہمیت دی اور اُسے اپنے نظریے کی تائید مین پیش کیا۔

یہ قول تو اسکا مقتضی تھا کہ ہندو اصحاب اپنے دل مین نادم ہوتے کہ ایک مسلمان کو جو اپنا سب کچھ مادر ہند کے نذر کر چکا ہو یہ تخصیص کرنے کی ضرورت درپیش آئی۔ کیونکہ اگر ہندوؤن نے مسئلہ خلافت کو مہاتما گاندھی کی وسعت نگاہ سے دیکھا ہوتا تو مولانا موصوف کو یہ تحریک کرنیکا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤن نے کبھی خلافت کی اہمیت ہی نہین سمجھی اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ بلکہ اسکو اشتباہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ مگر اب جسے انصاف کی نگاہ عطا ہوئی ہو چاہے تو دیکھ سکتا ہے کہ وہی شخص ہندو مسلم اتحاد کو جو بالفاظ دیگر سوراجیہ ہے کتنا اہم سمجھتا ہے اور اسکے لیے کتنی عظیم الشان قربانیان کرنے پر آمادہ ہے۔ ہندو قوم کبھی اپنی سیاسی بیدار مغزی کے لیے مشہور نہین رہی اور اس موقع پر تو اُسنے جتنی تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے اس سے مجبوراً یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس قوم کا سیاسی دیوالہ ہو گیا، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ساری ہندو قوم مین بحیثیت المجموع محض چند شوریدہ سر، نام نہاد محبان وطن کی تحریک پر یون از خود رفتہ ہو جاتی۔ ہم کہتے ہین کہ اگر ہندوؤن مین ایک بھی کچلو، محمد علی یا شوکت علی ہوتا تو ہندو سنگھٹن اور شدھی کی اتنی گرم بازاری

ہوتی اور اُن ہنگاموں میں قابل محسوس کی ہو جاتی جو ان تعصبات کے زیر اثر ہیں۔ مگر افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس نے بھی مجموعی طور پر ان تحریکات سے الگ تھلک رہنے کے باوجود انفرادی حیثیت سے اسکی شمولیت میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ اتنا ہی نہیں، ایک بھی ذمہ دار کانگریس کے سربرآوردہ شخص نے باعلان ان تحریکات کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہ کی۔ پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہرلال نہرو، لالہ بھگوانداس، لالہ سری پرکاش ان آدمیوں میں ہیں جنسے زیادہ اخلاقی جرأت سے کام لینے کی توقع کیجا سکتی تھی۔ مگر ان سبھی اصحاب نے ایک روز اپنے اختلاف اور بدگمانی کا اظہار کرکے دوسرے روز اس کی تردید کی، اور یہ بانگ دہل کہا کہ شدھی اور سنگھٹن کے متعلق ہم نے جو خیال ظاہر کیا تھا وہ غلط فہمیوں پر مبنی تھا جب ایسے ایسے لوگ دباؤ میں آجائیں تو پھر انصاف کی امید کس سے کی جائے! اگر مولانا محمد علی اور شوکت علی کی طرح ان اصحاب نے بھی اپنے قوم کو ان تحریکات کے مضر اور مہلک نتائج سے خبر کیا ہوتا اور اسکے خلاف باقاعدہ منضبط کوشش کرتے تو یقیناً آج ہندو مسلم تعلقات اتنے کشیدہ نہ ہوتے۔ مگر جو سیاسی دور اندیشی صدیوں سے پامال ہو چکی ہو اس سے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایک عصمت نے سارے یورپ کو انگشت بدندان کر دیا! ہندوؤں میں ایسے نفوس پیدا کرنیکے لیے ابھی صدیاں درکار ہیں۔ آج کون ہندو ہے جو ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر ہمہ تن مصروف ہو، جو اسے ہندوستان کا اہم ترین مسئلہ سمجھتا ہو جو سوراجیہ کے لیے اتحاد کو بنیادی شرط سمجھتا ہو۔ یہ درد قوم، یہ خلش، یہ سوز، آج ہندوؤں میں معدوم ہے۔ دس پانچ ہزار ملکانوں کو شدھ کر کے لوگ جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ گویا منزل مقصود پر پہونچ گئے۔ اب سوراج حاصل ہو گیا۔ ہمیں یاد نہیں آتا کہ آجتک کسی ہندو نے ان پاکیزہ، رفیع الہامی جذبات کا اظہار کیا ہو جو اس رام لکھن کی جوڑی نے جیل سے نکلتے ہی رو رو کر، باچشم تر، ایک فغان درد کی طرح ظاہر کئے ہیں۔ یہ ہے وہ قومی احساس جو قوموں کے بیڑے پار کرتا ہے، انکی کشتی کنارے پر لگاتا ہے۔ یہ قومی رواداری اور تحمل کا اعجاز ہے۔ ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جو اس استحسان اور گرانباری کا اظہار کر سکیں، جو ہر ایک قوم پرست ہندو کے دلمیں ان محترم ہستیوں کی توصیف میں ترنم سرا ہے۔

ہمکو یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ان دونوں فرقوں میں کشمکش اور بدگمانی اور منافرت کی ابتدا تاریخی ہے۔ مسلمان فاتح تھے۔ ہندو مفتوح۔ مسلمانوں کیطرف سے ہندوؤں پر اکثر زیادتیاں ہوئیں، اور اگرچہ ہندوؤں نے موقع ہاتھ آجانے پر انکا جواب دینے میں دریغ نہیں کیا، لیکن فی الجملہ مسلمان

فرمانرواؤن نے سخت ترین مظالم کیے۔ ہم یہ بھی مانتے ہین کہ موجودہ حالات مین اذان اور قربانی کے موضوع پر مسلمانون کیطرف سے زیادتیان ہوتی ہین اور ہنگامون مین بھی مسلمان ہی اکثر غاصب آتے ہین، بیشتر مسلم طبقہ اب بھی جتیم سلطان بود کے نعرے لگاتا ہے اور ہندوؤن پر غالب اور حاوی رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہے تبلیغ کے معاملہ مین زیادتی مسلمانون سے کی اور ہندوؤن کی روز افزون تقلیل کے باعث کسی حد تک وہی ہین مگر ان سارے وجوہ اور دلائل اور واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس امر کے مدعی ہین کہ ہندوؤن کو ابھی کہین زیادہ سیاسی تحمل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ تاریخی عداوت سخت جان ہوتی ہے لیکن غیر فانی نہین تاریخ عالم مین اسکی مثالین معدوم نہین ہین، اور اگر معدوم بھی ہون تو کوئی وجہ نہین کہ ہم اُسے حرز جان بنائے رہین ہندوون کے تیوہارون اور جلوسون کے موقعون پر اکثر مسلمانون کی طرف سے یہ تقاضا ہوتا ہے کہ جدون کے سامنے نماز کے وقت باجے اور ناقوس نہ بجائے جائین یہ بہت ہی فطری تقاضا ہے۔ شور و غل سے عبادت مین خلل پڑنا لازمی ہے اور اگر مسلمان اس شور و غل کو بند کرنے پر اصرار کرتے ہین تو ہندوؤنکو لازم ہے کہ وہ انکی دلجوئی کرین۔ یہ تو ہندوؤن کو بغیر اصرار کیئے محض معبود کے احترام سے فرض ہے۔ نہ کہ جب کوئی انجمن اُنکا فرض یاد دلائے تو اس سے آمادہ پرخاش ہون۔ ہندو کہین گے کہ ہمارے مندرون کے سامنے سے مسلمانون کے جلوس بھی باجے بجاتے نہ نکلین۔ بادی النظر مین تو یہ قرین انصاف معلوم ہوتا ہے لیکن اسکا عملی اثر یہ ہونا ممکن ہے کہ شہرون مین باجے مکمل بند کر دیے جائین۔ کیونکہ مندرون کے تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بعض بعض شہرون مین تو ہر ایک گھر کے بعد مندر نظر آتا ہے۔ پھر ہندوؤن کی سندھیا پوجا تو سکوت مین ہوتی ہے لیکن دیوتاؤن کی پوجا اکثر گھنٹے اور گھڑیال کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ تو جب وہ خود عبادت کیلئے سکوت ضروری نہین سمجھتے تو کس منہ سے مسلمانون سے سکوت کے طالب ہو سکتے ہین۔ تاہم ہم یہ کہدینا مناسب سمجھتے ہین کہ جب عبادت ہی پرماتما کی ہے اور محض اسکی ظاہری صورت مین تفرقہ ہے تو ہندو لوگ کیون اس بات کے منتظر رہین کہ جب مسلمان ہمارے مذہب کی تعظیم کرین گے تو ہم بھی انکے مذہب کی تعظیم کرین گے۔ اگر مذہب کی تعظیم کرنا اچھا ہے تو ہر حالت مین اچھا ہے اسکے لیئے کسی شرط کی ضرورت نہین۔ اچھا کام کرنیوالے کو سب اچھا کہتے ہین دنیاوی معاملات مین دبنے سے آبرو مین بٹہ لگتا ہے دین کے معاملات مین دبنے سے نہین۔ ہم یہ قیاس نہین کر سکتے کہ ... کا احترام کرین اور وہ ہمارے دین کی مذمت کرے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی سمجھ لین مسلمانون کا ہر ذمہ دار طبقہ عام آمادہ ہو تو مساجد کے سامنے بند ہوتے، نکلتا باجا بیان بجائے گا۔

اور تفاخر کے انداز سے کہینگا دب گئے! دب گئے! تو اتنا سُن لینے مین کیا ہرج ہے۔ یقیناً مسلم لیڈران اِسی حالت کو زیادہ مدت تک قائم رہنے دینگے۔ یہ کسی مذہب کیلئے باعث افتخار نہین ہے کہ وہ دوسرون کے مذہبی احساسات کو صدمہ پہونچائے۔ گئو کشی کے معاملہ مین ہندوؤن نے شروع سے ابتک ایک نامنصفانہ روش اختیار کی ہے۔ ہمکو اختیار ہے جس جانور کو چاہین متبرک سمجھین۔ لیکن یہ امید رکھنا کہ دوسرے مذہب کے پیرو بھی اُسے متبرک سمجھین، خواہ مخواہ دوسرون سے سر ٹکرانا ہے۔ گائے ساری دنیا کی خورش ہے اسکے لیے کیا آپ ساری دنیا کو گردن زدنی سمجھین گے۔ یہ کسی خونخوار مذہب کے لیے بھی باعث وقار نہین ہوسکتا کہ وہ ساری دنیا سے دشمنی کرتا پھرے، چہ جائیکہ ہندوؤن جیسے فلسفیانہ عالمگیر اور مہذب مذہب کے لیے جسکا پاک ترین اصول ہو۔ "اہنسا پرمو دھرم"۔ اگر ہندوؤن کو ابھی یہ جاننا باقی ہے کہ انسان کسی حیوان سے کہین زیادہ پاک وجود ہے، چاہے وہ گوپال کی گائے ہو یا عیسیٰ کا خر تو ہم انکی تمدن کے مبادیات پر بھی قدرت نہین پائی۔ ہندوستان جیسے زرعی ملک کے لیے گائے کا وجود نعمت ہے، مگر مسئلہ اقتصادیات سے علیحدہ اسکی کوئی اہمیت نہین ہے، لیکن بایں ہمہ آجتک کا ویری ہندوؤن نے گئو رکھشا کی ایسی کوئی مجموعی کوشش نہین کی جس سے ان کے دعوے کی عملی تصدیق ہو سکتی۔ گئو رکھشنی سبھائین قائم کرکے مذہبی مناقشے پیدا کرنا گئو رکھشا نہین ہے۔ صوبجات مین مشترکہ مینڈا رہنے دیجئے۔ اُنھون نے گوچر زمین کا کوئی انتظام کیا، یا جہان پہلے سے انتظام تھا وہان اُسے فنا نہین کر دیا۔ جس ملک مین تمباکو اور چائے اور نیل اور ربڑ کی کاشت کیلئے کافی زمین ہو وہان مواضعات مین گوچر کا نہ ہونا اقتصادی کشمکش کی دلیل ہوسکتی ہے، گئو رکھشا کی دلیل ہرگز نہین ہو سکتی۔ جب ہم دیکھتے ہین کہ بیلون کے لیے چارہ میسر نہین تو گایون کے لیے (وہ بھی جب لاغر نحیف اور بڈھی ہو جائین) چارہ بہم پہونچانے کی دقت کا حال کسی کسان سے پوچھیے۔ وہ گایون کو فاقہ کشی سے ایڑیان رگڑ رگڑ کر مرنے کے بدلے انہین قصائی کے اندست کے حوالے کر دینا زیادہ شایان انسانیت سمجھتا ہے۔ علیٰ مسئلہ تبلیغ۔ اسمین دو رائین نہین ہوسکتین کیونکہ ہر مذہب کو اسکا کافی اختیار ہے بشرطیکہ غرض خالصاً اصلاح ایمان اور اشاعت اصول ہو۔ جب اسمین کوئی سیاسی غرض مضمر ہوجاتی ہے تو وہ فی الفور سیاسی معاملہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بدقسمتی سے دور حاضرہ مین مذہب اصلاح ایمان کا ذریعہ نہین، سیاسی منفعت کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ اسکی حیثیت جنون کی سی ہوگئی ہے جسکا اصول ہے کہ سب کچھ اپنے لیے اور غیرون کے لیے کچھ نہین۔ جسدن مقابلہ رقابت اور سبقت کا خیال مذہب سے دور ہوجائیگا اُسدن تبدیل مذہب پر کسی کے کان نہ کھڑے ہونگے۔

غرض مذکورہ صدر وجوہ میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جو ہندوؤں کے لیے "ہماری جان خطرے میں ہے" کی ہانک لگانے کو حق بجانب ثابت کر سکے۔ اس خاص موقعہ پر ہندو سنگٹھن کی فریاد نے ہندو مسلم اتحاد کو جو صدمہ پہنچایا ہے اسکی تلافی اگر ہوگی تو بہت عرصہ میں ہوگی۔ ہندو اور مسلمان نہ کبھی شیر و شکر تھے نہ ہونگے اور نہ ہونے چاہئیں۔ دونوں کی جداگانہ صورت قائم رہنی چاہیئے اور رہیگی۔ ضرورت ہے صرف بیشتر دونوں میں تحمل اور ایثار کی۔ بالعموم ہمارے نائب وہ اصحاب ہوتے ہیں جو اپنے فرقہ کے مصائب و شکایات کے ایک سرگرم نوحہ خوان ہوتے ہیں۔ وہ اپنے فرقہ کی نگاہوں میں عزیز اور مقبول بننے کے لیے اسکے جذبات کو اکساتے رہتے ہیں اور مصالحت کے مقابلہ میں جو انکی نوحہ خوانیوں کو بند کردیگی مجادلہ کو قائم رکھنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں میں اسوقت متحمل مزاج لیڈروں کا قحط ہے۔ ہلا لیڈر وہ ہونا چاہیئے جو متانت سے مسائل پر غور کرے۔ مگر اسکی جگہ غوغائیوں کے حصہ میں آجاتی ہے جو اپنی بانگ بلند سے عوام کے سفلہ جذبات برانگیختہ کرکے اپنا اقتدار حاصل کرلیتا ہے۔ وہ قوم کو دو گز بڑھا نہیں سکتا۔ گرا سکتا ہے۔ اسکا مفاد اسی میں ہے۔ کوئی شخص اتنا کج فہم نہیں ہے کہ اسے اس نازک موقعہ پر دونوں فرقوں کی باہمی کشاکش کے نتائج نہ نظر آئیں۔ اور ہے تو ہمیں اس کی نیت خیر میں شبہ ہے۔ اس شبہ کی تصدیق اسوجہ سے اور ہوتی ہے کہ اس تحریک کے بانی اور کارکن زیادہ تر وہی حضرات ہیں جو سیاسی معاملات میں حصہ لینے سے محترز رہتے ہیں۔ یا لیتے بھی ہیں تو آبرو بچاتے ہوئے۔ ورنہ ہندو سنگٹھن کے جلسہ منعقدہ بنارس میں زمینداروں اور راجوں کی اتنی تعداد کثیر نظر نہ آتی۔ جدھر دیکھئے راجے مہاراجے اور سیٹھ مہاجن ہی نظر آتے تھے۔ مقلدوں میں بیشتر وہ تھے جنکا آبائی پیشہ غلامی ہے۔ جنہیں ازل سے شکایت ہے کہ مسلمان سرکاری نوکریاں ہڑپ کرجاتے ہیں اور ہمارا کوئی پرسان حال نہیں۔ جنکے لیے ایک مسلمان سب انسپکٹر یا قرق امین کا تقرر انقلاب چین یا فتح ترکی سے زیادہ معرکۃ الآرا واقعہ ہے۔

ہمارے رؤسا نے جمہوری تحریکوں کی طرف ابتک التزاماً جو رویہ اختیار کیا ہے اسنے انہیں ایک مقیاس کا مصداق بنادیا ہے جس سے حکام کے عندیوں کا صاف صاف پتہ چلتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد حکام کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ اسلیئے جب رؤسا کسی ایسی تحریک کا جوش سے خیر مقدم کریں جس سے اتحاد کو نقصان پہونچنے کا یقین ہو تو ظاہر ہے کہ انکی شرکت اختیاری نہیں بلکہ کسی کی ایما سے عمل میں آئی ہے۔ ورنہ جن حضرات نے سخت سے سخت قوانین پاس کرنے میں گورنمنٹ کی رفاقت کی، وہ ہندو سنگٹھن کے

جلسہ میں اس شد و مد سے ہرگز نہ شریک ہوتے۔ مگر یہاں تو یقین تھا کہ ہماری کوششیں عالم بالا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہیں تو پھر کیوں نہ دونوں ہاتھوں سے ثواب لوٹیں۔ قوم رہے یا مٹے اسکی کیا فکر۔ یہ ایک امر واقعی ہے کہ حکام نے بھی ہندو سنگھٹن کی تحریک سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اسلیئے روشمار کا اسمین تعداد کثیر سے شریک ہونا یقینی تھا۔ انکی شمولیت پر اظہار مسرت کرنا واقعات سے بے علمی کا اظہار کرنا ہے۔

ان مذہبی توجہات کو بھڑکانیکا الزام سب سے زیادہ طالبان کونسل کے گردنوں پر ہے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ کانگریس نے لبرل ۔ بردن کا پردہ فاش کر دیا تھا۔ رؤسا اور تعلقہ داران بھی جمہور کی نظروں سے گر چکے تھے۔ وہ حضرات جنھوں نے باوجود ادعاء حب الوطنی وکالت یا سرکاری ملازمت نہ ترک کی تھی۔ پبلک کی نگاہوں میں وقار کھو بیٹھے تھے۔ اس کثیر جماعت کے لیے اپنی کھوئی ہوئی آبرو کو حاصل کرنیکا، اپنی ساکھ جمانیکا، اپنی قوم پرستی کا ثبوت دینے کا، اور ایسے موقعہ پر جب کونسلوں کا انتخاب قریب تھا اس سے بہتر اور کونسا موقعہ ہاتھ آسکتا تھا۔ ہندو قوم خطرے میں ہے۔ کا نعرہ مار کر وہ حضرات ہندوؤں کے ہوا خواہ بننا چاہتے تھے۔ مسلم طبقہ میں بھی انکی تعداد کم نہ تھی۔ مذہبی تعصبات کو بھڑکانا شروع کیا گیا۔ اسے صاحب اور فلاں صاحب اپنے حقیقہ گوشوں سے نکل پڑے۔ اور جمہور کی دوستی کا دم بھرنے لگے ایک طرف سے صدا آئی ہندوؤں کو خلافت کی تحریک سے خبردار رہنا چاہیئے کیونکہ یہ انکی ہستی کو مٹادیگی۔ دوسری طرف نعرہ تکبیر بلند ہوا۔ ہندو ہمپر حاوی ہوتے جاتے ہیں سوراجیہ سے احتراز کرنا ہمارا فرض ہے۔ کہیں کسی میونسپلٹی نے قانوناً گاؤکشی بند کی۔ واویلا مچ گیا۔ غوغائیوں کی کمی نہ تھی۔ جیل جانا غائب اپنے اپنے گوشہ امن میں دبکے بیٹھے تھے۔ اب جیل کا خوف نہیں عزت افزائی کی امید تھی، پھر سکوت کیوں اختیار کریں۔ سوال وجواب شروع ہوا۔ روز بروز لہجہ سخت ہوتا گیا۔ ادھر لیڈر تھا تو ادھر متعدد اردو اخبارات اینگلو انڈین افسروں کی زہرہ ہدایت میدان میں آکھڑے ہوئے تھے۔ اعلان جنگ ہو گیا۔ جو اس ہنگامہ کو فرو کر سکتے تھے وہ جیل میں تھے۔ انکی جگہ لبرل حضرات نے لی۔ نتیجہ جو کچھ ہوا ظاہر ہے۔ وہ قوم کے دوست ثابت ہوگئے۔ سرکار سے بھی خوشنودی کا پروانہ عطا ہوا۔ نفاق کا بیج بویا گیا کانگریس کی یکجہتی کے لیے اسکا وقار مٹانیکے لیے۔ اسے پبلک کی نظروں میں ذلیل کرنیکے لیے۔ اور چونکہ کانگریس کا ایک حصہ خود ہی لبرل حضرات کا ہم غرض تھا اسنے بھی اس چنگاری کو بھڑکایا۔ کہ کہیں ہم اپنا بھرم نہ کھو بیٹھیں

کانگریس کے لیڈروں نے بھی مجرمانہ سکوت سے کام لیا۔ یہ ہے اس کشاکش کا نتیجہ جو اس وقت قوم کا نازک ترین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہ ساری آتش انگیزی یا تو محض کونسلوں میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے یا عوام کو خوش کرنے کے لیے تھی۔ لیکن اسکا اثر حصول مقصد کے بعد برسوں تک قائم رہیگا۔ ستم یہ ہے کہ اب بھی ہندو مسلم لیڈران قومی اتحاد کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ کونسلوں میں جو نمائندوں کی کمی نہیں ہے۔ ہندو سنگٹھن کو تقویت دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ تاریخی تعصبات کے مردے اکھاڑنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ کمی ہے تو اتحاد کے لیے اپنے تئیں وقف کر دینے والوں کی۔ فنا فی الاتحاد ہو جانے والوں کی۔ مسلمانوں میں علی برادران، مولانا ابو الکلام آزاد، ڈاکٹر کچلو اتحاد کے لیے اپنے کو وقف کر چکے ہیں۔ ہندوؤں میں یہ صف خالی ہے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ جس اتحاد کو مہاتما گاندھی نے سوراجیہ کا پہلا زینہ قرار دیا ہو اسکے لیے ایک بااثر ہندو بزرگ کلیتہً تیار نہیں ہے۔ اگر یہی لیل و نہار ہے تو سوراجیہ مل چکا اور اگر ملوکی کی دوکان پر دادے کا فاتحہ پڑھا جانا ممکن ہو تو ہمیں سوراجیہ کے نام پر فاتحہ پڑھ لینا چاہیئے۔

جیکر یم تنبیہ

مولانا محمد علی کیطرح منشی پریم چند مہاتما کے مخلص اور ملکی ترقی کے زبردست داعی ہیں۔ ملک کی ترقی کی [illegible] ہندو مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی ہے۔ اور ہم خوش ہیں کہ اب اہل ملک کو اس کی اہمیت کا احساس ہو چلا ہے۔ ہندو لیڈران اسکے دفعیہ کیلئے سرگرم کوشش ہیں۔ مسٹر پریم چند مسٹر سی آر داس کیطرح [illegible] ہیں اور ملک کے فائدے کیلئے حب الوطنی کے کام پر انسے انتہائی ایثار کے متمنی ہیں۔ مسٹر پریم چند کے اکثر مطالبات [illegible] جذبات کی پامالی کا شائبہ ہے۔ وہ مسٹر داس کے مجتہد ہیں۔ لیکن قوموں کے باہمی منافرت کا دفعیہ اسطرح ذرا مشکل ہے جو ایک کسی ایک قوم سے اپنے دیرینہ جذبات اور مذہبی محسوسات کو یک لخت ترک کر دینے کا مطالبہ ذرا ہم اور شاید ناممکن العمل مطالبہ ہے لیکن ملک کیلئے یہ کچھ کم خوش نصیبی کی بات نہیں ہے کہ فریقین کے بعض اہل الرائے اصحاب اتفاق باہمی کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ ہم اپنے قابل دوست کے رایوں سے متفق ہوں یا نہوں لیکن اس قسم کے صلح کن نظریوں کو ملک کیلئے باعث غنیمت سمجھتے ہیں۔ یہ مضمون بحث طلب ہے۔ اور زمانہ کے صفحات اس اہم مباحث کیلئے کھلے ہوئے ہیں ہم اپنے ہندو ناظرین سے اس مضمون کو ٹھنڈے دل سے پڑھنے اور اسپر خلوص دل سے غور کرنیکی درخواست کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص صدق نیت سے ملکی اتفاق کی ضرورت پر غور کرے۔ اور اسکے لیے زیادہ سے زیادہ ایثار نفس کیلئے تیار ہو جائے کیونکہ باہمی اتفاق کے بغیر ہماری ملکی نجات قطعی ناممکن ہے۔

(ایڈیٹر زمانہ)

ماجرائے ازل

تصادم آج پروانوں سے ہوتا ہو مرے دل کا — کہ بزم ناز میں دور عمل ہے شمع محفل کا
غزلخوانی کی فرمائش ہے اہل بزم کی مجھ سے — یہ اک ایما ہے درپردہ بیان قصۂ دل کا
وہ طالب ہیں اگر اسکے، اگر اصرار ہے انکو — سنا دو، ہاں سنا دو، رنگ [illegible] آج محفل کا
سبق آموز و عبرت خیز ہے لیکن ہے طولانی — یہ دردآمیز و حسرت خیز قصہ حسرت دل کا

طبیعت خلوت آرائی و تنہائی سے اکتائی — تو قصد جلوہ فرمائی ہوا اس حسن کامل کا
ہوئی تخلیق دل مد نظر حسن خود آرا کو — دل رنگیں کیا پیدا، جمایا رنگ محفل کا
ودیعت کر دیے جذبات الفت حسن نے دل کو — ہوا یہ حامل بار امانت عشق کامل کا
امانت دار بننے پر اک انداز محبت سے — خطاب اسکو ملا ظالم کا، لقب اسکو ملا جاہل کا
ہوا سامان دلچسپی، بصد رعنائی و خوبی — دل حسن آشنا پر کھل گیا در عیش منزل کا
بنا کسب ضیائے حسن سے سامان آرائش — صفائے حسن خود بین سے بنایا آئینہ دل کا
اُدھر وہ حسن بے پایاں، ادھر آئینۂ حیران — ہر اک محو تماشا بن گیا مد مقابل کا
جمال یار اُدھر مصروف تھا دلداری دل میں — پرستاری جمال یار کی، تھا کام ادھر دل کا

عہ انا عرضنا الامانۃ علی السموٰت والارض فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً جہولاً (سورہ [illegible] پارہ ۲۲)

ترجمہ:- ہم نے (اللہ تعالی فرماتا ہے) آسمان و زمین پر (اپنی) امانت پیش کی انھوں نے اسکے اٹھانے سے انکار کیا اور بوجہ (اہمیت بار عظیم کے) شق ہوگئے اور انسان نے اس (بار عظیم کو) اٹھا لیا۔ حقیقت میں وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل ہے" (بڑا ظالم ہے اپنے آپ پر ظلم اور ایسا ظلم کرتا ہے) اسکی ہمت و جرأت پر اس بلیغ و حقیقت ضمیر زبان سے آفرین و مرحبا کہا گیا۔ اور اسکی ذمہ داری کی اہمیت بتائی گئی۔

فنا فی الحسن تھا، توحید کی تعلیم کامل تھی
اور اک درس وفا تھا اتحاد حسن کامل کا

حواس و ہوش کے ادراک سے برتر تھا یہ عالم
نہ تھا کچھ دخلِ معقولات، آئین عقل عاقل کا

ابھی عشق مجازی کا نہ پردہ تھا نہ جھگڑا تھا
"آمد لیلیٰ" کا قصہ تھا، نہ لیلیٰ کا نہ محمل کا

ابھی مکر و فریب حسن سے ناآشنا دل تھا
نہ تھا سحر و زہرہ کا نہ تھا زہرہ شمائل کا

ابھی ہاروت اور ماروت کے ملنے میں تھی دیر
ابھی قصہ نہ پیش آیا تھا انکو چاہ بابل کا

ابھی نقش ہوا و حرص سے سادہ تھی لوح دل
ابھی ابھرا نہ تھا کتم عدم سے نقش باطل کا

ابھی خطرات آنے تھے نہ کچھ وسواس نفسانی
کہ سد باب تھا پہرا ابھی ان کے وسائل کا

غرض کچھ بھی نہ تھا حسن حقیقی تھا مراد دل تھا
وہی طالب تھا اس دل کا وہی مطلوب دل کا تھا

ہوا پھر قصد وسعت حسن کے شوق تماشا کو
ہوا منظور اسکو کچھ اضافہ حسن محفل کا

کہا اک ناز سے "کن" ہوگئی تخلیق عالم کی
زمانہ دیکھنے نکلا کرشمہ حسن کامل کا

ہوئے شمس و قمر پیدا، ہوئے ارض و سما پیدا
مقدر ان کو گردش، انکو ملے کرنا منازل کا

ہوئے لوح و قلم پیدا، ہوئے حور و ملک پیدا
ہوئے جن و بشر پیدا، بندھا نقشہ آب اور گل کا

مذاہب بھی ہوئے پیدا مسائل بھی ہوئے پیدا
مباحث بھی ہوئے پیدا کھلا دفتر دلائل کا

قلم نے لکھ دیا لوح جبین پر خط طغرا مین
"ہوا ہے حسن کو منظور اب امتحان دل کا"

محبوب لکھنوی

بیچین گھڑیان

کیا کہون ہوتا ہے اکثر اسقدر دل بیقرار
چاہتا ہے خود بخود رونیکو جی بے اختیار

یہ نہین معلوم کیون کس بات پر روتا ہون مین
یہ خبر ہے ہان کہ پہرون بیٹھکر روتا ہون مین

سوچتا ہون و مین بیتیرا کہ یہ کیا بات ہے
نیند آنی چاہئے اسوقت آدھی رات ہے

چاہتا ہون مین کہ غافل سو رہا ہوتا مین کاش
کہتے ہین گلیون مین چوکیدار جب ہشیار باش

اُنکی آوازین فضا مین گونجتی ہین بار بار
شب کی خاموشی مین پیدا کر رہی ہین انتشار

اپنے اوپر بس نہین ہے کیا کرون ناچار ہون
سو رہے ہین بیخبر سب اور مین بیدار ہون

گمشدہ میرا سکونِ دل میسّر ہو مجھے
اے مرے اللہ! قابو کچھ تو دلپر ہو مرے

حامد اللہ افسر بی، اے

یاس ہے حسرت ہے غم ہے اور شب دیجور ہے
اتنے ساتھی ہین مگر تنہا دلِ رنجور ہے

تیرا جانا تھا کہ غم خانہ پہ وحشت چھا گئی
مین یہ سمجھا تھا مرے گھر سے بیابان دور ہے

کثرت غم باعثِ محرومیٔ گریہ ہوئی
ورنہ اک طوفان ہماری آنکھ مین مستور ہے

ہائے کوئی بے خبر ہے محوِ آرائش اُدھر
کوئی دل تھامے اِدھر بیٹھا ہے اور مجبور ہے

ہین سرِ منزل مگر سودائیانِ جستجو
پھر رہین سرگرمِ سفر کہتے ہین منزل دور ہے

جب غرض والا کوئی آیا تو آنکھین پھیر لین
تم ہی پہ کیا ہے زمانے کا یہی دستور ہے

جھلملانے والے تارو! تم نے یہ کیا کر دیا
ذرہ ذرہ عالم ایجاد کا مخمور ہے

اپنی ہر ہر سانس پہ مین نے جھلک پائی تری
مین سمجھتا تھا کہ تو مجھ سے بہت ہی دور ہے

رو رہا ہے کوئی سناٹے مین پچھلی رات کے
دیکھ تو بھی چلکے شاید افسر مہجور ہے

کسی کی قبر کو دیکھ کر

(ایک غم نصیب کے خیالات)

مرنے والے کس زبان سے میں کہوں مردہ ہے تو
لوگ سمجھے ہیں تجھے مردہ؟ مگر زندہ ہے تو
پھر رہی ہے شکل تیری اب بھی آنکھوں میں مری
موت کی سرحد سے باہر ہے تیری زندگی

نقش ہے دل پر تری اک اک ادائے جان فزا
غنچۂ سربستہ تھا تو ہائے کیوں مرجھا گیا
کان کو بھی یاد ہیں تیری ترنم پاشیاں
یہ تو دن تھے پھولنے پھلنے کے اے نخل آشیان

زندگی سے تیری وابستہ تھیں ماں کی حسرتیں
رہ گئیں ناکام اس دنیا کی ساری نیتیں
مرگ بے ہنگام نے سب کو ملایا خاک میں
گردش ایام نے سب کو ملایا خاک میں

اف! تری وہ نزع کے دم کی نگاہ واپسیں
زندگی تھی تیری یا اک خواب حسرت آفریں
دیکھتی تھی جبکہ وہ بے کس کلیجہ تھام کر
ڈھونڈھتی ہے آنکھ مل مل کر جسے ہر سو نظر

تیرے آئین وفا کا کیا یہی ہے اقتضا!
ہو بھی سکتی ہے کوئی تدبیر اسکی سچ بتا!
تشنۂ دیدار صورت کو تری ترسا کریں ہم
تو ہمیں دیکھا کرے اور ہم تجھے دیکھا کریں ہم

اے غریق بحر غم اے نامراد زندگی + +
آہ تیرے پاؤں کو لغزش ہوئی تو کب ہوئی !
نامرادی حسرت و یاس و تمنا بیکسی
ذرہ ذرہ اسکا ہے تفسیر خواب زندگی
ڈوبتے ہیں تو لب ساحل کبھی دیکھا نہ تھا
یاس تک جانے میں جب باقی کوئی زینہ نہ تھا
وقف ہیں یہ چند کلیاں تیری تربت کیلئے
تیری تربت آئینہ ہے چشم عبرت کیلئے

ضمیر (دہا گلپوری)

بزم سخن

ذیل مین کرائسٹ چرچ کالج کانپور کے مشاعرہ کی غزلین درج کیجاتی ہین۔ جو دسمبر کے آخری ہفتہ منعقد ہوا تھا، چند غزلین نذر ناظرین ہین جنمین سے ابتدائی چار غزلین بلا انتخاب ہین باقی پانچ غزلون کے منتخب اشعار درج ہین

جناب مرزا جعفر علیخان صاحب اثر لکھنوی

معمہ تجلی سے حیرت کدۂ دل تھا — آئینہ تھا پہلو مین آئینہ مقابل تھا
ناکامی حسرت پہ سر پیٹتی تھین موجین — کشتی تھی تلاطم مین اور سامنے ساحل تھا
گلہائے نظارہ سے خالی تھے ابھی دامن — وہ آپ تماشائی اور آپ ہی محفل تھا
اس قتل کی لذت مین سب وصل کی لذت تھی — پیکان تھا کبھی دلمین پیکان مین کبھی دل تھا
پیمان محبت کو یون دل سے بھلا دینا — ترے لیے آسان ہو میرے لیے مشکل تھا
تو زہر اسے سمجھا غافل نہ مزا چکھا — یہ ذوق فنا کوشی اس زیست کا حاصل تھا
کیا لطف صبوحی تھا اُس نور کے تڑکے مین — سرخوش تھا ادھر ساقی سرشار ادھر دل تھا
تحصیل تھی حاصل کی یہ سعیِ دل وحشی — منزل پہ پہونچکر بھی سرگشتہ منزل تھا
جینے کے لیے مرنا مرنے کے لیے جینا — آسان سے یہ آسان تھا مشکل سے یہ مشکل تھا

مژگان سے ہو دامن تک مشکل سے اثر پہونچا
یہ خون کا اک قطرہ سنتے ہین کبھی دل تھا۔

جگر صاحب مرادآبادی

ہر پردۂ ہستی مین جب تو متشکل تھا — حیران ہون نہین جلوہ پھر کو نسا حائل تھا

وہ ہجر کے پردے میں جو وقت گزر واصل تھا ۔ اس درجہ لطافت تھی احساس بھی مشکل تھا
کیا سیر تھی میں جبتک آوارۂ ساحل تھا ۔ دریا کی طرح گم تھا کشتی کی طرح دل تھا
کیا چیز تھا یہ عالم کیا جسم مرا دل تھا ۔ حیرت کہ تھا آئینہ حیرت کے مقابل تھا
کل دیکھ کے یہ منظر قابو میں نہ پھر دل تھا ۔ بیتاب تھیں خود موجیں تشنہ جو ساحل تھا
جس میں کہ تیرے جلوے خود دوڑتے پھرتے تھے ۔ اس خون کا ہر قطرہ کونین کا حاصل تھا
وسعت نے نگاہوں کی تاریک کیا منظر ۔ اک ایک قدم ورنہ خود عشق میں منزل تھا
تھی شورش ہستی بھی تمہید فنا نیست ۔ ہنگامۂ محفل ہی برہم کن محفل تھا
جبتک تری نظروں سے تھا ربط نہاں مجکو ۔ پھیلا ہوا رگ رگ میں اک سلسلۂ دل تھا
جب غور کیا دم بھر سب نقش چمک اٹھے ۔ جب آنکھ ذرا کھولی آئینہ مقابل تھا
محدود تھا میں تھیں دیکھا نہ گیا ... نہ ۔ اک جلوۂ بیرنگی ہر رنگ میں شامل تھا
دل کھلتے الفت کی قیدیں ہی کتنا تھیں ۔ دیوانہ یہ ایسی ہی زنجیر کے قابل تھا
کونین میں برپا تھے جس جلوے سے ہنگامے ۔ عشاق کے سینے میں دیکھا تو وہی دل تھا
کل اتنی حقیقت تھی منصور و انا الحق کی ۔ ناچیز سا اک قطرہ دریا کے مقابل تھا
خود اپنی تجلی میں جب عشق تھا مستغرق ۔ ہر ثابت و سیارہ مدہوش تھا غافل تھا
اٹھتے تھے ادھر پیہم پردے رخ فطرت سے ۔ میں محو تماشائے صورتگری دل تھا
دونوں کے کشاکش میں مطلق نہ ملی فرصت ۔ میں تشنۂ دریا تھا دل تشنۂ ساحل تھا
کونین کا غم دل نے سب لے لیا اپنے سر ۔ آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا

کیا دن تھے جگر وہ دن جب صحبت اصغر میں
مخمور طبیعت تھی سرور مرا دل تھا

مولینا سعید رزمی بھوپالی

اک عمر میں اب سمجھا دنیا کا یہ حاصل تھا ۔ جو نقش تھا دھوکا تھا جو رنگ تھا باطل تھا
اے شوق طلب تو ہی وارفتۂ [illegible] تھا ۔ ہر نقش قدم ورنہ خضر رہ منزل تھا
وہ جلوۂ صد عالم جب رونق محفل تھا ۔ فطرت کا ہر اک ذرہ قربان صفت دل تھا

ہنگامۂ ہستی سے فرصت جو ملی دیکھا
اک داغ ندامت ہی کل زیست کا حاصل تھا

اے موج لب دریا سر پیٹ نہ تو اپنا
جو غرق ہوا اسمیں آزردۂ ساحل تھا

کچھ ذوق سماعت ہی دنیا کو نہ تھا ورنہ
ہر ساز خموشی میں اک زمزمۂ دل تھا

طوفان حوادث میں جب غور کیا میں نے
خود آپ ہی دریا تھا خود آپ ہی ساحل تھا

دنیا محبت میں کعبہ تھا نہ بتخانہ
ہر نقش قدم تیرا اک سجدہ گہ دل تھا

ہر سانس سے پیدا تھا اک محشر رسوائی
مانا کہ ترا رازی خاموش تھا غافل تھا

جناب احسن تمیمی ناظم حلقہ ادبیہ کانپور

ہستی کے فسانے کا جو باب تھا مشکل تھا
اک جان پُر ارمان تھی اک درد بھرا دل تھا

دل ڈوب گیا غم میں غم وہم کا حاصل تھا
دیکھا تو نہ دریا تھا موجیں تھیں نہ ساحل تھا

آئینۂ وحدت کی اللہ رے یک رنگی
جو عکس نظر آیا میرا ہی مقابل تھا

اک داغ ہے پہلو میں دل ہے نہ تمنا میں
برسوں اسی خلوت میں ہنگامۂ محفل تھا

اک جلوۂ رنگین تھا دامان تمنا میں
اس پردے میں کیا جانے تم تھے کہ مرا دل تھا

اس جلوۂ باطل کا اب راز کھلا احسن
امید کا مٹنا ہی امید کا حاصل تھا

جناب رشک صاحب فتحپوری

بیجا نہ تھا یہ کچھ بھی گر شکوۂ قاتل تھا
میں بھی تو اک انسان تھا پہلو میں مرے دل تھا

سو مرحلۂ الفت اک آن میں طے کرتا
قابو میں مگر دل کا آنا ہی تو مشکل تھا

وہ کشمکش پیہم اٹھی شب کہ معاذ اللہ
غم دل کا مقابل تھا دل غم کا مقابل تھا

دنیا کا ہر اک ذرہ بے چین تھا کیوں یا رب
ہر ایک میں پوشیدہ شاید کہ مرا دل تھا

تم خود کرو اندازہ ارمان رشک کی حسرت کا
ڈوبی ہے جہاں کشتی دو ہاتھ پہ ساحل تھا

حافظ اشرف علی صاحب حافظ کانپوری

اسقدر جلایا ہے سوز غم پنہاں نے　　اک داغ سا باقی ہے سینے میں جہاں دل تھا
اے بیخبر مستی دیکھا ہی نہیں تو نے　　میخانۂ الفت کے پہلو میں اک دل تھا
کیا حوصلہ افزا تھا ذوقِ طپش پیہم　　جب درد نہ تھا دل میں اسوقت بھی بسمل تھا

جناب ہاروتی ویلوری

اسطرح محبت میں بدنام مرا دل تھا　　ہر آہ میں پنہاں تھا ہر اشک میں شامل تھا
بجھنے پہ بھی روشن ہے یہ شعلہ بھی عجب دل تھا　　برسوں کسی محفل میں شمع سر محفل تھا
بلبل کے ترانے پر گو پھول ہنسے لیکن　　جو غنچہ تھا گلشن میں اک درد بھرا دل تھا
دلکو نہ پسند آیا ممنون خرد ہوتا　　اللہ رے ہشیاری کس شان سے غافل تھا

جناب فوقی کچھوچھوی

غم کا یہ نتیجہ تھا الفت کا یہ حاصل تھا　　جو داغ تھا سینے میں گویا وہ مرا دل تھا
اس بحر حوادث نے کیا کیا نہ دیئے دھوکے　　ہر موج کے دامن میں اک منظر ساحل تھا
اللہ نہ دکھلائے یہ منظر ناکامی　　کشتی مری کب ڈوبی جب سامنے ساحل تھا
ممنون ہوں میں تیرا اے ذوق غم اندوزی　　اب دل میں نہیں قائم وہ نقش جو باطل تھا

جناب فرحت کانپوری

سوز غم پنہاں ہے یہ عشق کا حاصل تھا　　ہر اشک تھا اک چھالا ہر قطرۂ خوں دل تھا
خود یاس میں پنہاں تھے امید کے سو جلوے　　جو جلوہ نظر آیا برباد کن دل تھا
جب آنکھ کھلی مر کر اک خواب تھی یہ دنیا　　ہستی جسے سمجھے تھے اک جلوۂ باطل تھا

جناب متین صدیقی کانپوری

اس بحث سے کیا حاصل ناقص تھا کہ کامل تھا　　سرمایۂ عمر اپنا جو کچھ تھا یہی دل تھا
آنکھوں سے لہو سا کچھ بہتا تھا جو فرقت میں　　ہم اشک سمجھتے تھے دیکھا تو وہی دل تھا
تم بیٹھے تو دم آخر کی آ کے مسیحائی　　ہر چند شفا پانا بیمار کا مشکل تھا
جس طرح سے بھی لایا لایا ترے کوچے میں　　کہنے کو تو دل اپنا ناواقف منزل تھا

ڈاکٹر ایٹس

نوبل پرائز جو ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر ڈاکٹر ٹیگور کو ملا ہے سب سے پہلے ڈاکٹر ڈبلو۔ بی ایٹس کو ملا۔ ڈاکٹر صاحب ۱۸۶۵ء مین آئرلینڈ کے شہر ڈبلن مین پیدا ہوئے تھے۔ انھون نے ابتدا مین ان سیاسی رہنماؤن کیساتھ کام شروع کیا جو آئرلینڈ کو انگلستان کے قبضہ سے بالکل آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو ہند قدیم کے فلسفہ سے خاص دلچسپی ہے اور عمر کیساتھ ان کا یہ شوق بڑھتا گیا اور وہ ہندو فلسفہ کا برابر مطالعہ کرتے رہے۔ شروع شروع مین انھون نے اپنے مخصوص طرز شاعری مین اس فلسفہ کو پیش کیا ہے تو لوگون نے انھین ہاتھون ہاتھ لیا اور ادبی دنیا مین انھون نے بہت جلد ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ ڈاکٹر ایٹس صرف سیاسی کامون تک اپنی ذات کو محدود رکھنا نہین چاہتے۔ اور نہ صرف شاعری کی خیالی دنیا ان کی مطمح نظر ہے۔ بلکہ آپکا خیال یہ ہے کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لیے ملک مین ایسی صلاحیت پیدا ہونا چاہیے جس سے وہ اپنی نظرون مین آپ موقر ہو سکے۔

ایکی شاعری نری خیالی شاعری نہین ہوتی وہ میدان ترقی مین قدم بڑھانا سکھاتی ہے۔ مردہ دلون جوش پیدا کرتی ہے اور نوجوانون کو وہ طریقے بتاتی ہے جن سے ان مین حیات قومی کے آثار پیدا ہو سکتے ہین آپنے کئی ڈرامے بھی لکھے ہین اور آئرش ڈراما نویسون کی ایک خاص روش پر لگا دیا ہے جس مین انکو نمایان کامیابی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیالات اس عالم مادی مین محدود نہین رہتے وہ عالم بالا اور عالم ارواح کے مضامین نظم کرتے ہین اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی فلسفیانہ مسئلہ کو بیان کرتے ہین۔ لیکن عوام اسکو نہین سمجھ سکتے۔ پیش پا افتادہ باتون اور پامال مضامین سے ان کی شاعری الگ ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل بنی نوع انسان کی محبت و ہمدردی سے بھرا ہوا ہے۔

ان کی شاعری مین محض لفاظی نہین ہوتی بلکہ وہ اپنے کلام مین فلسفیانہ نظریات اخلاقی مسائل تصوف کی چاشنی اس خوبی سے سموتے ہین کہ دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔

نظری متانت کی جھلک بھی ان کے کلام میں اکثر نظر آتی ہے ان کی انگریزی نظموں میں زبان کی وہ تمام خوبیاں موجود ہوتی ہیں جو زبان اور اہل زبان کے لیے سرمایۂ ناز ہو سکتی ہیں۔ لیکن زبان کی خوبیوں کے علاوہ علمی خیالات، فلسفیانہ مسائل، اور تصوف کے نکات کو وہ نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ اُنکی ان جذبات کا فقدان نہیں ہوتا لیکن متانت سنجیدگی کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پاتی وہ جذبات کی تصویر بڑی خوبی سے کھینچتے ہیں اور جب چاہتے ہیں تو نہایت آسانی سے سامعین یا ناظرین کے جذبات کو اپنے حسب منشا مشتعل کرا دیتے ہیں۔

غرض ڈاکٹر صاحب موصوف ہر طرح اس انعام کے مستحق تھے اور فیصلہ کنندگان نے ان کو انعام کا مستحق ٹھیرا کر اپنے مذاق سلیم کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔

ہندوستان میں خود نوشت حالات لکھنے کا زیادہ رواج نہیں ہے اور سوانح عمریاں بھی کم ہی لکھی گئی ہیں۔ حالانکہ اچھی سوانح عمریوں کی ہر ملک کے علم ادب میں ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ ہمارے ناظرین یہ سنکر خوش ہونگے کہ پولیٹکل زندگی سے کنارہ کشی کے بعد مشہور محب وطن سر سریندرناتھ بنرجی آجکل اپنی سوانح عمری لکھ رہے ہیں۔ بلکہ اسکے چند باب بھی ختم ہو گئے ہیں اور امید ہے کہ چند ماہ میں یہ کتاب مکمل ہوکر شایع ہو جائے گی۔ سر سریندرناتھ صاحب نے آجتک پولیٹکل جد وجہد ہی میں اپنی عمر بسر کی۔ آپکے خود نوشت حالات بہت ہی دلچسپ ہونگے اور زمانہ حال کے سیاسی تاریخ کے بہت سے واقعات کی اندرونی حالات معلوم ہو سکیں گے۔

مولینا عبد الحفیظ حافظ مرحوم (کلکتہ) کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا تھا۔ اب مولانا وحشت (کلکتہ) نے ڈھاکہ کے موقر رسالہ جادو میں لکھا ہے۔ کہ مرحوم کے انتقال کے بعد تکیہ کے نیچے ذیل کا شعر ایک پرچہ پر لکھا ہوا پایا گیا۔ غالباً مرحوم کا یہ آخری شعر ہے ؎

اے زمین کے رہنے والو کچھ جگہ باقی رہے
اس نئی بستی میں اک خانہ خراب آنے کو ہے

مضمون جتنا اچھوتا ہے۔ اتنا ہی برمحل ہے۔ اہل بصیرت اسکا حقیقی اور وجدانی لطف اٹھا سکتے ہیں

علمی خبریں اور نوٹ

اردو رسالوں میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ گو ہمارا خیال ہے کہ جتنے رسالے جاری ہوتے ہیں اتنی ترقی عام مذاق میں نہیں ہو رہی ہے۔ تاہم یہ سب علمی کوششیں قابل قدر ہیں۔ پچھلے سال کے نئے رسالوں میں جادو خاص طور پر قابل قدر ہے۔ یہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا ہے اور اسکے ہر نمبر میں بعض مفید اور محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ہمکو امید ہے کہ یہ رسالہ صوبہ بنگال میں اردو کی ترجیح و اشاعت کا ذریعہ بنیگا۔ اخیر کلکتہ سے مستورات کیلئے بھی حور نامی ایک دلچسپ پرچہ جاری ہوا ہے۔ بنگال سے ان رسالوں کے اجرا پر ہر ترقی خواہ اردو کو مسرت ہوگی۔

دہرہ دون سے مظاہر جدید۔ ایک رسالہ نکلا ہے۔ جسمیں سائنس کے چٹکلے اور علوم جدیدہ کے حالات وغیرہ چھپتے ہیں۔ اسکی ترتیب وغیرہ میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ اسکے کارکنوں کو مستقل مضامین کی حاصل کرنے کیطرف توجہ کرنی چاہیئے۔

ہمارے دوست ملا محمد الواحدی اردو کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ یہ خدمت نمایاں کامیابی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ حال میں آپ نے ایک اور نیا پندرہ روزہ رسالہ درویش نامی جاری کیا ہے جو آپکے دیگر رسالوں کیطرح خواجہ حسن نظامی صاحب کے زیر سرپرستی شائع ہوتا ہے۔

آپکا رسالہ نظام المشائخ نکل رہا ہے مگر اب گلچین اور خطیب ہمارے ناچیز مشورے کے بموجب بند کر دیئے گئے ہیں۔

یورپ کا مذاق علمی اس حد تک ترقی کر گیا ہے کہ مرحوم ایلی آف کربرنٹ کی انیس[۱۹] کتابیں صرف نصف گھنٹے میں پینتیس ہزار پونڈ میں فروخت ہوگئیں۔ انہیں کتابوں میں ایک کتاب ایسی ہے جسکی قیمت چھ ہزار پونڈ ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر نصیر الدین صاحب مراد ایم-ایس-سی شعبۂ طبعیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے ارادہ کیا ہے کہ سائنس اور دیگر فنون کے متعلق انگریزی کی بعض مشہور و عام فہم تصانیف کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ انکی زیر ہدایت ہمارے کرم مسٹر عبد الشکور صاحب بی۔ اے آجکل کتاب Discovery کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس ترجمہ کا ایک حصہ زمانہ بابت ماہ نومبر ۱۹۲۲ء میں ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے۔

اردو میں کتاب چھپانا ایک مہم سے کم نہیں ہوتا۔ ملک میں گنتی کے چند مطابع ہیں جو پورے طور پر مکمل پریس کہے جا سکتے ہیں۔ اور یہ بھی بہت کم ایسے ہیں جو پابندی وقت کیساتھ حسب مرضی کام کر سکیں۔ اس کا اندازہ انہیں کو ہو سکتا ہے جنکو کبھی کوئی کتاب چھپوانیکا اتفاق ہوا ہو۔ انگلستان میں پریس نے جو تکمیل کا درجہ حاصل کیا ہے اسکا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ حال میں مشہور و معروف مصنف مسٹر رڈیارڈ کپلنگ نے اپنی ایک تصنیف پہلے کرسمس کیلئے چھپوانا چاہی تھی ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو یہ کتاب پریس میں بھیجی گئی۔ دو دن کے اندر مطبع نے ٹائپ میں کتاب تیار کر لی اور پروف وغیرہ پڑھکر تمام غلطیاں بھی درست کر دیں۔ اسکے بعد فوراً ہی اسکے الیکٹرو ٹائپ تیار کر لیے گئے۔ اور ۲۶۔ اکتوبر کو چھپائی شروع ہوئی۔ ۳۰۔ اکتوبر کو کتاب چھپکر تیار ہو گئی اور ۳۱۔ تاریخ کو اسکی پانچ ہزار جلدیں جلد بندی کے لیے دی گئیں۔ اس کتاب کیلئے کاغذ مسرس جان ڈکنس نے خاص طور پر تیار کیا تھا ۲۲۔ اکتوبر کو ساڑھے تین بجے دن کیوقت انکو آرڈر دیا گیا اور دوسرے ہی دن صبح کو انھوں نے دو ٹن کاغذ تیار کر کے مطبع بھیجدیا اور ۲۶۔ اکتوبر تک آرڈر کی تعمیل کر دی! کیا اردو میں بھی کبھی یہ ممکن ہوگا؟

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے یونیورسٹی گریجویٹ ہندوستانی زبانوں کی ترقی کیطرف متوجہ ہوئے ہیں اور یونیورسٹیاں انکی پوری حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ ہمارے صوبہ کی الہ آباد و لکھنؤ یونیورسٹیوں میں اردو ہندی کے توسیع و ترقی کے لیے انجمنیں قائم ہو گئی ہیں۔ ان دونوں ادبی مرکزوں کی اردو انجمنوں کے حمایت میں آجتک کئی لکچر ہو چکے ہیں اور اپنے اپنے رسالے شائع کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہماری رائے میں نئے رسالوں کو جاری کرنے کی بہ نسبت مستند کتابوں کا ترجمہ شائع کرنا بہتر ہوگا۔ کیا اچھا ہو جو ہمارے قلم دوست نوجوان اردو زبان کی ترقی کیلئے ابھی سے باقاعدہ کوشش کرنا آغاز کر دیں۔ تصنیف و تالیف

کی قابلیت اور اسمین مشق حاصل کرنیکا بہترین موقعہ طالبعلمی ہی کا زمانہ ہے۔ ترجمون اور مضمون نگاری کے ذریعہ اردو کو بہت کچھ نفع پہونچ سکتا ہے۔ اور ابھی اسکی بڑی گنجائش بھی ہے۔ صوبہ بہار مین بھی انجمن ترقی اردو قائم ہوئی ہے۔ بہتر ہو کہ پٹنہ یونیورسٹی کے گریجویٹ صاحبان بھی اسطرف توجہ کرین۔

ہندوستانی زبانون کا مستقبل سرور شاندار نظر آتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے اردو زبان کے ذریعہ اعلیٰ ترین تعلیم دینے کا بندوبست کیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی نے عرصہ سے بنگالی زبان کو بی۔ اے کلاس کے کورس مین داخل کر رکھا ہے۔ اب ہمارے صوبہ کے انٹرمیڈیٹ بورڈ نے بھی یہ طے کر دیا ہے کہ اسکولون مین درجہ نہم یعنی انٹرینس کلاس (اسکول لیونگ کلاس) تک کی کل تعلیم اردو ہندی یا انگریزی مین دیجا سکتی ہے اور طلبا کو بھی اختیار دیدیا گیا ہے کہ وہ سوالات کے جوابات جس زبان مین چاہین دیسکتے ہین۔ اگر کوئی طالبعلم چاہے تو سب پرچون (انگریزی زبان کے پرچہ کے علاوہ) کے جوابات اردو مین لکھ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا سہولیت ہوسکتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ اور رفتہ رفتہ بی۔ اے کلاس کیلئے بھی یہی سہولیت ہوجائے گی۔ اس سے زیادہ ملک کی اور کیا خوش نصیبی ہوسکتی ہے کہ ہمارے نوجوان غیرملکی زبان کے ساتھ ساتھ (یا اسکے بجائے بھی) اپنے ملکی زبانون مین سے کسی مین دستگاہ حاصل کرین۔ مگر اسکے ساتھ ساتھ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ تصنیف و تالیف و ترجمہ مین غیر معمولی ترقی کا سامان کیا جائے۔ تاکہ دیسی زبانون کا ادبی خزانہ زمانہ حال کے ضروریات کا ساتھ دیسکے۔

پچھلے سال ہندی رسالون کی خاص طور پر ترقی ہوئی ہے اور مہر آدھوری لکھنؤ تو واقعی سب پر گوئے سبقت لیگیا ہے ہر ماہ اسمین تین چار رنگین اور پچاسون سادی تصاویر شایع ہوتی ہین مضامین کا حجم بھی سب سے زیادہ ہے یعنی ہر ماہ نظم و نثر کے قابل قدر سو سوا سو صفحات ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہین چھپائی کاغذ اور دیگر محاسن ظاہری مین یہ رسالہ نہایت درجہ دیدہ زیب ہے۔ مادھوری واقعی انگریزی کے بہترین باتصویر رسالون کے طرز پر شایع ہو رہا ہے اور ہم اسکی کامیابی پر اسکے کارکنون کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہین۔ حال مین مادھوری نے گوسوامی تلسی داس کی سہ صد سالہ برسی کی یادگار ایک خاص نمبر نہایت اعلیٰ اہتمام سے شایع کیا تھا۔ ایسی اولوالعزمی ہر طرح سے قابل قدر ہے۔ مہر پربھا کا نپور تھا۔ انمین ناگپور کے قومی جھنڈے کی ستیہ گرہ کے متعلق ایک خاص نمبر نکالا تھا جسمین اس تحریک کے متعلق دلفریب تصویرین دی گئی تھین ہم موصوف کی ترقی بھی ہر طرح قابل مبارکباد ہے۔ مہر سوقی ندآباد نے امسال خوب ترقی کی ہے۔ اسکے جنوری نمبر مین تین رنگین اور متعدد سادہ

پر شایع ہوئی ہین۔

بعض مضمون نگارون نے یہ عجیب افسوسناک طریقہ اختیار کیا ہے کہ دوسروں کے مطبوعہ
ین خفیف رد و بدل کے ساتھ اپنے نام سے شائع کرا دیتے ہین۔ ابھی حال مین رسالہ زمانہ
ایک صاحب سردار احمد صاحب نے اسی قسم کا دھوکہ دیا ہے۔ زمانہ جنوری مین جو قصہ
کے گنہگار کے نام سے چھپا ہے اسکے مصنف ہمارے مکرم بھاشے سدرشن ہین۔ اس سے پہلے
دلچسپ مجموعہ "قوس و قزح" مین چھپ ہو چکا ہے۔ اس قصے کا مسودہ ہمارے پاس موجود
عبارت مین جا بجا معمولی رد و بدل کر دیا گیا ہے۔ ہم اس دھوکے پر جو ہمکو اور ناظرین زمانہ کو
یا۔ اظہار افسوس کرتے ہین۔ آیندہ سے ہم سردار احمد صاحب کا کوئی مضمون رسالہ زمانہ مین شائع
تیار نہین۔ غالبا اس طرز عمل سے ان حضرات کو تنبیہ ہوگی جو غیر و نکے مضامین کو نقل کرکے الٹ پھیر سے اپنا بنا
لال رکھتے ہین اور ترجمہ کو تصنیف کے رنگ مین ظاہر کرنا باعث فخر سمجھتے ہین۔

انشاء اللہ زمانہ آیندہ اس قسم کے مضمون نگارون کی عنایت سے محفوظ رہنے کی پوری کوشش
ا۔ زمانہ خود بھی اس قسم کے سرقون کا اکثر شکار ہوتا رہتا ہے۔ یعنی کبھی کبھی اسکے شائع شدہ مضمون دوسرے
لون مین شائع ہوتے رہتے ہین۔ ہمین ان مضامین نگار حضرات کی شہرت پسندی اور جسارت پر افسوس ہے
س قسم کے اخلاق کش افعال کے مرتکب ہوتے ہین۔ وہ حضرات بھی قابل تحسین نہین ہو سکتے ہین جو اپنے
ون کو بار بار چھپوانا باعث فخر خیال فرماتے ہین۔ حال مین ہمارے دوست حکیم یوسف حسن صاحب کا
شکایتی خط موصول ہوا ہے۔

دسمبر ۱۹۱۱ء کے شباب اردو مین ایک افسانہ علمی کسی بھی کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ چند سال گذرے یہ افسانہ علاوہ دیگر مین شائع کیا تھا
جب یہ قصہ رسالہ زمانہ مین درج ہو چکا تو اسکو شباب اردو مین شائع کرنیکے لیے ضروری تھا کہ میری یا اڈیٹر زمانہ کی اجازت حاصل کی جاتی
یا کم از کم حوالہ زمانہ اسکو شائع کیا جاتا۔ لیکن شباب اردو مین یہ قصہ مسز بشارت سلطان کلکتہ کے نام سے درج ہے البتہ کہیں کہیں تھوڑی
کا اضافہ بھی کیا گیا ہے گو یہ ہرگز موافق نہین ہے۔ بلکہ منقول کیساتھ لفظ زمانہ بھی لکھنے کی ضرورت تھی۔ معلوم نہین کہ مسز
بشارت سلطان نے کن مصلحتون کی بنا پر زمانہ کا نام لکھنا ضروری نہین سمجھا۔ اڈیٹر کا علم اسکا تحمل نہین ہو سکا۔ ہو سکتا ہے کہ
کہ [illegible] رسالوں مین اس قدر کام کیا جاتا ہے کہ [illegible] ہر حال ہمین معلوم ہے کہ نقل [illegible] یہ کہ یہ فعل [illegible]
حکیم یوسف حسن [illegible]

[illegible]



رسالہ پنچا کانپور کی اجازت سے



جرمن مال کی کثرت



بازارون مین جو مال نظر آتا ہے سب پر جرمنی بنا ہوا لکھا ہی

سوراج پارٹی





موجودہ برٹش پارلیمنٹ مین پارٹیون کی حالت

پہلے ہی سے استعمال کرتے صاحب ... کی ذرا علاج ہو کر ... صاحب

... اپنے ننھے میاں منھو شکوہ و شکایت پہلے سے آپ ہی کریے صاحب



ہماری نیک صلاح

اگر آپ تندرست رہنا چاہتے ہیں!
اگر آپ میں کسی طرح کی بھی کمزوری ہے-؟
اگر آپکو دھات کی کوئی بھی بیماری ہے-؟
اگر آپ کسی قسم کے جریان میں مبتلا ہیں؟
اگر آپ میں دماغی کمزوری ہے-؟
اگر آپ کو رات کو نیند نہیں آتی-؟
اگر آپ کا ہاضمہ اور حافظہ خراب ہے؟
اگر آپ کسی بیماری کے سبب پیلے پڑ گئے ہیں-؟

تو ڈیڑھ سو برس کی آزمودہ

مصری جیون پربھا گٹکا

دن میں دو بار ٹھنڈے پانی یا دودھ کیساتھ کچھ روز متواتر استعمال کیجئے ہم شرطیہ کہسکتے ہیں کہ جسمانی اور دماغی کمزوریوں کے لیے بیحد و کیطرح اثر کرنیوالی ویدک شاستر کی دوا ہے- دماغی کمزوری جسمانی کمزوری نسوں کی کمزوری بیماری کے بعد کی کمزوری کھانا ٹھیک طرح ہضم نہونے سے پیدا ہونیوالی زیادہ پڑھنے سے پیدا ہونیوالی کمزوری تھکاوٹ کی کمزوری- "مادہ" کی زیادتی اخراج سے پیدا ہونیوالی کمزوری کو بہت جلد دور کرتی ہے- خون کی کمی- پیٹ کی خرابی- بواسیر- عورتوں کا ٹھیک ٹھیک حیض کا نہونا یا حیض کا جلد جلد اور زیادہ ہونا بچہ والی عورتوں کو دودھ کم آنا وغیرہ شکایتوں کے لیے یہ دوا امرت کا سا اثر کرتی ہے- تیر بہدف کا کام کرتی ہیں اردو- ہندی- سنسکرت- مرہٹی اور انگریزی- دوا کے استعمال کا پرچہ دوا کے ساتھ بھیجا جاتا ہے-

دن دونوں وقت استعمال کرنے کے لائق دوا کی قیمت عہ ایک روپیہ آٹھ آنہ-

دوا ملنے کا پتہ مصر کا آیورویدک جیون پربھا دواخانہ نمبر ۱ فیلخانہ کانپور

ٹیلی ویژن ... مینیجر اعظم ایجنسی

... ... سال کا ... مفید ... ... بیان ...
... ... قومی و ... ...
... ... نظر کتا ... ... کلان ...
... ... چند ... ... بھر ... جیکر ... غلب
... ہونے ... تجارتی سوداگران کے شتہا کے
... بہترین ذریعہ ہے۔

تاریخ شاہنشاہان دنیا بھر کی سلطنتون کے موجودہ ... ... کی
... ... وغیرہ دو جلد قیمت ...

مخزن الصفوا ... دنیا بھر کے اوزان و پیمانے تصاویر سکہ جات اور مختلف
... دو جلد ...

تاج و نشان دنیا بھر کی سلطنتون، ریاستون کے تاج و نشان ... ...
دستار و کلاہ تمام دنیا کی مختلف قسم کی پگڑی ٹوپی کنٹوپ خود
... وغیرہ کی تصاویر۔

... تواریخ فن ... ... تمام ... فن کے ... ...
جنگ یورپ اس جنگ کے مفصل حالات تفصیل واقعات کی پہلی کتاب ...
... جنگ ... ... قیمت ...

... ...
تاریخ اودھ ... ...
حالات ... جلد ...
تذکرۃ السلوک ... فلسفہ اور حکمت ...
صوفیہ قیمت ...
احسن الاذکار ... صاحب کی مفصل ... ...
ونسب وغیرہ اور مناقب ... ...
اصول و فقہ اردو فقہ مین نہایت مکمل اور شرح ...
طلبا کو نہایت مفید ہے قیمت ...
بحر الغرائب طریقہ ... شرح ... خواص اسمائے خداوند
مفصل قیمت ...
تاریخ ... ہر قوم کی ... مستند تاریخ کلان و خورد قیمت ...
... کالج علیگڈھ کالج ... ... کے ... روایات ...
سوانح عمری مہاراجہ ... سابق ... دولت آصفیہ قیمت ...
افسون ہند ... کا ناول ... پڑھنے کی ...

المشتہر مینیجر اعظم ایجنسی مراد آباد

تالاب

یکم اپریل ۱۹۲۳ء سے پرانے پبلک گارڈن واقعہ نواب گنج کانپور کے تالاب مچھلیان
شکار کرنے کی جدید ٹھیکے لینے کی بابت درخواستین مطلوب ہین مفصل شرائط
حسب ذیل پتہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہو سکتی ہین

پرنسپل اگریکلچرل کالج کانپور

... ...
... ...

رامی ... رجسٹرڈ

... ... خارش، سرخی کمزوری نظر کو مفید
... کا شرطیہ علاج ... ہونے نہین پاتے۔
... کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ ایک تولہ کی
شیشی بہ ... ایک روپیہ چار آنہ ...

جماد رجسٹرڈ

سفید موصلی کا دیسی کھانڈ کا سوہن حلوا۔ ... جسمانی
اور مردی طاقت کی دوا موسم سرما کا تحفہ خوش ذائقہ
لذیذ میٹھا۔ ایک ڈبہ کھا کر اپنے وزن مین ... ...
۲۵ تولہ کا ڈبہ دو روپیہ آٹھ آنہ ... علاوہ
محصول ڈاک۔

المشتہر
مینیجر رامی ... ... اسمٰعیل خان ...

اصلی کیسری

قیمت فی

بال شفا

احسن الکلام

قیمت ۲

اردو ادب [illegible] جدید کتابیں

[illegible] اسلام [illegible]
[illegible] نواب [illegible] الملک مرحوم [illegible]
سلطنت گورنمنٹ [illegible] زیر سایہ [illegible]
[illegible] کے متعلق نہایت وضاحت سے بحث کی ہے۔
[illegible] ۱ر

[illegible] آریہ سماج کے متعلق بہترین خیالات قیمت ۲ر
[illegible] ذات پات کی [illegible] - ذات پات
کے [illegible] بہترین خیالات قیمت ۲ر

[illegible] عالم ادب سنسکرت عالم ادب کے متعلق معلومات
قیمت ۴ر

مضامین [illegible] قاری عباس حسین دہلوی کے
ادبی [illegible] اور [illegible] مضامین کا مجموعہ قیمت فی
جلد [illegible] مجلد [illegible]

[illegible] حسن دلکش کی سچی داستان - [illegible]
[illegible] قیمت ۶ر

مثنوی سحر کا بیداس کی مشہور و معروف شکنتلا کا
[illegible] مثنوی سحر پڑھئے قیمت ۶ر

[illegible] کلوپیٹرا اور انسانی کی حسرت بھری
داستان [illegible] تاریخی واقعہ حسن دلکش کی [illegible] قیمت
فی جلد [illegible] [illegible]

چوروں کا کلب مولفہ ظفر عمر بی اے علیگ قابل
دید ناول قیمت [illegible]

نیلی چھتری سراغرسانی کا عجیب وغریب افسانہ اردو
میں اپنی [illegible] کا پہلا ناول - قیمت [illegible]

مکاتیب شبلی علامہ شبلی مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ۲ حصہ
قیمت [illegible]

[illegible] الجماعت فرقہ اہل سنت والجماعت
کے اصول [illegible] کی تحقیق قیمت ۸ر

برکلے اور [illegible] کا فلسفہ مشہور فلاسفر برکلے کے
حالات زندگی اور اُنکے فلسفہ کی تشریح قیمت [illegible]

[illegible] جلد کے بتیس حصوں کا مجموعہ
قیمت [illegible] ۱۲ر

[illegible] ناول [illegible] کے متعلق نہایت وضاحت سے
بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۵ر

یادگار قومی ملک کے مشہور ترین انشاپردازوں کے
۵۱ مضامین اور ۴۹ دلکش عکسی تصاویر بہترین قیمت [illegible]

شریف بدمعاش قابل دید ناول قیمت صرف [illegible]

فلسفہ جنگ قابل دید ناول قیمت [illegible]
دکھایا گیا ہے قیمت ۸ر

ناول ہاسی فارسی قاری سردار حسین دہلوی کے
اخلاقی ناول یعنی [illegible] سعید۔ سعادت کا
مجموعہ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

نصائح جہانگیریہ یعنی نامور شہنشاہ جہانگیر کے مشہور [illegible]
کلام کا اردو ترجمہ قیمت ۶ر

طریق دولتمندی اسمیں دولت حاصل کرنے کے
طریقے نہایت خوبی سے دکھائے گئے ہیں قیمت ۸ر

گورا دکھیا [illegible] کی رام کہانی وید مقدس اور [illegible]
ہندی کی رو سے عقد بیوگان پر دلائل قیمت [illegible] ۱۲ر

حسن سرور کامل حکیم علی مرحوم کا مشہور زمانہ ناول
۲ حصوں میں قیمت [illegible]

امتحان وفا انگلستان کے مایہ ناز شاعر لارڈ ٹینی سن کے
ایک مشہور افسانے کا ترجمہ قیمت ۶ر

جہان آرا بیگم مشہور سے جہان کی سوانح عمری قیمت
صرف ۸ر

دستہ گل علامہ شبلی مرحوم کی فارسی غزلیں قیمت ۴ر
برگ گل " " " " ۴ر

مبادی علم انسانی مادیت کی تردید میں برکلے کی مشہور
کتاب پرنسپلز آف ہیومن نالج کا نہایت سنجیدہ اور سنجیدہ
ترجمہ جسمیں حواس انسانی پر بحث کرکے مادیت کا ابطال کیا ہے
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے [illegible]

زمانہ

جلد [illegible] | اپریل ۱۹۲۳ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

تصاویر (۱) [illegible] (۲) [illegible]

[illegible] زمانہ [illegible] سے شائع ہوا [illegible]

[illegible]

زمانہ

جلد ۴۲ — اپریل ۱۹۲۴ء — نمبر ۴

مسلمان[1] اور علوم ہند

فن موسیقی کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ خود سنسکرت بھی اسپر بہت سے تصانیف کی سرمایہ دار ہونے کا فخر نہین کر سکتی۔ اور وجہ اسکی ظاہر ہے۔ اس فن کا کمال حاصل کرنے مین کتابون سے عملی امداد کی امید رکھنے پر صرف آجکل کے استاد جی ہی نہین ہنستے بلکہ تمام ایک گندھرب اور گنی ہمیشہ سے اسکا مضحکہ اڑاتے چلے آتے ہین۔ خیال تھا اور اب بھی ہے کہ اس فن کی نظریات اور عملیات ایسے آپسمین جکڑے ہوئے ہین کہ اول الذکر کا الگ جداگانہ وجود حیطۂ تصور سے باہر ہے۔ بلکہ ہندوستانی موسیقی سے طرائقہ تحریر بذریعہ علامات کے مفقود ہونے کا لازمہ ۔ ابھی سب سے زیادہ یہی خیال معلوم ہوتا ہے۔

رہا اس فن کا رایض اور عملی اکتساب تو بہت سی راگنیون کے مخترع اور ستار کے مشہور موجد حضرت امیر خسرو دہلوی کے زمانہ سے لیکر جو بلبن اور خلجی بادشاہون کے دربار کے سرمایۂ ناز تھے؛ آج کے دن تک مسلمانون کی توجہ اسپر ہندؤن سے غالباً زیادہ ہی رہی ہے۔ پچھلی چند صدیون مین راجپوتانہ اور وسط ہند کی اکثر دیسی ریاستون مین مسلمان صاحب کمال ہی اسرار فن کے اکیلے خازن شمار کئے جاتے رہے ہین۔ چونکہ اس بحث پر اس سے پہلے جریدہ "جادو" مین بزیر عنوان "اسلام اور فنون لطیفہ" ہم اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہین۔ لہذا یہان اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہین معلوم ہوتی۔

---

[1] اس مضمون کے دو حصے جنوری و مارچ کے رسالے مین شایع ہو چکے ہین۔

فلسفہ و مذہب

ان دونون مباحث مین سے آخر الذکر کو عرب چونکہ اونے اقسام کے بت پرستی خیال کرتے تھے تو اسمین شک نہین کہ یہ خیال غلط فہمی کا نتیجہ تھا، قدرتی طور پر انھون نے اُسے قابل توجہ نہ سمجھا۔ رہا اول الذکر تو فلسفہ یونان پیش قدمی کرکے اس سے سب پہلے میدان مین آچکا تھا اور عربون کے دماغون پر اپنا زبردست قبضہ جما چکا تھا۔ اسکے ماسوا ہندی فلسفی نظام چونکہ نہایت ادق اور سب زیادہ دماغی پریشانی و ذہنی حیرانی کے باعث تھے لہذا ان کے دماغون کو جو ہنوز فلسفہ کی چاٹ سے ناآشنا تھے اپنی جانب پھیرنے کی صلاحیت کم رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ عباسیون کے زمانہ مین سنسکرت کی جن کتابون کے ترجمے ہوئے اور ان مین فلسفہ کی تصنیف مین شاذونادر ہی نظر پڑتی ہے اور جو اکا دکا ہے بھی تو مذکورہ بالا طبیون مین سے کسی نہ کسی کے قلم سے نکلی ہوئی ہے نہ کسی مشہور ہندی فلسفی کی لکھی ہوئی۔ البیرونی کے زمانہ تک اس علم کی مطالعہ کی باقاعدہ کوئی کوشش نظر نہین آتی بیرونی کی کتاب الہند خود ہی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ حکیم مذکور کو ہندوستان کے مذہبون اور فلسفی نظامون سے کیسی گہری دلچسپی تھی۔ اور وہ ان سے کیسا واقف تھا۔ ان وادیون مین اُسے تجسس و تحقیق کا جو پرجوش شوق تھا اُسکے مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو اُسکی ذیل کی تصنیفات سے ملسکتا ہے (۱) ترجمہ پتنجلی یا موکشہ یعنی جسمانی زندگی کی قیدون سے نجات (۲) ترجمہ سانکیہ (۳) واسودیو کے دوبارہ ظہور پر رسالہ اور چند دیگر رسائل۔

ایک دوسرا عہد جسمین ہندو مسلمانون مین مصالحت کرانے، باہمی بہی خواہی اور برادرانہ جذبات کو ترقی دینے اور ایک دوسرے کے حالات سے مزید واقفیت کے ذریعہ سے مذہبی منافرت کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی۔ سلطان زین العابدین کاشمیری کا شاندار زمانۂ حکومت ہے جسنے اپنے ہندو رعایا سے ایسا الفت و محبت کا برتاؤ کیا کہ اُن مین سنجیدہ و راسخ اعتقاد پیدا ہوگیا تھا کہ سلطان اپنے جسم مین ایک ہندو کی روح رکھتا ہے تناسخ کے ماننے والون کو یہ خیال کیسا ہی خلاف عقل کیون نہ معلوم ہو اُس زمانہ کے ہندون مین یہ گھر گھر مشہور تھا کہ تخت نشینی سے کچھ روز پہلے سلطان کا مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کرچکا تھا اور ایک ہندو جوگی نے سلطان کے مردہ جسم مین اپنے روح منتقل کرکے دوبارہ زندگی عطا کی تھی

چونکہ انھیں یقین نہ تھا یا یقین کرنے کو جی نہ چاہتا تھا کہ ایک حکمران ایسے غیر معمولی روا داری،
رحم و نیک دلی کی قابلیت رکھتا ہو، اسکی ان خصائل حمیدہ و صفات پسندیدہ کی توجیہ کرکے دل
خوش کیا کرتے تھے۔ اُسکے عہد سلطنت کے مورخ باتفاق بیان کرتے ہیں کہ اُسکے ایام حکومت میں
سنسکرت کے جن کثیر التعداد کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے۔ وید شاستر، پران، اور بہت
کتھا بھی اُن میں شامل تھیں۔

مذکورۂ بالا تراجم میں سے افسوس کہ ایک بھی دست برد زمانہ سے باقی نہیں۔ ہندوں کے
مذہب کے متعلق ہمارے فارسی ذرائع اطلاع عملاً شاہنشاہ اکبر اور اُسکے جانشینوں کے زمانہ کے تراجم و تصانیف تک
محدود ہیں سب سے مہتم بالشان سنسکرت کی تصنیف جسکا اکبر کے زمانہ میں ترجمہ کیا گیا مہابھارت تھی۔ ہمارے زمانہ میں بڑی بڑی کتابوں کے
تصنیف کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ایک جماعت مصنفین کتاب کے مختلف حصوں کو آپس میں بانٹ کر ایک ساتھ لکھنا شروع
کر دیتی ہے۔ اور اسطرح برسوں کا کام دنوں میں نبٹ جاتا ہے وہی طریقہ اکبر کی جدت آفرینی نے
اس مقدس ضخیم کتاب کے ترجمہ میں اختیار کیا یعنی بخیال عجلت اسکے مختلف حصوں کا ترجمہ پانچ شخصوں
کے حوالہ کرکے پانچوں کو بیک وقت کام پر لگا دیا گیا۔ ان فاضل مترجموں کے نام۔ نقیب خان،
مولانا عبد القادر، بدایونی، ملا شیری، سلطان محمد تھانیسری اور فیضی فیاضی۔ ہیں۔ سوائے آخر الذکر
کے جیسے مولانا عبد القادر صرف دو پربوں کا مترجم بتاتے ہیں اور ان کا ٹھیک حصہ معین نہیں بڑے
بڑے دو وان پنڈت مثل دیبی کے ان کے امداد پر مامور تھے۔ اسطرح کتاب کے اٹھارہ پرب ختم
کیے گئے اور بعد ازاں ۹۹۵ھ میں فیضی نے کل ترجمہ پر نظر ثانی کی اور پاکیزہ شاعرانہ نثر کا جامہ پہنایا
اور ابو الفضل نے لمبی چوڑی تمہید کا اضافہ کرکے پادشاہ کے نیک اندیشانہ ارادوں پر پوری روشنی
ڈالی اکبر نے اسے رزمنامہ کا لقب عطا کیا مورخین کا بیان ہے کہ اس ترجمہ کے جو عموماً فیضی کی
طرف منسوب ہے خوبصورت قلمی نسخوں میں سے ایک ریاست جےپور کے کتب خانہ میں موجود تھا۔
[illegible] کے ابتدائی زمانہ میں جسے اب تقریباً چونتیس برس کا زمانہ ہوتا ہے۔ ہمیں بھی زیارت نصیب
ہو چکی ہے۔ آجکل ہندوستان و یورپ دونوں میں اسکے مطبوعہ نسخے بھی بکثرت و سہولت دستیاب
ہیں۔ اسکے بعد اس ہندی قومی رزمنامہ کے اور بھی کئی فارسی ترجمے ہیں جنمیں سے ایک تو شاہزادہ
دارا شکوہ کا ترجمہ نثر ہے (انڈیا آفس نمبر ۱۳۵۸) اور دوسرا محمد شاہ کے عہد کا حاجی

بیج اجنب کا منظوم ترجمہ ہے۔ مہابھارت کے دو برس بعد اکبر کے حکم سے مولانا عبدالقادر
بدایونی نے چار سال کی محنت میں ہندوستان کی دوسری قومی نظم یعنی رامائن کا ترجمہ ۱۲۰۰
صفحوں کا انجام کو پہنچایا۔ مولانا عبدالقادر تو اسکو تنہا انجام دینے کے مدعی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر
ابوالفضل ملا شیری نقیب خان، اور سلطان محمد تھانیسری کو برابر کا شریک بتاتا ہے (کتب خانہ
کیمرج نمبر ۳۳)۔ اسکے بعد اس کتاب کے تین ترجمے اور ہوئے (۱) شیخ سعد اللہ مسیح کیرانوی پانی پتی
کا ترجمہ موسوم بہ رام وسیتا (برٹش میوزیم نمبر ۱۳۶۰، ۲۶۳۵ اور ۳۷۶۲) (۲) دوسرا گردھرداس
کایستھ دہلوی کا (انڈیا آفس نمبر ۲۰۰۳) اور (۳) چندرمن ولد سری رام کا۔ پہلے دونوں منظوم ہیں
اور شہنشاہ جہانگیر کے نام سے معنون ہیں تیسرا نثر میں ہے اور ۱۱۰۰ھ کی تالیف ہے۔
شیخ سعد اللہ مسیح مقرب خان کے وابستگان دولت میں سے تھا جو جہانگیر کے دربار کا نامور
امیر تھا۔

بھاگوت گیتا کے فارسی ترجمہ کا سہرا بھی عموماً ابوالفضل کے سر باندھا جاتا ہے (برٹش
میوزیم ضمیمہ ۵۶۷۵)، اور بھاگوت پران یا سری کرشن کے قصہ کا جو نوے ادھیائے پر مشتمل ہے۔
فیضی کے سر (انڈیا آفس نمبر ۲۶۷۵) اور میونخ لائبریری آدیر کا جمع کردہ ذخیرہ ۳۵۰) فیضی نے اسکے
علاوہ اپنے شارق المعرفت میں جو بارہ فصلوں پر مشتمل ہے اور سنسکرت کی مشہور و معروف مستند تصنیفات
مثل سابق الذکر بھاگوت پران یوگ وسشٹھ وغیرہ کی بنی ہوئی ویدانت کے فلسفہ کو مفصل بحث کی ہے (انڈیا آفس نمبر ۱۲۰۵) تو دیک وسشٹھ جس میں رشی وسشٹھ
اور سری رام چندر جی کے مکالمہ کی شکل میں ہندی ناستک فلسفہ کے اصول کی تشریح کرتا ہے۔
۹۹۵ھ میں اکبر کے حکم سے فارسی خلاصہ کی صورت میں اسلامی دنیا کو واقف کیا گیا (برٹش
میوزیم ضمیمہ ۵۶۳۷) اس کتاب کے دوسرے فارسی ترجموں کے لیے ہم شیخ صوفی شریف کے
جو عہد جہانگیری کے فضلا میں تھے اور شاہزادہ دارا شکوہ کے ممنون ہیں (کتب خانہ آکسفورڈ
۱۰۵) اول الذکر کا ترجمہ موسوم بہ "اطوار در حال اسرار" یوگ وسشٹھ سار یعنی یوگ
وسشٹھ کے خلاصہ پر مبنی ہے۔ حال میں یہ مطبع نولکشور لکھنؤ سے چھپکر شایع ہو چکا ہے۔
ایک اور اہم ہندو مذہبی کتاب یعنی اتھرو وید کا ترجمہ اول مولانا عبدالقادر کے سپرد کیا
گیا تھا مگر چونکہ وہ برہمن جو ان کی امداد پر متعین تھا اپنی تشریح و توضیح سے ان کا اطمینان نہ کر سکا

اور انھون نے بادشاہ سے شکایت کی تو بادشاہ نے یہ دشوار کام حاجی ابراہیم سرہندی کے حوالہ کر دیا اور ایک زیادہ ذی علم پنڈت امداد کے لیے مقرر کیا کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد حاجی موصوف نے اس کار خطیر کو بخیر و خوبی انجام کو پہنچایا۔ مولانا عبد القادر اُس مختصر زمانہ کا کہ وہ اس کام مین مصروف تھے ایک عجیب و غریب قصہ بیان کرتے ہین۔ وہ برہمن جو وید کے مضامین مولانا کے ذہن نشین کرانے پر مامور تھا ایک روز اس مقدس کتاب کو پڑھتے پڑھتے ایسے مقام پر پہونچا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ گائے کا گوشت کھانا ممنوع نہین اور یہ کہ ویدون کے زمانہ مین ہر طبقہ کے ہندو اس بیدھڑک و بے تکلف نوش جان کیا کرتے تھے اس سے پہلے اُسنے کبھی وید کا مطالعہ نہ کیا تھا اسلیے تعجب بھی ہوا اور ساتھ ہی پنڈتون پر جھنجھلاہٹ اور غصہ بھی آیا کہ ابتک برابر دھوکے ہی مین رکھا۔ اسیطرح یہ ہوا کہ چند ہی روز بعد ایک اور عبارت نظر پڑی جسمین لکھا تھا کہ نجات ایک ایسے کلمے کے دوہرانے اور جپنے پر موقوف ہے جسمین حرف لام اکثر آتا ہے۔ یہ دیکھکر برہمن کو یقین آگیا کہ وہ کلمہ جسکی طرف یہان اشارہ کیا گیا ہے کلمۂ اسلام لا الہ الا اللہ ہے چنانچہ اُسنے بزور بلند آواز سے کلمۂ طیبہ پڑھا اور مشرف باسلام ہوگیا اس برہمن کا نام مولانا عبد القادر شیخ بھاون بتاتے ہین۔ غالبًا شیخ کا اضافہ مسلمان ہونے کے بعد کیا گیا ہوگا۔

اکبر ہی کے زمانہ مین ہری ونشہ کا جو سری کرشن جی کے حالات پر مشتمل مہابھارت کا ضمیمہ ہے (انڈیا آفس نمبر ۱۷۷۱) اور سوم دیو کی مشہور کہانیون کی کتاب کتھا سرت ساگر کا ترجمہ ہوا جو بلحاظ طرز بیان فیضی کے ترجمہ سے بہت مشابہ ہے گو کہ مترجم کا نام یقین کے ساتھ معلوم نہین (انڈیا آفس نمبر ۲۴۱۰)

سنسکرت کی مذہبی کتابون کے مابعد کے ترجمون مین بدنصیب شاہزادہ دارا شکوہ کے ترجمون کا ذکر کرنا ہنوز باقی ہے جو شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا اور ولی عہد تھا اور ۱۶۱۵ء مین پیدا ہوا اور ۱۶۵۹ء مین ارتداد کے جرم پر مارا گیا۔ اس کام مین دارا شکوہ کے محرک دینی جذبات تھے اور وہ وہی نیک اغراض پیش نظر رکھتا تھا جو اکبر کے رہنما ہوئے تھے یعنی ہندو مسلمانون مین میل جول کرانا اور آخر الذکر کے تعصبات کو مذہب برہمہ سے دور کرنا مگر سب سے بڑھکر یہ کہ صوفیون کو

جسکے خیالات سے وہ ایسے اچھی طرح واقف تھا یہ جتا نا کہ ان کے مسئلہ وحدت وجود یا وحدت میان کثرت کا پتہ آخر جاکر ویدون مین اور علی الخصوص اپنشد یا اپنکھت کے رسائل الٓہیات مین ملتا ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے اُسنے شہر بنارس مین وہان کے وددان پنڈتون کی مدد سے کتاب مذکور کا ترجمہ کرانا شروع کیا ۱۶۵۷ء مین یعنی اُسکے قتل سے دو سال قبل یہ اتمام کو پہنچا تو اسکا نام اُسنے "سر اکبر" یا جیسا کہ بعض قلمی نسخون سے معلوم ہوتا ہے "سر الاسرار" رکھا۔ اس ترجمہ کی تمہید مین جسکا ایک قلمی بوسیدہ نسخہ ہمارے پاس بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قرآن شریف مین جس اُم الکتاب کا ذکر آیا ہے اور جس سے مفسرین لوح محفوظ یا علم الٓہی مُراد لیتے ہین اُس سے اس کتاب یعنی اپنشد کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہین اگر علماے اسلام نے اُسپر زندقہ والحاد کا فتویٰ جاری کر دیا۔ اس سے ایک سال قبل اس آزاد خیال شاہزادہ کے زیر اہتمام یوگ وسشٹھ کا فارسی ترجمہ اتمام کو پہنچ چکا تھا (انڈیا آفس نمبر ۱۱۰۵، ۱۳۵۵، ۱۰۵۹)۔ جرمن عالم ہرمن ایتھے اپنی تصنیف "نواے پرسشے لٹراٹر" یعنی "علم ادب فارسی جدید" مین داراشکوہ کی مدح سرائی ذیل کے لفظون مین کرتا ہے "داراشکوہ ایک علی الخصوص روشن دماغ شخص تھا وہ تورات زبور انجیل، اور دوسری مقدس کتابون کا مطالعہ کر چکا تھا اور انھین ویسا ہی مستند اور سچا کلام الٓہی سمجھتا تھا جیسا قرآن کو۔ یہی اقرار اس امر کا باعث ہوا کہ مفتیان اسلام نے اُسپر الحاد کا الزام لگایا"۔ مگر مسٹر ہرمن ایتھے کو شاید یہ معلوم نہ تھا یا داراشکوہ کے جوش حمایت مین بھول گئے کہ داراشکوہ کی اسمین خصوصیت کیا تھی ہر مسلمان عہد قدیم اور عہد جدید کے صحیفون کو کتب آسمانی کلام ربانی جانتا اور مانتا ہے۔

سنہ ۱۶۵۵ء
داراشکوہ نے ہمارے واسطے ایک اور رسالہ بھی چھوڑا ہے یعنی مجمع البحرین جسے اُسنے مین تصنیف کیا اور اسمین اُسنے ہندی آلٓہیات کے مصطلحات کا صوفیہ کی اصطلاحات سے مقابلہ کرکر یہ دکھانا چاہا ہے کہ ان دونون مین فرق صرف اعتباری ہے لب لباب بالکل ایک ہی۔ فلسفۂ مذہبی پر ہندی اور ایرانی علماے الٓہیات سے جو اُسنے مباحثے کئے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہین۔ ان مین سے دو یعنی بابالال یا لال داس کے ساتھ اور شیخ محب اللہ کے ساتھ والے خاص اہمیت رکھتے ہین۔ متعدد قلمی نسخے ان کے یورپ کے کتب خانون مین موجود ہین۔

ادبیات

اس سلسلہ مین سب سے بڑا تحقیق طلب مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ الف لیلہ جسکی شہرت نے تمام متمدن دنیا پر قبضہ کر رکھا ہے ہندوستان جنت نشان سے کوئی رشتہ رکھتی ہے یا نہین۔ اکثر مستشرقین یورپ کا خیال ہے کہ اسکے بعض قصے مرہٹا اپنے ہندی اصل کا پتہ دیتے ہین یعنی ہندوستان سے ایران اور وہان سے نام نہاد شہرزاد کی زبانی عربون کے کانون تک پہنچے ہین افسوس ہے کہ اس عجیب خیال کی تنقید کے بے سر وست ہمارے پاس وقت ہے نہ مصالح۔ شاید بشرط فرصت آیندہ کبھی بکہہ سکین۔ یا اور کوئی با مذاق اہل علم سبقت کر کے اسپر مزید روشنی ڈال سکے،

اسکے بعد سب سے مشہور اور قابل قدر ادبی تصنیف جو خلفائے عباسی کے عہد مین ہندوستان سے بروایت مشہور ایران کا سفر کرتی ہوئی عراق پہنچی اور بعد ازان عربی لباس مین مہذب دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جلوہ افروز ہوئی وہ کلیلہ و دمنہ ہے، کہتے ہین کہ کسریٰ نوشیروان کے زمانہ مین یہ قصہ جا بجا مشہور تھا کہ ہندوستان مین ایک ایسا شجر حیات ہے۔ کہ جسکا پھل مُردون کو زندہ کرتا اور زندون کو حیات جاوید بخشتا ہے۔ کسریٰ کو اگرچہ پہلے ہی نوشیروان کا خطاب مل چکا تھا۔ جسکا لفظی ترجمہ "غیر فانی روح" ہے۔ اس درخت کا ایسا اشتیاق پیدا ہوا کہ اُس نے برزویہ طبیب کو اس غرض سے ہندوستان روانہ کیا کہ اس شجر حیات کو ایران لے آئے۔ یہ ایرانی طبیب ہندوستان پہنچا اور بہ تبدیل لباس ہندو پنڈتون سے سنسکرت سیکھی تو شجر حیات کا معمہ یون حل ہوا کہ یہ محض ایک استعارہ ہے جس سے مُراد درخت نہین ایک کتاب ہے جسے پنچ تنتر کہتے ہین۔ جسمین نیتی شاستر یعنی سیاست مدن کا بیان ہے اور راج نیتی کے اصول جانورون کے قصون کے پیرایہ مین بر مز و اشارہ بتلائے گئے ہین۔ علیٰ ہذا القیاس حیات سے مراد جسمانی زندگی نہین بلکہ دائمی نیکنامی ہے۔ غرضکہ طبیب مذکور نے اسکا پہلوی زبان مین ترجمہ کیا جسکی نوشیروان نے ایسی قدر دانی کی کہ اسے شاہی خزانہ مین جگہ دی۔ ایران کے قدردان علم بادشاہ کتابون کو جواہرات کی برابر قیمتی خیال کرکے بجائے کتب خانون کے خزانون ہی مین محفوظ رکھا کرتے تھے۔ اس پہلوی ترجمہ کو روزبہ المعروف بہ ابن مقفع نے خلافت بنی العباس کے ابتدائی زمانہ مین عربی جامہ پہنایا۔ یہ عربی ترجمہ کلیلہ دمنہ کے نام سے

آجتک زندہ اور مشہور ہے۔ کلیلہ ودمنہ سنسکرت کے کرٹکہ اور دمنکہ سے ماخوذ ہے۔ یہ دو گیدڑون
کے نام ہین جنکی زبانی پنچ تنتر کے پہلے باب مین کہانیان کہلائی گئی ہین۔ روایت مشہور کے مطابق
یہی ابن مقفع کا عربی ترجمہ ایشیا و یورپ کے دوسرے اکثر تراجم کا ماخذ ہے اسکا ترجمہ رودکی نے
نصر بن احمد سامانی کے حکم سے ۳۳۰ھ ہجری مین فارسی مین نظم کیا ہے۔ بہرام شاہ غزنوی کے
زمانہ مین یعنی ۵۴۰ھ مین ابو المعالی نصر اللہ بن محمد نے از سر نو نثر مین لکھا۔ آخر الذکر کو قانعی
خراسانی نے ۶۵۸ھ مین ایک فارسی مثنوی کے شکل مین مرتب کیا۔ اسی کو ملا حسین واعظ
کاشفی نے امیر شیخ احمد سہیلی کے حکم سے باضافہ حکایات کثیرہ صنائع و بدائع کے زیورون سے
لدی پھندی فارسی مین لکھا۔ کئی ترجمے اردو مین بھی ہوئے جنمین خرد افروز زیادہ مشہور ہے۔
ابوالفضل علامی نے پھر سلیس فارسی مین لکھا۔ کئی ترجمے اردو مین بھی ہوئے جنمین خرد افروز مشہور
اور زبانون مین جو ترجمے ہوئے ہین ان سب کے بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے ابن مقفع کے
علاوہ اور لوگون نے بھی معلوم ہوتا ہے اسکے عربی مین ترجمے کیے مگر افسوس کہ طاق نسیان
کے نذر ہو گئے۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ ہارون رشید کے مشہور وزیر یحییٰ برمکی کے حکم سے عبد اللہ
ابن ہلال نے اسکا عربی مین ترجمہ کیا تھا۔ جسپر خیال ہے کہ عبرانی ترجمہ مبنی ہے۔ یہ عبرانی ترجمہ
محققین جرمنی کی رائے مین ابن مقفع کے ترجمے کی بہ نسبت بہت زیادہ پنچ تنتر سے ملتا جلتا ہے
ابن مقفع کے ترجمہ مین پنچ تنتر کے پیش اور مابعد کے بعض قصے گذشتہ ہین۔

اسکے بعد کاشمیر کی بے مثل تاریخ راج ترنگنی مصنفہ کلیان یا کلہان کا ترجمہ ہوا۔ ابو الفضل اسکی
نسبت صرف اسقدر لکھتا ہے کہ شاہنشاہ اکبر کے حکم سے جو کتابین فارسی مین ترجمہ کی گئین اُن
مین یہ بھی شامل تھی۔ مترجم کا نام اُس نے ملا محمد شاہ آبادی لکھا ہے۔ اسکے مزید حالات ہمین
مولانا عبد القادر بدایونی سے معلوم ہوتے ہین جو تحریر فرماتے ہین کہ اکبر نے مجھے اس ترجمہ
کے خلاصہ اور نظر ثانی کا حکم دیا اور جب مین نے دو ماہ کے عرصہ مین اسے تمام کیا تو پادشاہ
کو ایسا پسند آیا کہ شاہی کتب خانہ مین داخل کرنے کا حکم دیدیا۔ یہی مصنف اپنی مشہور تاریخ
مین ایک اور مقام پر رقمطراز ہین کہ مجھے فرمان ہوا کہ ہندی حکایات وقصص کی اُس کتاب
کو جسکے ایک حصہ کا ترجمہ سلطان زین العابدین کاشمیری کے حکم سے بنام بحر الاسمار ہو چکا تھا فارسی

[illegible] تھا جو بیتال پچیسی کی دوسری جلد کا جو تقریباً آٹھ سو برس پیشتر [illegible] تھی اسکا ترجمہ تھا۔ اس بیان سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کتاب وہی [illegible] ترجمہ تھی یا کوئی اور۔ سلطان زین العابدین کے مورخوں کا بیان ہے کہ اُسکے زمانہ سلطنت میں [illegible] کا ترجمہ شروع کر دیا گیا تھا افسوس کہ یہ ترجمہ مفقود ہو گیا ورنہ ہم معلوم کر سکتے کہ اکبر کے زمانے کے ترجموں میں اس سے کہاں تک مدد لیگئی تھی اور اصل سنسکرت کو کہاں تک فارسی کے قالب میں ڈھالا گیا تھا۔

اکبر کے زمانہ کے ابتدائی ترجموں میں سنگھاسن بتیسی یا جسطرح کہ وہ سنسکرت میں کہلاتی ہے سنگھاسن دوترنشکا یا وکرم چرترم کا ترجمہ ہے جسمیں وکرمادتیہ کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ سنہ ۹۸۲ھ میں بدایونی نے ایک برہمن کی مدد سے اسے ختم کیا۔ یہ ایک نظم و نثر کا مخلوط مجموعہ ہے جسکا تاریخی نام اکبر نے نامۂ خرد افزا رکھا تھا۔ سنہ ۱۰۰۳ ہجری میں پھر بدایونی نے اسپر نظر ثانی کرکے ایک زیادہ دلفریب نسخہ تیار کیا۔ اسی زمانہ میں اور غالباً اکبر ہی کے ایما سے چتربھوج داس ولد مہر چند کالیستھ نے اسے تیسرا فارسی کا خلعت عطا کیا اور شاہنامہ لقب دیا۔ اکبر کے جانشین جہانگیر کے عہد میں سنہ ۱۶۱۰ء میں بہاریمل ولد راجمل چھتری نے ایک نیا ترجمہ تیار کیا۔ اسپرنگر ۱۶۶۰ برلن اور انڈیا آفس نمبر ۱۲۵۔

صاحبقران ثانی شاہجہان کے عہد دولت میں یعنی سنہ ۱۰۶۱ھ میں وشو راے ولد ہرکرپا جس کالیستھ نے مذکورۂ بالا دونوں نسخوں سے ایک تیسرا نسخہ تیار کیا۔ اورنگزیب کے زمانہ میں کرشن داس لاہوری نے پھر نیا لباس پہنا کر کرشن بلاس نام رکھا۔ ان کے سوا اسکے چند اور ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ (۱) شاہجہان کے زمانہ کا کسی مجہول الاسم مترجم کا (انڈیا آفس نمبر ۱۲۷) (۲) چندو ولد مادھو رام کا ترجمہ کوپنہیگن نمبر ۰ (۳) گلشن راز جسکے مترجم کا نام نا معلوم ہے۔ سنہ ۱۸۰۴ء میں مسٹر ای جی بیلی کے حکم سے سید امداد علی اور شیو سہائے کالیستھ کا ترتیب دادہ۔

اب ہم چند لفظ ان مصنفوں کی خاص و مستقل تصانیف کی نسبت لکھینگے جو یا تو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے یا اسکو وطن بنا لیا تھا۔ ایسے عشقیہ یا حیرت انگیز قصوں پر طبع آزمائی کی اور زور قلم دکھایا جنھوں نے اس ملک میں جنم لیا تھا۔ یہیں پہلے پھولے تھے اور فارسی لباس میں جلوہ

دکھانے سے پہلے ہی ہندوستان کی موجودہ بھاشاؤں خصوصاً ہندی وسندی میں بڑا حصہ
مولانا ضیاء الدین برنی فرماتے ہیں کہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں مولانا
شیخ محمود داؤد نے لورک و چندا کی داستانِ عشق و محبت پر ایک ہندی نظم لکھی جو حلاوت و لطافت
عشق سے ایسی بھری ہوئی تھی کہ اس زمانہ کے نہایت مقدس واعظ مخدوم شیخ تقی الدین ربانی
دہلی میں منبر پر اسکے اشعار بالحان پڑھتے اور وعظ کہنے لگے۔ ایک روز ایک بوجہ [illegible]
صاحب نے اس ہندی نظم کے ساتھ اس عجیب شغف کا سبب دریافت کیا تو آپ نے جواب میں
ارشاد کیا کہ اس نظم کے مضامین صوفیوں کے عقائد سے پورا اتحاد رکھتے ہیں اور آیات قرآنی جیسے
شفق میں ہندوستانی قوال اسے نہایت ذوق و شوق سے وجد میں آ آ کر گایا کرتے تھے۔

اب ہم اُن مضمون کا ذکر کرتے ہیں جو فارسی شعراء کے ہاتھ لگنے سے پہلے قومی اہمیت پیدا
کر چکے تھے۔ اس قسم کے پانچ افسانے حسب ذیل ہیں (۱) کامروپ و کام لتا (۲) مدہو مالتی و
منوہر (۳) پدماوت و رتن سین (۴) پنون و سسی (۵) ہیر و رانجھا۔ نل و دمینتی کی داستان بھی
جسے فیضی نے اپنے خمسہ میں پہلی جگہ دیکر نظم کیا۔ نہایت لطیف و دلکش ہے گو مذکورہ بالا پانچ ہی
داستانوں کی طرح قومی معاشرت پر اثر ڈالنے والی نہیں پہلا قصہ راجہ اودھ راج پتی کے بیٹے کامرو
اور لنکا کی شاہزادی کام لتا کے عشق کا افسانہ ہے۔ اسکا سب سے پہلا فارسی منظوم دستور ہمت ہے
جو سنہ ۱۰۶۱ھ میں نظم کیا گیا اور جس میں وزن نے ضرورت نے ناظم کو مجبور کیا ہے کہ نائکہ یعنی شاہزادی کے
نام کو بدلکر لتا کام بنا دے۔ اگرچہ کتاب کے نام سے تو ایسا ہی ذہن میں آتا ہے کہ کتاب کے مصنف
غالباً وہ ہمت خان نہ تھا جسے اورنگ زیب کی عنایت نے ترقی دیکر میر بخشی کے درجہ تک پہنچایا
تھا بلکہ شاہزادہ مراد بخش تھا جو ہمت خان کی بہ نسبت ہندی ادبیات سے کہیں زیادہ واقف
تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمت خان کے انتقال کے بعد اُسکی قبل از مرگ خواہش و التجا کے
مطابق مراد نے اُسکے نثر ترجمہ کو منظوم کیا۔ ابتک بھی بحث طلب سوال ہے کہ ہمت خان کا یہ
نثر ترجمہ عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر میر کاظم حسین کریم کے ترجمہ پر کہاں تک مبنی تھا
عالمگیر کی سلطنت میں ٹیک چند ولد بلرام نے اپنی مثنوی گلدستۂ عشق میں پھر اسی قصہ کو بیان
کیا۔ اسکے بعد حاجی ربیع المجتبیٰ نے پھر اسے فارسی میں نقل کیا۔ اس شخص نے سو برس کی عمر پائی

محمد شاہ کی سلطنت میں بہت سی سیر و سیاحت کے بعد دہلی میں سکونت گزین ہوا تھا نظامی کے خمسہ کے جواب میں ایک خمسہ نظم کیا۔ مہابھارت کا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے منظوم فارسی ترجمہ کیا اور ایک ضخیم دیوان اور دوسرے کئی ایک نثر کی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ اُسکی اس قسم کا نام فلک اعظم ہے جو [illegible]ھ میں۔ اختتام کو پہنچی۔ ابو الحسن عبد الرحیم ہستی [illegible]ھ میں میر علی شیر نے جو بہت سی بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پھر اسی داستان کے میدان میں اشہب خامہ کو جولان دی۔ سب سے آخر میں اسیر خامہ فرسائی کی وہ کوڑا مل تھا۔ جنے [illegible]ھ میں انتقال کیا۔

دوسرے ہندی افسانے یعنی مدھو مالت اور منوہر کے قصہ کو اولاً تو شیخ منجھن نے ہندی میں اور اُسکے بعد ۱۰۵۹ھ میں ناصر علی سرہندی نے فارسی میں نظم کیا۔ مگر زیادہ مشہور اور پسند خاطر خاص و عام میر عسکری عاقل خان کی نظم ہے جو عالمگیر کے عہد میں چوبیس سال کی عمر سے لیکر مرتے دم تک دہلی کے حاکم تھے۔ اُنکی مثنوی جسکا نام مہر و ماہ ہے ۱۰۶۵ھ میں لکھی گئی۔ اسمیں مدھو مالت و منوہر کی جگہ زیادہ دل آویز فارسی نامون مہر و ماہ کو دی ہے۔ اسکے تین سال بعد ملی عادل شاہ بیجاپور نے عاقل خان کی مہر و ماہ پر اپنی گلشن عشق کی بنیاد رکھی جسکی زبان دکھنی اُردو ہے۔ [illegible]ھ میں اپنی مثنوی مجمع البحرین میں ظہیر کرمانی نے پھر اسی افسانہ پر طبع آزمائی کی۔

تیسرے ہندوستانی افسانہ یعنی پدماوت و رتن سین کے قصے کو پہلی بار شاعرانہ طرز بیان دو ہندی نظمون کی بدولت نصیب ہوا جنمین سے پہلی اور دوسری ملک محمد جائسی نے ۹۴۷ھ میں بھاشا میں لکھی جسین غزنوی کی اسی مضمون کی فارسی مثنوی کی تاریخ چونکہ معلوم نہیں۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی پہلی نظم جو فارسی ادب کے افق پر نمودار ہوئی وہ غالباً عبد الشکور بزمی کی مثنوی تھی۔ جو ۱۰۲۷ھ میں رتن پدماوت کے نام سے عالم وجود میں آئی۔ اسکے بعد نواب عاقل خان نے ۱۰۶۹ھ شمع و پروانہ لکھی جسے لچھمی رام نے نثر کا لباس دیکر فرح بخش نام رکھا۔ ۱۱۶۷ھ میں حسین الدین نے اسی مضمون پر ہندو طبع و کہا کر اورنگ زیب کے نام پر حسن و عشق لکھی۔ بعد ازان ضیا والدین عبرت دہلوی اور ان کے اُستاد عشرت نے فارسی سے اردو میں نقل کیا۔ پھر میر عبد الجلیل بلگرامی نے اسی پر طبع آزمائی کی اور اخیر میں کسی ابراہیم نامی نے پشتو میں نقل کیا۔

پنو اور سسی کا عام پسند قصہ مذکورہ بالا تینون افسانون سے مختلف ہے یہ محض خیالی افسانہ

(جس میں پنجاب کی دستور ... ایک سچے واقعہ پر لکھی گئی ہے۔ اس سندھی عاشق و معشوق کے قصہ کو سب سے پہلے ہوبہو حاجی محمد رضائی سندھی نے ۱۱۳۳ھ میں فارسی نظم کے زیور سے آراستہ کیا اور زیبا نگار نام رکھا۔ یہ نظم سید علی متقی کی شرح پر مبنی ہے جنہوں نے اس واقعہ کو بچشم خود دیکھا اور قلمبند کیا تھا ۱۱۷۵ھ میں منشی جسونت نے بھی اسی مضمون پر ایک فارسی مثنوی میں زور قلم دکھا کر سسّی و پنوں لکھا۔ انیسویں صدی کے شروع میں لالہ چندبھان کاش نے اسی قسم کے واقعات پر ایک اور فارسی مثنوی لکھ کر دستور عشق نام رکھا اور روہیلوں کے نامی سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے بیٹے نواب محبت خاں نے مسٹر جانسن کی درخواست پر اردو میں بھی ایک سسّی پنوں لکھی اور اسرار محبت نام رکھا۔

پانچویں اور آخری ہندی افسانے یعنی پنجاب کے وامق و عذرا ہیر اور رانجھا کے قصہ کو ابتدا داستور پنجابی نے ہندی میں لکھا تھا۔ اس کے دو فارسی منظوم قالب اب تک موجود ہیں ایک شاہ فقیر اللہ آفرین کا ہیر و رانجھا یا راز و نیاز (برٹش میوزیم آر ۳۲۰) جنہوں نے ۱۱۵۴ھ میں اپنے وطن لاہور میں انتقال فرمایا۔ اور دوسرا میر قمرالدین منت کا ہیر و رانجھا جو ۱۱۵۶ھ میں دہلی میں متولد ہوئے ۱۱۸۸ھ میں لکھنؤ رونق افروز ہوئے۔ مسٹر رچرڈ جانسن کی عنایت سے وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کی ملاقات سے کلکتہ میں مشرف ہوئے۔ نواب ناظم بنگالہ کے دربار سے ملک الشعراء خطاب پایا اور ۱۲۰۸ھ میں بعالم غربت کلکتہ سے رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ انھوں نے اپنی مثنوی ۱۱۹۳ھ میں ختم اور اپنے مربی مسٹر جانسن کے نام سے معنون کی (انڈیا آفس نمبر ۱۳۱۰)۔ آخرالذکر دونوں مثنویوں کے بیچ میں منشی منسارام کا افسانۂ نثر جگہ لیے ہوئے ہے۔

اسی قسم کے مگر ان سے کم مرتبہ دوسری نظمیں جو سراسر ہندی سرچشموں ہی سے نکلی ہیں۔ حسب ذیل ہیں (۱) ملا حمید کا عبرت نامہ جو ۱۱۶۷ھ میں اختتام کو پہنچا (۲) ایک تنبولی کے لڑکے رامچند کا دل ہلانے والا قصہ میر شمس الدین فقیر مصنف حدائق البلاغت کے زور قلم کا نمونہ (۳) حسن علی عزت کی مثنوی لعل و گوہر جو ٹیپو سلطان والی میسور کی فرمائش سے لکھی گئی۔

ہندوستان کی فارسی افسانہ نویسی منظوم کے نشو و نما اور ارتقا کے اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے امیر خسرو دہلوی کے اس اچھوتے انوکھے طریقہ پر جو انھوں نے اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں

میں اختیار کیا۔ یعنی خود اپنے زمانہ کے دلچسپ واقعات و حادثات کو موضوع فسانہ نویسی بنا لے
یہ ایک تغیر از بس مناسب معلوم ہوتا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ طوطیِ ہند کے اس طرح
زاد اجتہاد طرز نوائے تازہ کے مقلد بہت کم پیدا ہوئے۔ بعد کے شعرا و افسانہ نگاروں میں بہت ہی کم ایسے ہیں
جو قصہ نگاری منظوم کی اس قسم میں شامل ہونے کے شایان ہوں انہیں نادر افسانوں میں سے ایک
حسین اور نوعمر ہندو لڑکی کے حسرت ناک موت کا قیامت خیز قصہ ہے ماثر الکرام کے بیان کے مطابق
اسکی مختصر داستان یہ ہے کہ اکبر اعظم کے عہد حکومت میں ایک ہندو نوجوان اپنی شادی خانہ آبادی سے
پہلے ہنگام میں چوک کے بازار سے گزر رہا تھا کہ چھت دفعتہً بیٹھ گئی اور جوان دب کر مر گیا
بد نصیب عروس نے جو دولت حسن سے مالا مال تھی یہ خبر سنکر ہندو رسم و رواج کے مطابق ستی ہونے کا
یعنی نامزد شوہر کی چتا پر اپنے آپ کو جلا کر اپنی راکھ کو شوہر کی راکھ میں ملا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔
افواہ بادشاہ کے کان تک پہنچی تو اُنھوں نے اس نوعمر ناشاد نامراد جان دینے والی کو بلا کر طرح طرح کی تسلی
دی سمجھایا بجھایا قسم قسم کی عنایتوں اور مہربانیوں کے وعدے کئے کہ اس خوفناک خودکشی سے باز
آئے مگر اس چلبلی لڑکی نے ایک بھی نہ مانی اُس کے مستقل عزم میں ذرہ برابر بھی تزلزل نہ آیا اور دلیرانہ شعلوں
میں کود کر شوہر کے ساتھ راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ ملا نوعی خبوشانی نے جو اکبر کے زمانہ میں ایران سے وارد
ہندوستان ہوا اور ۱۰۱۹ھ میں بمقام برہانپور سفر آخرت کیا شاہزادہ دانیال کے حکم سے اس دردناک
حادثہ کو نہایت موثر جگر خون کن الفاظ میں اپنی چھوٹی سی مگر نہایت دلفریب مثنوی سوز و گداز میں بیان
کر کے ثبت جریدۂ روزگار کیا۔

اب تک ہم اُن خزینہائے علوم کا ذکر کرتے رہے ہیں جو سنسکرت سے عربی و فارسی میں منتقل
ہوئے اسمیں شک نہیں کہ ابو معشر ابراہیم توخی اور ابو ریحان بیرونی جیسے ہمت والے لوگ جنھوں نے
لانبے اور پر خطر سفر اختیار کر کے طرح طرح کی دشواریوں کا سینہ سپر مقابلہ کر کے اور برہمنوں کے سخت
تعصبات پر غالب آکر جو ہندوں کو اپنے دیوبانی سکھانے اور اپنے علوم مقدسہ کے خزانے اُنپر کھولنے کو
ناقابل معافی گناہ سمجھتے تھے ام الالسنہ کے سیکھنے اور ان بیش بہا فنون کے حاصل کرنے میں کامیاب
ہوئے بیحد تحسین و آفرین شکر و سپاس کے مستحق ہیں مگر ان بزرگوں نے ہندی علوم و ادبیات پر جو کچھ بھی
لکھا یورپ کے مستشرقین کی طرح اپنی مادری زبان یا عربی میں لکھا سنسکرت یا اور کسی ہندوستانی

زبان کے اشعار میں کبھی ہشت بہشت قلم کو جولان نہ دی۔ لہٰذا اب ہم ہندوستان کی سب سے بڑی زندہ
بولی یعنی بھاکا یا ہندی کے ادبیات میں مسلمانوں نے جو اضافے کئے ان کا مختصر حال بیان کرتے
ہیں۔ مستشرقین تو وہ مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے بہت پہلے ہی مردہ ہو چکی تھی۔ ہندوستان
میں مسلمانوں کے بود و باش اختیار کرنے سے پہلے ہی یعنی بہرام شاہ غزنوی ہی کے زمانہ میں اُسکے
درباری شاعر مسعود سعد سلمان نے بھاشا میں ایسی مہارت پیدا کر لی تھی کہ تذکرہ نویسوں کے بیان
کے مطابق ایک ہندی دیوان اپنی یادگار چھوڑا۔ اس نادرۂ روزگار عجوبۂ زمان امیر خسرو دہلوی
کی نسبت جو فارسی میں اگر نظامی و سعدی کا مقابلہ کرتے تھے تو ہندی میں بھی کچھ کم اُستادی کے
ڈنکے نہ بجاتے تھے اور ملک محمد جائسی مصنف پدماوت کے متعلق ہمیں بیان کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت
نہیں کیونکہ اُنکی ہندی تصنیفات ہی اُنکے کمال کی کافی شاہد ہے آخر الذکر کی اُستادی کا لوہا اگر
ہندی کے ماہر مانتے ہیں تو اول الذکر کو چھوٹے بڑے سبھی جانتے ہیں۔ مولانا شبلی کا بیان ہے کہ
پدماوت کے علاوہ ملک محمد جائسی نے دو اور ہندی نظمیں بھی چھوڑی ہیں جنکے قلمی نسخے ہنوز
شاعر کے گھرانے میں محفوظ ہیں شاہزادہ دانیال اور عبدالرحیم خان خاناں بھی اپنے زمانہ کے
مشہور ہندی شاعر تھے جنکا جہانگیر اپنی تزک میں خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔

ہمارا مضمون چونکہ اب بھی اون ابعاد ثلثہ سے جو ابتداً ہم نے اپنے ذہن میں اُسکے لئے قائم
کئے تھے متجاوز ہو چکا ہے اور مسلمان مصنفین اور شعرائے ہندی کی تعداد ہزاروں ہے لہٰذا
ہمکو بطور مشتے نمونہ از خروارے صرف ایک شہر کے سربرآوردہ منتخب اصحاب کے مختصر ذکر
پر بمجبوری قناعت کرنی پڑتی ہے تاکہ ناظرین کو سارے ہندوستان کی مجموعی تعداد کی عظمت کا کچھ اندازہ
ہوسکے۔ اس غرض سے ہمنے جس مقام کو منتخب کیا ہے وہ صوبہ اودھ کا مردم خیز خطہ بلگرام ہے۔ اس
قصبہ کے بیشمار دیبان ہندی میں سے مولانا غلام علی آزاد مرحوم نے اپنی مشہور تصنیف مآثر الکرام
میں صرف آٹھ شخصوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے جنکی اعلےٰ درجہ کی شاعرانہ لیاقت اور
ہندی کی حیرت انگیز مہارت نے ہمعصر ہندو ادیبوں اور شاعروں سے سند استحسان و اعتراف
فضیلت حاصل کی تھی مولانا موصوف نے ان حضرات کے نہ صرف مختصر حالات لکھے ہیں بلکہ ہندی
تصنیفات کے کثرت سے انتخابات بھی دیئے ہیں ان سب کے پیش رو اور سب مقدم حضرت

شیخ شاہ محمد فرملی ہیں جو عہد اکبری و جہانگیری کے ممتاز اور صاحب اقتدار امراء میں سے تھے جس زمانہ میں کہ آپ صوبہ بہار میں چھند وار کے حاکم تھے ایک روز اثنائے شکار میں اتفاقاً فوج سے جدا ہو گئے اور ایک گاؤں کے پاس سے گزر ہوا۔ ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھا کہ اپنے شباب پر ہے لڑکی جس کا نام چمپا تھا کانوں میں وہ زیور جسے ہندی میں تاٹنک کہتے ہیں پہنے ہوئے تھی جس میں سیاہ ریشمی ڈورا پڑا تھا شیخ شاہ محمد نے دیکھتے ہی یہ برجستہ فقرہ کسا کیا اچھا بھونرا کنول پر بیٹھا ہے لڑکی نے فوراً جواب دیا "بھونرا نہیں گوبردہ ہے" شیخ لڑکی کی اس حاضر جوابی اور بذلہ سنجی سے ایسے محظوظ ہوئے کہ اس کا گہرا نقش دماغ پر مرتسم ہوا تھا جلد ہی نکاح کی شکل میں ظاہر ہوا شیخ اور چمپا کے اس قسم کے بہت سے سوال و جواب کا ہے جو ان لوگوں میں چرچا رہا دوہرانے والے ہونٹ ہلاتے اور سننے والے سر دھنتے رہے حضرت آزاد نے خود بہت سے نقل کئے ہیں مگر افسوس کہ ہمارے پاس ان کے لیے گنجائش نہیں۔

ان سے بھی زیادہ صاحب آواز و ہندی شاعر سید نظام الدین مدھنایک تھے جنھوں نے مدتوں بنارس میں رہکر سنسکرت و بھاشا کی باقاعدہ تحصیل کی اور ان زبانوں میں اور ناد و تال سنگیت کے علم میں وہ کمال پیدا کیا جس طرح تان سین کی نسبت مشہور ہے کہ دیپک گا کر بن میں آگ لگادی تھی اسی طرح ضعیف العقل اوہام پرستوں میں ان کی نسبت بھی ایک روایت مشہور تھی کہ آپ نے ایک خشک سالی کے زمانہ میں لوگوں کے گڑگڑانے پر میگھ راگ گا کر پانی برسا دیا تھا۔ آپ موسیقی میں دو قابل قدر کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں سے ایک کا نام نادچندریکا اور دوسری کا نام مدھنایک سنگار ہے۔

ایک اور بلگرامی ہندی شاعر جنھوں نے دور دور تک شہرت حاصل کر رکھی تھی سید رحمت اللہ تھے جو شاہ شجاع ابن شاہجہان کے مدح سرا مشہور ہندی شاعر چنتامن کے ہمعصر تھے یہ بڑے خاندانی امرائے عالمگیری میں سے تھے۔ چنتامن نے ہندوستان کی مخصوص قسم تشبیہ زمنیا النکار پر مشتمل ایک دوہا کہا جس کے آخر مصرعے میں اس نے اس صنعت کو اپنے خیال میں ایسے خوبصورتی سے برتا تھا کہ اپنے متقدمین سے گوئے سبقت لیجانے کا دعویٰ و فخر کرتا تھا صنعت کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی شے کو آپ ہی اپنا نظیر بتاکر اسکے عدیم النظیر ہونے کا دعویٰ کیا جائے جیسے علامۂ طباطبائی کہتا ہے۔

آب را نا آئینہ جم منسم   بچوسے گر پو وا آنسم منسم

چنتامن نے اس تشبیہ کو یون ادا کیا تھا " وامرگ نینی کی گئے جاری کبہی نین "۔ حکومت جاہجو کے زمانہ میں چنتامن کے ایک شاگرد نے یہ مصرع بڑے فخر کے ساتھ سید رحمت اللہ کو سنایا تو سید موصوف سنتے ہی بول اُٹھے کہ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہے یعنی لفظ مرگ نینی (آہو چشم) کا معنی تشبیہ خبر موجود ہے۔ چنتامن کے کان تک یہ تنقید پہنچی تو پھڑک اُٹھا اور غلطی کا بے تکلف اقرار کرکے مصرع کو یون بدل دیا " واسند رکی مین لکھی وا ہی کیسی نین " اور سید کی دقیقہ سنجی نکتہ رسی کا ایسا گہرا نقش دماغ پر بٹھایا کہ تھوڑے ہی دن بعد سید کی مدح مین ایک آب و تاب نظم لکھکر حاضر خدمت ہوا جسکے صلہ مین سید صاحب نے ایک خلعت اور بیش بہا انعام شاعر کے پاس بھیجا مگر چنتامن نے خود سید کے دست مبارک سے خلعت پہننے پر اصرار کیا چنانچہ اُسکی التجا پوری کی گئی اسپر اُسنے سید موصوف کی مدح مین کئی ایک اور نظمین لکھین جو سب کی سب اُسکی کبت بچار مین موجود ہین۔ سید رحمت اللہ نے ایک ضخیم مجموعہ ہندی نظمون کا اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ اسکا نام پوران رس ہے۔

ان کے بعد میر عبد الجلیل بلگرامی بھی جنکے مثل عربی کا ادیب و شاعر خاک ہند نے دوسرا نہین پیدا کیا ہندی کے مشہور شاعر تھے۔ ایک ضخیم جلد ہندی نظمون کی موسوم بہ سکھ نگمہ ان کی یادگار ہے میر عبد الجلیل کے بھانجے سید غلام نبی بھی ہندی کے جلیل المرتبہ شاعر اور دو ہندی کتابین انگ درپن دسراپا، اور نانک درپن یا رس پربودھ کے مصنف تھے۔ اسی طرح سید برکت اللہ پیمی پیم پرکاش کے مصنف ہین جو دوہون کبتون بشنپد دوہرپد وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان کا ہندی تخلص پیمی تھا۔

اس ضمن مین اُن کثیر التعداد ترجمون کو بھی نظر انداز نہین کرنا چاہئے۔ جو عربی فارسی سے ہندی مین کئے گئے۔ انکی تعداد اتنی بڑی ہے کہ ہم بیان اُسے ہاتھ بھی نہین لگا سکتے۔ جنھین شوق دریافت ہو وہ سکندر لودی، سلطان زین العابدین، ابراہیم عادل شاہ، اکبر اور اُسکے جانشینون کے مؤرخین معاصر کے تصنیفات کا مطالعہ فرمائین۔

فدا علیخان رامپوری ایم اے

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

آپ تقریباً ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت ضلع کرنال پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ بچپن میں ہی والد بزرگوار کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ اور آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کی زیر نگرانی رہی۔ کچھ عربی فارسی کی استعداد حاصل کی تھی کہ عنفوان شباب ہی میں تعلقات دنیا کے پھندوں میں پھنس گئے اور آپ کی شادی ہو گئی۔ لیکن شہباز علم آپ کو پرواز کی تعلیم دے رہا تھا اور چونکہ آپ کی سسرال خوشحال تھی اور گھر بار کی طرف سے ایک گونہ آپ کو بےفکری تھی۔

لہذا آپ پانی پت سے بغرض تحصیل علم دہلی پہنچے اور یہاں علوم مروجہ میں انتہائی درجہ تک تکمیل علم کی۔ ۱۸۵۶ء میں فارغ التحصیل ہو کر ضلع حصار کی محکمہ کلکٹری میں مختصر سی جگہ پر مامور ہوئے لیکن ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانہ میں یہ ملازمت بھی ترک کرنی پڑی اور ابتدائے شباب ہی میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کی تعلیم آپ کے سپرد ہوئی۔ اس تعلق سے آپ کو مفتی صدرالدین خان، نیر درخشاں اور حضرت غالب مرحوم کی خدمت میں باریابی کے اکثر مواقع ملتے رہے۔ آپ دہلی کے ان معرکۃ الآرا مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں جنکے دیکھنے والے بھی اب شاید مفقود ہو چکے ہیں۔ آپنے مرزا غالب کو دیوان عام دہلی کے شاہی مشاعروں میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں غزل پڑھتے سنا ہے۔ الحاصل آپ حضرت غالب کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے آپ جناب مرزا صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ کی عالی دماغی اور سخن فہمی اس زمانے میں بھی اپنے جوہر دکھاتی تھی۔

طبیعت میں شعر کا صحیح مذاق تھا۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں آپنے داد سخن دی ہے۔ آپ مرزا غالب کی آخری علالت اور وفات کے موقع پر دہلی میں موجود بلکہ ان کی تجہیز و تکفین میں شریک تھے۔ ان کی وفات پر سالک مجروح اور حالی تینوں رشید شاگردوں نے ایک ساتھ مرثیے لکھے ہیں اور وفات کی تاریخیں کہی ہیں مگر انصاف یہ ہے کہ جو رتبہ و مقبولیت مولانا حالی کے اس مرثیے کو حاصل ہوئی ہے وہ

کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسی طرح جو مرثیہ آپ نے حکیم محمود خاں صاحب مرحوم دہلوی کی وفات پر لکھا آپ کے تمام کلام میں ایک عالی رتبہ رکھتا ہے۔

عرصے کے بعد لاہور میں بسبب تعلقات ملازمت پہنچے۔ یہاں صاحب اپنے پر کمال محبت اور محبت حسن انصاف و تعصب [illegible] کچھ نئی نظمیں لکھیں نیچرل شاعری کا شوق آپ کو کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے دلایا چنانچہ آپ نے چند نیچرل نظمیں لکھیں۔ لیکن آپ بسبب ناموافقت آب و ہوا ایک دو سال کے بعد اینگلو عربک اسکول دہلی میں عہدہ مدرسی واپس چلے آگئے۔ اور یہاں آپ نے اپنا مشہور و معروف مسدس مد و جزر اسلام لکھا جس کی شہرت چاردانگ ہند میں پھیلی نثر میں تعلیم نسواں کے متعلق آپ نے ایک کتاب تحریر فرمائی جس کا نام مجالس النساء ہے۔ اس میں بالکل عورتوں کی زبان اور عورتوں کے محاورات برتے ہیں۔ یہ کتاب عورتوں کی ضروری تعلیم و اصلاح کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوئی حیات سعدی۔ یادگارِ غالب اور حیات جاوید آپ کی بہترین تصانیف ہیں۔

آپ نے اپنے مقدمہ دیوان میں جو شعر و شاعری پر بحث کی ہے اور اساتذہ عرب و یورپ کے اقوال کا مقابلہ کیا ہے وہ قابل دید ہے۔ اور فن شاعری حاصل کرنے کے لیے ایک عمدہ ذریعہ ہے۔

آپ ۱۸۸۷ء میں سر سید احمد خاں کی معیت میں حیدرآباد دکن بغرض فراہمی چندہ علیگڑھ کالج کی طرف سے گئے تھے۔ اس وقت وہاں کے مدار المہام نواب سر آسمان جاہ بہادر تھے۔ وہاں آپ نے کئی نظمیں پڑھیں اسی زمانہ میں آپ کا ماہوار وظیفہ بھی ریاست دکن سے مقرر ہو گیا۔ جس کے بعد آپ بار ملازمت سے بالکل سبکدوش اور دست کش ہو گئے۔

آپ آخر عمر میں پانی پت میں قیام رکھتے تھے اور گاہ گاہ دہلی یا میرٹھ چلے جاتے تھے۔ آخر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔

حالی کی شاعری اطراف ہند میں مقبول خاص و عام ہوئی۔ لیکن یہاں ہم کو آپ کے دیگر اصناف سخن سے قطع نظر کرکے صرف رنگ تغزل کو دیکھنا ہے کہ اس کوچہ میں آپ کی کہاں تک رسائی ہے۔ عام طور پر آپ کو محض نیچرل یا قومی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اور لوگ آپ کی قدیم شاعری پر ایک نظر ڈالنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ یہ سراسر غلطی ہے۔ آپ کا قدیم و جدید کلام رنگ

غزلیں ان کی ایک مثال میں ایسی لکھتا ہے۔ پڑھیے تو معلوم ہو کہ زبان کس قدر صاف اور چستی بندش کی ہے خیالات کس قدر بلند ہیں۔ بعض پامال اور فرسودہ مضامین نہیں پائے جاتے صرف تنگی اور چوٹی کے اشعار نہیں بعض اشعار غالب مرحوم کے رنگ میں پائے جاتے ہیں۔ مطالب کے لحاظ سے بھی دقیق ہیں۔ غور کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے کیا بات کہی ہے اور کیا خوب کہی ہے۔ طرز کلام شیریں اور طرز ادا نرالی ہے۔ بعض اصحاب آپ کی بعض نظموں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ متروک الفاظ استعمال کر جاتے ہیں یہ اعتراض کہاں تک صحیح اور بجا ہے اس سے ہمیں غرض نہیں لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ آپ کی غزلوں میں تو ایک لفظ بھی کوئی صاحب ایسا نہیں دکھا سکتے جو ان کے زعم میں بھی قابل اعتراض سمجھا جاوے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ کے کلام میں وہ رنگینی اور دلفریبی نہیں پائی جاتی جو حضرت داغ کا جوہر اصلی ہے۔ تغزل کا میدان بہت تنگ ہے اور اگلے استادوں نے اب کوئی بات چھوڑی نہیں تاہم آپ کی غزلیں پڑھنے اور سر دھننے کے لایق ہیں ؎

بیگانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں قائل اہل حال تیرا

ذیل میں مولانا حالی کے بہتر اشعار انتخاب کر کے درج کیے جاتے ہیں۔ دیوان میں اس قسم کے اور اشعار بھی بکثرت ہیں لیکن ہماری مفروضہ تعداد ہمکو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی۔

کلامِ حالی

۱ پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا — چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا
۲ قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے — چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا
۳ دوزخ ہے گرد پیچ تو رحمت وسیع تر — لا تقنطوا جواب ہے ہل من مزید کا

---

۴ یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے — اے آسمان کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا

---

۵ رونا ہو کوئی شاید ہی کم ہم سا — جب دیکھو تو غیروں سے دامن جھٹکتا
۶ مدعی بھی ان اشاروں کا ہم کو ستا گئے کیا — دیکھا ہے ہم نے پہروں لطف و کرم تمہارا

---

۷ یارب طلب وصل ہوا یا طرب وصل — جب دن کہ دونوں شوق و دم دکھلا

---

۸ کاش اک جام ابھی ساقی کو بچا لیتا — اک چراغ اور سر راہ جلایا جاتا
۹ عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید — خودبخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

---

۱۰ خلوت میں تری صوفی گر خود صفا ہوتا — تو سب میں وہ رہتا اور سب سے جدا ہوتا
۱۱ تھا آفت جان اسکا اندازِ کمانداری — ہم بچکے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا
۱۲ کل حالی دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ — سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا

---

۱۳ پیش از ظہور عشق کسی کا نشان نہ تھا — تھا حسن میزبان کوئی مہمان نہ تھا
۱۴ ملتے ہی ان سے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا
۱۵ سچ ہے کہ پاس خاطر نازک عذاب ہے — تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہربان نہ تھا
۱۶ تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی — مانا کہ اسکے ہاتھ میں تیر و سنان نہ تھا

---

۱۷ اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا — رو رو کے اور ہم کو رلانا ضرور تھا
۱۸ تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں — ہر خار نخل ایمن و ہر سنگ طور تھا
۱۹ حالی نہ قدر رحمت حق پا سکے کچھ — ٹھہرا قصوروار اگر بے قصور تھا

---

۲۰ دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائیگا — سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائیگا
۲۱ تم کو ہزار شرم سہی مجھکو لاکھ ضبط — الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا

---

۲۲ وہ وصیت کیا جسکی ہو انتہا وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

---

۲۳ یک گونہ سی ہو گئی ہے تسلی کی ورنہ اب وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
۲۴ غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا خانہ خراب خاطر الفت شعار کا

---

۲۵ وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبط راز تھا چہرہ سے اپنے شورش پنہاں عیاں ہوا

---

۲۶ گو جوانی میں تھی کج رائی بہت پر جوانی ہمکو یاد آئی بہت
۲۷ وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

---

۲۸ دیکھتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
۲۹ کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
۳۰ ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہمان دیکھنا آپ کی اور آپکے گھر کی صورت

---

۳۱ تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد
۳۲ کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد
۳۳ مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

---

۳۴ داستان گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
۳۵ آخری دور میں بھی تجکو قسم ہے ساقی بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

---

۳۶ اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالی پہ ہجوم شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

---

۳۷ دلبروں میں بھی وہ ہے شیخ پارسا ہی میں   مری نگاہ میں ہے رند و پارسا یک

---

۳۸ آگہ نہیں ہے قصۂ عشق بتاں سے ہم   سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم
۳۹ اب جا لگے ہیں سایۂ عشق بتاں میں ہم   کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
۴۰ جنت میں تو نہیں اگر اے زخم تیغ عشق   بدلینگے تجھکو زندگی جاوداں سے ہم

---

۴۱ کہتے ہیں جسکو جنت وہ اک جھلک ہے تیری   سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

---

۴۲ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
۴۳ یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر   تھا اسکو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں
۴۴ ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور   عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

---

۴۵ کچھ پتا منزل مقصود کا پایا ہم نے   جب یہ جانا کہ ہمیں طاقت رفتار نہیں

---

۴۶ بہت ہی خوش ہوا حالی سے مل کر   ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

---

۴۷ جی ڈھونڈتا ہے بزم طرب میں انھیں مگر   وہ آ کے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
۴۸ کہتا ہے غیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے   شکوہ کو تیغ کیا ہے وہ بیداد فن کہاں

---

۴۹ مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا   مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

---

۵۰ کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے   گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا کے

۵۱ ورد گزرے دعا سے تو بھروسہ ہے دعا کے — در گزر ہیں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

---

۵۲ کبک قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دیگی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
۵۳ واعظو عیب تو پاک ہے یا ذات خدا — ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کس کا ہے

---

۵۴ کہا جو ہنسے دعا کرتے آئے ہیں احباب — کہ زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے

---

۵۵ دیکھ اے بلبل ذرا گلچیں کو آنکھیں کھول کر — پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے
۵۶ تجھ میں جو ہے اے شمع وہ کس برق عالم سوز کی — جان و دل سے تجھ پہ پروانہ یوں قربان ہے

---

۵۷ پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے — شکوے وہ سب سنا گئے اور مہرباں رہے
۵۸ پوچھی گئی نہ بات کہیں پاس وضع کی — اتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے
۵۹ دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا — اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
۶۰ یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
۶۱ دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
۶۲ حالی سے ملکے ہو گئے تم افسردہ دل بہت — اگلے سے ولولے وہ اب انمیں کہاں رہے

---

۶۳ جسکو غصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے — آج دل لیگا اگر کل نہ لیا یاد رہے
۶۴ ہم بھی آداب شریعت سے تھے آگاہ مگر — نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے
۶۵ ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ — حضرت اس لطف کا پائینگے مزا یاد رہے

---

۶۶ ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے — آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
۶۷ اے دل اب آزمائش تقدیر کا ہے وقت — وہ امتحان پرکشش شمشیر کر چکے

۴۸ ہیں عاشقی کی گرائیں علوم سکھاری — حالی سے بیگانی پیا نہیں جاری

---

۴۹ دلکو درد آشنا کیا تو نے — درد دل کو دوا کیا تو نے

۵۰ رہرو تشنہ لب نہ گھبراتا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے

---

۵۱ جان بھی نظر نہیں آتی — غیر الفت بہت جتانے لگے

---

۵۲ مشترک ان دل شکیبا چاہیے — کب میں دلبر سے دیکھا چاہیے

محمد یحییٰ تنہا



البانیہ

آج کل کثرت سے اخبارات وجرائد مین اس قوم کا نام آرہا ہے اسلیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر اسکی تاریخ بیان کر دیجاے کہ گذشتہ زمانہ مین اسکی کیا حالت تھی اور اب کیاسے کیا ہوگئی ہے -

اس قوم کا نام خود اسکے قبائل مین مختلف طور سے لیا جاتا ہے چنانچہ قبیلہ کیغہ اربانیہ اور قبیلہ موسنہ مین اربیا مشہور ہے آر بمعنی کھیت کے ہین اور بان وہ شخص جو کھیتی کرتا ہے اور کبھی کبھی نون کو رے سے بھی بدل لیتے ہین اس نسبت سے اربانیا اربریا کے معنی کاشتکار کے ہوئے - یہ پہلی قوم ہے جسنے سب سے پیشتر اس مفید ترین صنعت کو ایشیا سے لیکر یورپ مین رواج دیا -

اہل یونان اہل اربانیا کو غلطی سے اروانتیس کہتے ہین وہ ب کو ر سے تے بدل لیتے ہین کیونکہ اول الذکر صرف ان کی زبان مین مفقود ہے اروانتیس مین نیتس اظہار نسبت کے لیے ہے اور اہل یونان کی اس غلط خیال کی بنا یہ ہے کہ وہ اربانیہ اس جگہ کا نام سمجھتے ہین جہان یہ قوم رہتی تھی ترک ان بلاد مین داخل ہوے تو وہ اہل یونان کی طرح ارناؤت کہنے لگے اور انھون نے سین زائد کو حذف کر دیا اور تحریف کے طور پر واؤ اور نون کو مقدم و موخر کر دیا جس طرح عربی مین عربون سے رعبون ہوگیا اور تا کو طا سے بدل کے واؤ کو بغیر کسی سبب کے کسرہ کے بجاے ضمہ دیدیا اور ناؤط ہوگیا -

آج کل یورپ مین بلکہ عام طور پر اس قوم کو البانی کہا جاتا ہے یعنی را کو لام سے بدل لیا ہے اور یہ دو نون قریب المخرج ہین اکثر ایک دوسرے سے بدلتے رہتے ہین - عربی مین البرت اور البت کے ایک ہی معنی ہین - یہی کا ثبات علماے السنہ کے نزدیک پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ البانی زبان قدیم یونانی، لاطینی، صقلی، غولی، اور سنسکرت کے مشابہ ہے۔

ف اس مضمون مین قاموس الاعلام مصنفہ شمس الدین سامی بک اور کتاب الشابۃ سے مدد لیگئی ہے - حسان

[redacted]

نیز یہ کہ قدیم آرین زبان کی تمام شاخون سے زیادہ قدیم ہے۔ لیکن ان الفاظ کے متعلق جو قدیم یونانی اور البانی مین مشترک ہین، اس امر کی تحقیق کرنا کہ انکو یونانی سے البانی نے لیا ہے یا البانی سے یونانی نے بہت مشکل امر ہے۔ صرف وہی حضرات جو ان دونون سے واقفیت اور مہارت تامہ رکھتے ہون اور ان دونون زبانون مین ان کی دلچسپی توغل کی حد تک پہونچگئی ہو اس امر پر قادر ہو سکتے ہین

شمس الدین شامی بک نے دعویٰ کیا ہے کہ اکثر مشترک الفاظ ان کی البانی اور یونانی صورتین اس امر پر دلیل ہین کہ یہ الفاظ البانی الاصل ہین اور یونانی مین البانی سے ماخوذ ہین اور یہان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ زبان یونانی اور لاطینی سے قدیم تر ہے۔

دوسری آرین زبانون کے مقابل ہین ژند فارسی اور سنسکرت اسکی زیادہ مشابہت اس امر پر دال ہے کہ یہ آریہ زبان کے سوا کسی اور زبان کی شاخ نہین بلکہ براسہ ہجرت عمومی کے زمانہ مین وسط ایشیا سے آئی ہے۔

وطن اصلی سے ہجرت کرکے یہ لوگ مشرقی یورپ مین پھیل گئے جیسا کہ ان کے دوسرے ہمجنسون نے مغربی یورپ کو رہنے کے لیے پسند کیا۔ مشرقی یورپ مین پہنچکر کچھ توالیریا جو آجکل البان کہلاتا ہے اور جسکے حالات کا اظہار اسوقت مقصود ہے/ بوسینیا ہرزے گونیا اور دلماسیا مین منتشر ہوگئے، کچھ لوگ ... لماسیا قدیم (یعنی ولایت سالونیکا مناستر اور اسکوپ) کچھ تھریس مین جسکا دارالسلطنت ایڈریانوپل ہے، اور کچھ لوگ بلغاریہ کے ایک حصہ مین منتشر ہوگئے۔ کچھ ایسے بھی تھے کہ جنھون نے اپنے وطن یعنی ایشیا کو یورپ پر ترجیح دی اور حب وطن کے جذبۂ صادق کے باعث یورپ کی دلفریبی ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے مین ناکام رہی، یہ لوگ فریجیون کہلاتے ہین اور ان کا ملک بحر ابیض مین اناطولیہ کے ساحلون سے لیکر سورس سے لیکر انگورہ تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ بات تاریخی دلائل سے پایۂ ثبوت کو پہونچگئی ہے کہ مذکورۂ بالا چارون شاخین ایک ہی درخت کے تنے سے نکلی ہین۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اہل الیریا اہل مقدونیہ سے اور اہل تھریس اہل فریجیا سے زبان اخلاق عادات اور خصائل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے زیادہ نزدیک ہین ان چارون شاخون سے مرکب تنہ کو زمانہ قدیم مین بلاسج یا بلاسجی کہتے تھے۔

بعض محققین السنہ کا خیال ہے کہ یہ بلاق سے ماخوذ ہے اور بلاق مجلس شیوخ کو کہتے ہین آج بھی پہاڑی لوگ بس کے نزاعات کو اپنے یہان کی مجلس شیوخ سے فیصل کراتے ہین اور اسے بلاقویہ کہتے ہین -

یہان سے یہ بات واضح ہوگی کہ یہ زبردست اور عظیم الشان قوم آج سے دو ہزار برس پیشتر ٹریسٹ سے منتقل ہوکر ہنگری سیورس اور اناطولیہ مین پھیل گئی -

جو لوگ اناطولیہ مین رہ گئے تھے، متعدد بار فارس اور یونان نے ان پر چڑھائی کی اور فتحیاب ہونے کی یہی وجہ تھی کہ فاتح قوم سے خلط ملط ہوکر ان کی قومیت تنگی بلغاریہ اور مقدونیہ نے بھی اسیطرح ہل ایلیریا اور مقدونیہ سے بھی سلوک کرنا چاہا اور دو ایک مرتبہ چھیڑ چھاڑ بھی کی اس موقع پر متحد و متفق ہوکر وہ اس حصہ کو چھوڑ کر ایلیریا کے حصون مین جا بسے اور اسی کو اپنی آزادی و مامون زندگی کے لیے کافی سمجھا -

وہ دوسری قومون سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے، حتی کہ خود ان مین بھی جمعیت مفقود تھی جلیسا کہ آج بھی دیرہ اور اشقودرہ کے پہاڑ دیہات کے اس لوگون طرز تمدن کا پتہ لگایا جاسکتا ہے - یعنی اسیوجہ سے ان کے عادات، خصائل قومی خصوصیات اور زبان اب تک محفوظ رہی ہین اسکے ساتھ ہی اس تفرقہ کے باعث ان مین ادبیات اور قومی لٹریچر کا فقدان تھا -

ایک زمانہ مین اس قوم نے حکومت کیبھی بنا ڈالی تھی، چنانچہ اسقودریا مقدونیہ اور سالونیکا مین کئی ریاستین قائم کین ان سب کا مرکز تلایا شہر تھا جو سالونیکا کے ملک ارمن کے کنارے اور کچھ وارداسکے قریب آباد تھا -

اس قوم کے امرائے سلاطین مین سکندر بن فیلب سب سے زیادہ مشہور ہے، یہ بادشاہ البانی الاصل اور البانی النسب ہے، اسنے یونان مین تعلیم و تربیت حاصل کی اور یونانی عادات و اخلاق اسمین سرایت کرگئے حتی کہ یہ لوگ اسے یونانی ہی سمجھنے لگے؛ حالانکہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے -

اسکے یونانی نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یونان کے مشہور خطیب دِمستھنیز کی وہ تقریرین

ہین جنمین اُسنے اہل آشینہ کو البانیہ کے خلاف بھڑکایا ہے' اور ان تقریرون مین اس ملک کا نام لینے کے بجائے بار بار وس یعنی عجمی کہا ہے۔

البانیہ کے مشہور بادشاہون مین بیروس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُس نے دو مرتبہ رومانیہ پر غلبہ حاصل کیا، اور ایک زمانہ مملکتوں پر قابض ہو گیا۔ لیکن اس فتح و ظفر کی حالت بالکل سیلاب کی سی تھی فتح کرنے کے بعد مستقل قبضہ نہ ہو سکا اور نہ حکومت قائم کیجا سکی۔ اسی لئے اس بادشاہ کے جانشینون کے پاس صرف وہی ممالک رہ گئے جو آباؤ اجداد سے چلے آئے تھے۔

اہل البانیہ جنھون نے سکندر کے عہد مین اپنے قبضہ اثر سے ایک زمانہ پر تسلط قائم کر لیا تھا۔ اہل روم کے زیر اقتدار رضا اپنی سخت ذلت بھی بلاشبہ وہ ایک شجاع قوم تھی اُسکی زبردست کارنامے فاتحانہ معرکہ آرائیان شجاعت و دلاوری کی زبردست دلیلین تھین۔

۱۶۷ء (ق م) مین جول آئیل روم کا ایک مشہور جنرل ایک لشکر جرار کے ساتھ ان کو نیچا دکھانے آیا اُسنے اُنکو کامل شکست دی۔ شہر کے شہر اور گانون کے گانون تباہ و برباد کر دئیے بے شمار البانی مقتول اور ڈیڑھ لاکھ کے قریب قید ہوے جنکو اُسنے اپنے ملک مین بیچا کر بیچ ڈالا۔

لیکن کیا اُنھون نے روم کی طاعت قبول کر لی، ہرگز نہین انھون نے اُس وطن کو جسپر غیرون نے قبضہ کر لیا تھا خیرباد کہا اور پہاڑون کے قدرتی قلعون کو اپنا امن سمجھکر اُس مین جا بسے اور اسطرح فقر و فاقہ کی آزادانہ زندگی کو عیش و آرام کی غلامانہ زندگی پر ترجیح دی انھین حالات مین زندگی گذر رہی تھی کہ سلاطین بنو عثمان روم مین داخل ہوے لیکن ۱۴۳۰ء مین البانیہ کے امرا مین سے ایک شخص اسکندر بیگ نے جو ایک بہادر انسان تھا اور غیر معمولی دل و دماغ رکھتا تھا تمام قوم اپنی زیر سیادت جمع کر کے ۲۵ برس تک استقلال کے ساتھ عثمانی عساکر کی مدافعت کی چنانچہ اس عرصہ مین عثمانیون کے اس ملک مین قدم نہ جمنے پائے۔

لیکن اسکے مرتے ہی تمام نظام درہم و برہم ہو گیا۔ اور آل عثمان ان تمام ممالک پر قابض ہو گئے۔

اسوقت ان کے جذبات حریت پرستی کو حرکت ہوئی اور اسطرح کی غلامانہ زندگی کو روایات

قوموں کے لیے تنگ و عار سمجھکر وطن مالوف کو چھوڑ مختلف بلاد میں منتشر ہوگئے۔ کچھ لوگ کلابریا اور صقلیہ میں جا بسے کچھ جیلو اور سلیسیا میں چلے گئے اور کچھ لوگوں نے اناطولیہ میں توطن اختیار کرلیا۔

لیکن بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے نقل و حرکت مناسب نہیں سمجھی اور وطن کی آب و ہوا کی محبت ان کے تمام جذبات پر غالب آگئی۔ ان لوگوں میں رفتہ رفتہ اسلام پھیل گیا یہانتک کہ صرف تہائی حصہ آبائی مذہب پر باقی رہا۔ اسمین بھی نصف کیتھولک تھے اور نصف آرتھوڈکس۔

تھوڑی ہی مدت میں یہ قوم حکومت کی دست راست بن گئی اور اسمیں کے متعدد افراد محض ذاتی قابلیت کی بنیاد پر جو ان کی فطرت میں ودیعت ہے مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ اسکا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کم و بیش بیس البانی ترکی حکومت کے وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ حکومت ترکی کا ایک مشہور جرنل جو ترکی فوج کا کمانڈر انچیف تھا اور جو سب سے پہلا شخص تھا جسنے عمان اور یمن کو عثمانی حکومت میں داخل کیا اور عثمانی علم خلافت کو آجینیہ اور صومالی تک پہونچا دیا اور البانی الاصل تھا۔ اسی طرح وزیر محمد پاشا جو عثمانی فوجوں کو وانا کی دیواروں تک لے گیا وہ البانی قوم کا ایک فرد تھا۔

ہر البانی قوم اپنی خلقت، عادات و اخلاق اور طرز بود و ماند میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے ہر ایک البانی عام طور پر بلند قامت قوی الجثہ کشادہ پیشانی ہوتا ہے۔ سر بڑا ہوتا ہے۔ یہ تمام مخصوص صفات اُسکی ذہانت و متانت اور اعلیٰ دماغی پر دلیل ہیں وہ وعدہ پورا کرنے میں جان کی بھی پروا نہیں کرتا، قبیلہ اور خاندان کی محافظت اسقدر سختی کے ساتھ کرتا ہے کہ ہمیشہ جان دینے کو تیار رہتا ہے، جو بات منہ سے نکل گئی بہادروں کی طرح اُسے پورا کر دکھاتا ہے۔

سبک روی کے ساتھ تیز قدم ہے حسن اور تناسب اعضا میں اپنی عورتوں سے بڑھا ہوا ہے۔ عورتیں ذرا گدازجسم کی ہوتی ہیں اور یہ اُن کو عزت و تعمت محبت اور خلوص کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

پردہ کا بالکل رواج نہیں لیکن اس قوم کی احتیاط، تقوی، غیرتمندی، حیا و شرم کی انتہا یہ ہے کہ متاہل عورت یا کسی نوجوان دوشیزہ کے متعلق ذرا بھی شبہ ہو جائے تو اُسوقت جوش

غضب مین بدترین سلوک کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

عورتین صناع و دستکار، محنتی اور وفاشعار ہوتی ہین گھر کی مالکہ ہوتی ہین اور گھر کا سارا اثاثہ انہیں کے سپرد ہوتا ہے۔ مردون کی حیثیت بالکل مہمان کی ہوتی ہے۔

شادی بیاہ صرف اپنے ہی قبیلہ اور خاندان مین ہوتا ہے۔ خواہ ایک دوسرے سے جسقدر بھی فاصلہ پر ہون۔

بیٹیون کو وراثت سے محروم رکھتے ہین (یہ رسم آباؤاجداد سے ورثہ مین ملی ہے) بیچاریون کے لیے جہیز تو درکنار عروسی کے جوڑے کا انتظام بھی دولہا کے سر ہے۔ مذہب کی پابندی مین سخت سخت ہین البتہ عملی عبادت مین حالت کسی قدر کمزور ہے۔ بعض مراسم وعادات کی جو یا تو قدیم مذہب یا عیسائیت کے زمانہ سے چلی آرہی ہین اب تک حفاظت کرتے ہین، اختلاف مذاہب کے باوجود ان مین زبردست اتفاق واتحاد ہے۔

یہ ہین البانی کی خصوصیات جنکو ہمنے مختصر طور پر بیان کیا۔ زبان کے متعلق پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ آرین زبان کی ایک مستقل شاخ ہے۔ لیکن اپنی دوسری ہمسایہ بہنون کے دوش بدوش نہ چلنے کی وجہ سے فصاحت و بلاغت کے اعلےٰ معیار پر نہین پہونچ سکی۔ اگرچہ یہ امر ناقابل تردید ہے کیونانی اور لاطینی مین کونسی زبان قدیم ہے کیونکہ یونانی ولاطینی کے قدیم قصص ومقامات مین بھی ان کے نام اسی زبان سے لیے گئے ہین۔

آثار قدیمہ کے محققین نے جو مقامات مین، حکومت ان کی نہین ہے ایک قدیم خط کا انکشاف کیا ہے اسی طرح ذربجیا مین اس قسم کے خطوط پائے گئے ہین، ان خطوط کو لاطینی کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی گئی تو بہت کچھ کامیابی ہوئی، اور یہ خطوط البانی سے بہت زیادہ مشابہ پائے گئے بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ اس زبان کا ایک خاص خط تھا،

ان کے پاس مذہب کیتھولک سے متعلق نظم ونثر کی چند کتابین ہین جو ۱۵۰۰ء مین لکھی گئی تھین اب تک موجود ہین۔ اسی طرح حب وطن کے بہت سے گیت جو آٹھ نو سو برس پہلے کے لکھے ہوئے ہین۔

[1] سعود قرنیت اس قوم اور ان اہل عرب پر جنکا اخلاق اس قسم کا بدعات سے ملوث نہین اور ان کی اس غیرت مندی اور شرم وحیا پر جنکو ہم متوحش وحشت سے تعبیر کرتے ہین۔

اب تک محفوظ ہین - آج کل کی زبان ان گیتون سے ملتی جلتی ہے، صرف مذہبی اصطلاحات بدل گئی ہین - کیونکہ عیسائیون نے یہ اصطلاحات یونان سے اور مسلمانون نے عرب سے لی ہین - یہ وجہ ہے کہ ان کی قدیم مذہبی اصطلاحات بالکل فنا ہو گئین -

محمد حسین حسان دارالعلوم ندوۃ

"تاج آگرہ"

چہرہ اے تاج محل کے نام سے موسوم ہونیوالے غیرفانی چہرہ - کس نے تمہاری بیجان رگون مین روح دوڑا دی ہے کسنے تمکو زندہ جاوید بنا دیا ہے، کون تمکو متواتر آب حیات پلا رہا ہے؟ حیات جاودان حاصل کرکے تمنے دنیاوی خوشیون کا جام اپنی سربفلک عمارت کے ذریعہ آسمان کی طرف بڑھایا ہے، موسم بہار کے آخری زمانہ کی رخصتی آہین تمہارے دریچون کے پاس ہوا مین گونجتی ہین - صبح شب وصل بیشتر عشاق کے اشکہائے غم یکہ و تنہا چراغ سحر کی دھندھلی روشنی مین چمکتے ہین - ہان تمام زمانون کے عشاق ناکام کے آنسو تمہارے قدمون کی نذر ہین -

اے شہنشاہ بیگم تیری یاد تیری بعد بھی ہمیشہ باقی رہی، امتداد زمانہ سے اسمین اضافہ ہوتا جاتا ہے. وہ ایک غیرفانی مجسمہ حسن وخوبی کی شکل مین منتقل ہو گئی وہ جذبۂ محبت صورت پذیر ہو گیا ہے اور اس دوامۃ لذت شہنشاہ کے عشق صادق کی یاد اہل عالم کے دلون کو ہلا رہی ہے -

بیگم تو اپنی تمثیل محبت کا تاج گوشہ حرم سے باہر لائی - تمام دنیا کے عشاق اس سے اپنے معشوقون کی آرائش کرینگے. محل اور جو تیرے دونون مین اسکے نظارے سے مردہ دلون مین جان پڑجاتی ہے تیرا مقبرہ صرف تیری ملکیت نہین ہے یہ تمام موجودہ اور آیندہ عشاق کا معبد ہے پرستشگاہ ہے -

اس مقبرہ مین شاہی شان وشوکت کا نشان نہین ہے خیر کوئی مضائقہ نہین، شان وشوکت عارضی چیز ہے فانی ہے انسانی روح کا اشتیاق اسکا طواف کرتا ہے اسپر سایہ افگن ہے جبتک دنیا مین کسی عاشق کا وجود رہے گا جبتک سپہر برین کا ایک ستارہ بھی چشم شوق سے اسکو دیکھتا ہے. بینگین ملکہ یہ تاج محل یون ہی ہمیشہ چمکتا رہے گا -

(از ٹیگور) باسط بسوانی

مسٹر کاڈل کا غصہ

(چھتری کے پیچھے)

مسٹر کاڈل نے اپنے ایک ملاقاتی کو اپنی چھتری عاریتاً دیدی یہ بات اُنکی میم صاحبہ کو ناگوار گذری جھنجھلا کر بولیں، یہ بڑے دن کے بعد تیسری چھتری جا چکی ہے۔ تم کرتے کیا ہو؟ اوسے اپنے گھر پانی برستے مین جانے دیتے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اوسکے پاس تھا ہی کیا جو خراب ہوجاتا۔ زکام ہوجاتا۔! بیشک!۔ اُسکی صورت سے تو نہین ظاہر ہوتا کہ حضرت کو زکام ہوجاتا۔ اور زکام ہوجاتا تو بلا سے ہوجاتا۔ اچھا ہوتا اگر ہوجاتا، ہماری چھتری کیون لیگیا۔ مسٹر کاڈل! تمکو پانی برسنے کی آواز بھی کچھ سنائی پڑتی ہے!۔ سنتے بھی ہو! پانی برسنے کی آواز بھی کان مین آتی ہے! بیشک آج سینٹ سیوٹن کا دن ہے۔ کیسا کھڑکیون کے اوپر پانی پڑ رہا ہے۔ واہیات مجھے نہ بکاؤ اس زور کا تو پانی پڑ رہا ہے اور نہین سنتا! سچ بتاؤ! تم سنتے ہو؟ غنیمت ہے کہ تمنے سُنا تو۔ ابھی یہ ایک طوفان آیا ہے جو کم از کم چھ ہفتہ رہے گا اور ہمکو گھر سے باہر قدم نکالنا دشوار ہوگا۔ خوب! مجھے بالکل ہی بیوقوف سمجھتے ہو کیا، مسٹر کاڈل! مجھے چھیڑو نہین، وہ اور چھتری واپس کرے!۔ لوگ نہین کل کا بچہ سمجھین گے۔ کبھی کسی نے آجتک چھتری واپس دی ہے، جو یہ دیگا۔ وہ دیکھو۔ تم سنتے ہو طوفان بڑھتا جاتا ہے۔ موسلا دھار پانی برس رہا ہے۔ اور چھ ہفتہ تک۔ ہمیشہ چھ ہفتہ تک رہتا ہے۔ اور چھتری ندارد۔

مجھے کوئی یہ تو بتلاوے کہ بچے کل مدرسہ کیسے جائینگے۔ ایسے پانی مین ہرگز نہین جائین گے، نہین! اس طوفان مین گھر ہی بیٹھینگے چاہے کورے جاہل رہجائین۔ بچارے معصوم بچے۔ ایسے پانی مین بھیگین اور سردی کھائین۔ اگر وہ ان پڑھ رہے تو یہ کسکا قصور سمجھا جاویگا۔ اُنکے باپ کا اور کسکا۔!۔

جن لوگون کو خود اپنے بچون کا ہی کچھ خیال نہ ہو اونکے اولاد ہی کیون ہو۔

مجھے معلوم ہے کہ تمنے چھتری کیون دیدی۔ بلا شبہ مین خوب جانتی ہون، مین اپنی مان کے ہان کل جا رہی تھی کو جانیوالی تھی۔ یہ تمکو معلوم تھا۔ اسلئے عمداً چھتری دیدی۔ زیادہ باتین نہ بناؤ تمہین میرا وہان جانا ہرگز پسند نہین۔ تم مجھے روکنے کے لیے ایسی ہی خفیف حرکتین کیا کرتے ہو۔ مسٹر کاڈل تم یہ ہرگز نہ سمجھنا۔ چاہے کیسا ہی موسلا دھار پانی برسے مین جاؤنگی اور ضرور جاؤن گی۔ نہین۔ مین کرایہ کی گاڑی مین نہین جاؤنگی۔ یہ تو بتاؤ کرایہ کو دام کہان سے آئینگے۔ تم اپنی اوس کلب مین ایسی دون کی ہانکا کرو۔ کرایہ کی گاڑی! معقول بلکہ اقلکم دو روپیہ کرایہ کو چاہیئے۔ ایکروپیہ جانیکا اور پھر ایکروپیہ لوٹ کے آنیکا کیا خوب! کرایہ کی گاڑی۔ یہ تو بتاے کوئی کہ کرایہ کسکے گھر سے آئیگا۔ میرے پاس تو ہے نہین۔ اور خدا نخواستہ اگر تمہاری بھی یہی حالت رہی تو تم بھی کہان سے دوگے۔ آئے دن چھتری خریدا کرو۔ اپنی چیز برباد کیا کرو اور اولاد کے لیے کوڑی نہ چھوڑو۔

پانی برسنے کی آواز تمہارے کانون مین آتی ہے مسٹر کاڈل؟ بتاؤ! سنتے ہو یا نہین! مگر خیر اس سے کیا مطلب۔ مین اپنی مان کے ہان کل جاؤنگی اور ضرور جاؤنگی اور راستہ بھر پیدل جاؤن گی اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میری حالت کیا ہوگی۔ میرے مرنے مین کوئی کسر باقی نہ رہیگی۔ مجھے ایک بیوقوف عورت نہ کہو۔ بیوقوف تو ہو تم۔ تمہین معلوم ہے کہ مین لکڑی کا جوتہ نہین پہن سکتی۔ چھتری کے بدون اگر مین بارش سے بھیگی تو سردی ضرور لگ جائیگی۔ اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اُف۔ اگر سردی لگ بھی گئی تو تمہین کیا پروا۔ مین بیمار پڑون تمہاری بلا سے۔ اور بیمار پڑنے مین کوئی شک بھی ہے اور پھر ڈاکٹر کا بلبلا چوڑا بل۔ بل آئے تو اچھا ہو۔ تمہین ذرا چھتری دیدینے کا مزہ تو معلوم ہو۔ تعجب نہین یہی سردی کا لگنا میری موت کا باعث ہو۔ جی ہان۔ اور اسی غرض سے تو چھتری دے ہی دی۔ یقیناً

ایسے موسم مین گھستے ہوئے میرے کپڑون کی کیا گت ہوگی۔ میری گون اور بانٹ کا تو ستیاناس ہی ہوگا۔ بالکل۔ تم یہ کہتے ہو کہ اونکے پہننے ہی کی کیا ضرورت ہے! بیشک مسٹر کاڈل! مین ضرور پہنون گی۔ نہین نہین۔ مجھے کیا تمہارا یا کسی اور کا ڈر ہے کہ محض ایک پھوہڑ اور ذلیل عورت بنکے جاؤن خدا گواہ ہے کہ مین شاذ و نادر ہی گھر کی دہلیز نانگتی ہونگی، سچ تو یہ ہے کہ مین ایک غلام سے بدتر ہون مگر یہ مجھے زیبا مسٹر کاڈل! کہ جب گھر کے باہر قدم رکھونگی تو ایک شریف خاتون کی طرح۔ خدا کی پناہ

بھسا پانی گر رہا ہے۔ یہ تو کھڑکیوں کو توڑ کے اندر گھس آئیگا۔

مجھے تو یہ خوف ہے کہ کل کیا نوبت ہوگی۔ میں حیران ہوں کہ اپنی ماں کے ہاں کیسے جاؤنگی۔ موت کا سامنا ہے۔ مگر جاؤنگی ضرور۔ نہیں میاں نہیں! میں کسی کی چھتری نہیں مانگنے کی اور نہ تم نئی چھتری خرید لاؤ گے۔ دیکھیے مسٹر کاڈل! یہ بات آپ اچھی طرح سن لیجیے۔ اگر تم کوئی دوسری چھتری گھر میں لائے تو میں اوسے سڑک پر پھینک دونگی۔ اگر ہو تو میری خاص چھتری ہو ورنہ کچھ ضرورت نہیں۔

ہائے! پچھلے ہفتہ ہی تو میں نے اُس چھتری میں نئی موٹھ لگوائی تھی۔ کاش مجھے یہ خبر ہوتی کہ چھتری کا کیا حشر ہونیوالا ہے تو میں اوسے بلا موٹھ کے رہنے دیتی۔ جتنی موٹھ میں دام خرچ کریں، اور لوگ ہمارا مضحکہ اوڑاتے ہیں۔ ابھی تمہاری بلا سے۔ تم چین سے سوؤ۔ نہیں ابھی۔ بیچاری عورت اور پیارے بچوں کا تو کچھ فکر ہے ہی نہیں۔ نہیں تو بس ایک فکر ہے کہ اوٹھائی اور چھتری دیدی!

درحقیقت مرد یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ساری خدائی کے مالک ہیں۔ بھلے مالک ہیں! جبکہ ایک چھتری کی داشت اون سے نہیں ہو سکتی۔

بلاشک کل کا پیدل جانا اور آنا میری جان لیگا۔ مگر یہی تو تم چاہتے ہو۔ پھر تو خوشی سے اپنی کلب کو جانا اور جو جی میں آئے سو کرنا۔ لیکن میرے بیچارے بچوں کی کیا گت ہوگی۔ خیر میاں تم تو چین سے رہوگے۔ مت باتیں نہ بناؤ۔ میں خوب جانتی ہوں تم بڑے چین سے رہوگے۔ یہ بات نہوتی تو تم چھتری دیدیتے۔!

ہاں نہیں جمعرات کو جانا ہے وہ جو سمن آیا تھا۔ مگر تم جا کیسے سکتے ہو۔ بغیر چھتری کے تم جاؤگے کیسے، چاہے تمہارا مقدمہ خارج ہو جائے۔ بلا سے۔ تمہارے کپڑے خراب ہوں۔ چاہے تمہارا قرضہ مارا جائے۔ جو لوگ اپنی چھتری دوسروں کو دیدیتے ہیں وہ اسی لایق ہیں کہ اونکا قرضہ مارا جائے

مجھے یہ تو بتلائیے کہ کل میں بغیر چھتری کے اپنی ماں کے ہاں کیسے جاؤنگی۔؟

تمہیں اس سے کیا کہ میں کہتی تھی، میں ضرور جاؤنگی،۔ یہ بات اور وہ بات اور۔ میری ماں خیال کریگی کہ مجھے اونکی کچھ پروا نہیں ہے۔ اور جو تھوڑا بہت روپیہ ہمکو وہاں سے ملنے والا تھا وہ بھی گیا گذرا ہوا۔ اور کیوں؟ ہمارے پاس چھتری نہیں ہے۔

اور رہے بیچارے بچے۔ غریب۔ وہ بھی شرابور ہونگے۔ گھر تو خالی بیٹھے رہنے پائینگے نہیں

انکے پڑھنے کا ہرج کیون ہو۔ اپنا ہی لکھا پڑھا کام آئے گا۔ اسکے سوا اور اُنکا باپ کیا چھوڑ یگا۔ یقیناً! وہ مدرسے ضرور جاوینگے یقین اس سے کیا کہ مینے یہ کہا تھا کہ اب وہ نہ جائینگے، کاڈل! تم ناحق بات کا بتنگڑ بناتے ہو۔ تمہاری باتون سے ایک فرشتہ کا بھی مزاج بگڑ جائیگا۔ بچے مدرسے ضرور جائینگے۔ خوب کان کھولکے سُن لو۔ اور اگر وہ سردی کے اثر سے مرے تو یہ میرا قصور نہین۔ مینے تھوڑے ہی چھتری دی ہے،

(مسٹر کاڈل اپنی وسنی تحریر مین لکھتے ہین کہ اس کے بعد اُنکو واقعی نیند آگئی اور اُنہون نے خواب مین دیکھا کہ تمام آسمان کا ایک سبز رنگ کا کپڑا بنگیا، جسمین وہیل مچھلی کی آنتون کی تانین لگی تھین اور در حقیقت تمام دنیا ایک بہت بڑی چھتری کے تلے گھوم رہی تھی۔)

(ترجمہ)   رادھا رمن

حیدرآباد مین ایک قدیم اور نادر کتب خانہ

حکیم سید محمد قاسم صاحب طبیب شمیات سرکار عالی کے قبضے مین ایک موروثی کتبخانہ ہے جو آپکے بزرگون کی ایک بیش بہا یادگار ہے، اس کتبخانہ مین عربی، فارسی، سنسکرت، تلنگی (وغیرہ) کی قدیم کتابین موجود ہین۔ تلنگی و سنسکرت کی بعض کتابین تاڑ کے پتون پر لکھی ہوئی ہین جس سے اِن تصنیفات کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔ بعض کتابون کا موضوع نہایت حیرت انگیز ہے مثلاً مصر قدیم مین جن اجزاسے انسانی لاشس کو اپنی اصلی حالت پر محفوظ رکھا جاتا تھا۔ ان کا مفصل بیان موجود ہے۔ اور زمین کے پوشیدہ خزائن ودفائن کا پتہ لگانے، پانی کی دبار بلندی پر لیجانے اور سرخ و سبز اور نیلے اور زرد رنگ پیدا کرنے کے اعلےٰ موضوع پر بھی کتابین موجود ہین۔ کتابین عموماً اُن کاغذون پر ہین جو اس زمانہ مین مستعمل تھے۔

یہ کتب خانہ پہلے قصبہ شاہجہانپور مین تھا جو حکیم صاحب کا وطن مالوف ہے لیکن اب حکیم صاحب بسلسلۂ ملازمت حیدرآباد مین فروکش ہو گئے تو کتب خانہ کو بھی ساتھ لاسکے کتب خانۂ مذکور ابھی غیر مرتب حالت مین ہے، اور سچ یہ ہے کہ اسکی ترتیب ایک شخص کے بس کی بھی نہین، یورپ اور امریکہ کے اکثر علما و فضلا اس کتب خانہ کا معائنہ کر چکے ہین حکیم صاحب کا بیان ہے کہ ایک امریکن فاضل نے اسکی قیمت پندرہ لاکھ روپئے تجویز کی تھی، خدا کرے باقاعدہ طور پر اسکی ترتیب و تنظیم ہو جائے۔

ہندو اور ہندو مسلم اتحاد

جس مضمون کو منشی پریم چند نے فروری کے زمانہ مین چھیڑا ہے، اسکی گہرائی اس امر کی مقتضی ہے کہ اسکے سارے پہلوؤن کو خوب غور کیا جائے۔ ممدوح کو ہندؤن کی خلاف کچھ شکایتین ہین اگر وہ شکایتین اصل ٹھیک ہون تو ہندؤن کے لیے نہایت شرم کا موقع ہوگا۔ ہم یہ قصہ چھیڑنا نہین چاہتے کہ اس معاملہ مین مسلمانون کے خلاف بھی انہین کے چند اکابران قوم ایسی ہی بلکہ اس سے بڑھی ہوئی شکایتین پیش کرتے ہین۔ بلکہ ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ منشی پریم چند کی غلط فہمی کے متعلق چند الفاظ مین اپنی رائے کا اظہار کر دین؛

منشی پریم چند کی پہلی شکایت یہ ہے کہ ہندؤن نے کبھی خلافت کی اہمیت ہی نہین سمجھی اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ معلوم کیون آپ پچھلے سارے واقعات کو بھلا رہے ہین۔ جس وقت عارضی صلح کے برخلاف مہاتما گاندھی نے آواز بلند کی تھی تو کیا عارضی صلح کے جشن سے احتراز کرنے مین ہندو مسلمانون کے دوش بدوش نہین رہے! اسکے بعد جب چندہ وغیرہ دینے کا سوال آیا تو کیا ہندؤن نے کبھی اپنا حصہ ادا کرنے سے گریز کیا، مولانا شوکت علی کی مشہور تقریر کی جو تفسیر آج منشی جی نے کی ہے شاید مولانا صاحب بھی اُسکو ماننے سے ہچکچائین کیا خلافت کے لیے چندہ ضرورت سے کم ہوا ہے؟ اگر یہ ہوتا تو سیٹھ چھوٹانی کے سامان کارخانہ جات کو آج انگورا بھیجنے کی ضرورت نہ پڑتی، کیا ایشیا کے سارے ملکون کو یکجا کرنے کا خیال مسٹر داس کے دماغ سے نہین نکلا۔ معاف فرمائیے کیا ہندو بیچارے ایسے ہی کم دماغ ہین کہ وہ خلافت کے سوال کو سمجھ ہی نہین سکے۔ جن عصمت پاشا کی منشی جی اتنے دلدادہ ہین اُنکی بابت کیا کہا جائے، آج ٹرکی کی جمہوریت نے خلیفہ کے سلسلے کا خاتمہ کر دیا ہے، کیا ہندوستان کے مسلمان اب ٹرکی کو دار الحرب قرار دیکر وہان حملہ کرنے کے لیے طیار بیٹھے ہین۔ مولانا محمد علی بھی ولایت کے ڈیپوٹیشن مین شامل ہوکر جزیرۃ العرب کو خلیفہ کے ماتحت رکھنے اور عربون کو آزادی دینے کے سوال کی

گتھی کو نہ سلجھا سکے تھے۔ ہندوؤں کی تو یہ تنگ ظرفی کینہ دلی کی مثال تھی کہ وہ خلافت کے خیال کو نہ سمجھ سکے۔ اب ٹرکی کی جمہوریت کو آپ کس نام سے پکارینگے۔ عصمت پاشا ہی کہہ رہے ہیں کہ لوگوں نے ہماری مدد اسلیے کی کہ ہم طاقتور تھے، نہ کہ خلیفہ کے محافظ۔ ہندو تو سیاسی بیدار مغزی کے وارث ہی نہیں تھے، اسکے مالک تو مسلمان ہی رہے جنھوں نے کھدر کا استعمال بہت کم کیا، جنھوں نے تلک سوراج فنڈ میں روپیہ بہت کم دیا۔ جن کے کانگریس کے ممبر نہ بننے کے بارے میں علی برادران کو بھی شکایت کرنی پڑی۔ بے وقوف تو ہندو ہی تھے جو کہ خواہ مخواہ سوراجیہ کے جھمیلے میں پڑے۔

آپ شکایتیں بھی عجیب طرح سے کرتے ہیں، ہندوؤں کے لیے تو نصیحت ہے کہ وہ کیوں خواہ مخواہ گئو ماتا کی تقدیس مسلمانوں سے منوانا چاہتے ہیں، لیکن اسکے ساتھ ہی آپ ان سے یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ مسجدوں کے سامنے باجے بجانے سے احتراز کرو، کیوں اس لیے کہ موسیقی مسلمانوں کے مذہب میں حرام ہے! کیونکہ ان کی نماز میں اس سے خلل پڑنے کا امکان ہے۔ پرماتما کا شکر ہے کہ اب ہندو ایسے دور سے ناصحوں کی بات ماننے کے لیے کم تیار ہیں۔

مان لیا کہ ہندوؤں کو وقت عبادت باجا بند کرنا مذہبی تنظیم کے لحاظ سے ضروری ہے، تو کیا منشی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ جہاں کہیں یہ جھگڑے ہوتے ہیں وہاں عبادت کے وقت ہی باجا بجانے پر جھگڑا ہوا ہے، معاف فرمائیں مسلمانوں کا تقاضا تو یہ رہا ہے کہ ہماری مسجدوں کے سامنے باجا بجایا ہی نہ جائے۔

منشی جی ہندوؤں کو اُدارتا کا اپدیش دیتے ہیں، یہ خواہ مخواہ کی زیادتی ہے، اُدارتا وہاں ہی دکھلائی جاسکتی ہے جہاں دوسرا آدمی اسکو اُدارتا سمجھنے کے لیے تیار بھی ہو۔ اور یوں بھی کمزور کے لیے اُدارتا کا اپدیش کیا؟ اسکی اُدارتا تو اسکی کمزوری کی مترادف سمجھی جاتی ہے۔ آپکو یقین ہے کہ مسلم لیڈران مسلمانوں کے غیر ذمہ دار طبقے کے موجودہ رویہ کو زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہنے دینگے۔ جھگڑا تو یہیں شروع ہوتا ہے۔ مسلم لیڈران نے کب اسبات کا یقین دلایا کہ وہ اس بات میں کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں؟ حساب خوب ہے ہندوؤں کو تو آپ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کے احترام کی تعلیم دے رہے ہیں، لیکن دوسری طرف مسلمانوں کے لیے گئوکشی کے معاملے

مین آپ کچھ کہنے کے لیے طیار نہین اور ہندوؤن کو کوستے ہین، جناب من جھگڑے یون طے ہونے سے رہے کھلے دل سے دونون فریق اتحاد کی ضرورت کو سمجھ جائین، اور پھر ایک دوسرے کو مراعات دینے کے لیے طیار ہون تب ہی قضیہ نپٹ سکتا ہے، تبلیغ کے متعلق ہمین خوشی ہے آپنے اپنے پرانے خیالات تبدیل کر لیے ہین، اور اُس مین آج آپ کم از کم ہندوؤن کے سر کوئی خاص الزام تھوپنے کے لیے طیار نہین ہین۔

ایک بات صاف ہے دونون مذہبون کے پیروُن کو، دل اسیات کا یقین دلایا جانا چاہئے کہ اُن کے درمیان اتحاد ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اسکے لیے جبتک مسلمانون کے دل سے یہ خیال دور نہین ہوتا کہ ہمین افغانستان کے مسلمان ہندوستان کے ہندون سے زیادہ عزیز ہین اُسوقت تک کسی بہتری کی امید رکھنا فضول ہے۔ جبتک مسلمانون کی آشاؤن کا بڑا حصہ ہندوستان تک محدود نہین ہوتا اسوقت تک وہ سنجیدگی سے اس سوال پرسوچنے کے لیے طیار نہ ہونگے اُنھین ہندوؤن سے کیسے برتاؤ کرنا چاہیے۔ یہ غیرملکی حب الملتی ہی سب جھگڑون کی جڑ ہے، ایک اور خیال جو ان جھگڑون کو نشو ونما پانے کا موقع دیتا ہے وہ ہندون کی کمزوری ہے، افراد ا ہندو اہل دماغ بھی ہین تعلیمیافتہ بھی ہین دولتمند بھی ہین، شاید طاقتور بھی ہین لیکن بحیثیت مجموعی وہ بالکل کمزور ہین کمزور ہونا گناہ ہے اسکو منشی پریم چند اور انکے سارے ساتھی ملکی نکتہ نگاہ سے ماننے کے لیے تیار ہین کمزور خواہ مخواہ غیرون کو اپنے اوپر جبر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ہندوؤن کی یہ کمزوری ہے۔ جو انھین گاہے گاہے مسلمانی زیادتیون کا تختہ مشق بنادیتی ہے۔ ہند و سنگھٹن اسیات کی دوا ڈھونڈنا چاہتا ہے ہندون کے لیے ایک مذہب کے پیرون کے حیثیت سے اکٹھا ہونے کا سوال ایسا ہے جسکے برخلاف کسی معقولیت پسند صاحب کو اعتراض نہین ہوتا چاہیئے۔ مسلمانون کی مسلم لیگ ہے۔ خلافت کمیٹیان ہین جمیعتہ العلما ہے، اسکے سوا اور بھی کئی نظام ہین۔ جبوقت یہ جماعتین ملکی معاملات مین ہاتھ ڈالتی ہین اُسوقت نہ منشی پریم چند اور نہ اُن کے ممدوح علی برادران اسبات کو بُرا سمجھتے ہین۔ نہ معلوم ہندوؤن کی ہندو سبھائین کیون اُنہین ایک آنکھ نہین بھاتین۔ یا تو کہہ دو کہ سب فرقہ وارانہ جھگڑے جھمیلے ٹھیک نہین۔ یا پھر یہ بتادو کہ

ہندو مہاسبھا اور ہندو سنگھٹن کے سر سوار ہونے میں کہاں کی معقولیت ہے۔

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہندو سنگھٹن اسلیے منشی پریم چند اور ان کے چند ساتھیوں کے لیے باعث عتاب بن رہا ہے کہ اسمین ریئس پارٹی بھی شامل ہے۔

لیکن کیا مسلمانوں کی مختلف تحریکوں میں حاکم اور محکوم، رئیس اور غلام سب شامل نہیں ہیں۔ ہندو سنگھٹن میں ٹھوس کام کرنے والے نہیں ہیں اور نہ وہ شور و غوغا کرنے والے ہیں عام لوگوں کے جذبات کو بھڑکانے کا کام ہی وہ نہیں کرتے۔ لیکن وہ لوگ یہ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کسی ہندو کو اس لیے اس تحریک سے باہر رکھیں کہ وہ کانگریس کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، اگر ہندوؤں میں متحمل مزاج لیڈروں کی کمی ہوتی تو ۱۹۱۶ء کا لکھنو کا معاہدہ وجود میں نہ آتا، مسٹر داس کا بنگالی معاہدہ بن سکتا کسی انصاف پسند آدمی کو یہ کہنے کا موقع نہیں مل سکتا کہ سوراجیہ کی جنگ میں مسلمانوں کو داخل کرنے کے لیے ہندوؤں نے موقع بموقع مسلمانوں کو مختلف قسم کی مراعات نہیں دیں۔

منشی پریم چند ایسے ہندوؤں کے لیے اپیل کرتے ہیں جو کہ علی برادران کی طرح اپنا سب کچھ ہندو مسلم اتحاد کے لیے وقف کر دیں، ایسے آدمیوں کا وجود مبارک ہوگا، لیکن ہندوؤں کے لیے ایسے آدمیوں کا وجود ان سے بھی مبارک ہے، جو کہ ان کے مسئلوں کے حل کرنے کے لیے اپنے آپکو وقف کر دیں شکر کا مقام ہے کہ ایسے آدمی ہندوؤں میں پیدا ہو رہے ہیں۔

سری رام شرما۔ ایم اے



تنقید کتب

رباعیات حکیم عمر خیام

یورپ نے حکیم عمر خیام کی اس درجہ توقیر کی کہ ایشیا میں بھی اسکی رباعیاں خصوصیت سے ہر دلعزیز ہوگئیں، عربی، فارسی، اردو رسالوں میں تو خیر اسکے کلام پر تبصرے ہوتے ہی رہتے ہیں، مگر اب ہندی زبان بھی خیام کو عزت کی نظر سے دیکھ رہی ہے، اور ہندی رسالے رباعیات خیام کے ترجمے اور ان کی خیالی تصویریں شائع کر رہے ہیں۔

اس سے پہلے لودھیانہ سے ایک صاحب نے خیام کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ اردو میں شائع کیا تھا مگر وہ ادبی نقطۂ خیال سے ناقابل التفات تھا، اسوقت جو ترجمہ رباعیات عمر خیام کا ہمارے سامنے ہے وہ البتہ قابل قدر ہے، اسکے مترجم، مولوی حافظ جلال احمد صاحب جعفری، الہ آبادی ہیں۔ اسمیں ۴۰۹ رباعیاں مع ترجمہ درج کی گئی ہیں، کتاب کے ابتدائی صفحات میں دیباچہ کی طور پر عمر خیام کے سوانحی حالات تحریر کیے گئے ہیں، اور آخر میں اوسکی تصنیفات کا ذکر ہے، اس کے بعد چگونگی و تاریخ رباعی و محاسن آن، کے تحت میں رباعی کی ایجاد اور اسکی خوبیوں پر بحث کی گئی ہے اور اسی سلسلے میں رباعی کے مروجہ اوزان بھی تحریر کر دیے گئے ہیں، یہ مضمون بیشک دلچسپ اور مفید ہے مگر عنوان کی چگونگی نے موجب حیرت بنا رکھا ہے۔ کاش مترجم صاحب بجائے فارسی کے کوئی اردو کا سیدھا سادہ فقرہ تحریر فرما دیتے۔

رباعی کے اوزان و تعریف کے بعد آپ نے خیام کے معاصرین کا ذکر کیا ہے اور اسی میں ان شعرا کا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے خیام سے پہلے رباعیاں کہی ہیں، اور مثالاً ہر شاعر کی منتخب رباعیان

بھی تحریر کی ہیں۔ رباعیوں کو پڑھکے اندازہ ہوتا ہے کہ خیام کو کس میدان کا تمام رمیدان بتایا جاتا ہے، اس میں پہلے بھی ایسے مردان کار گزرچکے ہیں جنکے نقش پر چلکر خیام کو یہ درجہ قبولیت نصیب ہوا، اسی سلسلے میں ابوالحسن خرقانی کی ایک رباعی ایسی بھی نظر آتی ہے جو خیام کی رباعیوں میں شامل ہے، اور مزا یہ کہ باوجود علم کے حضرت مؤلف نے اس کا اظہار نہیں کیا، رباعی یہ ہے،

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من ٭ وین حرف معما نہ تو خوانی و نہ من ٭
هست از پس پردۂ گفتگوے من و تو ٭ گر پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من ٭

صفحہ ۵ امین یہ رباعی ابوالحسن خرقانی، کے نام سے لکھی ہے اور پھر صفحہ ۲۱۲ میں، یہی رباعی، عمر خیام کی رباعیوں میں شامل کی گئی ہے، حضرت مؤلف کا فرض تھا کہ اس قسم کی تمام رباعیوں کے متعلق کم سے کم اپنی رائے تو ضرور ظاہر کر دیتے، جو دوسرے شعرا کی ہیں جنکی نسبت شبہہ ہے کہ یہ خیام کی نہیں، مثلاً

گویند بہشت و حور عین خواہد بود ٭ وان جا مئے ناب و انگبین خواہد بود
گر ما مئے و معشوق گزیدیم چہ باک ٭ چون عاقبت کار چنین خواہد بود

اس رباعی کے متعلق عام خیال ہے کہ حافظ شیرازی کی ہے، اور حافظ شیرازی کے دیوان میں موجود ہے، حضرت مؤلف کا فرض تھا کہ دیباچے میں ایک عنوان اس قسم کا بھی قائم کرتے جسکی تحت میں ان غلط فہمیوں پر روشنی ڈالی جاتی،

جناب مؤلف نے اُن احسانات کا بھی ذکر کیا ہے، جو یورپ نے عمر خیام کی رباعیوں پر کیے ہیں اور ان مختلف تراجم کا حوالہ دیا ہے جو وہان شائع ہوے ہیں، لیکن موصوف نے انکے متعلق جو کچھ کہا ہے، مولانا شبلی مرحوم کی زبان سے کہا ہے، یعنی شعر العجم کی تحریر نقل کر دی ہے، کاش آپنے یہ محنت بھی گوارا کی ہوتی، کہ مختلف تراجم کو سامنے رکھکر ان غلط فہمیوں کے اظہار کی کوشش کرتے جو یورپین تراجم میں موجود ہیں، آپ نے خیام کی رباعیوں پر تبصرہ بھی کیا ہے اور سچ یہ ہے کہ خوب کیا ہے، یعنی مختلف عنوانات کی تحت میں خیام کی منتخب رباعیاں تحریر کی ہیں، خمریات کی تحت میں لکھا ہے،

"اس سے کسکو انکار ہو سکتا ہے کہ خیام شراب نہیں پیتا تھا، بیشک وہ شراب پیتا تھا، او۔

شراب بھی پی ظاہر، وہ سرشار فلسفہ تھا،،

ہمکو مؤلف کے اس قول سے پورا پورا اتفاق ہے، خیام کی اکثر رباعیات بتاتی ہیں کہ وہ واقعی شراب پیتا تھا، لیکن ہم اسکو فلسفہ، صرف اسی معنی میں تسلیم کرتے ہیں کہ وہ قیود شرعی سے بڑی حد تک آزاد تھا، وہ بزم تصور مستی بخشیں، لکھدینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقعی فلسفہ تھا، اور وہ اصل قیود تھندری کا پابند تھا، یوں تو غالب نے بھی دعویٰ کیا ہے،

عام دستور ہے کہ شراب کا نشہ خیالات میں ایک رنگینی اور بیان میں ایک دلاویزی پیدا کردیتا ہے اکثر بادہ پرستوں کے دلمیں ایسے خیالات آتے ہیں جو صوفیائے کرام کے لیے مخصوص ہیں، لیکن ان نقوش ظاہری پر تاثرات باطنی کا اطلاق نہیں ہو سکتا،

غالب، شراب پیتا تھا، اور اکثر نشہ کی ترنگ میں ایسے پتے کی باتیں کہ جاتا تھا جنکا تعلق بغیر حقیقت اور فلسفہ کائنات سے ہے، ممکن ہے کہ اکثر حضرات کو اُن خیالات میں، اسرار حقیقت کے جلوے نظر آتے، لیکن غالب خود نہایت آزادی سے اپنے متعلق اعلان کیا ہے،

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا،

مقصود اس بحث سے یہ ہے کہ عمر خیام کی رباعیوں کے مستانہ مضامین سے متاثر ہوکر اُسے صوفی صافی تسلیم کر لینا، حقیقتاً درست نہوگا کیونکہ نشۂ شراب کی حکومت تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے اگر کلام میں کوئی خاص اثر ہو تو یہ ضروری نہیں کہ کہنے والے کے دل پر بھی وہی اثر قائم ہو۔ لیکن اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا، کہ خیام کی رباعیاں، اسرار حقیقت، فلسفۂ کائنات کی معلم، اور رموز ہستی اور بے ثباتی دنیا کا آئینہ ہیں، اور یہی چیزیں ہیں جن پر ہمکو نظر کرنی چاہیے، خیام کی ذات سے بحث فضول ہے،

اکیاون صفحے، اس دلچسپ دیباچے ونکش اور تبصرے کے نذر ہوتے ہیں، اسکے بعد صفحہ ۴۵ سے اصل رباعیات شروع ہوتی ہیں،

ٹائٹل دیکھکر یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ حضرت مؤلف شاید رباعیوں کے نکات کی شرح بھی بیان فرمائیں گے، لیکن سرسری مطالعہ کے بعد ہی نگاہیں مایوس ہوگئیں، رباعیات کے نیچے

صرف انکا ترجمہ لکھدیا گیا ہے، اِن کہین کہین ترجمے کے ساتھ، جناب مؤلف نے دوچار لفظ کا اضافہ فرمایا ہے، صفحہ ۲۹، ۳۰، ۳۲ مین چند باعیان ایسی ہین جنکا ترجمہ مطلب کے عنوان سے لکھا گیا ہے، چاہے اسے ترجمہ سمجھئے یا شرح بہرحال جو کچھ بھی لکھا ہے اچھا لکھا ہے،

در ہر دشتے کہ لالہ زارے بوداست — آن لالہ زخون شہریارے بوداست
ہر برگ بنفشہ کز زمین مے روید — خالے ست کہ بر رخ نگارے بوداست

جس جنگل مین کہ کوئی لالہ زار ہے، وہ لالہ کسی بادشاہ کے خون سے ہے، ہر بنفشہ کی پتی جو زمین سے اُگتی ہے، وہ ایک خال ہے جو کسی حسین کے چہرے پر تھا۔ (اس بیے وہ قابل توقیر ہے،)

ترجمے کی خوبیون سے انکار نہین، لیکن اسے شرح نہین کہہ سکتے تمام کہتا ہے،

جس کسی جنگل مین بھی کوئی لالہ زار ہے، اسکا ہر پھول (یعنی لالہ) کسی بادشاہ کے خون سے پیدا ہوا ہے، بنفشہ کی جو پتی زمین سے اُگتی ہے وہ ایک خال ہے جو کسی حسینہ کے چہرے پر تھا،

اس اجمال کی تفصیل یا اس مسئلہ کی شرح یہ ہے، کہ خیام مناظر فطرت سے درس حقیقت لیتا ہے، اسے زندگی مین فنا کا جلوہ نظر آتا ہے، وہ کہتا ہے، اسے لالہ نہ سمجھو، ممکن ہے، اسمین کسی بادشاہ کا خون شریک ہو، اور یہ بنفشہ کی پتی ممکن ہے، کسی حسینہ کی، خال دلکش ہو یہ خیال اسلیئے پیدا ہوا کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے، ساری چیزین مٹ کر خاک ہوتی رہتی ہین اور ہر حال خاک سے گل بوٹے اُگتے رہتے ہین، اسلیئے حقیقت شناس خیام کو لالہ کی رنگت مین کسی بادشاہ کے خون کی جھلک نظر آتی ہے یعنی ممکن ہے کہ لالہ جو ابھار کس فرمانروا کی خاک سے اُگا ہو اسی بنفشہ کی پتی دیکھکر کسی حسین چہرے کے خال دلکش کی لطافت یاد آجاتی ہے، اور وہ دنیا کے سامنے یہ درس حقیقت پیش کرتا ہے، کہ دنیا فانی ہے ہر ہستی ایک دن مٹ کر خاک ہوجائیگی اور اس کی خاک سے مختلف قسم کے گل بوٹے اُگینگے

غالب نے بھی اسی خیال کو لفظون مین ادا کیا ہے۔

سب کہان کچھ لالہ و گل مین نمایان ہوگئین — خاک مین کیا صورتین ہونگی جو پنہان ہوگئین

ترجمہ متعلقات اسقدر سلیس ہے کہ حقیقتاً شرح کی ضرورت نہین اور ترجمہ ہی سے مطلب

واضح ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ کہیں کہیں الفاظ کی تشریح بھی کردی ہے، مثلاً

ساقی قدحے کہ نور بخشد ہمہ را   پر کن کہ دمے حضور بخشد ہمہ را
خوش باش کہ ہم بہ بخشد آلایش ما   آن کس کہ مے طہور بخشد ہمہ را

آلایش آلودگی کنایہ ہے گناہ سے، مئے طہور وہ شراب جو بہشت میں بہشتیوں کو پینے کے لیے ملے گی۔ اے ساقی ایسا پیالہ بھر دے جو سب کو نور عنایت کرے (یعنی سب کے دلکو منور کردے) تاکہ وہ ایک دم سب کو حضور قلب کامرتبہ عنایت کردے تو خوش رہ (اور فکر نہ کر) کیونکہ وہ ذات ہم سب کے گناہ معاف کریگی اور سب کو شراب طہور عنایت کرے گی، (یعنی خدا گناہوں کا بخشنے والا ہے وہ شراب طہور عنایت کرے گا فکر کی کیا بات ہے تو تو شراب کے پیالہ بھر کر دیدے)۔

بعض رباعیان ایسی بھی نظر آتی ہیں۔ کہ (شرح تو شرح) انکے ترجمے میں بھی خامی ہے، مثلاً۔

من مے بعیان ہمی خورم بر لب کشت   گر زان کہ مرا دو کس ناپابد زشت
گوئی تو کہ ہر کسے خورد دوزخی است   کس رفت بدوزخ و کہ آمد ز بہشت

(اے زاہد، میں تو سبزہ زار کے کنارے شراب پیتا رہونگا، تو کہتا ہے کہ جو شراب پئے گا وہ دوزخی ہے (تو مجھے یہ بتا کہ) کون دوزخ میں گیا تھا۔ اور بہشت سے کون آیا ہے (جس نے یہ کہا ہے کہ شرابی دوزخ میں جاتا ہے اور جو شراب نہیں پیتا وہ جنت میں جاتا ہے)

اس ترجمے میں دوسرے مصرعے کا پورا ترجمہ شامل نہیں، گر زان کہ مرا دو کس ناپابد زشت خدا جانے کیوں اس مصرعے کو حضرت مترجم نے ناقابل التفات سمجھا،

نہ لایق مسجدم و نہ خورد بہشت   ایزد داند گل مرا از چہ سرشت
چون کافر درویشم و چون قحبہ زشت   نہ دین و نہ دنیا و نہ امید بہشت

خدا جانے مری مٹی کا خمیر کس چیز کا ہے کہ نہ مسجد کے لایق ہوں اور نہ بہشت کے قابل، میں فقیر، کافر اور بدکار قحبہ کیطرح ہوں، نہ میں دنیا کا نہ دین کا نہ مجھے دوزخ کی امید ہے نہ بہشت کی،

آخری فقرہ، نہ مجھے دوزخ کی امید ہے نہ بہشت کی، شاید جناب مترجم کی قلم سے بے اختیار نکل گیا ہے بہشت کے مقابلے میں مجبوراً دوزخ کی ضرورت لاحق ہوئی، خیام کو تقابل منظور

نہ تھا وہ تو دوزخ کو اپنے افعال کا لازمی نتیجہ قرار دیتا ہے، یعنی نہ میں دین کا ہون نہ دنیا کا، نہ بہشت کی امید ہے، وہ دوزخ کا ذکر ہی نہیں کرتا، کافر درویش اور قحبۂ زشت کی تشبیہ قابل غور ہے، یعنی میں بظاہر فقیر ہون

مگر میرے اعمال و افعال کفر و ضلالت سے مملو ہیں، دنیا کے لایق اسلیئے نہیں کہ فقیر بنا ہوا ہون اور دین سے اسواسطے الگ ہون کہ کافر ہون، قحبۂ زشت، کا ترجمہ بدکار قحبہ کرنا، تشبیہ کا خون کرنا ہے بلکہ ذلیل قحبہ مناسب ہے، اس پیشے کے ادنی درجہ کی عورتین (جو عرف عام میں ایک خاص لقب سے ملقب ہین) عموماً مفلس رہتی ہین، دولت پاس ہوتی نہیں کہ دنیا میں اچھی زندگی بسر کرین، اور دین سے بلحاظ پیشہ پہلے ہی سے باتھ دھو چکی ہان، اب یہ کہنا کہ یہ دونون دوزخ کے قابل نہین غلط ہے، کیونکہ دوزخ تو انکا بہترین ٹھکانا ہے، ہان بہشت سے البتہ مناسبت نہین،

ساقی نظرے بمن کن از لطف عمیم
بیمار چہل جان مرا ہمچو نسیم
آہو چشمی و شیر چشمی چہ کنم
جان من از بین امید و بیم است دو نیم

اے ساقی تو اپنی عام مہربانی سے مجھ پر ایک نظر کر تو نسیم کی طرح میری جان کو بیمار نہ چھوڑ تو آہو چشم اور شیر چشم ہے میں کیا کرون، میری جان امید و بیم سے دو ٹکڑے ہو رہی ہے،

اگرچہ رباعی کا ترجمہ ہوگیا، مگر وہ لطافتین ظاہر نہ ہو سکین جو خیام کے بیان مین پوشیدہ ہین، پڑھنے والا اس ترجمے کو پڑھکر سمجھ نہین سکتا کہ نسیم کی طرح بیمار چھوڑنا کیا معنی، اور آہو چشم اور شیر چشم سے کیا مراد ہے، نسیم، اس دھیمی دھیمی ہوا کو کہتے ہین جو صبح کے وقت گلشن میں چلتی ہے، اس کی آہستہ خرامی کے بنا پر خیام نے اپنی سانس کو (جس پر زندگی کا دار و مدار ہے) اس سے تشبیہ دی ہے اور ظاہر ہے کہ سانس کو روح سے ایک خاص نسبت ہے پھر نسیم کی لطافت بھی ظاہر ہے خیام کی روح میں ساقی کی نا قدری سے ایک لطیف افسردگی پیدا ہو گئی ہے اسلیے سرد آہ اسکو آہستہ خرامی تشبیہ دینا آگیا ہے آہو چشم کہنے سے چشم معشوق کی انتہائی تعریف مد نظر ہے اور شیر چشم سے نگاہ گرم تیز مراد ہے، مشہور ہے کہ شیر کی آنکھوں مین ایک خاص کشش ہوتی ہے کہ اس سے آنکھ ملانا دشوار ہوتا ہے،

اب نفس مضمون پر غور کیجیے، خیام کہتا ہے، ساقی تری بالتفاتی نے میری جان کو بیمار کردیا ہے اب میری جان مین نسیم کی طرح ایک خفیف سی سانس جنبش باقی ہے، تو میری جان کو اس حال

مین نہ چھوڑ، اور اپنے لطف عام سے میری طرف بھی ایک نظر کر، تاکہ میری جان مین ایک تڑپ پیدا ہو جائے، تیری آنکھین ہرن کیطرح خوبصورت، اور شیر کی طرح خشمگین اور شکاری ہین، آہو چشمی میری جان کو مست کر دیتی ہے، مگر شیر چشمی، مایوس و افسردہ، مین کیا کرون میری جان کے دو ٹکڑے ہو گئے ہین، جسمین ایکطرف امید دستی ہے اور دوسری طرف بیم افسردگی)

اگرچہ اس تشریح مین، ترجمے کی طرح اختصار تو نہین رہا، مگر رباعی کی اصل لطافت سامنے آگئی، بہرحال اس تنقید سے تنقیص مراد نہین بلکہ جناب مترجم کے کمال کا اعتراف مقصود ہے۔

ترجمے کی خوبیون سے بھی انکار نہین، لیکن یہ گذارش ضرور ہے کہ دوسرے اڈیشن مین، ترمیم و اضافہ کی بہت کچھ گنجایش ہے،

امید ہے کہ شایقین ادب اس کتاب کی قدر فرمائینگے، کیونکہ رباعیات عمر خیام، کی خوبیون مین مترجم کے ترجمے اور تبصرے نے چار چاند لگا دیئے ہین،

کتابت و طباعت دیدہ زیب حجم ۲۷۰ صفحہ قیمت فی جلد عہ،

ملنے کا پتہ:- منیجر مطبع انوار احمدی الہ آباد

پیام امن

یہ کتاب، دراصل ترجمہ ہے، لوڈی نیشن کا (؟) ملک کے مشہور و معروف فلسفی انشا پرداز مولانا عبد الماجد صاحب بی اے، نے اپنے دلچسپ طرز تحریر سے اور مفید اضافون سے اسمین تصنیف کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ دیباچہ مین مترجم موصوف اعلان کرتے ہین کہ یہ لفظی ترجمہ نہین۔ اقتباس ہے اور اسلیے وہ اس کتاب کو تالیف کہنا زیادہ مناسب سمجھتے ہین۔ لیکن سرورق پر از عبد الماجد بی اے دیکھکر دھوکا ہوتا ہے کہ آپ کی کوئی مستقل تصنیف ہے، بلاشبہ مضمون کے اضافے نے، پیام امن کو بالاتر بنا دیا ہے۔

کتاب بہرصورت قابل قدر ہے، کاغذ نفیس، کتابت طباعت دیدہ زیب، حجم ۱۰۱ صفحہ

ملنے کا پتہ، دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ،

حضرت رشید،

سید آغا شہر لکھنوی نے لکھنؤ کے مشہور شاعر و مرثیہ گو پیارے صاحب رشید کے حالات زندگی شایع کئے ہیں، جسمیں جناب رشید مرحوم کے خاندانی حالات اور خصوصیات شاعری کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے، سلسلۂ بیان میں جناب عشق، جناب انس، جناب مونس، اور جناب انیس وغیرہم کے حالات و واقعات بھی تحریر کردیے ہیں، اس سوانح عمری، کی ترتیب اور واقعات کے سلسلے میں بعض مشاہیر لکھنؤ، کے دلچسپ بیانات بھی قابل دید ہیں،

رشید مرحوم کا شمار، لکھنؤ کی ان باکمال ہستیوں میں تھا، جنکی ذات اردو کیلئے سرمایۂ ناز تھی، آپ اردو کو اردو بنانا چاہتے تھے اور فارسی ترکیبوں کی غیر ضروری آمیزش کو اردو کا دشمن سمجھتے تھے، چنانچہ عزیز لکھنوی کا یہ شعر

شرح جنون سلسلہ جنبان کیے ہوئے
بیٹھا ہوں چاک چاک گریبان کیے ہوئے

سُنکر فرمایا،

بھئی پہلا مصرعہ تو بالکل فارسی ہوگیا،

کاش اس روایت کو پڑھ کے وہ حضرات اردو کی حال پر کرم فرماتے، جو اردو کے راستے میں ایسی ترکیبوں کے بڑے بڑے پتھر چن دینا اپنا ادبی فرض خیال کرتے ہیں -

رشید مرحوم باعتبار تغزل بھی عجیب و غریب شاعر تھے، سادگی میں ایسی رنگینی پیدا کردیتے ہ، جو فارسی کی رنگین ترکیبوں میں قطعی ممکن نہیں، مثال کی طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں،

وہی حیات کا باعث ہے جس پہ مرتا ہوں — یہی مرض ہے مرا اور یہی دوا میری

زندگی کہتے ہیں کسکو موت کسکا نام ہے — مہربانی آپکی، نامہربانی آپ کی

ایسے مضطر چلے اس کوچے کیجانب دونوں — گر پڑا میں کبھی سنبھے میں کبھی دل میرا

دونوں عالم جسے کہتے ہیں وہ یہ عالم ہیں
صبح مرغان چمن، یا شام اسیران قفس

چمن میں چین مجھے ساری او تیں رات،
بہشت تھا مرا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

ہاتھ پہلو پہ دھرا ہے کرتے ہیں دلبر کی فکر
پوچھتے پھرتے ہیں گلیوں میں کہیں دل جا ہیے،

سوئے جب گور غریبان میں تکلف نہ رہا
دیکھئے پانوں کیسا ہے کسی کا سر ہے

گھرا ہے میکدے پر ابر شرما کر نہ برسے گا
ذرا دم بھر نہ روئے منع کر دو اپنے گریبان کو

دل جگر پڑھتے ہیں کلمہ ترا ملک تن میں
ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے

ایک مدت کا ہے قصہ کسی جانب دل تھا،
اب نہیں یاد یہ پہلو ہے کہ وہ پہلو ہے،

لطف نظارہ پہ موقوف ہے اپنی ہستی
منھ ادھر آپ نے پھیرا کہ ادھر ہم نہ رہے

بس ایسے حال میں عاشق کو آپ ہی تو ہیں
حواس جا نہ سکیں اور ہوش آ نہ سکے

کہتا ہے ہاتھ اُٹھا کر سوئے شجر یہ گلچین
کیوں بدنصیب تو نے پھر آشیان بنایا

سینہ پہ جب کبھی کوئی آنسو ٹپک گیا
اس درجہ ناتوان ہوں کلیجہ دھڑک گیا،

کیا جوڑتے ہیں آپ دل پارہ پارہ کو
معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

وہیں وقت ذبح حسرت ہے کہ دیکھیں آپ کو　　مرتے مرتے خیر جینے کی تمنا بھی سہی

کب ترے دام محبت سے رہا ہوتا ہے　　کوئی سو مرتبہ مر جائے تو کیا ہوتا ہے

اے جوش جنون کیا یہ ہنسی ہوتی ہے ہم پر　　ہم تو کبھی ہنستے نہ تھے، وحشت پہ کسی کی

درحقیقت رشید مرحوم اردو زبان کے بہترین شاعر تھے، مرثیہ گوئی آپ کے نزدیک ایک موروثی فن تھا جس میں اپنی خصوصیت سے نام پیدا کیا، آپ کی بہاریہ تمہید، قابل قدر ہوتی تھی جسے آپ ہر مرثیہ میں نئے رنگ سے کہتے تھے، ایک موقع پر فرماتے ہیں،

اے خوشا وقت کہ عالم میں ہے سامان بہار　　سب مہیا ہیں وہ چیزیں جو ہیں شایان بہار
پھر سنواری گئی ہے زلف پریشان بہار　　صحن گلشن میں ہیں گل دست و گریبان بہار
پھول سب کھلنے لگے شاخ ہر اک پھلنے لگی
گر کے جب اوس تھمی سرد ہوا چلنے لگی،
کچھ عجب صورتیں غنچوں کی ہیں بھولی بھولی　　جو نظر آ گیا بھر لی زر گل سے جھولی
منع بلبل نے کیا چیز کسی نے جو لی　　بولی نرگس تجھے کیا بحث ہے تو کیوں بولی
بات جاتی رہے یہ حسن بیان کھس جائے
کہیں ایسا نہ ہو سوسن کی زبان کھل جائے

یہ سوانح عمری، جس میں رشید مرحوم کی تصویر، اور کلام کا مختصر انتخاب بھی شامل ہے ۲۱۴ صفحوں پر ختم ہوئی، زبان و بیان کے متعلق صرف لکھنؤ کا انتساب کافی ہے، کاغذ عمدہ کتابت، طباعت دیدہ زیب، قیمت عہ/

ملنے کا پتہ۔ جناب محشر صاحب، داہ گنگر لکھنؤ،

اعظمی

دل سے باتین

آنا تو بتا مجھکو تو، اے دل دیوانہ	کیا ہو گئے وہ تیرے انداز قدیمانہ
بچپن سے ترا کل تک، مجھسے رہا یارانہ	کیون آج ہے برگشتہ، کیون آج ہے بیگانہ

تو کیون نہین قابو مین، کہنے کو ہے قابو مین
یون ہے مرے پہلو مین، گویا نہین پہلو مین

بجلی جسے کہتے ہین وہ خاصہ تیرا ہے	بیتاب ہے بیکل ہے مضطر ہے تڑپتا ہے
ہر دم تری رگ رگ سے اک درد سا پیدا ہے	کچھ کہہ تو سہی آخر۔ یہ تجکو ہوا کیا ہے

برباد نہ کر مجکو، اس درد نہانی سے
یہ سن ہے جوانی کا، یہ دن ہین جوانی کے

ہان اے دل وارفتہ، ہان ای دل سودائی	اب کیون نہین اگلی سی، ہشیاری و دانائی
کچھ روز اگر یونہین تیری رہی خود رائی	ہو جائیگی بدنامی۔ ہو جائیگی رسوائی

کہنا ہی نہین منتا۔ کس کس طرح سمجھاؤن!
کیونکر تجھے بہلاؤن۔ اب کیا کرون! مر جاؤن!!

معلوم یہ ہوتا ہے، تو محو محبت ہے	مجھ پر یہ سب آنکھونکی، ڈھائی ہوئی آفت ہے
اس سوزش پیہم کا، موجب غم فرقت ہے	جو تجکو ستاتی ہے۔ وہ دید کی حسرت ہے

یہ امر ہے لاحاصل۔ مجبور نہ کر مجکو
اے دل۔ مرے پیارے دل مجبور نہ کر مجکو

مانا مرے کہنے سے وہ آئین، تو کیا ہو گا	یا اپنے یہان مجکو بلوائین، تو کیا ہو گا
آنکھون سے اگر آنکھین لڑ جائین تو کیا ہو گا	یہ سب سہی۔ وہ لیکن شرمائین تو کیا ہو گا

رہجاؤنگا منہ تک کے - چھا جائیگی خاموشی
لب تک بھی نہ آئیگی فریاد ستم کوشی

حالت شب فرقت کی، کون اُنکو سنائیگا
مین کہہ نہ سکون پھر کیا - تو آپ بتائیگا
ڈر ہے کہ فلک مجکو - یہ دن نہ دکھائیگا
سب کہنے کی باتین ہین - کون آئیگا جائیگا

مجھ تک وہ چلے آئین - کیا ایسی غرض اُن کو
کیون مجکو وہ بلوائین - کیا ایسی غرض اُن کو

تو یاد مین مرتا ہے - وہ یاد نہین کرتے
تو ہجر سے غمگین ہے - وہ شاد نہین کرتے
گر صبر کہ حال آتا - برباد نہین کرتے
عشاق جو ہوتے ہین - فریاد نہین کرتے

یون ہوکے پریشان تو - مجکو نہ پریشان کر
گر وصل کی خواہش ہے - ضبط غم ہجران کر

محمد یٰسین قریشی تسکین اسودی

کلام اعلیحضرت شاہ دکن

اثر پیدا ہوا اسکی فغا مین
تلاطم ہے زمین و آسمان مین
مین اُمید مسیحا پر ہون زندہ
وگرنہ کیا ہے جانِ ناتوان مین
حقیقت کھولکر اک دن رہینگے
وہ آنسو جو ہین چشم رازدان مین
مزے ملتے رہین دونون کے صیّاد
قفس بھی لاکے رکھدے آشیان مین
جرس کے بھی جو اُٹھکر ہوش کھو دے
وہ نغمے ہین میرے سازِ فغان مین

رہ طیبہ مین گرتے پڑتے عثمان
چلا جاتا ہون گردِ کاروان مین

گورو نانک دیو

(از دتّہ پرشاد فدا)

اے نانک قلب تھا صاف ترا، کیا وصف ہو تیرے سینے کا
کہتے ہیں چراغ طور جسے، جوہر تھا اس آئینے کا
ہر تار نفس ترا پایہ تھا، معراج وفا کے زینے کا
تری بزم میں کس کو یارا تھا، مکر اور فریب اور کینے کا
دل میں جو لگن پوشیدہ تھی، وہی لب سے ہویدا ہوتی تھی
ناپید جو تھی ذہن پہلو میں، گفتار سے پیدا ہوتی تھی

رتبہ تھا سوا ترا شاہوں سے، انداز فقیروں والا تھا
ہر سرو سہی ترا شیدا تھا، اور والہ ہر گل لالہ تھا
تری معنی خیز نصیحت کا، طور اور طریق نرالا تھا
تا دل ترے ہر جذبے کی مرغان سحر کا نالا تھا
اک ساز سراپا وحدت کا، القصہ تری ہستی تھی،
جس سے دل اہل دانش پر طاری محویت و مستی تھی،

ملتی تھی صلا جب رندوں کو اے پیر ترے خمخانے سے
بو سوز عشق کی آتی تھی، ہر سوز بھرے پروانے سے
یوں شوق تجلی اٹھتا تھا، ہر محفل کے دیوانے سے
جس طرح چھلکتی پڑتی ہو، مئے ناب بھرے پیمانے سے

دیدار کے طالب محفل میں، سرگرم تماشا رہتے تھے
خاموش مگر دل ہی دل میں، سرگرم تماشا رہتے تھے

مے عرفان کا متوالا تھا ، اور بزم الست کا ساقی بھی
تھا جام پیاپے گردش میں، اور دور کئی تھے باقی بھی
تری بیعت کا دم بھرتے تھے، ہندی بھی اور عراقی بھی
انداز میں ترے پنہان تھی، خلاقی بھی رزاقی بھی
تری ساقی گری کا شہرہ تھا، اِس عالم سے اُس عالم تک
ترے لطف وکرم کا چرچا تھا، بس عالم سے اُس عالم تک

مُسلم تجھے مرشد کہتے تھے، ہندو اوتار سمجھتے تھے
وہ کلمہ گو، یہ نانک کو، اہل زنار سمجھتے تھے
وہ بندۂ سُبحان کہتے تھے، یہ خود کرتار سمجھتے تھے
اور صوفی اپنے مذہب کا تجھکو سردار سمجھتے تھے
ان سب میں شامل ہوتے بھی، ترا اپنا طور نرالا تھا
سب اپنی اپنی مت والے، تو عرفان کا متوالا تھا

تو درس حقیقت دیتا تھا، سب کو یہ سناتا تھا ہر سُو
جز اللہ سب ناپیدا ہے، ہر سمت ہے پیدا اللہ ہو
جو میرا ہے سب تیرا ہے، میں مٹ مٹ کر ہو جائے "تو"
کاف تصغیر یہ کہتا ہے میں، ہیچ ہیں سب کچھ واہگورو
تو شاہ دِلوں کی بستی کا، اور واہ گورو کا پیارا ہے
اور نام ترا اس ہستی کے گلشن میں پھول ہزارا ہے

دتسر پرشاد فدا

عالمِ انتظار

از کلیم اعظم گڈھی

اُف یہ بیقراریان، لطفِ انتظار مین
ٹیس اُٹھ رہی ہے پھر قلبِ بیقرار مین

کب سے راہ تکتی ہون اسکی ان کو کیا خبر
دل تو انکا سخت ہے اسپہ ہوگا کیا اثر

اپنی شان دیکھتے گر نہین مرا خیال
پاس اپنے قول کا کچھ تو کرتے تند خصال

یہ سویرے کا سمان اور کنارۂ چمن
سبز سبز گھاس ہے ڈھڑ ہار ہا ہے من

خاک لطف سیر کا دلمین جب نہو قرار
پھول مین مہک کہان انمین ہین بھرے شرار

سرخ سرخ پھول مین رنگ ہی کہ آگ ہی
کیون جلا رہے ہین دل کیون یہ مجھسے لاگ ہے

جھیل دیکھتی ہون مین وہ کنول کا جھومنا
کالے کالے بھونرے کا منھ کو اُنکے چومنا

زخم دل ہرے ہوئے "پی کہان" کے شور سے
جانے کیون پپیہے آج چیختے ہین زور سے

مجھکو کیون سناتے ہین "پی کہان ہے، پی کہان"
ان سے کیا بتاؤن مین؟ دل کہان ہے جی کہان

چھیلتا ہے دلکو "آہ" بول ہے کہ تیر ہے
دلمین آج سو جگہ خون بھری لکیر ہے

مین تو چھپکے رات مین گھر سے آج چل پڑی
کب سے راہ دیکھتی راستے مین ہون کھڑی

آہ وہ نہ آئے کیون؟ انمین کوئی بات ہی
وہ نظر نہ آئین تو دن بھی مجھکو رات ہے

بڑھ رہی ہے روشنی "آہ" کوئی آنہ جائے
دیکھکر یہان مجھے دل کی بات پا نہ جائے

میری انتظار کو لوگ تاڑ جائین گے،
مجھکو دیکھ دیکھ کر انگلیان اُٹھائین گے

اپنے منھ کو ڈھانپے ہے، مین کہان چھپاؤنگی
جنا جی تو پاس ہین اس مین ڈوب جاؤنگی

آتی ہین موتشیان "اُجلی پیلی، کالی، لال"
پیچھے پیچھے کھیلتے آتے گوال بال

بولیان وہ بولین گے دیکھکر مجھے یہان
شک کرینگے مجھپہ وہ ہائے مین چھپون کہان

تیر جان بنکے وہ پھول لانے آئی ہے
اُٹھ کے آج تڑکے ہی یہ نہانے آئی ہے

ہائے کیا غضب ہوا آگئیں سہیلیاں
کیا نہانے آئی ہیں؟ آنہ جائیں سب یہاں

ایشور مجھے بچا! اُن کا سامنا نہو،
میں ادھر کو چھپ رہوں کوئی دیکھتا نہو

کُنج میں دبک رہوں جسم کو چھپا کے میں
اُنکو دیکھتی رہوں یوں نظر بچا کے میں

ٹھیک میرے سامنے گھاٹ پر وہ آگئیں
پانی لینے ہاتھ میں لو وہ کھیلنے لگیں

بول اُٹھی مالتی، میں نہیں نہاؤنگی
مجھپہ پھینکنا نہیں دیکھ بھیگ جاؤنگی

لو وہ کھینچ ہی لیا لالتا نے اس کا ہاتھ
جل میں وہ لپٹ پڑیں گر کے دونوں ساتھ ساتھ

لو وہ تیرنے لگیں جسم کو سنبھال کے
پانی پھینکنے لگیں ہر طرف اوچھال کے

میں نے کچھ نہیں سُنا مالتی نے کیا کہا
اسقدر تو سن لیا کہتی تھی وہ "رادھکا"

دیکھکر کہیں مجھے اس نے یہ نہو کہا
دوڑکر یہاں نہ آئیں مالتی و لالتا،

لو نکلیں نکلنے وہ ساڑیاں سنبھال کر
جسم اپنا ڈھانپ کر خوب دیکھ بھال کر

ساڑیاں بدلتی ہیں گھاٹ پر نکل کے وہ
لو پھر اسطرف چلیں ساڑیاں بدل کے وہ

دل دھڑک رہا ہے کاش اسطرف نہ آئیں وہ
جسطرف سے آئی ہیں اسطرف کو جائیں وہ

جا رہی ہیں گھر کو وہ بھر کے جل سے جھاریاں
سر پہ چندریاں دھرے ہاتھ میں ہیں ساریاں

باندھکر قطار وہ گھاٹ سے رواں ہوئیں
رفتہ رفتہ آنکھ سے وہ میری نہاں ہوئیں

اب کوئی نہیں رہا میں ہوں اور انتظار
آہ لب پہ آگئی اور دل ہے بیقرار

کیا خبر تھی وعدے کو یوں وہ بھول جائینگے
راستہ بھٹک کے بھی اسطرف نہ آئیں گے

ہوگئی کھڑے کھڑے مجھ کو پانچ چھ گھڑی
ہے قریب وہ گھڑی جب ہو دوپہر کڑی

میری آہ گرم کا اِسقدر اثر ہوا
دھوپ تیز ہوگئی گرم ہوگئی ہوا،

کیوں وہ پوچھنے لگے میرے حال زار کو
جانتے ہیں خوب ہی میرے انتظار کو

ہیں یہ کدھر سے آئی ہے یہ صدائے جانفزا
روح تازہ ہوگئی گونجنے لگی فضا

اُن کی بانسری کی لے یہ کدھر سے آگئی
جان بیقرار تھی سنکے چین پا گئی

گوپیوں کے ساتھ ساتھ دیکھئے وہ آتے ہیں
وہ ستانے کے لئے اُن کو ساتھ لاتے ہیں

سامنے نجاؤنگی سامنے گر آئیں بھی
میں نہ اُن سے بولوں گی گر مجھے منائیں بھی

جذبات فراق

ہمی رخ لے ہوئے گھر سے جانان ہم بھی بیٹھے مین
دل افسردہ پر اپنے تری ۃ اثر دیکھین گے

نسیم صبح ہم تیرے نثار اس تمنا بھی آ تا
ذرا ہم بھی خرام ناز کی تصویر دیکھین گے

اٹھین شمع لحد کا جھلملانا کوئی دکھلا دے
وہ کہتے تھے آخری سانس کی تصویر دیکھین گے

بیان شکست طلسم جہان عدم مین کرون
کہ مرتے دم یہ فسانہ ہمین سے چھوٹا تھا

تجھے خبر ہے تو ہی اے نگاہ ساقی آ
کہ رات بزم مین کس کس کو ہوش کتنا تھا

نگاہ تیز، وہ ترے حسن بے نیاز کی آہ
مین دل کو تھامے تری بزم سے جب اٹھا تھا

وہ دل جو قطرۂ خون تھا اسکی لہرون سے
بہار باغ جہان تھی وجود دنیا تھا

اے دل کسیکی پہلی نگاہون کا ذکر، آہ
یاد آگیا مجھے مرے غفلت شعار کیا

بجھ بجھ کے داغ دل ابھر آتے ہین ہمنشین
مجھ قیدی قفس کی خزان کیا بہار کیا

کچھ لڑکھڑائی چال ہے اسکی بھی ساقیا
آتا ہے میکدہ لیے ابر بہار کیا

تھا حال بے ثباتی دنیا کا ذکر تر ع
کہتی تھی رونے والے سے شمع مزار کیا

رگھوپت سہائے فراق

بزمِ سخن

نہایت خوشی کی بات ہے کہ کالجون اور اسکولون مین بھی اب اُردو ادب کی ترقی کا خیال پیدا ہو چلا ہے۔ چنانچہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو پرنس ناتھ ہائی اسکول مین ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی تین طرحون مین غزلین پڑھی گئی تھین ہم چند ادب دوست طلبا کی غزلون کا انتخاب ہدیہ ناظرین کرتے ہین۔ اڈیٹر

جناب محمد افتخار حسین صاحب افتخار

دعا مانگتا ہون ذرا تم بھی کہدو — خدا تیری سن لے دعا کرنیوالے
مرے ساتھ مٹ جائے نقشِ وفا بھی — پشیمان تو ہون یہ جفا کرنے والے

جناب مرزا صمصام علی بیگ تاسف

مریضِ محبت کا اب ہے یہ عالم — دعا کر رہے ہین دوا کرنے والے
یہان تک بڑھی ہین جفائین تمہاری — کہ مٹتے نہین اب دعا کرنے والے
مرے دل پہ کستی ہین اُنکی نگاہین — یہ ناوک نہین ہین خطا کرنے والے

جناب اولاد علی صاحب عرق

یہ شرمائی صورت یہ نیچی نگاہین — غضب ڈھا رہے ہین حیا کرنیوالے
مجھے زہر دیتے ہین مایوس ہوکر — مرے دردِ دل کی دوا کرنے والے

جناب ممتاز بریلوی

وفا کر رہے ہین وفا کرنے والے — سلامت رہین یہ جفا کرنے والے
تڑپتے ہین کس کس طرح تیرے بسمل — ذرا دیکھ لے او جفا کرنیوالے

تصاویر

اس ۱۰ دسمبر کو تمام ملک میں سیتا جی کی سالگرہ کا تہوار منایا گیا۔ ہم اس سالگرہ مبارک کے موقعہ پر اس پرچے میں رامائن کے متعلق دو دلکش تصویریں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ پہلی تصویر میں شری اتری کی اہلیہ انسویا بائی۔ سیتا جی کو نئے کپڑے پہنا رہی ہیں۔ رامچندر جی لکشمن جی و سیتا جی بن باس کو تشریف لیجاتے ہوئے تو شاید انھی کے آشرم میں ٹھہرے۔ انسویا مجسم پتی برت دھرم ہیں۔ ہندو خاتون کی شوہر پرستی خود دنیا میں ایک مثال ہے۔ دیوتاؤں میں بھی انسویا کا درجہ بہت ممتاز ہے چنانچہ روایت ہے کہ ایک دفعہ کسی دیوتا نے اتری رشی سے ناراض ہوکر بددعا دی کہ صبح ہوتے ہوتے دنیا میں انکا نام و نشان نہ رہے گا جب اس عصمت مآب خاتون کو اس بددعا کا حال معلوم ہوا تو اسنے اپنے پتی برت دھرم کی طاقت سے کامل چھ مہینے تک سویرا ہونے ہی نہ دیا۔ اور جبتک دیوتاؤں نے اس بددعا کا عدم کرنے کا وعدہ نہیں کر لیا تب تک انسویا بائی کے عزم بالجزم میں فرق نہیں آنے پایا۔

سیتا جی جب انسویا جی کے آشرم میں رونق افروز ہوئیں تو انھوں نے سیتا جی کی بڑی آؤ بھگت کی۔ انھیں دیوتاؤں کے عطیہ لباس و زیورات سے آراستہ کیا اور استری دھرم کے متعلق بہت سی باتیں بتلائیں۔ انسویا جی نے فرمایا کہ عورت کے لیے ماں باپ، بھائی اور دوست بھی قابل قدر ہیں لیکن شوہر ایک دولت نامتناہی ہے وہ عورت جو اپنے شوہر کی پرستش نہیں کرتی کسی ستایش کی مستحق نہیں ہے۔ بجز نیکی دوست اور عورت یہی چار چیزیں مصیبت کے وقت کام آتی ہیں جو عورت اپنے شوہر کی اطاعت کرتی ہے اسکی جگہ بہشت ہی میں ہے۔ سیتا جی تمہارا نام دنیا میں ہمیشہ نیکی سے یاد کیا جائیگا کیونکہ تم اپنے شوہر کو جان سے زیادہ چاہتی ہو۔

دوسری تصویر حسب ذیل واقعہ کے متعلق ہے۔ بن باس کے سلسلے میں جب شری رام لکشمن و سیتا جی گنگا جی کے کنارے پہنچے تو انہوں نے دریا عبور کرنے کے لیے ملاحوں سے کشتی طلب کی ملاحوں کا چودھری کہنے لگا "مہاراج میں نے سنا ہے کہ آپ کی خاک پا میں ایسی تاثیر ہے کہ ایک پتھر کی شلا آپکے قدم بوس ہوئی تو وہ ایک خوبصورت عورت بنگئی مگر یہ کشتی تو لکڑی کی ہے مجھے خوف ہے کہ اگر آپ میری کشتی پر سوار ہونگے تو کہیں یہ بھی کسی رشی کی استری نہ بن جائے اور اس طرح میری روزی جاتی رہے۔ ہاں اگر آپ مجھے اجازت دیں کہ میں پہلے آپکے چرن دھو لوں اور پھر آپکو کشتی پر بٹھاؤں۔ بھگوان شری رام چندر جی کیوٹ کی باتیں سنکر مسکرا دیے اور اسکو اپنے چرن دھونے کی اجازت دی اس نے بڑی خوشی خوشی کشتی پر سوار کرا کے دریا عبور کر دیا۔

تلسی داس جی نے اس واقعہ کو بہت خوبی سے نظم کیا ہے۔ دونوں مناظر سے شری بھگت جی کا واقعہ ہیں۔

کارٹون



یورپ خانہ جنگیوں کے تلاطم میں



ہندوستان اور گورنمنٹ ہند کا انجام ایکٹ

برطانیہ و روس کی کانفرنس



خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو



مزدوروں کے ادنےٰ طبقے کی بیداری



زمانہ

جلد سی و ہفتم

جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء

مرتبہ

دیانرائن نگم بی۔ اے

زمانہ پریس کانپور میں چھپکر

دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا

سالانہ عہ/ درجہ اعلیٰ عہ/

فہرست مضامین سالنامہ

جلد ...

بابت جولائی تا دسمبر ۱۹۲۲ء

تصاویر، انتظار (رنگین) اے بسا آرزو کہ ... ، ... کا ... پتا ...

[illegible]

باٹلی والا کی ... [illegible]

... [illegible]

باٹلی والا ... [illegible]

باٹلی والا ... [illegible]

باٹلی والا کا ... یہ ... استانوں ... [illegible]

باٹلی والا کا ... بام - یہ دوا ... [illegible]

باٹلی والا کا ... یہ دوا ... [illegible]

باٹلی والا کی ... [illegible]

باٹلی والا کا ... ۱۰۰ ... [illegible]

باٹلی والا کا ... یہ دوا ... جلدی ... بے حد مفید ہے -

باٹلی والا کا ... یہ ... سفید اور بے حد مضبوط بناتا ہے -

تار کا پتہ TELEADDRESS QAWADHAPUR BOMBAY

ڈاک کا پتہ - ڈاکٹر ایچ - ایل باٹلی والا اینڈ سنس کمپنی لمیٹڈ پوسٹ ... بمبئی

جنگ میں فتحمند کون ہوگا

لڑائی میں فتحمند وہی ہو سکتا ہو ... [illegible]

... اگر آپ ... [illegible] ... تیار کردہ

معمولات ... عالم ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

... ستارہ ... عالم آشنک ... [illegible]



زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی اے

جلد ۴۲ | جون ۱۹۲۴ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

تصویر ۔ راد ھا دیمن (؟) ، کارٹون

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

زمانہ

جلد ۴۲ — جون سنہ ۱۹۲۴ء — نمبر ۶

تعمیری نظام

تحریک ترک موالات نے ہندوستان مین سیاسی ترقی کی رفتار بہت تیز کر دی ہے۔ وہ باتین جو ناممکن معلوم ہوا کرتی تھین دیکھتے دیکھتے ممکن ہو گئی ہین عظیم الشان قربانیون نے ہمارے غصب کردہ حقوق واپس دلانے مین اپنا معجزہ دکھایا ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانی اب وہ ذلیل الفاظ نہین رہے جو آج کو چند سال پہلے تھے۔ گو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے تاہم بزرگان ملک متفق ہین کہ اسکا بہترین ذریعہ ترک موالات یا اُس سے ملتے جلتے اُصول کار ہین۔

یہ تو رہی سیاسیات کی ترقی لیکن اگر ہم دیکھین کہ سیاسیات کو چھوڑ کر تمدن حال کے باقی شعبون پر اس خاص تحریک کا کیا اثر ہوا۔ یا اس ضمن مین اسکے جان نثارون نے کیا کارنامے کئے تو ہماری امیدین درمیان مین ہی منقطع ہو جاتی ہین۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تعمیری نظام کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے۔ اس سے میرا مدعا نہین ہے کہ قوم پرستون کے اس قابل احترام گروہ نے اس ضرورت کو محسوس ہی نہین کیا۔ یا محسوس کرتے ہوئے ادھر ذرا اسطرف توجہ کی۔ یا اور باتون کو زیادہ ضروری سمجھا نہین ان نباضون نے سیاسیات کی اہمیت کو خوب جانچ لیا تھا۔ کوشش یہی کی کہ تخریب کے ساتھ ہی تعمیر بھی جاری رہے اور قومی ترقی کے عالیشان قصر کی ردی اینٹین اور خراب کڑیاں نکال کر ان کی جگہ اچھے اور مضبوط اجزا لگائے جائین۔ رونا تو صرف یہ ہے کہ انکا ہاتھ بٹانے والے کوئی سامنے نہ آئے۔ ہر انقلابی تحریک مین یہ ہوا کرتا ہے کہ عوام الناس کے محسوسات پر اثر ڈالا جاتا ہے چونکہ تخریب قدرتاً آسان ہے اس لئے حسیات عامہ کا اسطرف رجحان

[illegible] کیا وہ ہو جاتا ہے ؟ اسی میں کہ جب ان قوم کا [illegible] مقصود - [illegible]
[illegible] تعمیر کا کام جاری رہ سکے۔ تو اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ [illegible]
درست ہوتا ہے اور ملک کے انتظام و ترقی میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ بدقسمتی سے ہندوستان
کی ترقی کی جد و جہد میں یہ پہلو - یہ بات بہت حد تک نظر انداز کی گئی ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے
حصول میں تو ہم ماشاء اللہ خاصی ترقی کر گئے ہیں تاہم ابھی تک بہت سے ایسے اسباب باقی ہیں جن سے
ہم آئندہ مہذب اقوام دنیا میں کوئی امتیاز حاصل کر سکیں گے

آپ ایک منٹ کے واسطے تصور کر لیں کہ ہمنے اپنی انتہائی خواہشات حاصل کر لیں۔ ہندوستان کا مطالبہ پورا ہو گیا جسکا تقاضا شد و مد کے ساتھ ہر ہندوستانی کر رہا ہے۔ کینیا کا مسئلہ بھی ہمارے حسب خواہش طے ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کے ٹھیس لگے ہوئے دل کو بھی سکون ملا۔ مظالم پنجاب کی بھی تلافی ہو گئی وہ گورنمنٹ بھی ظہور میں آگئی جو بجائے انگریزی پارلیمنٹ کے ہندوستانی مجلس قومی کے جواب دہ ہوگی

مگر کیا سب باتیں حاصل کرنے کے ساتھ ہی ہندوستان اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے میں انگریزی تعلق قائم رکھنے یا نہ رکھنے کے متعلق اسوقت بحث نہیں کرتا ہوں میرے مقصد کا حصول ان چھوٹی چھوٹی بندشوں سے آزادی ہے میرا سوال صرف یہ ہے کہ کیا سوراج حاصل ہوتے ہی ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ مہذب اور ترقی یافتہ اقوام عالم کی صف میں ممتاز جگہ حاصل کر لیں۔ قبل اسکے کہ آپ جلدی میں اسکا جواب دے جائیں ذرا مفصلہ ذیل سوالات کی اہمیت پر غور کریں۔

(۱) کیا آپنے اس بات کی پوری کوشش کر لی ہے کہ وسائل ملکی کی ترقی کی رفتار مستقل رہے

(۲) کیا آپنے تجارت خارجہ کے اصول کو سمجھ کر وہ رکاوٹیں ہٹا دی ہیں جو اسمیں حائل ہیں یا آیندہ ہونے والی ہیں۔

(۳) کیا آپنے اس طرف پوری توجہ کی ہے کہ حفاظت ملکی اور مختلف صنعتوں کے واسطے تمام فنون جو ایک قوم کو اچھی طرح سیکھنے لازمی ہوتے ہیں آپ بھی کما حقہ سیکھ لیں۔

(۴) کیا آپ نے تعلیم عام کا مسئلہ حل کر لیا ہے۔

(۵) کیا آپ نے ملک کے کثیر التعداد حصہ آبادی یعنی زراعت پیشہ لوگوں کی حالت کی بہتری و ترقی پر پورا وقت صرف کیا ہے۔

[illegible] کا اثر کیا ہے -

وہ ایک دوسرے سے مختلف مذاہب کی روحانیت پرست ہندو رہ کے مسائل بھی ہیں؟
بھی ساتھ ہی تمثل ہندوؤں کے قابل غور ہیں: ہندو شاستروں کے سیاسیات کی وسعت دیکھ کر
محمد شعیب کی بعض ایسی حضرات ایسے ہیں جو مذکورہ بالا باتوں میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں
یہاں تک کہ انہوں نے کسی ایک خاص مذہب کو اپنا نصب العین زندگی قرار دے رکھا ہے اور اپنے چند رنگ
میں وہ شاید بہت کام تعمیری نظام کا کر رہے ہیں -

لیکن ہمیں کرنا ہے مہذب انسانوں کے مسکن ہندوستان کے واسطے محض اتنی تنگ
ہمارا نہیں - ضرورت ہے تعلیم عمل کی احساسات کی تکمیل کے واسطے ضروری ہے کہ مساوات - غیر معالات
سماجی برابری - برادری کی بحث اسی حد تک قائم رہے جہاں تک وہ اصول پرستی پر مبنی ہو - تعمیری نظام
میں حصہ لیتے ہوئے ہر پولیٹیکل گروہ ایک دوسرے کے دوش بدوش چلے - جہاں کتر بیونت کی ضرورت ہو کہ
بعض پرانی ٹہنیاں کاٹ دینے سے درخت میں مضبوط اور مفید شاخیں نکل آویں گی - ایسا کرنے
سے ہمیں لڑنے جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے - ہم کسی سیاسی خیال کے ہوں - آخر ہندوستانی ہیں - تو پھر
جزوئیات پر تو تو میں میں کیسی - کاش کہ ہم اب بھی اس نکتہ کو سمجھ لیں - اگر ایک مولانا آج سائنس کا ایک
کلیہ کہہ سکتا ہے اور وہ ظاہر کرے تو تارک مساوات کو کیا ضرورت کہ وہ اسکی گردن مارنے پر تیار ہو جاوے
ہر وہ تحریک جو کسی صورت میں ملک کے واسطے مفید ثابت ہو سکتی ہے - اس وقت تک بالجبر رد کی جاوے
جب تک کہ اسکی موجودگی سے فائدہ پہنچنا بند نہ ہو جائے - اصلاح کی بسا اوقات ضرورت ہوتی ہے مگر اصلاح
کا نام [illegible] جنگ و جدال نہ ہونا چاہئے - اگر ہم اس آشتی کے اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں تو ہمیں
بھروسہ ہے کہ سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ ہی تمدنی ترقی بھی ہوتی جاوے گی -

ہندوستان کی تہذیب پرانی اور قابل فخر ہے نہ صرف ہم بلکہ غیر بھی ہماری کھوئی ہوئی عظمت کے
معترف ہیں - یادگار نشان ہمکو عزیز ہے، تو غیروں کے واسطے بھی کچھ کم قابل احترام نہیں - لیکن محض پرانی
عظمت کا [illegible] ہمکو اس قابل نہ بنا دے گا - کہ ہم اپنی ہستی باعزت طور پر برقرار رکھ سکیں -
زمانہ بدل گیا - اور بدل رہا ہے - دنیاوی عزت کا معیار اور تمدنی ترقی کا راستہ بدل گیا تو ہمکو
بھی لازم ہے کہ "چلیں ہم ادھر کو رخ ہو جدھر ہوا کا" موجودہ تہذیب کو ناقص بتلا کر ہم اسی کی پرانی لکیر

ہوتا کہ ملک درست ہو سکتا ہے۔ اور صرف ہم بالکل مغربی رنگ میں سیاسی بہبود جیسا کہ آجکل اکثر ہو رہا ہے
کیئے جانے کا خواہاں ہیں جو فلسفۂ تعلیم، طرز حکومت، طرز معاشرت، طرز تمدن کی تقلید ہیں، اور دوسرا
اضافات فرمائیے کہ کیا ملک درست ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اصلاح کی
کی ضرورت اکثر اوقات محسوس ہوتی ہے۔ بیشک ہر اُس چیز میں جو مغربی ہے۔ اپنے خیالات اور عادات
کے مطابق اصلاح کریں جو مضر ہے اُس سے بالکل احتراز کریں لیکن چونکہ انہی باتوں سے ہمیں واسطہ
پڑتا ہے اسلئے ہم از خود حسن انجام سے بیخبر ہوکر ایک قدم بھی شاہراہ ترقی پر نہ اٹھائیں۔

تیسری نظام کی اسوقت ہندوستان کو سخت ضرورت ہے میں نے مختصر چند اصناف عرض کی ہیں
جن پر ہمکو فوری توجہ کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر میں پہلی شق کو لیتا ہوں اس دنیا میں ہمکو کئی باتیں ایسی ہیں
جنکی طرف ہمنے ابھی تک خیال نہیں کیا۔ ہر مہذب ملک آجکل اپنی طاقت پر نازاں ہے۔ گزشتہ جنگ
نے ثابت کر دیا ہے کہ وہی قوم دنیا میں اپنا لوہا منوا سکتی ہے جو زمانۂ جنگ و زمانۂ صلح میں اپنی پوری طاقت
کا اظہار کر سکے سائنس ایک ایسی چیز ہے جسکو سیکھکر اقوام عالم سرفراز ہو رہی ہیں۔

ہندوستان ابھی تک اس سے غافل ہے۔ اسوقت ایک صنعتی اور سائنٹفک کالج کی اشد ضرورت
ہے۔ ہمارے لیڈر اول تو خود اس کام کو کریں۔ اور اگر ہم میں اتنی استطاعت نہیں تو گورنمنٹ کو مجبور کریں
لیکن اس دوسری صورت میں مجھے تو کوئی خاص امید کامیابی نظر نہیں آتی۔ ہماری کمی تو اسیوقت
پوری ہوگی جب ہم خود بلا امداد غیر اس قابل بن جائیں کہ وسائل ملکی کی ترقی کے راز کو سمجھ لیں اسیطرح
باقی باتیں ہیں۔ اور ایسی کئی اور ہیں جن کی نسبت مفصل کسی آئندہ وقت عرض کروں گا۔ اسوقت تو میرا
مدعا یہی ہے کہ ہم زیادہ توجہ تیسری نظام کیطرف کریں فرقہ بندی کا شکار ہونے سے بچیں۔ اور اپنی اپنی جگہ
ہر ہندوستانی انفرادی طور پر یا مجموعی حیثیت سے یہ کوشش کرے کہ وہ معراج کی منزل مقصود تک
پہونچے پبلک کو اس قابل بنا دے کہ ہم غیروں کے محتاج نہ رہیں۔ مشورہ یا امداد اور بات ہے۔

چودھری۔ نذیر احمد خان بی' ایس' سی۔ ایل ایل بی

طالسطائی

طالسطائی سرزمین روس پر ایک زبردست شخصیت کا انسان گذرا ہے اسکی تعلیم پر عہد روس مین انقلاب عظیم کا باعث ہوئی بلکہ ساری دنیا کیلئے مشعل ہدایت ثابت ہوئی۔ اسکے معتقد و مرید تقریباً دنیا کی تمام شایستہ اور مہذب ممالک مین موجود ہین۔ اسکے اصول کی پابندی اور اقوال کی تائید و تبلیغ کے لیے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہرون مین متعدد انجمنین اور سوسائٹیان قائم ہین مہاتما گاندھی اور ان کے ہمعصرون نے جنوبی افریقہ مین اس متبرک ہستی کے مقدس نام سے طالسطائی فارم قائم کیا تھا۔ جہان اس فرشتہ صفت انسان کی تعلیمات و تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنے کی پیہم کوششین کیجاتی تھین بذات خود مہاتما گاندھی طالسطائی کے سرگرم معتقد ہین۔ کیونکہ مہاتما جی کی ستیاگرہ کا اصول طالسطائی کی تعلیم کا قابل تقلید جزو ہے۔ ترک موالات کی اس تعلیم کا لب لباب اور اصل یہ ہے کہ "لاپروائی کے ساتھ مقابلہ کرو" اور یہی تعلیم مہاتما جی کے اصول ترک موالات کی ہے۔

یہ قابل ستایش ہستی ۲۰ر اگست ۱۸۲۸ء کو ملک روس کے شہر تولا کے قریب موضع یاسنایا پولیانا مین وجود پذیر ہوئی۔ خوش قسمت تھی شہزادی میری اور شاہی خاندان کے رکن کاونٹ نکولس جنھین طالسطائی جیسی برگزیدہ ہستی کے والدین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مگر افسوس کہ آسمان ادب و تمدن کا نیّر درخشان اور اپنے مستقبل مین دنیا کو مشعل ہدایت دکھانیوالا نونہال ابھی صرف تین ہی سال کا تھا کہ شہزادی میری کا سایہ اسکے سر سے اٹھ گیا۔ اور ۹ سال کی عمر مین والد بزرگوار کے ظل عاطفت سے بھی محروم ہو گیا۔ اب پرورش کا بار اسکی چچی پر پڑا اور بڑے بھائی نکولس نے اسکی تربیت و پرداخت مین نمایان حصہ لیا۔ نکولس کے علاوہ طالسطائی کے دو بڑے بھائی اور تھے ایک کا نام ڈیمٹری تھا اور دوسرے کا سرجیس۔

عالم طفولیت مین طالسطائی کے بشرے سے یہ غیر معمولی آثار ہویدا تھے جس نے آگے چلکر

دنیا کا سب سے بڑا لیڈر اور رہنما بنا دیا۔

عالم طفولیت میں وہ اکثر کسی عمیق غور و فکر میں مستغرق رہا کرتا تھا اعتکاف پسندی گویا اسکے خمیر میں تھی اور کنج عزلت میں وقت گزارنا اسکا معمول تھا۔ اسوقت ٹالسٹائی کو تصنع و نمائش کا بھی شوق تھا اسکو اپنے جسم کی خوبصورتی کا بہت خیال رہتا تھا۔ باایں ہمہ وہ سلیم الطبع تھا اور شروع سے ہر مسئلہ پر غور و فکر کا عادی تھا۔

تعلیم کے ابتدائی منازل طے کرکے نوجوان ٹالسٹائی ۱۸۴۴ء میں کازان یونیورسٹی میں داخل ہوا شروع میں اسنے شرقی زبانوں کا کورس لیا لیکن امتحان میں ناکامیاب ہونے پر دوسرے سال قانون کا نصاب لے لیا قانون میں اسنے کچھ ضرور ترقی کی مگر طبیعت اسطرف بھی رجوع نہ ہو سکی۔ اسکا آزادانہ اور فکر دوست نیچر اسوقت کے طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہ ہو سکا اور اس کی ہوشمند زندگی میں ایک عظیم انقلاب واقع ہوا۔ شہر قازان اسوقت رقص و سرود تھیٹر و تماشوں اور دیگر منہیات کا مرکز بنا ہوا تھا وہاں کی یونیورسٹی کے متمول طلبہ بھی ہر قسم کے عیش و آسایش میں حصہ لینے پر مجبور تھے ٹالسٹائی پر بھی اسکا نمایاں اثر پڑا وہ بھی عیش پسند بن گیا تھا۔ حتی کہ وہ اکثر کالج کے بعض لکچروں سے غائب ہوجایا کرتا تھا۔ امتحان میں بھی وہ ہمیشہ کم نمبروں سے پاس ہوتا تھا لیکن وہ ان مضامین کا نہایت دلچسپی سے مطالعہ کرتا تھا جو اسے بالطبع پسند تھے۔

جب ۱۸۴۷ء میں ٹالسٹائی کا بڑا بھائی نکولس تحصیل علم سے فارغ ہوگیا تو ٹالسٹائی بھی اسکے ساتھ گھر لوٹ آیا گھر آکر ٹالسٹائی خاموش نہ بیٹھا۔ اس وقت سے وہ سلطنت انسانی غلامی کی بیہودہ اور اپنی ہمجنسوں کی شدید تکالیف کی تاب نہ لا سکا اور حتی الامکان شکست کی تدابیر میں منہمک ہوگیا چنانچہ اسنے ایک معمولی ناول "ایک زمیندار کی صبح" A MORNING OF A LANDED PROPRIETOR لکھا۔

پھر وہ تفریح کی غرض سے پیٹروگراڈ (سینٹ پیٹرس برگ) چلا گیا وہاں جاکر اسکی نو خیز امیرانہ عیش پسندیوں اور مخرب اخلاق تماشوں میں گم ہوگئی۔ وہ لہو و لعب میں مستغرق ہوگیا اور لہو و لعب بھی کیسے؟ تاش کھیلنا قرض لینا اور اسے فضولیات میں صرف کرنا وقت بیکار ضائع کرنا وغیرہ وغیرہ ایسی حالت میں اسکی روح کو راحت اور اطمینان کیونکر نصیب ہو سکتا تھا اور خیالات میں یکسوئی کیونکر پیدا ہو سکتی تھی۔ کبھی وہ یونیورسٹی کے امتحانات پاس کرنے کی

کرنا کبھی دوسری ولایتون کی سیر کا شوق دامنگیر ہوتا اور کبھی فوجی خدمات ادا کرنے کا عزم کرتا غرض یہکہ اسیطرح طالسطائی کا عالم عنفوان مین شباب کی گوناگون ولولون اور پرتلون کشمکشون سے مسرور ہوکر جوانی کے بہاؤ مین بہا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً اسکی زندگی مین ایک غیر معمولی تغیر رونما ہوا۔ یعنی اپریل ۱۸۵۱ء مین نکولس جو کاکیشس کے توپخانہ مین ملازم تھا رخصت پر گھر آیا اور یہ دیکھکر کہ طالسطائی کی طبیعت کا رنگ روز بروز بدل رہا ہے۔ اپنے ساتھ لیجانے پر آمادہ ہوگیا۔ طالسطائی نے بھی اس تجویز کو بخوشی منظور کرلیا کیونکہ وہ ایسے موقع کا خود متلاشی تھا چنانچہ اختتام رخصت کے بعد دونون بھائی کوہ قاف کی طرف روانہ ہوگئے۔

بھائی کی صحبت کے اثر نے طالسطائی کے دل مین فوجی کارگذاریون کے جذبات موجزن کردیئے اسلئے وہ طفلس کے فوجی اسکول مین داخل ہوگیا اور وہان کا امتحان بھی پاس کرلیا اسکے بعد ایک ناول لکھنا شروع کیا جسکا نام لڑکپن تھا۔ (BOY HOOD) اُسکو ختم کرکے پیٹرو گراڈ کے ایک خاص ماہوار رسالہ مین اشاعت کی غرض سے روانہ کردیا۔

اڈیٹر نے اس ناول کو نہایت شکریہ کے ساتھ شائع کردیا۔ طالسطائی کی زندگی مین یہ پہلا واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کیونکہ اس ناول کی اشاعت کے بعد اُسنے طے کرلیا کہ اسکی زندگی کا خاص مرکز دائرہ ادب ہوگا جس رسالہ مین یہ ناول شائع ہوا تھا وہ نہایت ہی وقیع تھا اور ملک کے تمام بزرگ اور مستند اہل قلم اسکے قلمی معاون تھے۔

کوہ قاف کی سیر سے سیر ہوکر اُسنے فوجی خدمات سے استعفےٰ دیدیا۔ ابھی استعفےٰ منظور بھی نہوا تھا کہ کریمین جنگ چھڑ گئی۔ جو روس اور انگریزون اور فرانسیسون کے مابین تھی۔ طالسطائی کے دلیرانہ جذبات بھڑک اُٹھے اسنے اپنا استعفےٰ واپس لے لیا اور میدان جنگ مین معرکہ آرا ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ اسوقت وہ فوجی امتحان اعلیٰ پاس کرچکا تھا۔ اسلئے وہ سواسٹوپل کے مشہور قلعہ مین افسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔

طالسطائی نے اس جنگ عظیم مین صدہا انسانون کو مرتے کٹتے دیکھا میدان جنگ کے خوفناک مناظر کا اسکے دل پر ایک خاص اثر پڑا۔ چنانچہ اسکا ناول جنگ و امن WAR & PEACE انھین واقعات سے پُر ہے جسمین میدان جنگ کے سانحات کا ذکر نہایت موثر اور دلکش پیرائے

مین درج ہے۔ طالسطائی ہرگز ان واقعات کو خوبصورتی سے نہ لکھ سکتا۔ اگر وہ بچشم خود ان کا مشاہدہ نہ کرچکا ہوتا۔ جب ۱۸۵۵ء مین سواستوپول کا قلعہ نیست و نابود ہو گیا تو یہ خبر لیکر طالسطائی [illegible] پہونچا اور وہان سے اپنے وطن مین جاکر فوج سے ہمیشہ کے لیے مستعفی ہو گیا۔

اسکے بعد اسکو غیر ممالک کی سیر کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور وہ انواع و اقسام کی تکالیف سفر برداشت کرتا ہوا پیرس پہنچا لیکن وہان کی تہذیب دیکھکر دنگ ہو گیا۔ دوران قیام پیرس میں اسنے ایک شخص کو (جسے پھانسی کی سزا ہوئی تھی) گلوٹین[1] سے قتل ہوتے دیکھا۔ اس عبرت انگیز منظر سے طالسطائی بہت متاثر ہوا اسنے پیرس کو خیرباد کہا اور سوئٹزرلینڈ کی راہ لی جو یورپ کا کشمیر ہے قدرتی مناظر کے اس آستانے پر لوگ دور دراز ممالک سے سجدہ ریزی کے لیے آتے ہین چنانچہ طالسطائی نے بھی یہ فریضۂ شوق ادا کیا اور پھر جرمنی ہوتا ہوا اپنے وطن لوٹ آیا اور یاسنایا پولیانا مین اپنی زمینداری کی نگہداشت کرنے لگا۔ دوسرے سال وہ ادبی کانفرنس کا نمایندہ منتخب ہوا اور اب روز بروز اسکا درجہ ادبیات مین بلند ہونے لگا۔

طالسطائی انہین مشاغل مین منہمک تھا کہ اسکے بڑے بھائی نکولس کا انتقال ہو گیا۔ اس غیر معمولی صدمے سے اسکے دل کو سخت رنج پہونچا۔ لیکن اسکی تخیل طبیعت نے اس موقع کا بھی فائدہ اُٹھایا یعنی وہ موت کے ثقیل مسئلہ پر غور کرنے لگا اور یہی مسئلہ اسکے لیے ایک موضوع دلچسپ بنگیا

اسی درمیان مین روس کا زار نکولس اول بھی راہی عدم ہوا اور الگزنڈر دوم زار ہوا جنگ کریمین سے ملک کی حالت نازک ہو رہی تھی ہر طرف سے رفارم کی آوازین بلند ہو رہی تھین تمام اخبارات رعایا کے مطالبہ سے پُر ہوتے تھے۔ صدہا نئے اخبارات جاری ہو گئے۔ دلون مین جذبات کے سمندر اُمنڈنے لگے اور ٹوٹے ہوئے قلوب مین بھی خوشگوار امنگین پیدا ہونے لگین نئے زار نے جب سلطنت کی باگ ہاتھ مین لی تو لوگون کی تجسس نگاہین رفارم کی امید مین اسکی جانب اُٹھنے لگین۔

---

[1] گلوٹین ایک خاص قسم کا آلہ ہے جو اپنے فرانسیسی موجد کے نام سے مشہور ہے [illegible] جاتا ہے اور کاغذ کاٹنے والی مشین کی طرح اوپر سے چھری گر کر گردن اڑا دیتی ہے (فرحت)

خاص سیاسی نظام جسکے لیئے لوگ سخت مضطرب تھے کسانون کی آزادی تھی ۲۳۰ لاکھ کسان غلامی کی سخت زنجیرون مین اسیر تھے۔

بیچارے کاشتکار اپنے آقا کے مزرعون مین سخت کاوش اور جانفشانی سے کام کرتے تھے اور کھیت کے ساتھ یہ بھی فروخت ہو جاتے تھے۔ کھیت کا مالک کسان کے ساتھ حسب خواہش برتاؤ کرتا تھا ظلم و تعدی کی کوئی حد نہ تھی۔ ایسے امرا قدرتاً اس نظام کے سخت مخالف تھے مگر الگزنڈر نے بڑے بڑے زمیندارون کی ایک انجمن قائم کی آخر تین سال کی متواتر کوششون اور بحث و مباحثہ کے بعد کسانون کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔

نئے قانون کے مطابق باشندہ کاشتکارون اور زمیندارون کے مابین صلح قائم کرنیکے لیے جا بجا پنچ اور ثالث مقرر کیے گئے بعض طالسطائی بھی تھا کاشتکارون کی ہمدردی کی وجہ سے اکثر لوگ اس سے برگشتہ ہوگئے کیونکہ زمیندار کاشتکارونکو مغالطہ دینا چاہتے تھے مگر طالسطائی کے سامنے ان مغالطون کی کچھ وقعت نہ ہوتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کے پاس طالسطائی کی شکایتین پہونچنے لگین اور اُسکو ایک سال کے اندر ہی مستعفی ہونا پڑا۔

پنچایت کی ذمہ داریون سے فارغ ہوتے ہی طالسطائی نے تعلیم کا کام اپنے ہاتھون مین لیلیا اور اپنے گاؤن مین ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کر دیا۔ تعلیم سے اسے فطرتاً مناسبت تھی یورپ کے مختلف شہرون کی سیاحی مین اسنے طریقۂ تعلیم کا غور مطالعہ کیا تھا چنانچہ اپنے مدرسے کا اصول ان سب سے الگ رکھا۔ اس اسکول کے معلمین کو سخت تاکید تھی کہ وہ نہ تو لڑکون کو انعام دین اور نہ سزا بلکہ اگر ہوسکے تو وہ طلباء پر اخلاقی اثر ڈالین۔ طالسطائی لڑکون مین آزادی اور از خود کام کرنے کی خواہش پیدا کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسکا خیال تھا کہ بچے قدرتاً سامنے کی چیزون کے متعلق غور کیا کرتے ہین اور نئی باتین دیکھنا چاہتے ہین وہ کہا کرتا تھا کہ جو بات بلا کسی جبر یا دباؤ کے ذہن نشین ہوتی ہے وہی قائم رہتی ہے۔ اساتذہ صرف ان کے رہنما ہین طلباء کو ہمیشہ آزادانہ تعلیم کا عادی بنانا چاہیئے۔

بدقسمتی سے یہ تعلیمی سلسلہ زیادہ دنون تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ کچھ دنون کے بعد طالسطائی بیمار ہوگیا اور تبدیل آب و ہوا کی غرض سے باہر جانا پڑا اسکی عدم موجودگی مین پولیس نے اُسکے مکان کی تلاشی لی لیکن بغاوت یا سازش کے متعلق کچھ بھی نہ ملا تاہم گاؤن کے

سا وہ طرح لوگ اس سے بہت زیادہ مخالف ہوگئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ بند ہوگیا۔ لیکن اس اسکول کی بدولت روسی زبان میں بہت سی درسی اور مفید کتابوں کا اضافہ ہوگیا۔

طالسطائی نے بعمر ۳۴ سال ۱۸۶۲ء میں شاہی طبیب کے خاندان کی ایک دوشیزہ سے شادی کی اور اپنے وطن یاسنا پولیانہ میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوگیا۔ اب پھر اسنے ادبی مشاغل میں کوشش شروع کی اور ملک میں ایک مستند ناول نویس کی حیثیت حاصل کی۔ اسی سلسلہ میں اسنے اپنا بہترین ناول اینا کورینا لکھا جو دنیا کی مشہور کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جب ۱۸۸۱ء میں روس میں سیاسی انقلاب عظیم برپا ہوا اور ۱۳ مارچ کو شورش پسندوں نے وہاں کے زار الگزینڈر دوئم کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو اس پرجوش ادیب کا دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اسنے دیکھا کہ لوگوں نے زار کو قتل کر دیا۔ اور حضرت عیسٰی مسیح کے احکام اور نصائح کی کچھ وقعت نہیں کی بلکہ الگزینڈر سوم بھی ان مقدس وعظ احکامات کے برعکس قتل کرنے والوں سے سلوک کر رہا ہے۔ چنانچہ اسنے زار کو اسکے متعلق ایک طول طویل خط میں لکھا۔ کہ جور و تشدد اور انتقام کی کوشش کا ختم ہونا بہتر ہے اسلیے اب استقلال سے ضبط کا مقابلہ کرنا لازم ہے۔ مگر زار کی طرف سے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

اسی دوران میں وہ کچھ عرصہ کے لیے ماسکو چلا گیا وہاں کے باشندے دو طبقوں میں منقسم تھے ایک طبقہ جفاکش محنتی اور مفلس کاشتکاروں کا تھا۔ دوسرے طبقے میں کاہل و نکمے سست آرام پسند متمول شامل تھے موخر الذکر طبقے کی تمام عیش و راحت کا دارومدار اول الذکر طبقے کی محنت و رنج پر منحصر تھا اس انکشاف سے طالسطائی کے دل کو سخت چوٹ لگی اور اسکا دل رحم کے جذبات سے بھر گیا۔ اس وقت ماسکو میں مردم شماری شروع ہونے والی تھی۔ طالسطائی نے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اپنی خدمات اس خطہ کی مردم شماری کے لیے پیش کیں جسمیں غریب و تنگدست طبقے کے افراد آباد تھے۔

اس مردم شماری کے تجربات کی بنا پر طالسطائی نے ایک کتاب تصنیف کی WHAT SHALL WE DO THEN? اس کتاب میں اسنے ان غریبوں کے حالات پردرد نہایت پُراثر پیرائے میں تحریر کیے ہیں۔ اور نتیجہ یہ نکالا کہ سوشل دنیا رحم کے لیے سوسائٹی کے اندر

سخت تغیر و تبدل کی ضرورت ہے طالسطائی کا قول تھا کہ سوسائٹی میں خرابیاں پیدا کرنیکا بہت بڑا ذمہ دار روپیہ ہے جسکا اثر جبریہ طور پر دوسرون پر ڈالا جاسکتا ہے۔

اُسنے لکھا ہے کہ "اپنی افعال پر افسوس کرو، اپنی زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دو اپنی دولت کو غریبون کو دو یا نہ دو مگر اُن کی پُر تکلیف اور جفاکش زندگی مین حصہ ضرور لو"

تھوڑے دنون کے بعد جب وہ پھر یاسنا پولیانہ مین واپس آیا تو عوام کے مفاد اور دلچسپی کے لیے چھوٹے چھوٹے قصے نہایت سلیس زبان مین لکھنا شروع کئے جو نہ صرف روس بلکہ بیرونی ممالک مین بھی وقعت اور دلچسپی کی نظر سے دیکھے گئے باوجود ان تمام خدمات کے طالسطائی نے اپنی زندگی کا معمول تبدیل نہ کیا۔ وہ غریبون کے ساتھ لکڑیان کاٹتا پانی بھرتا اور خود اپنا ہی بنایا ہوا جوتا پہنتا وہ سیاحون کی طرح اپنا سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر پیدل ہی سفر کرتا لکڑی کاٹکر غریبون یتیمون اور بیوا ؤن کو تقسیم کرتا۔ غرض ہر طرح غریبون کی اعانت مد نظر رکھتا۔ وہ روس کا کاونٹ تھا لیکن غریبون کے دُکھ درد مین شریک ہو کر ان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو ساری عمر باعث فخر سمجھتا رہا۔

اُس زمانہ کی روسی گورنمنٹ نے طالسطائی کی کتب کو غیر قانونی۔ باغیانہ اور شورش انگیز قرار دیکر اُن کی اشاعت اور تبلیغ بند کر دی مگر بیرونجات مین ان کی اشاعت بڑی وقعت اور آزادی کے ساتھ ہونے لگی۔ جا بجا ان کے تراجم ہونے لگے طالسطائی کے مضامین پڑھکر اکثر حضرات کو اس سے ملنے کا شوق پیدا ہوا جب اسکے سوانح زندگی اخبارات مین شائع ہوئے تو اسکی عزت اور بھی بلند تر ہو گئی۔ یہان سے کہ زار روس بھی طالسطائی کو قابل عزت خیال کہنے لگا۔ حالانکہ پولیس اسکی تصنیف کردہ کتابون کے پیچھے پڑی رہتی۔ اور ان کے شائع کرنیوالون اور فروخت کرنیوالون کو سزائین دیجاتین۔ لیکن طالسطائی پر دست درازی کرنے کی ہمت وہان کی گورنمنٹ کو کبھی نہ ہوئی۔

جب انقلاب پسند اور فتنہ انگیز لوگون نے الگزینڈر دوم کو قتل کر ڈالا اور پھر بھی کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا تو انھین اپنی سوسائٹی کو ترتیب دینے کے لیے غیر ممالک کی تقلید کرنی پڑی اسوقت روس کے نوجوان سیاسی معاملات کے علاوہ سوشل اور مذہبی اصلاحات کی طرف بھی متوجہ

ہوئے اور طالسطائی کو بیمار سمجھا اور لیڈر سمجھنے لگے۔ اس نئی تحریک کی بدولت صدہا امرا و رؤسا غریب کسانون کے ساتھ رہنے لگے اور صدہا لوگون نے قومی خدمات ادا کرنے کا عہد و پیمان قطعاً ترک دیا۔ اسوقت سے غیر عملی مخالفت یا ستیاگرہ کی بنیاد پڑی جسکی بدولت دنیا مین طالسطائی کا درجہ نہایت بلند ہو گیا اور جسکی تقلید سے مہاتما گاندھی نے ہمارے ملک کی سیاست مین ایک نئی روح پھونک دی۔

جب ۱۸۹۱ء مین روس مین قحط پڑا تو طالسطائی نے اپنے دلی جذبات سے متاثر ہو کر بھوکے مرنے والون کسانون کی مدد کرنا شروع کی۔ اسوقت صوبہ ریان سب سے زیادہ تکلیف مین تھا اسلئے وہ اپنی دو بیٹیون اور ایک بھتیجی کو ساتھ لیکر وہان گیا۔ اگرچہ اسکے پاس صرف ہزار ساٹھ روپیہ تھے مگر اسنے لوگون کو کھانا تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ خبر فوراً چارون طرف پھیل گئی بیگم طالسطائی نے، اخبارون مین اپیل شائع کرائی اور ہر طرف سے اچھی اچھی رقمین وصول ہونے لگین طالسطائی کے اہل خاندان بھی کسی نہ کسی صورت مین قحط زدون کی خدمت کرنے لگے اور صدہا لوگون نے انکی پیروی کی۔ اسوقت اس نے ایک کتاب تصنیف کی جسکا نام ہے "خدا کی سلطنت تمہارے اندر ہے THE KINGDOM OF GOD WITH IN YOU اس کتاب مین نظام سلطنت کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ روسی سرکار نے اسکی اشاعت قطعاً بند کرا دی اور طالسطائی کو انارکسٹ (باغی) کا خطاب مل گیا مگر اسکی انارکزم یا بغاوت خونریز نہ تھی۔ اسکا قول تھا کہ انسان مین قدرتاً محبت اور راستی کے خدائی قوانین ودیعت ہین اسلیے انکی مضبوطی کے لیے انسان کے تعمیری قوانین کی ضرورت نہین۔

روز بروز طالسطائی کا اثر عوام کے دلو پر زیادہ ہونے لگا طلبہ اور مزدور اسکو فرشتہ سمجھنے لگے اسنے ایک کتاب "رزریکیشن" اور لکھی جسمین عیسائی مذہب اور روسی حکومت پر نکتہ چینی کی۔ اسپر پادریون نے اسکی تکفیر کا فتوی دیا اور غلط اصولون کی اشاعت کا جرم لگا کر مذہب سے خارج کر دیا۔ ماسکو مین جب یہ خبر پہونچی تو وہان فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا۔ طالسطائی حسب معمول اس دن بھی سیر کرنے گیا تھا۔ راستہ ہی مین لوگون نے اسے گھیر لیا۔ اسکے سامنے نہایت عاجزی سے اظہار ہمدردی کرنے لگے اسکے گھر پہونچنے سے پیشتر سینکڑون ڈپوٹیشن اظہار ہمدردی کو

آچکے تھے رفتہ رفتہ ان خطوط اور تاروں کا ڈھیر لگ گیا جو اظہار ہمدردی کے لیے اس کے پاس آئے تھے۔

اس فتوی کے جواب مین اسنے ایک مضمون لکھا جسمین عیسائی مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار صاف صاف کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ مین صرف یہی نہین منظور کرتا کہ مین گریک چرچ سے منحرف ہون بلکہ مین یہ بھی اعلان کر دینا چاہتا ہون کہ مین اپنے تئین عیسائی کہنے مین بھی ہچکچاتا ہون کیونکہ مجھے خوف ہے کہ اس نام سے کہین راستی پر پردہ نہ پڑجائے۔ راستی مجھکو سب سے زیادہ پیاری ہے اور اس سے مجھے کوئی طاقت ہٹا نہین سکتی۔

اسّی سال کی عمر مین لوگون نے طالسطائی کی سالگرہ بڑی دھوم سے منانے کا ارادہ کیا لیکن اُسکے مخالفین نے مشتہر کیا کہ طالسطائی دہریہ (خدا کی ہستی سے منکر) ہے اسلیے اسکی عزت کرنا گناہ ہے وہان کی گورنمنٹ نے بھی اسکی تائید کی لیکن ان الفاظ کے ساتھ کہ ایک ادبی مذاکرہ نگار کی حیثیت سے عزت افزائی کیجا سکتی ہے اسپر خود طالسطائی نے اعلان کیا کہ اُس دن کوئی جلسہ نہو۔ بلکہ صرف خداے تعالیٰ سے دعا مانگی جائے سالگرہ کے دن تمام اخبارات مین اسکی تصویر اور حالات زندگی شائع ہوئے۔

زندگی کے آخری حصہ مین وہ اپنے خیالات و اصولون پر غور و خوض کرنے مین غلطان و پیچان رہا کرتا تھا۔ چنانچہ اسنے بار ہا گھر بار ترک کر دینے کا ارادہ کیا لیکن اسکو بھی خود غرضی سمجھکر اس سے باز رہا کیونکہ ایسا کرنے سے اُس کے گھر والون کو روحانی تکلیف ہوتی اسلیے اسنے یہ خیال کیا کہ جبتک اسکے لیے گھر مین رہنا بالکل ناممکن نہو جائے وہ مکان سے قطع تعلق نکریگا

سنہ [illegible]ء مین اسنے ایک خط اپنی بی بی کے نام لکھکے لفافہ مین بند کیا اور لفافہ کی پشت پر لکھدیا کہ میری وفات کے بعد دیا جائے۔ اس خط مین اسنے اپنے خیالات کے مطابق مکان اور دنیا ترک کر دینے کے وجوہات بیان کئے تھے۔ بالآخر اسنے ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۱۰ء کو گھر چھوڑ دینے کا عزم مصمم کرلیا۔ صبح اٹھتے ہی اپنی زوجہ کو ایک خط لکھا پھر اپنی لڑکی سیشا اور اپنے دوست ڈاکٹر میکوڈنسکی کو جگا کر۔ اُن کی مدد سے اسباب باندھا پھر ایک ڈاکٹر کے ساتھ اسٹیشن پر پہونچکر گاڑی مین سوار ہوگیا اور گاڑی چل نکلی۔ لیکن اسکی تندرستی قطعاً سفر کے

قابل زحمتی شروع سفر ہی سے تکلیف کا آغاز ہوا۔ سردی کے اثر سے بخار آگیا راستہ
طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ اور اسکے ہمسفر ڈاکٹر نے اسکو شاید دو گاؤں کے اسٹ
پر اتار لیا۔ آخر اسی اسٹیشن پر ۲۰ نومبر ۱۹۱۰ء کو دنیا کا یہ بہت بڑا رہنما ہمیشہ کے
دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جے، این، فرحت کا

،، موت کے راز سے محبت کا راز قوی تر ہے ،،

،، نیک ہونے سے خوبصورت ہونا بہتر ہے، لیکن بدصورت ہونے سے نیک ہونا ہی بہتر ہے ،،

،، مرد اتنا ہی نیک بن سکتا ہے جتنی اسے مہلت ملے، عورت اتنی ہی بد ہو سکتی ہے جتنی وہ جرأت کر سکے ،،

،، عورت کا قیاس جب صحیح نکلتا ہے تو وہ اُسے ہدایت پر مبنی سمجھتی ہے ،،

،، حسن نام ہے اپنی نظر کا لیکن کیا لوگ اس معاملے میں نابینا نہیں ہوتے ،،

،، جو اظہار محبت عورت کی نگاہ سے پیدا ہوتا ہے اس میں کبھی دھوکا بھی ہوتا ہے کیونکہ اسکی نگاہوں کی یہ کیفیت بعض اوقات فطری ہوتی ہے ،،

،، کتنی حیرت کی بات ہے کہ باوجود اس علم کے کہ انسان ہر لمحہ میں مر سکتا ہے لوگ جینے کے لیے مرتے ہیں ،

گناہ کی اُجرت اُسی وقت حاصل ہوتی ہے لیکن اسکی قیمت خوفناک ہے جو بعد میں ادا کرنی پڑتی ہے ،

،، اسکر وائلڈ ،،

امداد باہمی

تحریک امداد باہمی کی جو کچھ ترقی اسوقت تک مغربی ممالک مین ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے اسکا اندازہ ہم لوگون کو نہین ہو سکتا۔ ساری دنیا مین ہندوستان ہی ایک ایسا بدنصیب ملک ہے جہان اتحاد اور امداد باہمی کا عنصر بہت کم ہے۔ ترقی کا راز اگر سچ پوچھئے تو انہین دو لفظون مین مضمر ہے۔ بغیر اتحاد اور امداد باہمی کے دنیا مین کوئی کام خوش اسلوبی کے ساتھ سر انجام نہین پا سکتا۔ امداد باہمی سے جو معاشی فوائد حاصل ہوتے ہین۔ اسکا اندازہ کچھ مغربی ممالک کی انجمنہا ئے امداد باہمی کی کارگذاریون سے ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی انجمنون کو وجود مین آئے ہوئے ساٹھ ستر سال کا عرصہ ہوتا ہے اسی قلیل مدت مین یہ انجمنین مغربی ممالک کے عام باشندون کی معاشی حالت کو درست کرنے مین اسقدر کارآمد اور معین ثابت ہوئین کہ شاید ہی کوئی اور تحریک اسقدر جلد معاشی حالت کو سدھارنے مین کارگر ہوتی۔

چنانچہ انہین انجمنون کا نتیجہ ہے کہ دیگر ممالک مین بھی اس تحریک پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے موجودہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہین کہ یہ انجمنین آگے چلکر نہایت درجہ مفید ثابت ہونگی۔ اسوقت تک یہ انجمنین مزدور پیشہ اور کسان طبقہ کے افلاس کو دور کرنے مین خاص طور سے معاون ثابت ہوئی ہین اور زیادہ تر انہین طبقون کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لیے قائم کیگئی تھین۔

اول اول جب یہ انجمنین قائم ہوئین تو انکو بری بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر چونکہ ان انجمنون نے اپنا مقصد مزدور پیشہ اور کسانون کی حالت درست کرنا قرار دیا تھا۔ اسلیئے عوام بہت خوشی سے ان مین حصہ لینے کو طیار ہو گئے۔ اور جس تندہی سے وہ ان کے لیے کام کرتے تھے شاید وہ دوسرون کے لیے نہ کر سکتے ہونگے یہ عام مشاہدہ ہے کہ مزدور ایسے کامون مین جنمین اجرت کے سوا اور کسی قسم کے منفعت کی امید نہین ہوتی۔ لاپروائی اور کاہلی سے کام لیتے ہین۔ مگر ایسے کام جسکا نفع و نقصان

سب انہین سے کیے ہے اسمین صد ہا مجلسی لیے دین بختلف انجمنین جو اسوقت یورپ مین بالخصوص
یہکا رواج ہو رہا ہے تفصیل سے دو چار کا ذکر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے یہ واضح ہو جائیگا کہ ان انجمنو
کا آغاز کیونکر ہوا اور انکو کن رکاوٹون سے دو چار ہونا پڑا۔

راشڈیل پائینر سوسائٹی (ROCHDALE PIONEER SOCIETY) جو ۱۸۴۴ء مین قائم
ہوئی اپنی قسم کی سب سے پہلی انجمن ہے۔ ابتدا مین اس انجمن کی یہ حالت تھی کہ اسکی طرف کوئی توجہ بھی
نہین کرتا تھا۔ اسکا وجود اسطرح عمل مین آیا کہ ۱۸۴۳ء مین راشڈیل ROCHDALE مین
فلالین کی تجارت کو غیر معمولی زک پہونچی۔ مزدورون کی اجرت مین اسقدر کمی عمل مین آئی کہ انہین
مجبوراً کام چھوڑنا پڑا۔ انہین مزدورون مین سے ۲۰ مزدورون نے کچھ رقم اکٹھا کی اس رقم سے
انہون نے کسی تھوک فروش کے یہان سے شکر چائے کی خرید کرنی شروع کی۔ یہ اشیا وہ خود
لوگ خرید کرتے اور اسی نرخ سے لیتے۔ جتنے مین انہین کسی خوردہ فروش کی دوکان سے ملتین نہین
محض نفع ہی مد نظر نہ تھا بلکہ اسمین یہ بھی فائدہ تھا کہ انہین بلا کسی آمیزش کے وہ چیزین دستیاب
ہوتی تھین جنکا دوسری جگہ ملنا ناممکن تھا۔ اور چونکہ انجمن لین دین کے معاملات مین بہت سخت تھی
چاہے ممبران خرید کرین یا کوئی اور شخص سب سے نقد لیا جاتا تھا۔ لہذا تھوڑے عرصہ مین منافع ہونے لگا
سوسائٹی کی یہ حالت دیکھکر اور مزدور بھی اسمین شریک کار ہونے کے لیے آگے بڑھے اور روز افزون
ترقی ہونے لگی یہانتک کہ ۱۸۵۰ء مین اس انجمن کے پاس ۹۰۰۰،۱۲ پونڈ سرمایہ ہو گیا۔ انجمن نے بھی
اپنی مالی حالت کا اندازہ کر کے دیگر قسم کی کاروبار مین روپیہ لگانا شروع کیا چنانچہ اسی سلسلہ مین اپنے
آٹا پیسنے کی چکی کھولی اور ڈبل روٹی بھی تیار کرنے لگی۔ وسعت کاروبار کا نتیجہ ہوا کہ انجمن کے پاس
معتدبہ سرمایہ فراہم ہو گیا۔ مزدورون کی معاشی حالت بہت کچھ سدھر گئی تھی۔ ۱۸۶۰ء مین جو سالانہ
رپورٹ اس انجمن نے شائع کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ کل سرمایہ ۲۴۶۰۳۱ پونڈ تھا اور اسکے شرکا کی
تعداد ۹۰۸۶۱ تھی۔ الغرض یہ انجمن اپنے مقصد مین خوب کامیاب ہوئی۔

اس مثال سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ انجمن جسکی ابتدا ایسی معمولی حالت سے ہوئی تھی اسکے
پاس اتنی قلیل مدت مین اسقدر سرمایہ ہو گیا۔ یہ ہین امداد باہمی کے نتائج۔ اسی سلسلہ مین
اور انجمن کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے بخوبی روشن ہو جائے گا کہ امداد باہمی میں

کیا کیا فوائد مضمر ہیں ؟

انگلستان میں اشنگٹن اسٹیٹ ASHINGTON ESTATE تھی یہاں کے زمیندار کا نام کارٹن تھا۔ مزدور پیشہ لوگوں کے افلاس کو دیکھکر اسکے دل میں یکایک خیال پیدا ہوا کہ ان کے افلاس کو دور کرنے کی فکر کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسنے اپنی اراضی کا ایک بڑا رقبہ ۱۵۰ پونڈ سالانہ کے لگان پر مزدوروں کو دیدیا۔ ساتھ ہی اسکے اسنے انھیں ضروری آلات زراعت بھی دیئے اور مزدوروں کی ایک انجمن قائم کی۔ اس طریق سے بہت تھوڑے عرصے میں مزدوروں کے پاس اچھا خاصہ سرمایہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس سرمایہ سے انہوں نے ضروری آلات زراعت مول لیے اور جو رقم بچی اسے دیگر ضروری کاموں میں صرف کرنے لگے

اس وقت یورپ میں سب سے اہم قسم کی انجمنیں وہ ہیں جو کہ انجمنہائے قرضہ امداد باہمی کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کئی قسموں پر مشتمل ہیں جنکے بیان کے لیے یہاں گنجائش نہیں۔ حال میں چند اور انجمنیں قائم ہوئی ہیں جنمیں ایک تو جرمنی میں ہے جسکا نام
THE COOPERATIVE SALE OF LINE STOCK
دوسری ناروے میں THE COOPERATIVE OF PURCHASE OF FARM REQUISITIES کے نام سے موسوم ہے

ان انجمنوں کا ذکر کر دینے کے بعد میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اس تحریک کا ہندوستان پر کہاں تک اثر پڑا اور کس حد تک کامیابی ہوئی اور اس تحریک کے متعلق عوام کا کیا خیال ہے۔ آیا یہ تحریک اس ملک کے پس ماندہ طبقہ یعنی کاشتکار اور مزدوروں کی حالت کو سدھار سکتی ہے یا نہیں

قاعدہ ہے کہ جب کبھی کسی نئی تحریک کی ابتدا ہوتی ہے تو اسے مقبول بنانے کے لیے بڑی بڑی کوششیں کیجاتی ہیں۔ پھر ہندوستان جیسے وہم پرست ملک میں جہاں قدم قدم پر جہالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی نئے خیال یا تحریک کا گذر ہو۔ ایسا ملک جہاں آپس میں ملکر کام کرنا برا سمجھتے ہوں جہاں ہر شخص ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے پر تلا رہتا ہو بھلا وہاں اتحاد وامداد باہمی کے کیا معنی جہاں ہر شخص اپنے ہی فائدہ کا متمنی ہو وہاں دوسرے کی بھلائی کا کیا خیال۔ ہندوستانی یہ نہیں جانتے کہ ملکر کام کرنے میں کیا کیا فوائد ہیں انہی خود غرضی نے ملک کو تباہ کر رکھا ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جدید تعلیم سے اوہام پرستی دن بدن دور ہو رہی ہے۔ تھوڑا بہت جوش پیدا

چنانچہ اس جوش کی تصدیق ان کی موجودہ جد وجہد سے ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس جوش کا دائرہ وسیع نہیں۔

امداد باہمی کا آغاز ہندوستان میں ۱۹۰۴ء سے ہوتا ہے۔ جبکہ سر فریڈرک نکلسن مامور یہاں کام پر تعین کیے گئے کہ اسکی تحقیقات کریں کہ آیا امداد باہمی کی تحریک ملک کے لیے کس حد تک مفید ہو سکتی ہے۔ بعد تحقیقات کے انھوں نے رائے دی کہ کاشتکاروں کی مالی حالت کو درست کرنے اور انکو ساہوکاروں سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اس قسم کی انجمنیں قائم کیجاویں۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں باقاعدہ ایکٹ پاس ہوا جسمیں ہر صوبہ میں انجمنہائے قرضہ امداد باہمی قائم کرنے کی گورنمنٹ نے اجازت دی۔

۱۹۱۵ء میں مکلگن کمیٹی MACLIGAN COMMITTEE کی سفارش پر اس کے متعلق تجاویز پاس ہوئیں جس سے اس تحریک کو اور زیادہ تقویت پہونچی۔

اس تحریک کی حالت بہت امید افزا ہے مگر ابھی تک صرف انھیں انجمنوں کی طرف منبطل ہے۔ دیگر ضروریات کے لیے بھی انجمنیں قائم ہونی چاہئیں اسوقت اس قسم کی انجمنوں کی بہت ضرورت ہے جو صنعت و حرفت کے اغراض کے لیے چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی دے سکیں اس قسم کی انجمنوں کا رواج نہیں ہوا۔ ساتھ ہی اسکے ایسی انجمنوں کی بھی بہت ضرورت ہے جو خرید و فروخت کا کام انجام دیں تاکہ عوام کو اعلی قسم کی اشیاء بکفایت دستیاب ہوں اگر یہ تمام انجمنیں ملک میں رواج پا جاویں تو لوگوں کو خود بخود کاروبار کی طرف رغبت ہو گی اور ان میں کفایت شعاری کا خیال پیدا ہو گا۔ انکا سرمایہ بیکار کاموں میں صرف نہ ہو گا بلکہ روز افزوں ترقی کرنا سکھائیگا۔ اس سے نہ صرف دولت ہی میں اضافہ ہو گا۔ بلکہ وہ اپنے معیار زندگی کو اعلی بنا سکیں گے۔ ان میں ایک طرح کی بیداری پیدا ہو گی۔ انکے دلوں میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رونما ہو گا۔

بہی خواہان قوم و ملک کا فرض ہے کہ قوم کی بہبودی کے لیے جہاں اور بہت سی تجاویز پیش کرتے ہیں ان میں اس تحریک کو بھی شامل کر لیں اور اسکو کامیاب بنانے میں حتی الامکان کوشش کریں۔

مجھے یقین کامل ہے کہ اس قسم کی انجمنیں ضرور ملک کی عام افلاس دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہونگی۔ اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔ اسکی تصدیق ہندوستان کے مختلف صوبجات کی کوآپریٹو بنکوں

کی سالانہ بچت نون سے ہو سکتا ہے۔ ذیل میں کچھ اعداد و شمار درج کرتا ہوں جس سے واضح ہو جائیگا کہ اس تحریک کو اس ملک میں کس حد تک کامیابی ہوئی اس نقشے میں تمام ہندوستان کی انجمنا ئے امداد باہمی کے ۱۹۰۰ سے لیکر ۱۹۲۱ء تک کے اعداد و شمار درج ہیں۔

	۱۹۰۶ - ۱۹۱۰	۱۹۱۰ - ۱۹۱۵	۱۹۱۵ - ۱۹۲۰	۱۹۲۰ - ۱۹۲۱
مرکزی بنک	۱۶	۲۳۱	۳۰۰	۳۴۹
زرعی انجمنیں	۱۶۱۳	۱۰۸۹۱	۳۶۷۱۹	۴۲۰۵۲
انجمنیں برائے نگرانی	۰	-	۹۹۳	۱۱۵۰
غیر زرعی انجمنیں	۱۹۹	۶۶۴	۱۶۶۴	۳۲۴۲۲
	۱۹۲	۱۱۷۸۹	۴۰۷۷۲	۴۷۵۰۳

اوپر کے نقشہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس تحریک کو ہندوستان میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے اور انجمنوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زراعتی انجمنوں کی تعداد بہت ہے۔

۱۹۰۶ء میں کل انجمنیں زرعی و غیر زرعی ۱۹۲۶ تھیں جبکہ ممبران کی تعداد ۱۶۱۹۱۰ تھی سنہ ۱۹۲۱ء میں انجمنوں کی تعداد ۴۷۵۰۳ تک پہونچ گئی تعداد ممبران ۱۰۵۲۹۰۴ تھی ان اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تحریک بہت سرعت کیساتھ ملک میں پھیل رہی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں کا طبقہ اسمیں دلچسپی بھی لے رہا ہے۔

کیا یہ بات قابل افسوس نہ ہوگی کہ ایسی مفید تحریک کی حمایت نہ کیجاوے۔ یہ انجمن محض قرض وغیرہ اور خرید و فروخت ہی کا کام نہیں انجام دیتیں بلکہ بلا واسطہ عوام کو عملی سبق دیتی ہیں۔ اور دولت کے پیدا کرنے اور باقاعدہ صرف کرنیکے طریقے سکھاتی ہیں۔

اس تحریک کو صرف کسانوں اور مزدوروں تک محدود نہ رکھنا چاہئے بلکہ ملک کے دیگر افراد کو بھی اسمیں شریک ہونا چاہئے کیونکہ ملکی ترقی کے فرائض ملک کے ہر فرد کے لیے یکساں اہم اور واجب الادا ہیں۔

سید عزیز احمد

میر و غالب

(غالب کے دیوان جدید سے ایک غزل اور اسی کی ہم طرح میر کی غزل سے تنقید پیش کی جاتی ہے۔)

(اثر)

میر

کل شب ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا
شام سے تا صبح دم بالیں پہ سر یک جا نہ تھا

یہ قافیہ غالب نے نظم نہیں کیا میر نے کرب و اضطراب شب ہجراں کی لاجواب نقاشی کی ہے لب پر نالۂ و بھی بیمارانہ۔ شام سے تا صبح باوجود ضعف و ناطاقتی سر دھننا۔ اللہ اللہ یہ شعر حقیقت سے کس قدر ہمدوش ہے اور شاعر شب ہجر کی مصوری میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں تاکہ ضعف و نقاہت دکھانے کے بجائے انہیں قیامت کا زور بھر دیتے ہیں اسی طرح تکیہ پر ایک جگہ سر نہ ہونے سے جس روحانی تکلیف و بیقراری کا اندازہ ہوتا ہے ہرگز کسی مبالغہ آمیز کیفیت اضطراب دکھانے سے نہیں ہو سکتا۔

میر "شہرۂ عالم اسے یمن محبت نے کیا
ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا

غالب اے اسد رویا جو دشت غم میں میں حیرت زدہ
آئینہ خانہ ہجوم اشک سے ویرانہ تھا

شکوۂ یاراں غبار دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

میر نے عشق کی عظمت دکھائی ہے اور بھی دیوانے ہوئے مگر کوئی انکا نام تک نہیں جانتا یہ محبت کی برکت ہے کہ مجنوں تمام عالم میں مشہور ہوگیا۔ یہ شعر ضرب المثل ہونے کے قابل ہے۔

غالب کے دونوں شعر لاجواب اور ان کے خاص رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پہلے شعر میں ارتقائے نفس کا نازک مسئلہ عجیب انداز سے حل کیا ہے۔ منزل معرفت تک پہنچنے کو جادۂ غم اختیار کیا۔ کیونکہ غم بہترین معلم انسان ہے۔ یہ راستہ ایسا پر ہول و پر خطر تھا اور میں اسکی مشکلوں سے ایسا ناواقف تھا کہ ... اور اسی کے ساتھ خیال ناکامی سے گریہ طاری ہوا اس گریہ نے جس میں اپنی کمزوری کا اعتراف مضمر

تمام کتاب وا کر دیے ہیں وہ منزل ہے جہاں عقل کی سعی ختم ہو جاتی ہے اور انسان دل کو اپنا رہبر بناتا ہے۔ انٹیوشن (INTUITION) سے کام لیتا ہے۔ وحشت پُرغبار آئینہ خانہ بن گیا جسے ہر طرف اپنا ہی جلوہ نظر آنے لگا مجھے اپنی ذات کی معرفت ہوئی جو حقیقی نشہ رو معرفت ہے۔ کیونکہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اُسنے خدا کو پہچانا۔

شعر کی بندش مصرعوں کا ربط ترتیب سے ستھری ہے۔ ردیف کی مضبوطی خاص طور پر قابل توجہ ہے اس خوبی سے صرف ہوئی ہے کہ بیابان کا یکایک آئینہ خانہ ہو جانا آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

دوسرا مقطع بھی عجیب و غریب ہے دوستوں کی محبت کا تو کیا ذکر انکی سرد مہری بھی پیش بہا خزانہ ہے اگر چہ انکی کم نگاہیوں سے دل خاک ہو گیا شکوہ زبان تک نہ آیا سینے اُسے غبار دل میں دفن کر دیا۔ اس سے زیادہ دوستی کی قدر کیا ہو سکتی ہے۔

میر منزل اس مہ کی، رہا جو تو اے ہمنشیں اب وہ دل گویا اک مدت کا ماتم خانہ تھا

غالب دود کو آج اُسکے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا

میر کے شعر میں لفظ منزل کا صرف قابل داد ہے۔ شعر میں وصل و ہجر کا حقیقی مفہوم دکھایا ہے دونوں کیفیتیں رو جاتی ہیں۔ کسی عزیز مہمان کے رخصت ہونے پر گھر میں جو اداسی چھا جاتی ہے۔ اُسکو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ پہلے مصرع میں لفظ مہ کے مقابل سے ماتم خانہ کی تاریکی پیش نظر ہو جاتی ہے۔ شعر میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ خوشی کی گھڑیاں چاہے جتنی طولانی ہوں جلد گزر جاتی ہیں مگر غم کا ایک ایک لمحہ پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔

غالب نے عجیب دلخراش شعر کہا ہے (وہ دل سوزاں جس سے ماتم خانۂ (ہستی) کی زینت تھی جو سب کا شریک غم تھا۔ آج وہ جلکر خاک ہو گیا یا بجھ گیا تو اُسپر سوا دھوئیں کے کوئی سوگوار نہ تھا شعر نہیں عبرت کی زندہ تصویر ہے پہلے مصرعہ میں ایک ایسا واقعہ دکھایا ہے جس سے غالب کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ شمع کے گل ہونے پر جو دھواں نکلتا ہے وہ اُس دھوئیں سے کثیف تر ہوتا ہے جو روشنی ہونے کی حالت میں برآمد ہوتا ہے اسی کو دود کی سیہ پوشی سے تعبیر کیا ہے۔

میر اک نگاہ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا

غالب کو وقت قتل حق آشنائی اے نگاہ خنجر زہر آب دادہ سبزۂ بیگانہ تھا

دونوں اشعار کا مقابلہ کیجئے۔ غالب کا شعر ثقیل اور فارسی ترکیبوں کی بے اعتدالی کی سبق آموز مثال ہے۔ بخلاف اسکے میر کا شعر زبان میں قابلِ قدر اضافہ کرتا ہے خصوصاً نگاہِ آشنا۔ ان دونوں لفظوں میں وہ مفہوم ادا ہوگیا ہے کئی جملوں میں بھی نہ سماتا۔ ایسی نگاہ جو سپہ گری کے ساتھ حقیقت رس ہو۔ میر کے شعر میں ہر لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔ سبزۂ مژگان کا لطیف استعارہ عجب لطف دے رہا ہے۔ یہ شعر بظاہر سادہ مگر در اصل رموزِ حقیقت سے لبریز ہے سبزہ کی نشو و نما بہت جلد ہوتی ہے اتنی جلد کہ گویا ہر لحظہ وہ اپنے آپ سے بیگانہ رہتا ہے یہی حال زندگانی دنیا کا ہے۔ جس میں ہر وقت انقلاب ہوتا رہتا ہے۔

غالب کے شعر میں لفظ کو "دکھانا" بے اختیار اُنھیں کی زبان میں "ادا" بلا تکلف کو جی چاہتا ہے اس لفظ کی اردو میں گنجایش نہیں۔ غالب کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ اے نگاہ دوست تو نے قتل کے وقت حق آشنائی فراموش کر دیا۔ تیرے زہر آلود خنجر میں سبزہ کی سی بیگانگی ہے۔ سبزہ و زہر میں وجہ شبہ رنگ ہے، نگاہ کی تشبیہ خنجر سے اور خنجر زہر آب داد "کی سبزہ سے" کی ہے۔

میر	روز و شب گذرے ہے پیچ و تاب میں تجھ کو	اے دل صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا
غالب	انتظار جلوۂ کاکل میں ہر شمشاد باغ	صورت مژگان عاشق صرف عرض شانہ تھا

میر کا شعر صاف اور مکمل ہے پہلے مصرع کا پہلو ایسا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ معشوق ہر وقت مو آرایش گیسو رہتا تھا جسکے اتباع میں دل صد چاک (جو شانہ سے مشابہ ہے) ہر وقت پیچ و تاب میں رہتا ہے۔

غالب کے شعر کا یہ مطلب ہوا کہ تیرے جلوۂ کاکل کے انتظار میں باغ کا ہر شمشاد مژگان عاشق کی طرح شانہ بن گیا ہے عرض (مقابل طول) حشو قبیح ہے۔ اگرچہ بالکل بیکار بھی نہیں کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ شانہ کے چاک عرض میں ہوتے ہیں نہ کہ طول میں۔ ممکن ہے کہ فقط عرض بمعنی اظہار حال "استعمال کیا ہو مگر یہ مفہوم بعید ہے" کیونکہ صورت مژگان عاشق سے کوئی ربط نہیں رہتا شعر میں مضمون آفرینی کے علاوہ کوئی خاص لطف نہیں۔ البتہ "جلوۂ کاکل" کی ترکیب دلکش ہے۔

میر — یاد ایامے کہ اپنی روز و شب کی جائے باش — یا در باز بیاباں یا در میخانہ تھا

غالب — وصل میں دست رسا نے سنبلستاں گل کیا — رنگ شب تہ بندیٔ دود چراغ خانہ تھا

میر اس زمانہ کو یاد کرتا ہے کہ دیوانگی کا جوش تھا محبت یا صحرائے عشق میں بسر ہوتی تھی میخانے گئے ایک جام چڑھایا اور مست و بے خود ہو کر جنگل کی راہ لی۔ سرور کم ہوا اور ساقی پہ ہو چکے تو چپک کر پھر صحرا کا رخ کیا۔ میخانہ منزل قریب ہے اور بیاباں منزل پر ہے۔

غالب کے شعر کے معنے میرے ذہن میں یہ آتے ہیں کہ شب وصال معشوق کی زلفیں اس طرح بکھریں کہ ہر طرف سنبلستان نظر آنے لگا و گل کیا لفظی ترجمہ ہے "گل کر دیا" جس کے معنی شگفتہ ہونا ہیں۔ زلفوں کی سیاہی شب کی تاریکی پر غالب آ گئی۔ شب گھونگٹ کھا کر وہ تاریک حلقہ بن گئی جو شعلہ چراغ کے نیچے ہوتا ہے مگر خوبی قسمت سے اس "ظلمات" میں محبوب کا چہرہ نورانی چمکتا تھا جس طرح وہ نظارۂ نور و ظلمات مکمل پذیر ہوا جس کی مثال اگر ملتی ہے تو چراغ کی لو میں جہاں نور اور تاریکی کا اجتماع ہوتا ہے مگر نور غالب رہتا ہے۔

میر — جس کو دیکھا ہمنے اس دشت کدہ میں ہم کے — یا سڑی یا خبطی یا مجنوں یا دیوانہ تھا

غالب — ساز جنبش کے یک برخاستن طے ہو گیا — تو کہے صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

یک جوش گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا — چاک موج سیل تا پیراہن دیوانہ تھا

میر کا شعر معمولی ہے۔

غالب کے پہلے شعر میں "یک برخاستن" کی مطلق العنانی یادگار ہے۔ مطلع میں بھی کوئی خاص بات نہیں شاعرانہ مبالغہ ہے۔

میر — چھوڑ نرمی کے مدت بے حنا رنگیں رہا — ہاتھ انکا جو مرے لہو میں گستاخانہ تھا

یہ قافیہ غالب نے نہیں کہا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر کوئی کہہ بھی نہیں سکتا لفظ گستاخانہ نے وہ کیفیت پیدا کیا ہے جس کا اعادہ نثر میں ناممکن ہے

میر — خبر کے کہتے ہیں مارا اُن نے مجھکو بیگنہ — یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

یہ قافیہ بھی غالب نے نہیں کہا ایسے ہی اشعار ہیں جنہوں نے میر کو خدائے سخن بنا دیا ہے۔ اور دنیائے ادب میں ہر کہ ومہ سے خراج تحسین وصول کر لیا۔ یہ زبان و بیان کی آخری حدیں ہیں جہاں

تشبیہ اور تخیل میں ایسا اتحاد ہے کہ ایک میں کی یا دوسرے میں بیشی ہو تو دونوں کا حسن جاتا رہے گا۔ یک سیر ہے جو مجسم ہو کر روح سے زیادہ لطیف ہو گیا۔

میر — صبح ہوتے وہ بناگوش نظر آیا بجے | جگر دامن پہ آنسو گوہر یکدانہ تھا

غالب — موسم گل میں ہے گلگون حلال بیکھٹکا | عقد وصل دختر رز انگور کا پڑھتا تھا

میر کے شعر میں لطف استعارہ و حسن تعلیل ملاحظہ ہو۔

غالب نے موسم گل میں شراب کے جواز کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ دانۂ انگور نے (جو حلال ہے) دختر رز سے سلسلہ قائم کر دیا نکاح پڑھا دیا۔

میر — شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست | شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

غالب — یاد تھا دل گرم خیال جلوۂ جانانہ تھا | رنگ روئے شمع برق خرمن پروانہ تھا

دیکھ اسکے ساعد سیمین و دست پرنگار | شاخ گل جلتی تھی مثل شمع گل پروانہ تھا

شب ترے تابِ سر شعلۂ آوازے | تار شمع آہنگ مضراب پر پروانہ تھا

میر نے عجب شعر کہا ہے حسن دوست سے بزم کی تجلی بڑھ گئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نور شمع دیدۂ پروانہ میں غبار ادھندلا ا نظر آنے لگا۔ پروانہ جو شمع کا دلدادہ تھا شمع کے سامنے حسن دوست پر نثار ہونے لگا جہان گرمی محفل کا یہ رنگ ہو۔ عاشقون کے سوز و گداز کی کیا حالت ہوگی۔

غالب کے مطلع کا ماخذ میر کا شعر ہے اگرچہ الگ کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے یک خیالی محفل قائم کی ہے جسمین روئے جانان کا تصور برق خرمن پروانہ ہے۔ دونوں مصرعوں میں بہت نازک ربط ہے دلکو پروانہ اور خیال جلوۂ جانانہ کو رنگ روئے شمع سے استعارہ کیا ہے۔

دوسرے شعر کی تخیل بھی وہی ہے جو مطلع کی۔ معشوق کی ساعد سیمین و دست حنا بستہ دیکھکر شاخ گل مثل شمع اور گل مثل پروانہ جلنے لگا۔

تیسرے شعر میں بھی وہی تخیل جلوہ گر ہے۔ گر لباس دوسرا منظر پیدا ہوا ہے۔ معشوق کے نغمۂ آواز میں ایسا جادو تھا کہ تار شمع میں وہ آہنگ پیدا ہوا جو پر پروانہ کے مضراب میں تھا شمع کی لگن جلنے لگی اور وہ ترنم پیدا ہوا جو پر پروانہ میں شمع پر قربان ہوتے وقت پیدا ہوتا ہے۔

تینوں شعر نازک خیالی و جدت ادا کی عمدہ مثالیں ہیں۔ گر انصاف سے دیکھئے جو مدعی

میرزا بیدل سے بھی کام کر دیں ان سے آگے نہ بڑھ سکے۔

میر — رات اس کی چشم میگون خوب مجلس میں تھی — جیسے سر دست تھا تو سامنے پیمانہ تھا

غالب — شب کہ تھی کیفیت محفل بیاد روئے یار — ہر نظر داغ سے خالی سے جدا تھا

داغ مہرِ ضبط بیجا مستی سعی پسند — دود مجمر لالہ ساں دُرد تہِ پیمانہ تھا

میر کے شعر میں غضب تازگی و لطافت ہے (دین بھی معنی میں اب متروک ہے)

غالب کے دونوں شعروں میں اضافتوں کی بہتات سے دم اُلجھتا ہے۔ ان اشعار کے سمجھنے میں بہت دماغ لڑایا جو مطلب ذہن نشین ہوا عرض کرتا ہوں مگر اطمینان نہیں۔ اور حضرات بھی طبع آزمائی کریں۔

پہلے شعر کا مفہوم شاید یہ ہے کہ یاد روئے دوست میں اہلِ محفل کا یہ عالم تھا کہ نظر دہ دماغ سے بن گئی تھی جو خالی لب پیمانہ پر ہو یعنی ہر میخوار کی نظر ساغر پر جمی ہوئی تھی کہ دوست آ کے اور ساقی گری کرے ساغرِ نقطۂ نظر بنگیا تھا۔

داغ مہر ضبط الخ۔ پہلے دوسرا مصرع لیجئے۔ دود مجمر لالہ کی طرح دُردِ تہِ پیمانہ تھا۔ دل سوزان مجمر ہے۔ اُسکا دھواں داغ دل ہے جسطرح لالہ کے سینہ میں داغ ہوتا ہے (لالہ = آتش = دود = داغ لالہ) پھر دل پیمانہ ہے اور داغ (بوجہ کثافت) دُردِ تہِ پیمانہ (شراب کی تشبیہ آگ سے اور دل کی پیمانے سے بدیہی ہے۔ درد کی داغ سے بدیع۔ مگر قرینِ قیاس ہے) اب پہلا مصرع لیجے۔ داغ سعی پسند (پسند کی کوشش) کی بیجا مستی (مستی بیجا) کی مہر ضبط ہے۔ (خاموشی اور باز رہنے کا حکم ہے) شعر کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے حقائق اشیا پر یہ امر دریافت کرنے کو غور کرنا شروع کیا کہ کون شے کس بہتر ہے کس کو کس پر ترجیح ہے تاکہ میں اُسی کو پسند اور اختیار کروں۔ مجھے معلوم ہوا کہ تمام موجودات عالم مثل اُس دھوئیں کے ہے جو مجمر سے بلند ہو رہا ہو ان کی بعینہ وہی حالت ہے جو داغ لالہ کی۔ کہ خود لالہ ہے مگر مختلف۔ یا دُرد تہِ جام کی جو جزو شراب ہے مگر اُس سے الگ۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ کہ آگ سے دھواں کثیف تر ہے (اسی طرح سے لالہ سے داغ (باعتبار رنگ) شراب سے دُرد۔ اور یہ سب چیزیں اپنی بقا کے لیے اُن اشیا کی محتاج ہیں جن سے مستنبط ہیں۔ اگر آگ نہ ہو تو دھواں محال ہے۔ لالہ نہو تو داغ کہاں سے آئے۔ شراب نہو تو تلچھٹ کہاں۔ یہ بھی غور فرمائیے کہ غالب کے لیے

غالب نے دو چیزین مجتمع کی ہین جنکی مشابہت دل سے ہے، اور [illegible] دل و داغ داغ = دل و داغ دل۔ درد تہ پیانہ = دل و داغ دل، عالم [illegible] وابستی ہے اپنی حیات و بقا کے لیے ایک لطیف جوہر کی محتاج ہے۔ اس کلیہ کا اطلاق تمام مخلوقات عالم پر ہوتا ہے۔ اس احساس نے انہین چیزون (یعنی بمردہ دل) کی طرح میرے دل پر بھی ہر داغ ثبت کی (درد بہ عشق حاصل ہوا) میرے ہونٹ سی دیے۔ جیسا سعی "پسند" پکار ہش کی مخلوق کی حقیقت کا انکشاف ہو گیا مگر خالق کی کنہ ذات سے محروم رہا جو در اصل منشا سعی تھا۔ لہذا مین اپنی کوششون کو رائگان سمجھا۔ اور اپنی سعی پر نادم و شرمندہ و خاموش ہوا۔ اسقدر کوشش بلیغ کے بعد یہ خاموشی اعتراف ناکامی خود ایک بلند درجہ معرفت کا ہے جسکا حاصل داغ یا دوسرے لفظون مین عشق ہے۔ غالباً اسی فلسفیانہ خیال کا دوسرا شاہد غالب کا یہ مشہور شعر ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہین سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

میر — رحم کچھ پیدا کیا شاید کہ اس بے رحم نے — گوش اسکا شب وہ ترا آخر افسانہ تھا

غالب — شب کہ باندھا خواب مین آپکا غافل ز جلج — وہ فسون وعدہ میرے واسطے افسانہ تھا

حیرت اپنی نالہ بیدرد سے غفلت بنی — راہ خوابیدہ کو غوغائے جرس افسانہ تھا

میر کہتے ہین کہ شاید اس بیرحم کے دلمین کچھ رحم پیدا ہو چلا ہے۔ مین اپنا فسانۂ دل کہتا رہا اور وہ بے خبر سو گیا مگر کروٹ اسی طرف تھی جس سے خیال ہوتا ہے کہ افسانہ مین دلچسپی لینے لگا ورنہ پہلے تو جہان مین نے قصہ شروع کیا وہ دوسری طرف کروٹ لیکر سو گیا)

غالب کا پہلا شعر چیستان کا حکم رکھتا ہے۔ غالباً یہ لفظ جبلج کاتب کی غلطی ہے۔ شاید جلج ہو جسکے معنی "شرط بدنا ہین" معشوق نے مجھے خواب مین شرط بدی کہ مین ضرور آؤنگا اس وعدہ کا ایسا جادو چلا کہ پھر مجھے ہوش ہی نہ آیا ہمیشہ محو خواب رہا۔

دوسرے شعر کا مطلب شاید یہ ہے کہ نالۂ بیدرد (ایسا نالہ جو بیدرد ہے) نے میری حیرت کو غفلت مین بدل دیا حالانکہ نالہ کا مطلب یہ تھا کہ کوچ کے لیے تیار ہو جاؤ یعنی نالہ گھنٹا جرس تھا مگر مین ایسا غافل تھا (راہ خوابیدہ = راستہ مین سونے والا) کہ میرے حق مین نالۂ جرس نے

بجائے ہوشیار کرنے کے افسانہ کا کام کیا میری غفلت اور بڑھا دی۔

میر — میر بھی کیا مست طافح تھا شراب عشق کا | لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا

غالب — جوش بے کیفی ہے اضطراب آرا اسد | ورنہ بسمل کا تڑپنا لغزش مستانہ تھا

غالب کے "تڑپنا" سے میر کے "طافح" کا مقابلہ کیجیے۔ انہوں نے ایک غیر مانوس لفظ کو کس سلیقہ سے صرف کیا ہے۔ میر کے شعر کا مطلب صاف ہے۔ میر شراب عشق سے ایسا چھکا ہوا تھا کہ لب پر ہر وقت نعرۂ مستانہ رہتا تھا۔

• غالب کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ جن کے دل میں جوش بے کیفی ہے (جو بوالہوس یا حقیقت ناآشنا ہیں) وہ بسمل کا تڑپنا دیکھکر مضطرب ہو جاتے ہیں حالانکہ رقص بسمل میں ساقی کی لغزش مستانہ کا کیف ہونا چاہیے جو استعداد و ولولہ انگیز ہو کہ ہم خود گلا خنجر قاتل کے نیچے رکھدیں۔

اثر (لکھنوی)

مہاتما گاندھی ہر روز صبح چار بجے اٹھتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں ختم عبادت کے بعد، موصولہ خطوط کو پڑھتے ہیں، ۶ بجے ناشتہ کرتے ہیں، اسکے بعد خطوط کا جواب لکھواتے ہیں، صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مہاتما جی ہر شخص سے اسکے مذاق کے موافق گفتگو کرتے رہتے ہیں شام کے ساڑھے چھ بجے آپ سیر کو تشریف لیجاتے ہیں اور ۸ بجے واپس آکر عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں، بعد از فراغ عبادت ۱۰ بجے شب کو آرام فرماتے ہیں۔

مہاتما گاندھی پہلے ہر دوشنبہ کو چپ کا روزہ رہتے تھے، اب آپ نے ہر منگل کو اور بدھ کو صوم سکوت شروع کر دیا ہے، سارے دن چپ رہتے ہیں، اسکے علاوہ روزانہ چار گھنٹے چپ رہتے ہیں۔

آزادی

اے مردو!!! تم جو اس بات پر شیخی بگھارتے ہو، کہ ہم بہادر اور آزاد باپوں کی اولاد ہیں
جب تک روے زمین پر ایک غلام بھی موجود ہے کیا تم حقیقی طور پر آزاد اور بہادر ہو؟
اگر تم اُس زنجیر کو محسوس نہیں کرتے جو تمہارے ایک بھائی کے لیے مضرت رسان ہے۔
تو کیا تم درحقیقت غلام نہیں؟ اور غلام بھی وہ ہو جو آزادی کے مستحق نہ ہو۔

(۲)

اے عورتو!!! تم جو ایکدن ایسے بچے پیدا کروگی، جو امریکہ (ہندوستان) کی ہوا میں سانس لیں گے،
اگر تم اپنی اُن بہنوں کے متعلق جو قید غلامی میں ہیں ایسی باتوں کو سنکر جن سے خون سرخ لاوے کی طرح رگوں میں دوڑنے لگتا ہے بغیر شرمندہ ہوئے سن لیتی ہو۔ تو تم اس بات کا جواب دو!
کہ آیا تم بہادر اور آزاد بیٹوں کی مائیں بننے کے قابل ہو؟

(۳)

کیا سچی آزادی یہی ہے؟ کہ تم غلامی کی زنجیروں کو اپنے فائدے کی خاطر توڑ لو۔
لیکن چمڑے کے دلون سے اُس فرض کو جو بنی نوع انسان کا تمہارے ذمہ ہے۔ بھول جاؤ۔ حقیقی آزادی یہی ہے کہ تم بھی ان زنجیروں کو پہنو!!
جو تمہارے دوسرے بھائی پہنے ہوئے ہیں۔
اور دل و جان سے دوسروں کو آزاد کرانے کی سرتوڑ کوشش کرو،

(۴)

وہ لوگ غلام ہیں جو پست اور کمزور قوموں کی حمایت کرنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ لوگ

غلام ہین: جو دوسرے لوگون کی حقارت اور طعن و تشنیع کے ڈر سے اُس سچی بات کی کہنے سے جو انہین ہر حال مین کہنی چاہیے باز رہتے ہین، اور اسکے متعلق سکوت اختیار کر لیتے ہین۔
وہ لوگ بھی غلام ہین جو چند شخصون کا جو صراط مستقیم پر ہین۔ ساتھ دینے کی جسارت ہنہین کرتے۔

(سود مل جیف کرسل)

صادق ڈیرہ غازیخان

یہ باتین کرنی چاہئین: اچھا خیال اچھا کام شیرین گفتگو
یہ باتین سیکھنی چاہئین۔ محنت۔ استقلال پختہ ارادہ۔
ان باتون کو قابو مین رکھنا چاہیے اپنا غصہ۔ اپنی زبان اپنی خواہش۔
یہ باتین آدمی مین ہونا چاہئین عقلمندی: زندہ دلی۔ نیک چلنی۔
ان باتون سے نفرت کرنی چاہیے۔ بزدلی۔ گھمنڈ شیخی۔
ان باتون کیلیے لڑنا چاہیے۔ اپنی آبرو۔ اپنا ملک۔ اپنا دوست
ان باتون کا خیال رکھنا چاہیے۔ تعلیم۔ تنظیم۔ زیبائش۔
یہ باتین اچھی معلوم ہونا چاہئیں۔ صاف دلی۔ خوش دلی۔ ملنساریت۔
ان باتون سے دل خوش ہونا چاہیے۔ فراخدلی۔ حسن۔ خود مختاری۔
یہ باتین ترک کرنی چاہئین۔ فضول گوئی۔ فضول خرچی۔ فضول مذاق۔

(منقول)

محبت کا کھیل

(۱)

رات تاریک تھی آسمان میں چاروں طرف کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی بادل کی گرج اور بجلی کی چمک نے ایک خوفناک منظر پیدا کر رکھا تھا۔ موہن اپنے خس پوش مکان میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا مٹی کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ایک گوشہ میں رکھا ہوا ہوا کے تیز و تند جھونکوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اور بارش اپنے پورے شباب پر تھی۔ موہن کبھی کبھی دروازہ کی ٹٹی ہٹا کر باہر دیکھ لیا کرتا تھا۔ مگر تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا ہاں بجلی کی چمک اس منظر تاریک کو دور کر چمکا دیا کرتی تھی

موہن آج خلاف معمول اسوقت تک بیدار تھا۔ شام ہی سے اسکے دل کو ایک الجھن تھی اور باوجود کوشش کے نیند نہ آتی تھی اُسکے بشرے سے پریشانیِ قلب کا اظہار ہو رہا تھا۔

خدا خدا کر کے بارش بند ہوئی، موہن چادر میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ ابھی نیند نہ آئی تھی کہ دروازہ پر کچھ کھٹکا معلوم ہوا اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

آواز آئی "کیا اس مکان میں کوئی موجود ہے۔؟" موہن پر خوف کے آثار طاری ہو گئے۔ اسکا دل دھڑکنے لگا مگر اُسنے ہمت سے کام لیکر دروازہ کی ٹٹی ہٹائی، دیکھا کہ دروازہ پر ایک سوار کھڑا ہے جسکا تمام جسم ایک سیاہ لبادے میں پوشیدہ ہے۔

موہن نے دریافت کیا "آپ کون ہیں اور اسوقت مجھ سے کیا کام ہے" "آئیے اندر تشریف لائیے" سوار نے تشکر آمیز لہجہ میں جواب دیا "نہیں میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا، صبح قریب ہے، اور مجھے صبح ہونے سے پہلے بہت کچھ کرنا ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ اس بچہ کو دن نکلنے تک اپنے پاس رکھ لیں۔" یہ کہکر اُسنے لبادہ کے نیچے سے ایک شیر خوار بچہ نکالا۔ موہن مشکوک نگاہوں سے سوار کو دیکھنے لگا اور ہنوز اسکی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا تھا کہ سوار نے پھر کہا، "آپ کچھ شک نہ کیجئے میں موہن کے

تھے جلد ہی واپس آکر اس بچہ کو آپ سے لے جاؤنگا"

دل چھٹ گیا تھا اور ماہتاب کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی موہن نے دیکھا کہ سوار کے لباس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ اسکے چہرے سے مایوسی و پریشانی ظاہر ہے اور اسکی نگاہیں ہمدردی کی طلبگار ہیں۔ موہن سے انکار نہ کیا گیا اور اُسنے بچہ کو سوار کی آغوش سے لے لیا سوار نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسکا نام دریافت کیا۔ اور گھوڑے کی باگ موڑ کر چلدیا۔

صبح ہوئی سورج نکلا موہن نے حوائج ضروری سے فارغ ہوکر تھوڑا سا گائے کا دودھ بچہ کو پلایا اور سوار کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ شام ہوگئی رات گذر گئی تھی کہ دوسرا دن بھی ختم ہوگیا مگر سوار واپس نہ آیا۔ موہن اب اسکی واپسی سے مایوس ہوکر اس بچہ کی پرورش پر کمربستہ ہوگیا۔

(۲)

تاج پور کی پہاڑی میں ایک چھوٹا سا موضع تھا جس میں زیادہ تر خس پوش مکان تھے اور عموماً کاشتکاروں کی آبادی تھی گاؤن کے تین طرف مرتفع زمین تھی اور ایک جانب سرسبز و شاداب پہاڑی موہن کے کھیت اسی پہاڑی کے دامن میں تھے۔

موہن اگرچہ ایک معمولی کسان تھا مگر اُسکے اخلاق اور پرخلوص ہمدردی نے گاؤن والون کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ اسکی عمر چالیس سال سے زیادہ تھی بیوی کے مرنے پر دوران شباب ہی میں داغ مفارقت دیگئی تھی) اُسنے دوسری شادی نہ کی اور خدمت خلق کے واسطے اپنی بقیہ زندگی وقف کردی۔ اُسکے کوئی اولاد نہ تھی اسلئے گاؤن کے بچون ہی سے اسکو محبت تھی اور انھیں کو وہ اپنی اولاد سمجھتا تھا۔

کچھ دنون بعد موہن کے نام ایک منی آڈر آیا۔ کوپن پر لکھا تھا "یہ روپیہ موہنی کے واسطے ہے" آج موہن کو معلوم ہوا کہ جس لڑکی کی پرورش وہ چند ماہ سے کررہا تھا اسکا اصلی نام موہنی ہے، اسی طرح وقتاً فوقتاً کبھی کہیں سے کبھی کہیں سے موہن کے نام روپئے آتے رہے مگر بھیجنے والے کا کچھ پتہ نہ چلا۔

(۳)

موہنی کی عمر سات برس کی ہوئی تو موہن نے اسکو گاؤن کے مدرسہ میں بھیجدیا جہاں اُسنے چند سال میں ہندی لکھنا پڑھنا بخوبی سیکھ لیا جب اسکی عمر گیارہ سال کی ہوئی تو گھر کا کام کاج خود اپنے ہاتھ

سے کرنے لگی اور دوپہر کا کھانا تیار کرکے روزانہ موہن کے واسطے کھیت پر لیجانے لگی۔

موہن کے گھر سے کچھ فاصلہ پر ایک پیپل کا پرانا درخت تھا جسکے سایہ مین ایک چھوٹی سی کٹی بنی ہوئی تھی، یہان کسی زمانے مین ایک بوڑھا سادھو رہتا تھا جسکو مرے ہوئے مدت ہو چکی تھی مگر گاؤن والے آجتک اس جگہ کو متبرک سمجھتے تھے اس کٹی کے ایک طاق مین چند قلمی کتابین اس سادھو کی لکھی ہوئی رکھین تھین جنکا مطلب کسیکی سمجھ مین نہ آتا تھا۔

موہنی جب گھر کے کام سے فرصت پاتی یا دوپہر کا کھانا کھیت پر پہنچاکر واپس آتی تو اس کٹی مین جا بیٹھتی اور ان کتابون کی ورق گردانی کیا کرتی۔ موہن جب شام کو گھر واپس آتا اور موہنی کو نہ پاتا تو وہ اسی کٹی مین جاتا۔ اور اسکو کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ مین مصروف پاتا۔ موہن نے اکثر اسکو سمجھایا کہ ان کتابون کے دیکھنے سے کیا حاصل انکا مطلب تو سمجھ مین آتا ہی نہین، مگر موہنی کا شوق برابر بڑھتا گیا اور جسقدر فرصت کا وقت اُسے ملتا وہ انہین کتابون کے مطالعہ ہی مین صرف کرتی رفتہ رفتہ ان کا مطلب کچھ کچھ اسکی سمجھ مین آنے لگا۔ اور اسکی دلچسپی بڑھ گئی۔ یہ تصوف کی کتابین تھین جنمین دنیا کی بے ثباتی، اہل دنیا سے بے تعلقی اور مالک حقیقی کا عرفان حاصل کرنے کا ذکر تھا۔

(۴)

موہن کے خود تو کوئی لڑکا نہ تھا۔ مگر گھر مین دو معصوم ہستیان موجود تھین جنمین سے ایک کا نام موہنی تھا اور دوسرے کا پریم! پریم موہن کے ایک قریبی عزیز کا لڑکا تھا جو اپنے باپ کی وفات پر موہن کی سرپرستی مین پرورش پا رہا تھا۔ ابتدا مین تو موہنی اور پریم ایک ساتھ رہتے تھے مگر گاؤن کی معمولی تعلیم کے بعد جب موہن نے پریم کو دوسرے گاؤن کے ایک انگریزی اسکول مین بھیجدیا تو مسلسل ملاقات کا سلسلہ قائم نہ رہا پھر بھی جب تعطیل کے زمانہ مین پریم تاجپور آتا تو اکثر موہنی ہی کے ساتھ پہاڑی پر کھیلا کرتا وہ موہنی سے دو تین سال عمر مین بڑا تھا۔ دونون کے معصوم دلون مین بچپن ہی سے محبت پیدا ہوگئی اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ پاک محبت بھی ارتقائی مدارج طے کرتی گئی۔ آخر پریم اپنی تعلیم ختم کرکے گاؤن مین واپس آگیا اور مستقل طور سے وہین رہنے لگا۔

ایکدن شام کے وقت پریم اور موہنی حسب معمول چٹان پر بیٹھے ہوئے آبشار کی روانی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اور دو معصوم دماغ صناعی فطرت کی موشگافیون مین مصروف تھے اسوقت پریم خلاف

سے زیادہ موہنی کو خوش پاکر کہنے لگا "موہنی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔" موہنی محبت کا نام سنکر چونک پڑی اور پریم کے چہرے کو غور سے دیکھکر بولی" پریم! محبت و محبت جسکا ہر شخص دعویدار ہے حقیقت میں محبت نہیں محبت صرف وہ ہے جسمین غرض شامل نہو دیکھو یہ جھرنا مالک حقیقی کی محبت میں نجانے کب سے رواں ہے اور نہ معلوم کب تک جاری رہیگا۔ اسکی ہر موج میں محبت کی لہر ہے، اسکی روانی میں محبت کی لطیف اور پاک جھلک نمایاں ہے۔ آؤ آج سے ہم اور تم دونوں عہد کرلیں کہ دنیا میں کسی سے محبت نکرینگے بلکہ صرف محبوب حقیقی سے دل لگائینگے۔ دنیا اور اسکی ہر شے فانی ہے صرف ذات معبود ہی باقی ہے اسلیے ہمکو صرف اُسی سے محبت کرنی چاہئیے" پریم کے دل پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ اُسنے فوراً سر تسلیم خم کردیا اور دونوں چٹان پر سر بسجود ہو گئے۔

(۵)

موہن بیمار ہوا اور ایسا بیمار کہ زندگی کی امید منقطع ہو گئی۔ اُسنے موہنی کو اپنے پاس بلایا، اُسکے سر پر ہاتھ پھیرا، پیار کیا اور کہا

"پیاری موہنی میں تمہارا باپ نہیں ہوں"۔ موہنی یہ سنکر چونک پڑی۔ اور حیرت زدہ ہوکر بولی۔

"دادا، ایسی بات کیوں کہتے ہو جسکو کوئی باور نہیں کرسکتا، کیا تمنے مجھے بیٹی کی طرح پرورش نہیں کیا؟ کیا گاؤں والے مجھے تمہاری بیٹی نہیں سمجھتے؟"

"ہاں یہ درست ہے لیکن حقیقت میں تم میری لڑکی نہیں ہو کیونکہ میرے یہاں تو ساری عمر میں کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔

"اور پریم، کیا وہ بھی تمہارا لڑکا نہیں ہے؟"

"ہاں، پریم بھی میرا بیٹا نہیں ہے" اسکے بعد موہن نے تمام گذشتہ واقعات موہنی کو سنائے۔ موہنی پر تعجب کے ساتھ رنج و غم کے آثار چھاگئے اور اُسکا خوبصورت چہرہ اداس ہوگیا۔

موہنی کی غمگین صورت دیکھکر موہن کے دل پر خاص اثر ہوا مگر وہ مجبور تھا اور اپنے آخری وقت میں موہنی کو اصلی حالات بتانا ضروری سمجھتا تھا اگرچہ آج سے پہلے اُسنے کبھی بات اُسکے متعلق نہ کہی تھی اور ہمیشہ موہنی کے ساتھ باپ کی طرح شفقت و مہربانی سے پیش آتا رہتا۔

آخر اُسنے کہا "بیٹی موہنی! میری آرزو تھی کہ پریم کے ساتھ تمہاری شادی ہوتی میری کل زمین اور گھر کا اثاثہ تم دونون کے واسطے ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو مین بڑی خوشی کے ساتھ جان دیتا" موہنی ابھی جواب نہ دینے پائی تھی کہ موہن کی زبان ہمیشہ کے واسطے خاموش ہو گئی۔

موہن کو مرے ہوئے چند ماہ گذر گئے، پریم ہمہ اوقات موہنی کی خدمت اور خاطرداری مین مصروف رہنے لگا اسکو اس خدمت مین ایک دلی مسرت اور روحانی خوشی حاصل ہوتی تھی موہنی کی محبت ابتدا ہی سے اسکے دل مین گھر کر چکی تھی، اور دن بدن ترقی پذیر تھی۔ وہ اکثر موہنی کے پاس بیٹھا ہوا اسکی صورت دیکھتا اور محبت بھری نگاہون کے وسیلے سے اظہار محبت کرتا رہتا موہنی یہ سب کچھ دیکھتی اور دل ہی دل مین سوچتی کہ آخر اسکا انجام کیا ہو گا۔ اگرچہ پریم کی سچی محبت کی وہ دل سے قدر کرتی تھی اور اُسکا صلہ دینا اُسکے اختیار مین تھا مگر وہ دنیا کی اس کشمکش سے آزاد رہنا چاہتی تھی۔ کیونکہ دنیا کی طرف سے اسکا دل افسردہ ہو چکا تھا۔

(۹)

سردی کے زمانہ مین صبح کے وقت پریم اور موہنی انگیٹھی کے پاس بیٹھے ہوئے سرگرم گفتگو تھے کہ دروازہ پر ایک رتھ آکر رُکی اور اُسمین سے ایک حسین عورت ریشمی ساری باندھے ہوئے اُترکر گھر مین چلی آئی۔ موہنی اسکو دیکھکر اپنی جگہ سے تعظیماً اُٹھ کھڑی ہوئی، آنیوالی عورت نے بڑے پیار سے موہنی کو گلے لگا لیا اور پیار سے اسکی پیشانی کو بوسہ دیا،

موہنی دیکھتی رہی لیکن پریم نے ایک چادر زمین پر بچھا دی اور وہ دونون اُسپر بیٹھ گئین۔ حسینہ نے مسرت آمیز لہجہ مین کہا۔ "پیاری موہنی آہ مین کب سے تیرے دیکھنے کی آرزومند تھی۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد آج تیرا پتہ ملا۔ بیٹی مین تیری ماں ہون۔

"تم میری ماں ہو! مین نے تو اپنی ماں کو کبھی دیکھا ہی نہین"۔

"ہان ہان مین بدنصیب ہی تیری ماں ہون۔ نصیب کا لکھا نہین مٹتا۔ آج پندرہ برس کے بعد مین تجھے دیکھ رہی ہون"

"اور میرے باپ کہاں ہین؟"

"تیرے باپ کو مرے ہوئے مدت ہوئی تیری عمر ایک سال کے قریب تھی جب اُن کا انتقال

"موہنی نے حسینہ کے سراپا پر غور سے نظر ڈالکر کہا۔

"مگر میں تو تمہارے جسم پر سہاگ کے نشان دیکھتی ہوں"

"ہاں اُن کے مرنے کے بعد تمہارے نانا نے میری شادی دوسری جگہ کر دی تھی اور......

اتنا کہکر حسینہ کی زبان رک گئی حسینہ کی زبان سے یہ الفاظ سنکر موہنی کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور اُسکی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور آنکھوں میں ایک نفرت آمیز چمک پیدا ہو گئی۔ وہ حسینہ کی طرف سے منھ پھیر کر بیٹھ گئی۔ حسینہ نے بہت کچھ کوشش کی کہ موہن کے دل سے اُسکی بدگمانیاں دور کر کے اسکو اپنے ساتھ لیجائے مگر موہنی نے صاف صاف کہدیا کہ ایسی عورت کو جسنے اپنے شوہر سے بیوفائی کی ہو وہ اپنی ماں نہیں سمجھتی اور نہ اُسکے گھر جا سکتی ۔۔۔ آخر حسینہ مجبور ہوکر بادل ناخواستہ اُٹھی اور للچائی ہوئی نگاہوں سے موہنی کو دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔

(۷)

اس واقعہ کے بعد موہنی بالکل افسردہ وغمگین رہنے لگی۔ وہ گھنٹوں منھ لپیٹے پڑی رہتی اور اپنے گذشتہ وموجودہ حالت پر غور کرتی۔ پریم کی باتوں میں بھی اُسکا دل نہ لگتا۔ دنیا اُسکی نگاہوں میں تاریک سے تاریک تر ہو گئی تھی۔ پریم کے دل پر بھی موہنی کے تغیر حال کا بہت اثر تھا وہ حتی الامکان اُسکو خوش رکھنے کی کوشش کرتا مگر ہمیشہ ناکامیاب رہتا۔ آخر ایک دن رات کی خاموشی وتاریکی میں موہنی گھر سے نکلی اور غائب ہو گئی۔ پریم کو اُسکی گمشدگی کا بے حد صدمہ ہوا۔ جہاں تک ہو سکا دوڑ دھوپ کی مگر اسکا پتہ کہیں نہ چلا۔

موہنی گھر سے نکلکر سیدھی ریلوے اسٹیشن پہونچی اور تن بتقدیر پراگ کا ٹکٹ لیکر گاڑی میں سوار ہو گئی۔ اسوقت وہ عجیب کشمکش کا شکار ہو رہی تھی، کبھی پریم کا خیال آتا اور واپسی کی سفارش کرتا کبھی گذشتہ واقعات یاد آکر اسے بیچین کر دیتے۔

اُسی گاڑی میں ایک ضعیف العمر رئیس شام بابو بھی سوار تھے وہ موہنی کی اس حالت اضطراب کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

اگلے اسٹیشن پر گاڑی پہونچی ہی تھی کہ ایک مال گاڑی سے ٹکرا گئی۔ یہ تصادم اگرچہ بہت

خفیف تھا کیونکہ اس گاڑی کی رفتار سُست تھی اور مال گاڑی بالکل غیر متحرک تاہم بحمد اللہ کسی کا زیادہ نقصان نہ پہنچا اسباب اُلٹ پلٹ گیا بعض بعض مسافر بھی زخمی ہوئے موہنی کے ڈبہ کو بھی اس زور کا جھٹکا پہونچا کہ وہ گھبرا گئی۔ خدا خدا کر کے گاڑی کو سکون ہوا۔ مسافر پلیٹ فارم پر گھبرا کر اترنے لگے اسٹیشن کے سارے ملازم گاڑی کے پاس جمع ہو گئے، اسی ہنگامے میں موہنی بھی گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ شیام بابو نے جلدی سے قلی کو آواز دی۔ اسباب نیچے اتروا دیا اور اس اتفاقی حادثہ سے محفوظ رہنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

موہنی ایک طرف چپ چاپ کھڑی تھی اسٹیشن پر ایک ہنگامۂ محشر برپا تھا مگر اسے اپنا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ آخر شیام بابو نے اسکی معصومانہ نظر کو پہچان لیا اور قریب جا کر بولے بیٹی۔ کیا کوئی تیرے ساتھ نہیں موہنی نے معصومانہ انداز سے کہا "پرماتما کے سوا کوئی نہیں" شیام بابو نے کہا اچھا تو آج سے میری دھرم کی بیٹی ہے۔ مجھے اپنا باپ سمجھ اور میرے گھر چل۔ موہنی اس ہنگامہ سے اس درجہ متاثر تھی کہ چپ ہو گئی۔ قاعدہ ہے کہ مصیبت دوستی کی کسوٹی ہوتی ہے اور مصیبت زدہ، شریک مصیبت کو درست سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ موہنی کا دل بھی شیام بابو کی مخلصانہ پرسش کو بزرگانہ شفقت پر محمول کرنے لگا۔

غرض شیام بابو موہنی کو لیے ہوئے گھر پہنچے مکان میں صرف پیاری شیام بابو کی بہن تھی شیام بابو نے پیاری سے موہنی کا تعارف کرایا۔ پیاری نے محبت سے موہنی کو گلے لگا لیا اور حقیقی خلوص کا اظہار کرنے لگی۔

موہنی کو یہاں رہتے ہوئے چند ماہ گذر گئے تھے اس نے اپنے حسن اخلاق اور حسن خدمات سے شیام بابو اور پیاری کے دل میں کافی جگہ پیدا کر لی اور سچ مچ اس گھر کی چشم و چراغ بن گئی۔

دالان میں ایک خوبصورت تصویر آئینہ میں جڑی ہوئی آویزاں تھی جسکے نیچے سندر بابو لکھا ہوا تھا۔ موہنی کا دل خود بخود اس تصویر کی طرف کھنچتا تھا۔ اور وہ اکثر خاموش بیٹھی ہوئی ٹکٹکی لگائے اسکو دیکھا کرتی تھی۔ جہاں تک وہ غور کرتی اسکو اپنے ہی خط و خال اس تصویر میں نظر آتے، اصل میں یہ تصویر موہنی سے اسقدر مشابہ تھی کہ اگر مردانہ خط و خال تصویر کے چہرہ سے نکال دیئے جاتے تو وہ ہو بہو موہنی بن جاتی۔ ایکدن اُسنے پیاری سے دریافت کیا کہ یہ تصویر کسکی ہے۔ پہلے تو پیاری نے ٹالا مگر آخر

موتی نے کے اصرار سے مجبور ہو کر اُسے بتایا کہ یہ تصویر پیاری کے شوہر دسسندر راؤ کی ہے جو مجھ سے ملا تہ ہے۔

(۴)

پیاری کی سہیلی تارا کی بڑی لڑکی سمرتی کی شادی ہونے والی تھی جس میں پیاری کی شرکت ضروری تھی۔ وہ موہنی کو اپنے ہمراہ لیکر تارا کے گھر پہنچی۔ جیسے ہی مکان کے اندر قدم رکھا موتی کی نظر اُس عورت پر پڑی جو ایک سال پہلے تاجبو۔ مین اُ سکے یہان گئی تھی اور اپنے آپ کو موتی کی مان کہتی تہی۔ تارا کی صورت دیکھتے ہی موتی کو گذشتہ واقعات یاد آگئے اور اُسنے پیاری سے گھر واپس چلنے کی ضد کی۔ تارا بیتابی کے ساتھ موتی کی طرف لپکی اور اسکو اپنے سینہ سے لگا لینا چاہا مگر موتی نے اسکی جانب سے منھ پھیر لیا تارا کا دل بھر آیا۔ اسکی آنکھون سے آنسو جاری ہوگئے اور اُسنے موتی سے کہا کہ گھر واپس نہ جائے بلکہ اپنی بہن کی شادی مین شریک ہو مگر موتی نے ایک نہ مانی اور واپس چلی گئی۔ تارا ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑی اور بیہوش ہو گئی۔

مراسم شادی ختم ہوئے لڑکی رخصت ہوگئی مگر تارا کو کچھ خبر نہ ہوئی وہ بدستور بستر علالت پر پڑی رہی۔ ہر چند علاج ہوا مگر اسکی حالت روز بروز بد تر ہوتی گئی۔ نہ کچھ کھاتی تھی اور نہ کسی سے بات کرتی تھی یا تو خاموش بیٹھی رہتی یا روتی پیاری کو تارا کی یہ حالت دیکھکر بہت صدمہ ہوا اور تیمارداری کے واسطے رک گئی۔

پیاری کو یہان رہتے ہوئے ایک ہفتہ گذر گیا مگر تارا کی حالت مین کوئی نمایان فرق نہ ہوا آٹھوین دن صبح کے وقت تارا نے پیاری کو اپنے پاس بلایا اور اپنے شوہر کو بلانے کے واسطے کہا جب وہ آگئے تو تارا نے آنچل مین منھ چھپا کے کہا۔

"سوامی مین آپ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوتی ہون۔ موت میری سر پر کھیل رہی ہے اور مین کوئی دم کی مہمان ہون۔ مین چاہتی ہون کہ اس آخری وقت مین اُس راز کو آشکارا کردون جسکو آجتک میرے سوا کوئی نہین جانتا اور جسکے بوجھ سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے شاید اس بھید کو ظاہر کرنے کے بعد آسانی کے ساتھ جان نکلے"۔

آہ مین گنہگار ہون! مین نے اپنی پیاری بہن پیاری کا گھر برباد کیا اور آپ کو اپنی

...کی محبت کے جال میں پھنسالیا۔ سندر بابو میری وجہ سے آوارہ وطن ہوا۔ آجتک... اتنا کہکر تارا بے اختیار رونے لگی اور بیہوش ہوگئی۔ بڑی کوشش کے بعد تارا کو کچھ ہوش ہوا اور اُسنے پھر کہنا شروع کیا۔ موہنی میری آنکھوں کا تارا ہے، اسے کیا معلوم کہ میں اسکی ماں ہوں۔ موت میرے سر پہ کھڑی ہے اسلیے میں وہ سب کچھ کہے دیتی ہوں جو میرے دل میں ہے۔ موہنی کو میں نے بچپن ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اسکا آجتک میرے دل میں ہے مجھے ایک خاص ذریعہ سے سندر بابو کے اس منی آرڈر کی اطلاع ملی تھی جو انھوں نے موہن کے پاس موہنی کے لیے روانہ کیا تھا اور میں ایکمرتبہ ممتا سے مجبور ہوکر اسی پتہ سے موہنی کے پاس گئی تھی۔ مگر آہ! موہنی نے میری قدر نہ کی۔

"سوامی جی! پیاری بہن!! میں تم دونوں کی خطاوار ہوں۔ ہائے میں تمہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں ہوں۔ بس اسقدر آرزو ہے کہ تم دونوں میرا قصور معاف کردو تاکہ میری جان آسانی کے ساتھ نکل جائے۔ آہ موہنی تو نے ایک مرتبہ بھی مجھے ماں کہکر نہ پکارا، تجھے کیا خبر کہ تیری جدائی میں میں نے کسطرح زندگی گذاری، کاش اسوقت تو میری آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ اچھے سوامی مجھے معاف کردو، پیاری بہن! میری خطا سے درگذرو۔ دیکھو میرا دم گھٹا جاتا ہے اور میں تمہاری زبان سے "معافی کا مژدۂ جانبخش" سننے کی مشتاق ہوں۔ پیاری موہنی سے کہدینا کہ وہ بھی مجھے معاف کرے اور اگر کبھی سندر بابو آجائیں تو ...." یہ کہتے کہتے تارا کی زبان بند ہوگئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ ہمیشہ کے واسطے خاموش ہوگئی۔

(۹)

پیاری اور تارا بچپن سے ایک ساتھ کھیلی تھیں ان کے مکان ایک ہی محلہ میں تھے۔ شیام بابو اور سندر بابو بھی ہم عمر اور ہم سبق تھے اور یہ چاروں اکثر ایک جگہ کھیلا کرتے تھے۔ تارا پیاری کی بہ نسبت حسین تھی۔ اسکی شوخی اور تیزی طبع نے بچپن ہی میں سندر بابو کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ وہ پیاری کے مقابلہ میں ہمیشہ تارا کو ترجیح دیتا اور اسکی تعریف کیا کرتا دونوں کی عمروں کے ساتھ ساتھ محبت بھی بڑھتی گئی۔ یہانتک کہ دونوں ایک دوسرے کے پرستار بنگئے۔ جوان ہونے پر اگرچہ وہ پہلی سی بے تکلفی باقی نہ رہی مگر اکثر درپردہ دونوں اپنی اپنی محبت کا اظہار کیا کرتے

تھے۔

سندر بابو کی نسبت پیاری کے ساتھ ہوئی اگرچہ اُسنے اسکی بہت کچھ مخالفت کی مگر تقدیر کا نوشتہ مٹ نہیں سکتا والدین کے خوف نے اسکو مجبور کر دیا شادی ہوگئی لیکن پیاری کی تمنائیں پوری نہ ہوئیں ادھر پیاری پریشان تھی، ادھر سندر بابو کشمکش مین مبتلا تھے۔ ایکدن موقع پاکر پیاری نے سندر بابو کے قدمون پر گر پڑی۔ اور اپنی محرومی قسمت کا سبب پوچھا بچپن کی محبت اور دلداری یاد دلائی مگر سندر بابو نے بجز خاموش۔ بنے اور حسرت آمیز نگاہون سے دیکھنے کے کوئی جواب نہ دیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ کے اندر ہی سندر بابو اور تارا غائب ہوگئے۔ وہ گھر سے نکلکر بنارس پہنچے جہان تارا کے بطن سے موہنی پیدا ہوئی۔ موہنی ابھی سال بھر کی تھی۔ ہوئی تھی کہ تارا کی طبیعت نے پلٹا کھایا وہ رات دن سندر بابو کو طعنے دیتی اور برا بھلا کہا کرتی اور آخر کار ایکدن سندر بابو کی عدم موجودگی مین موہنی کو چھوڑ کر وہان سے چلدی اور ایک خط لکھکر رکھ گئی جسمین سندر بابو کو برا بھلا لکھا تھا کہ اب مری تلاش نہ کرو میرا دل دنیا سے بیزار ہو چکا ہے۔ جب سندر بابو کو تارا کے غائب ہو جانے سے بہت صدمہ ہوا۔ شہر بھر مین اسکی تلاش کی مگر تارا کا نشان نہ ملا، مجبور ہو کر موہنی کو لیکر چلدیئے اور اسکو موہن کے سپرد کر کے خدا معلوم کہان چلے گئے۔ تارا نے گھر پہنچی اسکے والدین نے ابتک اسکی گم گشتگی کو پوشیدہ رکھا تھا اور آخر اسکی شادی دوسری جگہ کر دی

(۲)

تارا کے مرنے کے بعد پیاری اپنے گھر واپس آئی اور موہنی سے سب واقعات دوہرائے اور اسکو پیار کیا اور کہا کہ اب صرف موہنی ہی سندر بابو کی حقیقی یادگار اُسکے پاس ہے موہنی کو جب معلوم ہوا کہ راز افشا ہو گیا تو وہ بہت افسردہ و پژمردہ رہنے لگی۔ پیاری اور شیام بابو ہر طرح اسکی دلجوئی کرتے مگر موہنی کے دل سے خوشی مفقود تھی۔ وہ اس دنیا مین خوش رہنے کے لیے پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے موہنی کو پریم کی یاد آئی۔ اُسکی محبت اور اپنی بے وفائی کا خیال کر کے وہ کانپ اُٹھی، اُسی حالت اضطراب مین اُسنے ایک خط لکھا۔

"پیارے پریم! میں جانتی ہوں کہ تم مجھے ضرور یاد کرتے ہوگے میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہاری محبت ہنوز میرے دل میں ہے۔ آہ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہم دونوں پہاڑی پر کھیلا کرتے تھے۔ اے پریم تم مجھے بیوفا اور احسان فراموش کہو گے اور تمکو کہنا بھی چاہیئے۔ میں نے واقعی تمہاری سچی محبت کی قدر نہ کی اور تم سے بے وفائی کی مگر قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔ اب میرا دل زندگی سے سیر ہو چکا ہے، دنیا میں میرے واسطے مصیبت ہی مصیبت ہے میں ایسی زندگی سے موت کو بہتر سمجھتی ہوں۔ تم بھی اب مجھے اپنے دل سے بھلا دو میں اپنی مصیبت کی داستان اسوقت تمکو سنانا نہیں چاہتی اور نہ میرے پاس اسقدر وقت ہے کہ میں اپنی پوری سرگذشت لکھوں۔ میں اپنا پتہ بھی نہیں لکھتی تاکہ تمکو میری جستجو میں اپنا وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی شاید میں اس دنیا سے گذر جاؤں۔ ہاں اتنا جتلائے دیتی ہوں کہ آخری وقت تک تمہاری محبت کو اپنے دل سے لگائے رکھوں گی۔

تمہاری بے وفا موہنی

پریم موہنی کے ملنے سے ناامید ہو چکا تھا، اُسنے سمجھ لیا تھا کہ موہنی اب دنیا میں موجود نہیں ہے اور اسلئے وہ اسکی طرف سے مایوس ہوکر زندگی کے دن گذار رہا تھا موہنی کی یاد اکثر اسے ستاتی اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اُسنے بی موہن کی روش اختیار کر لی تھی اور اسیطرح گاؤں والوں کی خدمت کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔

جسوقت موہنی کا خط پریم کو ملا اُسکا جسم خوشی سے کانپنے لگا۔ مضمون پڑھکر بے اختیار رونے لگا اُسنے بار بار خط کو پڑھا، اسکی تمنا تھی کہ کسی طرح اپنی زندگی میں ایکبار موہنی کو دیکھ لیتا۔ مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی آخر بے چارہ خاموش ہوکر بیٹھ رہا۔

(۱۱)

رات کے دس بج چکے تھے آسمان ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی، پریم اپنے گھر میں تنہا بیٹھا ہوا سر بزانو اپنے خیالات میں مستغرق تھا۔ آج خلاف معمول اسکے دلکو ایک نامعلوم اضطراب تھا۔ موہنی کی یاد خصوصیت سے اسکو ستا رہی تھی اور وہ بار بار ٹھنڈی سانسیں بھر رہا تھا۔

بجلی سے [illegible] کی گونج پیدا کرنے کی کوشش کی؟ پریم چونک پڑا اور کان لگا کر سننے لگا نرم و نازک لہجہ میں کسی کو کراہنے کی آواز آنے لگی۔ پریم اپنی خلقی ہمدردی سے مضطرب ہو کر باہر نکل آیا۔ دیکھا کہ ایک عورت دروازہ پر پڑی ہوئی دم توڑ رہی ہے۔ پریم اسکو اٹھا کر اندر لے گیا اسکے جسم سے بھیگی ہوئی چادر اتار کر کمبل اوڑھایا اور انگیٹھی میں آگ بھر کر اسکے پاس رکھ دی اب اُسنے اسکے چہرہ کو غور سے دیکھا اور بیساختہ چلا اٹھا "سوہنی! او پیاری سوہنی!! تم کہاں؟" سوہنی کے جسم میں گرمی آ چلی تھی اُسنے آنکھ کھول کر تشکر آمیز اور شوق انگیز نگاہیں پریم کے چہرہ پر ڈالیں اور ہونٹوں پر ایک خفیف مسکراہٹ نمایاں ہو گئی پھر نحیف آواز میں کہا!

"پیارے پریم! تم میری زندگی سے ناامید ہو چکے ہوگے۔ تمنے میری جدائی میں واقعی تکلیف اٹھائی ہوگی، آہ! میری بدبختی نے تمہیں بھی ناشاد و نامراد رکھا، میں تمہاری ہوں اور شکر ہے کہ پھر تمہارے پاس آ گئی۔ اب تمکو گھبرانے کی ضرورت نہیں میں بڑی مشکلوں سے تم تک پہنچی ہوں آج میری زندگی کا آخری دن تھا۔ لیکن میں ارادہ کر چکی تھی کہ مرنے سے پیشتر تم سے ضرور ملونگی چنانچہ خدا نے کامیاب کیا۔ پریم میں اپنی کہانی تمہیں سناؤنگی۔ لیکن اسوقت زہر کا اثر، پریم میں کیا کہوں تمہیں میری زبان سوکھ رہی ہے سر پھٹا جا رہا ہے میں سونا چاہتی ہوں پریم مجھے پانی پلا دو اب اگر میں دنیا میں رہوں گی تو تمہاری ہو کر رہونگی، ورنہ معاف کرنا: یہ کہکر کمبل سے منہ لپیٹ لیٹ رہی۔

پانی زور سے برسنے لگا جھونپڑی کہیں کہیں سے ٹپکنے لگی۔ پریم اپنے آپے میں نہ تھا۔ سوہنی کی باتوں نے ہوش و حواس میں برہمی پیدا کر رکھی تھی زہر کا نام یاد آتا تو اسکی روح افسردہ ہو جاتی اور وہ ایک مایوسی کے عالم میں جھونپڑی سے باہر سر نکال کر دیکھنے لگتا۔ رات کا وقت بلا کا زور، باہر سے بھی کسی امداد کی توقع نہ تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ سوہنی نے اپنی منحوس زندگی کے خاتمہ کے لیے زہر کھا لیا تھا، وہ ایک مستقل مزاج عورت تھی اُسنے پریم کو خط لکھتے وقت ہی ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جلد اس دنیا کو چھوڑ دیگی۔ اسنے اپنے ارادے میں کوئی ترمیم نہ کی۔ ہاں صرف اتنا اضافہ کر دیا کہ مرنے سے پیشتر پریم کو دیکھ لے۔ چنانچہ وہ شام باپ کی نظر بچا کر ایک روز گھر سے نکلی اور دن بھر کے انتھک سفر کے بعد اس پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئی جہاں پریم مسکن گزین تھا۔ نرم و نازک عورت

اسوقت وہ بھی تھکی ہوئی ایک جھاڑی مین چھپکر سورہی، آنکھ کھلی تو طبیعت نڈھال تھی دن کافی سے چڑھ چکا تھا اسنے آسمان کیطرف دیکھا۔ ساڑی کے آنچل سے سنکھیا کی پڑیا کھولکر جلدی سے پھانک گئی۔ اب زہر اپنی پوری طرح پھیل چکی تھی بارش کا سامان زیادہ ہوتا جاتا تھا نہایت تشنہ حال ہوئی پریم کے مکان کیطرف بڑھی، جھونپڑی کے سامنے زمین چکنی تھی دفعتاً پاؤن پھسلا اور دھم سے گر پڑی۔

اسوقت موہنی چارپائی پر منھ لپیٹے پڑی تھی پریم کی حالت عجیب تھی وہ چاہتا تھا کہ موہنی کو جگاکر اس سے باتین کرے کمبل ہٹانا چاہتا مگر اس کی تکلیف کے خیال سے رک جاتا تھا۔

ابھی صبح نہوئی تھی کہ پریم نے اضطراب قلب سے مجبور ہوکر موہنی کے چہرے سے کمبل ہٹا ہی دیا۔ لیکن موہنی کے بجائے ایک بیجان مجسمہ تھا۔ شانہ ہلایا مگر نہ موہنی نے کروٹ لی اور نہ کوئی جواب دیا۔ پریم نے چراغ لیکر اسکو غور سے دیکھا، نبض پر ہاتھ رکھا لیکن موہنی کو کچھ خبر نہوئی وہ تو ابدی نیند سے سوگئی تھی، پریم کے ہاتھ سے چراغ چھوٹ گیا اور منھ سے ایک چیخ نکل گئی وہ موہنی کے بے حس و حرکت جسم پر گرکر ہمیشہ کے واسطے بیہوش ہوگیا۔ اس طرح ایک کو دنیا کی کشمکش سے اور دوسرے کو فراق کی مصیبت سے نجات ابدی حاصل ہوئی۔

سید راز چاندپوری

فن طباعت مین اکثر ممالک مین تحریک ایجاد کی صورت مین رائج ہوا تھا اسی وقت سے ابتک جتنی کتابین زیور طباعت سے آراستہ ہوچکی ہین، انکے متعلق مختلف اندازے لگائے گئے ہین، ایک مستند ماہر کا خیال ہے کہ پندرھوین صدی مین ۴۰۰۰۰ سولھوین صدی مین ۵۰۰۰۰ سترھوین صدی مین ۱۲۵۰۰۰، اٹھارہوین صدی مین ۲۰۰۰۰۰ اور انیسوین صدی مین ۰۰۰۰۰۰ ۲۵ کتابین چھپی ہین ان تمام کی مجموعی تعداد ۱۲۱۳۳۰۰ ہوتی ہے ان کے علاوہ ۱۵۰۰۰۰ رسائل بھی تھے، بیسوین صدی مین ہر سال ۲۰۰۰۰ کتابین چھپتی رہین اور گزشتہ ۲۲ سال مین ۴۴۰۰۰۰ کتب چھپین ان تمام کتابون کی مجموعی تعداد اب ۱۶۵۰۰۰۰ ہے قلمی کتب، سرکاری رپورٹ اور وقتی رسائل الگ ہین۔ (معارف)

سید نظام الدین مدھنایک

جس طرح برادران ہنود نے فارسی شاعری اور بعض علوم اسلامیہ میں اپنی علمی دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اسی طرح اہل اسلام بھی ہندوؤں کے ادبیات میں حصہ لیکر بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے ہیں یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو دلائل و براہین کی ضرورت سے بے نیاز ہے، ملک محمد جائسی، محقق برنی، فیضی، عبدالقادر بدایونی اور انکے مثل بزرگان سلف کی روشن تر داستانیں اور ان کے علمی کارنامے اس دعوی کی شاہد عدل ہے۔

اس تمہید سے میرا یہ مدعا نہیں کہ فریقین کا ایک دوسرے کی علمی خصوصیات پر متوجہ ہونا بعض عارضی اغراض پر مبنی تھا اور ہندی یا اسلامی علوم میں فی نفسہ مذاق سلیم کو جذب کرلینے کا مادہ نہ تھا۔ یہ تو واقعیۃً غلط ہوگا کیونکہ ادب اور شعر تو خصوصیت سے علم کے ایسے نمایاں ترین شعبے ہیں جو صرف انہیں لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جنہیں فطری طور پر رقت قلب و انجذاب محبت کا مادۂ لطیف ودیعت ہوتا ہے اور یہ مادہ جس درجہ آزادی ذوق و تصفیہ خیال کا باعث ہو جایا کرتا ہے اسکا اظہار تحصیل حاصل ہے۔

بہرحال یہ امر طے شدہ ہے کہ شاعری ہر زبان کی ہندی ہو یا غیر ہندی اپنے اندر کچھ نہ کچھ ایسے دلفریب اور غیر معمولی اسباب تفریح رکھتی ہے جو بڑی حد تک جاذب ذوق و نظر ہوتے ہیں اور اسی لیے شاعری میں اہمیت و زبان کا سوال چنداں ضروری نہیں۔

فارسی اور اردو شاعری پر عہد حاضر کے رسائل میں آئے دن ذمہ دار اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اور اب ان مباحث نے ایسی اکثریت اختیار کر لی ہے کہ اس طرف سے عموماً لوگوں کی توجہ کم ہو گئی ہے،

زمانہ میں بھاشا شاعری کے متعلق دو ایک مضمون میری نظر سے گذرے ہیں یہ دیکھکر مجھے بھی شوق ہوا کہ اسی موضوع پر اپنی ناچیز معلومات پیش کردوں۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کی

مبارک تحریک نے یہ خیال پیدا کیا کہ "بھاشا" بزرگان ہنود کی خاندانی اور قومی خصوصیت ہے۔ مسلمانوں کا شغف بھاشا کے ساتھ البتہ قابل اعتبار ہوگا۔ ایسے ہی سلسلہ کی ابتدا کرنے کے لیے ذیل میں سید نظام الدین المتخلص بہ مدھنایک بلگرامی کی شاعری پر مختصر تبصرہ معہ ضروری حالات کے ناظرین کی نذر کرتا ہوں۔

حالات خاندانی — سید عبدالواحد بلگرامی بلگرام کے مشہور صاحب سجادہ بزرگوں میں سے تھے انہیں کے سلسلہ میں سید نظام الدین ہیں جن کے والد سید علاء الدین مرحوم سید صدر جہان کے پوتے تھے۔

تعلیم اور تکمیل استعداد — ہوش سنبھالنے کے بعد ابتداً نظم و نثر کا شوق ہوا اور اس فن کو مستند اساتذہ عصر سے حاصل کر کے شعر گوئی میں کمال پیدا کیا اور فارسی میں اتنی قابلیت بہم پہنچائی کہ بڑی بڑی دقیق درسی کتابیں بے تکلف پڑھانے لگے۔

آخر میں علوم ہندی کی طرف توجہ ہوئی تو شہر بنارس کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے مستند علما و ماہرین فن سے سنسکرت اور بھاشا کی مکمل تعلیم پائی پھر اسی سلسلہ میں موسیقی میں اتنی مہارت پیدا کی کہ علم تال اور سنگیت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ بڑے بڑے پنڈت اور کلاونت ان کی تحقیق و نکتہ رسی کا دم بھرتے تھے اور اطراف و جوانب سے استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔

مدھنایک تخلص کرتے تھے، فن موسیقی میں دو کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں۔ ناد چندرکا اور مدھنایک سنگار۔ گوتے اب تک بعض بعض گانے کے وقت ان کا نام لیتے اور کان پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ کان پر ہاتھ رکھنا یا کان پکڑنا ہندوستان کے قدیم تمدن کا ایک طرز ادب ہے۔ مرزا صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت میں بھی یہی مروج تھا۔

آتش نفسان گوش بہ تعظیم بگیرند
ہر جا کہ من سوختہ را نام بر آید

اخلاقی خصوصیات — سید صاحب کا شمار ان کے زمانہ کے نہایت باوضع اور کامل فن بزرگوں میں تھا۔ سخاوت و مروت تو گویا ان کی امتیازی خصوصیت ہے، خلق انکسار کا یہ عالم تھا کہ لوگ ہر وقت گھیرے رہتے تھے اور ان کی پیشانی پر شکن نہ آتی تھی۔ بذلہ گوئی اور علم مجلسی میں اتنا کمال تھا

موسیقی آپ سے تقرب مجلس میں بھی صرف انہیں کا مذاق صحبت کامیاب ہوتا تھا۔

متفرق واقعات

علامہ آزاد بلگرامی نے سید نظام الدین کے کمالات موسیقی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے متعلق ایک روایت لکھی ہے جو یہاں درج کیجاتی ہے۔ اس روایت سے ناظرین کو ان کے تقدس نفس اور مہارت فنی کا اندازہ ہو جائے گا۔

ایک دفعہ بلگرام میں امساک باران سے خلق خدا سخت پریشان ہوئی اور قحط کی صبر شکن تکالیفِ عام ہو گئیں تو سید محمد فیض بلگرامی سید نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ نائیک سلف کے راگوں سے صبحت سے تصرفات کا اظہار ہوا ہے جو عموماً لوگوں کی زبان پر ہیں، آجکل قحط سے بندگانِ خدا تباہ حال ہیں اگر کوئی تصرف ممکن ہو تو ظاہر فرمائیں۔ سید صاحب نے فرمایا "بندہ عاجز ہے، خدا کو ہر بات پر قدرت ہے، اور سید محمد فیض کے گھر جا کر ایک چوکی منگوائی اور اسپر بیٹھکر راگ مسکیہ شروع کیا۔

سید صاحب کا گانا اسقدر پُرکیف اور وجد آور ہوتا تھا کہ انسان تو انسان بعض وقت جانور بھی مست ہو جاتے تھے، ابھی گانے کا آغاز ہی تھا کہ بادل گہر آیا حالانکہ اس سے پہلے نام کو بھی ابر نہ تھا۔ سید محمد فیض نے کہا "حضرت کو بہت تکلیف ہوئی، اظہار تصرف کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ مگر اسپر کوئی التفات نہ کیا اور برابر گانے میں مصروف رہے، یہانتک کہ چاروں طرف سے بادل گھر کر پانی برسنا شروع ہوا اور اتنا برسا کہ طوفان کی نوبت آگئی۔ اہالیان قصبہ بہت ممنون ہوئے اور سید محمد فیض نے بہت معذرت کی۔

سید صاحب بلگرام کی ایک نازک ادا حسینہ کو دل دے بیٹھے تھے اور اسکی محبت میں اس قدر غلو رکھتے تھے کہ زندگی اسکے لیے وقف کر دی، چونکہ جذبات محبت غیر مصنوعی تھے اور بڑی حد تک اغراض نفسانی سے پاک۔ اسلئے دلدادہ کے ساتھ دلربا بھی محبت کا شکار ہوئی۔ سید صاحب نے زمانے کو موافق نہ دیکھکر محبوبہ کو ساتھ لیا اور شاہ آباد میں حسب قاعدہ مذہبی رسوم نکاح ادا کرنے کے بعد سکونت اختیار کی، نواب کمال الدین خان والی شاہ آباد سید صاحب کی حد سے زیادہ تعظیم کرتے تھے، اور ان کی مدت قیام تک برابر انکی خاطرداری میں مصروف رہے۔

وطن کو بعد مراجعت اور وفات — بعد چندے وہاں سے طبیعت اُچاٹ ہوئی اور بلگرام میں انگریزوں کے خلاف شورش فرو ہو گئی تو وطن کا رُخ کیا اور پھر مستقل قیام وطن کے لطف اُٹھا کر بتاریخ یکم رمضان المبارک ۱۲۹۲ھ وفات پائی۔

کبت — اب ہم ان کے چند کبت با ترجمہ درج کرتے ہیں جس سے ان کی بھاکا شاعری کا پایہ معلوم ہو سکے گا۔

"کاری کجراری، انیاری جگ موھنی کو تن بیچ ناری ات تزل تریری ہین"
"جیسی ہین ساوک جاوک جل بھر مین پھر کین سو کیھون ریت نہ ٹھہری ہین"
"دوآر رہنا یک جو میرو من موھنی کو نپ پنجری پھر رہت نہ ہبری ہین"
"ساولو کی سودھار سو ہجا ہما دھکار ایسی ہین کی کہلونان مین پیاری سری ہین"

ترجمہ — تیری سیاہ، زکدار سرگین، اور مردم فریب آنکھوں کی لالہ گون سطح پر مردمک چشم اس طرح سے متحرک ہین گویا چھوٹی چھوٹی مچھلیان سرخ پانی مین شوخیان کر رہی ہین۔

مین رہنا یک کہتا ہون تیری چشم نظر فریب قفس نقاب مین بھی آزادی سے صرف دلربائی ہے، اور میری طرف نگران، پھر تیرے ریشمین ڈوپٹہ نے نقاب کی سنبھال مین جو حسن پیدا کر دیا ہے اسکا تو بیان بھی امکان سے باہر ہے۔ بہر حال اسے سمجھ نا کہ تیری آنکھین حسن مجسم کا بازیچہ ہین،

چتر ان چت چڑھے : بدھی بدھ بیدن گرستہ نہ : گائے
بھاگتی بھوری کری بھبرن جب جوگن جوگ ایستہ نہ سہائے
جو لکھ جوت جگی : جھکی رہنا یک گھونگھٹ چنچل تائے
جیسی دو کول جبی جھلکی اچھو برا جیت اچھیہ رجائے

نقاب کے اندر تیری آنکھون مین جو خوشنائی معلوم ہوتی ہے ملائک اسکا انداز ہ لگانے سے قاصر ہین اور کتب سماوی اسکے وصف سے عاجز، ناطقہ خود رفتہ و سرگردان ہے اور زاہد و مرتاض اپنی سمجھ گردانی و ریاضت سے زیادہ اسکی تعریف مین تر زبان ہ

وقول مہہنایک، تری آنکھیں تیرے برق تاب چہرہ پر اس طرح ضیا پاشی میں مصروف ہیں کہ نقاب کی حرکت ان کی نور افشانی میں کمی پیدا نہیں کر سکتی بلکہ اس باریک پردہ میں ان میں ایسی ایسی بے مثل خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ زمانہ کی آنکھیں گرویدہ ہوئی جاتی ہیں۔

"کوئی کہے چند کی مرکلنک اک دیکھیت کوئی کہے چھایا چھت بھوتل پرکاس کی"
"کوئی کہی اندھکار ہوتی سو دیکھیت کوئی کہی کالمان کلنک انیلتا اکاس کی"
"مدہ کی سار ہر لینہوں کرتار سب تاہی کی سنوار تی جیا ان کا بہ کی بلاس کی"
"تاہل میں چھانی چھید پڑے ہیں چھپا کر کے دار پار دیکھیت نیلتا اکاس کی"

چاند کے سیاہ داغوں کو کسی نے کہا ...... ماہتاب کی سواری میں جو آہوئے سیا ہیں یہ انکی سیاہی ہے۔ کسی نے کہا ...... زمین کا سایہ چاند پر ہے۔ ..... یہ انکا اثر ہے" کوئی بولا " ماہتاب نے عشق و محبت کیا اسی سے یہ سیاہی پیدا ہوگئی ہے۔ میں مہہنایک کہتا ہوں کہ اللہ نے چاند کا خلاصہ نور و خوبی نیکر اس نازک اندام مہ لقا کی تخلیق کی اسلیے چاند میں سوراخ ہوگیا اور ان سوراخوں سے آسمان کی سیاہی نظر آنے لگی۔

سبحان اللہ کیا لطیف اور نازک جذبات ہیں اور کس قدر پاکیزہ تشبیہیں ہیں۔ نہ اردو فارسی کے عام اور صوفیانہ شاعری کی طرح رقیب اور اغیار کے ہنگامے ہیں نہ معشوق کے ہرجائی پن کا تذکرہ پھر خیالات میں وہ بلندی اور جاذبیت کہ بایدو شاید۔

ابوالولا محمد زکریا مائل

ہندوستان کی ۳۱ کروڑ آبادی میں ۴۹ فیصدی کنوارے ہیں اور ۴۶ فیصدی شادی شدہ اور ۵ فیصدی رنڈوے ہیں،
عورتوں میں ۳۴ فیصدی کنواری ۴۸ فیصدی شادی شدہ اور ۱۸ فیصدی بیوہ ہیں

تنقید کتب

انگریزوں نے پنجاب کسطرح لیا

اس کتاب میں وہ تمام واقعات وحالات بشرح وبسط کے ساتھ مندرج ہیں، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ شیر پنجاب کے بعد پنجاب میں وقوع پذیر ہوئے۔ مؤلف نے تاریخی واقعات کو روشنی میں لاکر انگریزوں کی ان حکمت عملیوں کا راز فاش کرنے کی کوشش کی ہے، جو پنجاب کو قبضے میں لانے کے لیے وقوع پذیر ہوئیں لیکن مولف نے اس کوشش میں سنجیدگی اور متانت کا دامن اپنے ہاتھ سے قطعاً چھوڑ دیا ہے۔ اور صرف تصویر کے ایک رخ کو نمایاں کرنے میں کامل سرگرمی کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک منصف مزاج شخص فوراً یہ رائے قائم کر سکتا ہے، کہ مولف موصوف قوم پرستی کی دھن میں واقعات پر ٹھنڈے دل سے تبصرہ نہیں کر سکا ہے، انشاپردازی اول تو کتاب میں بہت کم شامل ہے، کیونکہ تحریر سے پنجابی اُردو کی جھلک کافی طور پر نمایاں ہے، اور اگر کسی حد تک انشاپردازی مان بھی لی جائے تو وہ فریق کی مخالف تنقیص وسرزنش میں صرف ہوئی ہے۔ ٹائیٹل پر مہاراجہ دلیپ سنگھ کی تصویر بھی دی گئی ہے۔

اس کتاب کے مولف بھائی ٹھاکر سنگھ سود ہیں اور چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحہ پر ختم ہوئی ہے کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت ٹائیٹل پر تحریر نہیں ہے

ملنے کا پتہ، بھائی جنر سنگھ، جیون سنگھ، کتب فروش بازار ماہیوان امرتسر،

بزم اُردو

یہ نظم ونثر کا ایک جدید انتخاب ہے اسکے مرتب، احمد عارف صاحب، حیدرآبادی ہیں، آپ نے کوشش کی ہے کہ اس انتخاب میں ملک کے بہترین شعراء اور انشاپردازوں کا کلام جمع کیا جائے جو جماعت مڈل کے طلباء کے لیے مفید ثابت ہو۔ یقین ہے کہ آپ اس کوشش میں

بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

حصۂ نظم میں اکثر وہی نظمیں ہیں جو ایسے انتخاب میں شامل ہوتی رہتی ہیں مثلاً ڈولا بیٹا جانمردی کا کام، حب وطن، بے اعتدالی، وغیرہ جو مولانا حالی کی مشہور نظمیں ہیں اور اس سے پہلے کورس میں بار بار شامل کیجا چکی ہیں۔ اسیطرح جالا او گری، خواب راحت وغیرہ، جو مولوی محمد اسمعیل کے گذشتہ انتخابات میں شامل تھیں اور نیچے درجوں میں پڑھائی جاتی تھیں یہ ہم سے یہ مراد نہیں کہ اس قسم کی نظمیں اب درس میں قایم ہی نہ رکھی جائیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ترقی کیطرف نظر رکھی جائے اور شعرائے جدید کی وہ نظمیں جنکے مطالب و محاسن ان پیش کردہ نظموں کے دوش بدوش ہوں۔ داخل نصاب کیا ئیں۔ اس سے ایک طرف تو طلبا کے معلومات میں نیا اضافہ ہوتا رہے گا، اور دوسری طرف ملک میں اچھی نظمیں لکھنے کی تحریک ہوگی۔ مرتب حضرات کو اسبات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جو نظمیں نیچی جماعت کے کورسوں میں انتخاب کی جا چکی ہیں انھیں اونچے درجے کے نصاب تعلیم میں نہ شامل کریں کیونکہ ترقی میں تنزل اور بلندی میں پستی کا رنگ ہرگز پسندیدہ نہیں ہوتا

ادبیات اردو میں، غزلیات، رباعیات کا درجہ اتنا پست نہیں کہ انھیں انتخاب میں نہ شامل کیا جائے طلبا کو ادب اردو کے ہر صنف سے آگاہ کرنا چاہیے۔ ورنہ معلومات کی تکمیل نہیں ہوسکتی،

بہر صورت یہ انتخاب مفید اور دلچسپ ہے اور اس سے مولف کی دماغ سوزی اور قابلیت کا پتہ چلتا ہے،

کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت دیدہ زیب قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ، حکیم احمد عارف حیدرآبادی، گنبد گوشہ محل، حیدرآباد دکن۔

آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں

(۱)

وہ دیکھ کہ موجیں رقص کناں، ہیں سطح زمیں پر گنگا کی
نوزادۂ آریہ حیرت میں، ہیں دیکھ کے شان اس دریا کی
گنگوتری سے آتی ہے چلی، اٹھکیلیاں کرتی دھار اُس کی
آزادی ہے تیور سے عیاں، متوالی ہے رفتار اُس کی

(۲)

اُتر کی طرف جب اُٹھتی ہے، اِس قافلۂ مغرب کی نظر
پڑتی ہوئی کرنیں سورج کی، ہیں دیکھتے برف کے تودوں پر
پر قلۂ کوہ ہمالہ پر، عظمت کے ہیں بادل چھائے ہوئے
سینوں کو ہیں تانے دیو کھڑے، ابر سے سروں کو ملائے ہوئے

(۳)

برگد کے درختوں کے جنگل، پھیلے ہیں پہاڑ کے دامن میں
شاخیں ہیں جو اُنکی سایہ فگن، ظلمت کا سماں ہے ہر بن میں
پھرتے ہیں وہ ہاتھی مست یہاں، ہو دیو کا جنکے قد پہ گماں
یہ کالی گھٹا جب دوڑتی ہے، آتا ہے نظر ہیبت کا سماں

(۴)

ہیں رنگ برنگ کے پھول کھلے، زینت ہے چمن کی شباب ان کا
کھولا ہے نسیم سحر نے ابھی، کس شان سے بندِ نقاب ان کا

آ گئے ہین مسافر ہند مین جو، خیبر کے درون سے اُتر کے ابھی
دیکھے تھے اُنھون نے یہ لالہ و گل، پامیر کی وادی مین نہ کبھی

(۵)

طائر بھی یہان پیدا ہین کئے، قدرت نے عجیب گلرنگ و حسین
گر زمزمے اُن کے رنگین ہین، یاد آئے اُنھین فردوس بریں
اندر کے اکھاڑے کی پریان، گاتی ہین جو دلکش راگنیان
یا بیچ سُرون مین اُن کے نہین، یہ سوز گلون مین اُن کے کہان

(۶)

سورج کی چمکتی ہوئی کرنین، ہین چھیڑتی ٹھنڈی ہواؤن کو
بھر دیتی ہین نور و حرارت سے، باغونکو اور اُن کی فضاؤن کو
سوتی ہوئی سوتین چشمونکی، اُٹھتی ہین سب آنکھین مل مل کر
دھارین ہین جو برف کے پانی کی، آتی ہین پہاڑون سے چل کر

(۷)

اے آریو! آؤ قدم رکھو، ان حُسن بھرے گلزارون مین
جنت کے مزے لوٹو گے سدا، اس پاک زمین کی بہارون مین
تم گنگ و جمن کے کنارون پر، شہر اپنے نئے آباد کرو،
گا گا کے بھجن، کرکر کے ہون، ہو جاؤ مگن، دل شاد کرو،

وحید الدین سلیم پانی پتی

”مان“

کی یاد مین پیسر بیٹے کے ذاتی جذبات

یہ تمنا تھی مری، دنیا مین اے پروردگار اپنی مان کی قبر کا ہوتا مجاور کاش مین
اسطرح اک ذاتِ اقدس کا تو ہوتا سوگوار یونہی اکثر کہتا ہون سینہ مین دل پاش پاش تھا

بیٹھکر آنسو بہاتا ۔ اپنی مان کی قبر پر جب فورِ غم سے دل بیتاب ہو جاتا بہت
دل پھر مجبور کر سکتے نہ مجھکو صبر پہ ایسی حقیقتو ن کا سدِ باب ہو جاتا بہت

یون نہ ہرگز ضائع ہو سکتے مرے قطرات اشک سینچتا اُن سے ہمیشہ سبزۂ تربت کو مین
پھر نہ اپنی قدر کھو سکتے ، مرے قطرات اشک دونون عالم سے سمجھتا بڑھکے اس کو قیمت مین

گو جوانی مین مری آثارِ پیری آ گئے عہدِ طفلی کی مگر اب بھی ادا موجود ہے
سب اگرچہ سازِ ہستی کو مرے ٹھکرا گئے اب بھی لیکن اسمین اک دلکش صدا موجود ہے

آہ، وہ دلکش صدا وہ پاک نغمہ ہے یہی پیارا بیٹا اپنی مان کا مین ہر اک حالت مین ہون
کوئی دنیا مین ذرا مجھکو سنائے تو سہی مین بہت محفوظ مان کے دامنِ شفقت مین ہون

آہ لیکن کسقدر ہے یہ حقیقت دلخراش مین ہون زندہ اور زندہ میری پیاری مان نہین
دل ہے ٹکڑے ٹکڑے میرا اور جگر ہے پاش پاش گرچہ مین بچہ نہین کمسن نہین نادان نہین

یک زمانہ ہو چکا ہے، ایک مدت ہو چکی — اپنی ماں سے دور میں ہوں اور مجھ سے دور وطن
زندگی میں سمجھتا ہوں نہایت ہو چکی — اب مجھے ملجائیگی ارشد مری مہجور ماں

میرا مالک دیگا جنت میں وہی جنت مجھے
یعنی حاصل ہوگا، ماں کا دامن شفقت مجھے

ارشد تھانوی

جذبات فطرت

از محمد مبین نازش بدایونی

یہ کرشن کا مقدر رکھتے برج میں جوانی — نئی جب ہو گوپیوں کی رہے ہر گھڑی سہانی
کہیں مور کوکتے ہیں کہیں جھومتے ہیں بادل — کہیں بلبلوں کا اٹھنا کہیں لہر کی روانی
سنی پی کہاں کسی نے تو بندھا نیا تصور — کہ ابھر کے دل میں چوٹیں بنیں دشمن جوانی
جو صدائیں بانسری کی گئیں مہ وشوں کے گھر تک — چلیں تا سی بن کی جانب یہی سب نے جی میں ٹھانی
وہ نگاہ شوخ جس پر ہوں نثار اہل گوکل — وہ رسیلی آنکھ جس میں ہو شراب ارغوانی
اٹھی برج سے گھٹا جب قدم اس طرح بڑھا لے — یہ پکار اٹھی جمنا کہ گلے لگے ہے پانی
کبھی آنکھ کے اشارے کبھی پٹ سے بند کرنا — کبھی دل ستان ادائیں کبھی چھیڑ کچھ زبانی
وہ کنول سے پاؤں پوجے تو گگن میں ہو برہمن — بنے پھول نیلوفر کا اسی پانوں کی نشانی
گری موتیوں کی مالا تو چمک اٹھے ستارے — نظر آ گیا زمیں پر ہمیں دور آسمانی

ہوئیں برق خرمن دیں وہ ستم نما نگاہیں
نہ حجاب کی سنی کچھ نہ حیا کی بات مانی

سہرا

بتقریب شادی بابو سری نراین نگم بی اے سلمہٗ

(۱)

۳ر جون کو اڈیٹر زمانہ کے فرزند اکبر سری نراین نگم بی۔ اے۔ کی شادی ہوئی، باپ کے لیے بیٹے کے سہرے کی تقریب ایک مسرت انگیز تقریب ہوتی ہے۔ خصوصاً ہندوستان مین (جہان لڑکون کی شادی کرنا بھی والدین کے فرائض مین داخل ہے)

احباب اور اعزا اس خوشی مین خلوص دل سے شریک ہوئے، بعض سخنور احباب نے سہرے کے پیرائے مین اپنی دلی مسرت کا اظہار فرمایا، اس اشاعت مین دلی شکریہ کے ساتھ جناب احسن شمسی (ناظم حلقۂ ادبیہ و انجمن حمایت اُردو) جناب اعظمی، اور جناب نازش بدایونی کے بلند پایہ سہرے درج زمانہ کیے جاتے ہین یہ جواہر ریزے اُردو کے خزانۂ عامرہ مین ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہین۔

ایڈیٹر

دیا نراین کو ہو مبارک الٰہی نورِ نظر کا سہرا
اب اس سے بڑھکر بھی کیا خوشی ہے کہ باپ دیکھے پسر کا سہرا

جلال نوشاہ کا یہ عالم نظر نہ لگ جائے یا الٰہی
کہ رُخ پہ گلہائے تر کا سہرا ہے اُسپہ تارِ نظر کا سہرا

جو تابش روئے آتشین سے پسینہ ٹپکا کبھی جبین سے
تو غنچے سہرے کے مسکرائے کہ اب بنیگا گُہر کا سہرا

بنے ہین نوشہ سری نراین ہمیشہ پھولین پھلین وہ یارب
بندھا ہو جاہ و حشم کا کنگنا ہو سر پہ علم و ہنر کا سہرا

کہان یہ جوشِ بہار رنگین، وہ کہکشان ہوکہ عقد پروین
فلک ابھی سب کو بھول جائے جو دیکھے تیرے سر کا سہرا

پتا بتا دین ہوا کے جھونکے کدھر کو ہے بارگاہِ نوشہ
اندھیری شب مین غریب شبنم چلی ہے لیکر گُہر کا سہرا

جمال نوشاہ پر ہین صدقے ستارے بھی دیپنڈن بھی — نثار سہرے کی ہر لڑی پر شعاع نور قمر کا سہرا
ہوئی ہے صبح نشاط ظاہر ہوئی ہین زلف کی کستاری — کہ لائی ہین بہر رونمائی بناکے نور سحر کا سہرا

کہلائے کیسے گل مضامین غضب ہوا حسن کی طبع رنگین
کلام ایسا کلام شیرین اکہ اس کے حسن ہے شکر کا سہرا

احسن شمسی

(۲)

زبان ہو تو ہو نوشہ کا مدح خوان سہرا — ہے دم بخود اسی حسرت سے بے زبان سہرا
بنا ہے جلوت و خلوت کا راز دان سہرا — جہان جہان مرا نوشاہ ہے وہان سہرا
سُنا رہا ہے مسرت کی داستان سہرا — زبان حال سے ہے میرا ہمزبان سہرا
یہ بزم عیش مبارک مری نراین کو — خدا کرے کہ ہو اقبال کا نشان سہرا
جو سر کے گرد رہا تو بنا وہ ہالۂ ماہ — جو کھل پڑا تو ہوا رشک کہکشان سہرا
خوشی کے پھول برستے ہین ہر طرف سر بزم — عجب بہار سے ہے آج گلفشان سہرا
بھرے ہین شوق تمنا کے پھول دامن مین — چھپا کے لایا ہے محفل مین گلستان سہرا
ستارے گوندھ کے تار شہاب ثاقب مین — بنائیگا مرے نوشہ کا آسمان سہرا
نگاہ شوق سے نور جمال چھپ نہ سکا — نقاب بنکے ہوا لاکھ درمیان سہرا
فروغ پرتو رخ سے ہے آسمان پہ دماغ — سپہر حسن کا گویا ہے کہکشان سہرا
نظر نواز نہوتا جو جلوۂ نوشاہ — تو پھر کہان نگہ شوق اور کہان سہرا

عجیب رنگ سے لے اعظمی پئے نوشاہ
بناکے لائی مری طبع نکتہ دان سہرا

اعظمی

جناب ... کا سہرا اگلے نمبر مین ہدیہ ناظرین کیا جاوے گا

بزم سخن

امسال آل انڈیا کایستھ کانفرنس کا اجلاس گورکھپور مین ہوا تھا، اسی سلسلے مین ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوئی تھی
ہمارے پاس مشاعرہ کی غزلین اشاعت کیلئے ارسال کی ہین ہم ناظرین کی تفریح طبع کیلئے غزلونکا انتخاب پیش کرتے ہین

جناب جگر مرادآبادی

کیسے سجودِ ظاہری کعبۂ امتیاز مین — دونون جہان کو محو کر عشق کی پاک نماز مین
دی نظر کو دے فروغ، عالم سوز ساز مین — لاکھ نشاط روح ہے، عشق کے اک گداز مین
توڑ کے سب قیودِ عشق چل دلِ مدعا طلب — با لبِ خشک و آہ سرد اُن کی حریم ناز مین
جلد سکون و عیش سے ہات اُٹھا کے جگر — تیری بقا کا راز ہے، سوزشِ جانگداز مین
اسکی خلاف مصلحت ٹوٹ نہ جائے یہ نظام — عشق کو بے ضرر بنا، عالم امتیاز مین
حسن کمال عشق کا کوئی کمال رہ نہ جائے — ناز کا اک سبق بھی لے درسگہ نیاز مین
مشرق عزم سے کر طلوع ایک وہ آفتاب حسن — ڈوب سکے نہ جو کبھی، مغرب امتیاز مین
اصل سے ہو کے بے خبر ڈھونڈھ نہ اے دلِ حزین — عیشِ دوام عافیت غمکدۂ مجاز مین
یہ جو ہے ایک لذتِ بیخودی فنائے عشق — اب تو اسے بھی دفن کر مشہدِ امتیاز مین

دونون جہان مین دو قدم، اول و آخر ہوں
انکو اُٹھا، تو ہو ابھی خاص حریم ناز مین

دیگر

ہو کے فنائے ذاتِ حق دل مرا سوز ساز مین — مرکزِ اصل بنگیا، دائرہ مجاز مین
دونون جہان سے تھے غرق و محو جسکی نگاہ ناز مین — ایسا ہی اک بت ملا، بتکدۂ مجاز مین
اصل مین جلوہ گر کبھی، غرق کبھی مجاز مین — مین بھی عجیب راز ہون، عالم امتیاز مین

ہم کہ ہیں ظاہرانِ حق، ڈھونڈھتے ہیں جھکے رہی
میں بھی عجیب راز ہوں، عالمِ امتیاز میں

نقشے وہ سارے عشق کے بن گئے نورِ معرفت
کھیل رہے تھے جو ابھی دامنِ امتیاز میں

اب نہ وہ سعیِ مضطرب، اب نہ وہ کاوشِ عمل
ڈوب گئے تمام حسن، نقش بیانہ ساز میں

غیر جو تلخکام ہے اسکے نصیب کی کمی،
مجھکو تو اک مزا ملا، ہر غمِ جاں گداز میں

ایک نگاہِ باطنی جو ہے امیدگاہِ عشق،
یہ بھی کہیں اُلجھ نہ جائے، دائرۂ مجاز میں

دیدۂ بوالہوس تھی، خود وہ نہاں کیے ہوئے
جلوۂ رنگ رنگ کو پردۂ راز راز میں

لرزش متصل میں اب لطف سماع وہ کہاں
لذتِ نغمہ اپنی تھی جیسی سکوت ساز میں

پھیلے پڑے ہیں جسقدر حسن کے جلوۂ لطیف
جی میں ہے سب سمیٹ لوں دامنِ امتیاز میں

بنگئے وہ آفتابِ حسن آج ہے پیشِ چشمِ شوق
داغ سا اک جو تھا کبھی، ناصیۂ نیاز میں

وحدتِ خاص عشق میں، ذکر ہی غیریت کا کیا،
اپنے ہی جلوے دیکھئے اپنی ہی بزمِ ناز میں

اشک اگر نہیں تو کر صرف تمام خونِ دل
چاہیئے اک نیا وضو عشق کی ہر نماز میں

جسم کی سب کثافتیں روح کی سب لطافتیں
پاک ہر ایک چیز ہے، دیدۂ پاکباز میں

کام نہ آئیں عقل کی عقدہ کشائیاں جگر
اور اضافہ ہو گیا سلسلۂ راز راز میں

منشی جگت موہن لعل صاحب رواں

جلوے تھے جتنے مضطرب ان کی حریمِ ناز میں
عقل نے جذب کر لیے ناصیۂ نیاز میں

عالمِ محویت ہے یہ شدتِ سوز و ساز میں
ترکِ نماز ہے نہاں میری، ہر اک نماز میں

سنگ زمیں کعبہ خود بڑھکے جبیں کو بوسہ دے
ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیۂ نیاز میں

کاش عطا ہو پھر وہی، نور نشاطِ بیخودی
قلب سیاہ ہو گیا، کاوشِ امتیاز میں

حال کھلے تو کسطرح یار کی بزمِ ناز کا،
جو ہے یہاں وہ مست ہے اپنے ہی سوز و ساز میں

بادہ کشانِ ذوق کے صعف حواس پر نہ جا
نعمتِ بیخودی بھی ہے، میکدۂ مجاز میں

ناخنِ امتیاز کی عقدہ کشائیاں کجا،
آپ میں راز بن گیا سعیِ کشودِ راز میں

نقدِ نیازِ غزنوی وجہ قبول ہو گیا،
تاجِ شہی تھا پائمال، بارگہِ ایاز میں

وہ ہیں بہ رُخِ آرزو، رقص میں ذرہ ہائے دل　　اُف یہ کسی سے کیا کہا، فاش زبانِ راز میں
لاتے ہیں چند لخت دل نذرِ نیاز کو دوا ن　　دیکھیں اگر قبول ہو خدمت بے نیاز میں

جناب فرحت کانپوری

عشق کا مرتبہ تو دیکھ حُسن کی بزمِ ناز میں　　خاک نشین ہے غزنوی، بارگہِ ایاز میں
مطربِ غم ہے نغمہ زن، بیہودہ سوزِ نوا ہے　　نغمۂ غم ہے مستتر، نالۂ دل گداز میں
آ تو پھر اسطرح سے آ، دوست کی بزمِ ناز میں　　سر کی بھی کچھ خبر نہو، سجدۂ بے نیاز میں
دیکھ کے آستانِ دوست عقل کے ہوش اُڑ گئے　　دل کہاں تو اس کا حُسن کی بزمِ ناز میں
واہ رے شانِ اضطراب، دیتے ہیں ہو کوئی حسین　　جلوے تڑپ رہے ہیں آج، دامنِ سوز ساز میں
سُن کے مری شکایتیں، ناز سے مسکرا دیئے　　چھپ گئیں سب کدورتیں، خندۂ غدر ساز میں
یار کا پاسِ ناز تھا، سب اسیرِ بستر تھا　　سوز محبت ساز تھا، جلوہ گہِ نماز میں
کون ہے مریضِ غم، اوہ کیا نہیں زندگی کی آس　　اشک اُمنڈ رہے ہیں آج دیدۂ چارہ ساز میں
فرحت آرزو پسند، ہوش میں آ خودی کو چھوڑ　　دیکھ یہ کس کا عکس ہے، آئینۂ مجاز میں

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

دل ہے حقیقت آشنا جلوہ گہِ مجاز میں　　حسن ازل ہے مستتر عشق کے سوز ساز میں
خواہش علم ہے فضول حرف غلط ہے آشنا　　ایک طلسم راز ہے ہستی کارساز میں
اس میں نہاں ہیں دیکھ لے میری جبیں کے راز　　سجدے کے جو نشان ہیں ناصیۂ نیاز میں
تری سمجھ سے ہے بلند ہستی راز کائنات　　عقل یہ کر رہی جبر تو کوشش امتیاز میں
موت اب اختصار کر کشمکش حیات کو　　اس کا رنگ ہے عیاں کوشش چارہ ساز میں

جناب ہادی مدراسی (ویلوری)

دل کو ملا رہا ہوں خاک رہ نیاز میں　　کیونکہ ہے جب دل پسند اُن کی حریم ناز میں
راحت دلنواز ہے ناز جگر گداز میں　　یعنی وفا کی شان ہے حسن جفا طراز میں
اُٹھنے لگا حجاب راز کھلنے لگیں حقیقتیں　　آئینہ بن رہا ہے دل جلوہ گہِ مجاز میں
پھر کوئی یاد آ گیا بڑھ گیا اضطراب شوق　　درد نے روح پھونک دی نالۂ دل گداز میں

عشق کی بیخودی نہ پوچھ ہماری دعا کہ یہاں ... پہلے یہ بیخودی نہ تھی تو بت امتیاز میں
اک بت خود نما تو ہے کعبہ نشین منظم سہی ... ہے کوئی نازنین ضرور دل کی حریم ناز میں
شمع نہ ساتھ دے سکی ایسی جلی کہ بجھ گئی ... آگیا رنگ بیکسی میری شب دراز میں
سرخوش کیف غم ہو یہیں نشۂ عشق ہے یہی ... کھیل رہی ہیں مستیاں دامن خود ساز میں
آ دی اضطراب کو ش پھر کوئی آہ دلگداز ... آگئی کیوں فسردگی ہمت سرفراز میں

جناب وآرث مارہروی

ذوق نظر سے کام لے جلوہ گہ مجاز میں ... دیکھنے والے شک نہ کر ہستی کارساز میں
سر ہی جھکا تو کچھ نہیں دل بھی جھکے نماز میں ... ناز کا نام بھی نہ ہو سجدۂ بے نیاز میں
دور شراب غم سہی مستی عیش ہو نہ ہو ... کچھ تو سرور خاص ہو غمکدۂ مجاز میں
کیا یہی نور سرمدی رونق بزم طور تھا ... کوئی مجھے ہی دیکھلے جلوہ گہ مجاز میں

جناب ذکی کچھوچھوی

رنگ یہ بھر رہا ہوں میں نالۂ دلگداز میں ... خون جگر پسند ہے انکی حریم ناز میں
دیکھ اُدھر نگاہ شوق جان چلے کہ دل چلے ... کھیل رہی ہیں بجلیاں ان کی نگاہ ناز میں
آنکھ سے منتظر تری بزم حقیقت الست ... لے اکہ ہے تو بیخودی جلوہ گہ مجاز میں

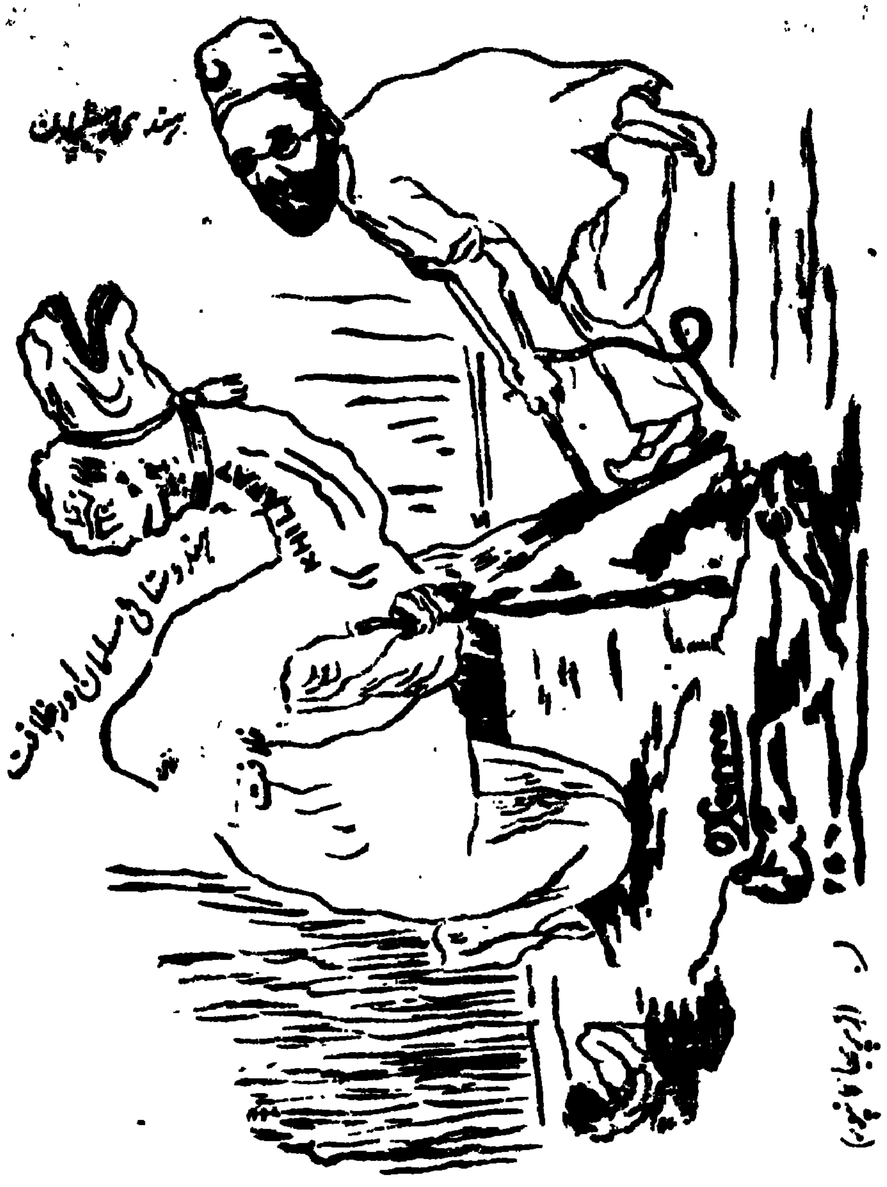
آج یہ راز کھل گیا عشق ہے لا دوا مرض
ورنہ ذکی کمی نہ تھی کوشش چارہ ساز میں

شیو شنکر لعل صاحب نجم آبرو والی

پیک اجل کہاں ہے تو تیز کر اپنی چال کو ... کوئی ہے منتظر ترا رہگذر نیاز میں

سید علی اوسط صاحب اشک فتحپوری

چشم کرم فضول ہے خواہش مدعا غلط ... لطف کا شائبہ [illegible] طبع ستم نواز میں
واہ رے بیخودی عشق سجدے سے سر نہ اٹھ سکا ... کس کا خیال آگیا آج جبین نیاز میں



ترکی نے خلافت کو بے دست و پا کر دیا ہے۔ مگر ہمارے مسلم ہموطن ابھی
اسکو اپنے زور سے قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

فہرست مضامین رسالۂ زمانہ

جلد چہل و ہشت

از جولائی تا دسمبر ۱۹۲۳ء

تصاویر — (۱) نوگرفتار قفس (۲) ایک ڈراونا منظر (۳) خود آرائی ـ

جاں صاب

گو شاعر میر باسط علی صاحب جا
مرزا سلیمان جاہ صاحب
بیانی اور ٹکسالی زبان کو
تو دیکھنا ہو تو کلیات
پڑھئیے اور لطف اٹھائیے
کی نہایت ضرورت ہے
ہوتے ہوئے قیمت فی جلد

داری کے وقت غمگین
ا ایک کتاب ہے دیکھ لیں۔
ا محمد علی صاحب
ماحب بی۔اے قیمت ۶
کلام اکبر الہ آبادی ۳
ا صاحب شوق کی تصانیف۔
فی جلد ۴ر
" ۳ر
" ۵ر
" ۲ر
" ۱۴ر

صبح سادق
سدھا سدھو

بالا نوپان کی دوا

یہ ایک خوش ذائقہ اور خوشبودار دوا ہے ... کرنے سے کھانسی، ہیضہ، درد، شول ... اپھارہ، پیٹ کا درد، بچوں کے ہرے پیلے دست وغیرہ امراض کو شرطیہ فائدہ ہوتا ہے۔
قیمت ۸ر ڈاک خرچ ایک سے دو شیشی تک

دورنج کیسری

داد کی دوا

بلا جلن اور تکلیف کے داد کو ... کرنے والی صرف یہی ایک دوا ہے قیمت فی شیشی ... ڈاک خرچ ایک سے دو تک ۵ر
۱۲ شیشی لینے سے ... روپیہ دیتے ہیں

بال سدھا

... مرض ... تندرست ہونا ہو تو اس میٹھی دوا کو ... اسکو خوشی سے پیتے ہیں ... کا حال معلوم کرنے کے لیے ... فہرست ...

چھکر سنہار کی ...





فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار اور طحال کیلئے ایک دوا

آجکل سینکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپنے دیکھے ہونگے مگر انمین عموما کونین پڑی رہتی ہے اس لیئے یہ دوا ئین بخار کو کچھ وقت تک روک دیتی ہین مگر جلسے آرام نہین کر سکتی ہین۔ ایسے بخار کے لیئے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز مین ایکدم آرام کرنے کا دعوی رکھتی ہے اور عوام کے فایدہ کو مد نظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے اسمین تین خاص صفتین ہین۔ (۱) یہ ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے اسلیئے بخار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہوجاتا ہے۔ (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے اور مزاجون کو درست کرتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلان عمر شیشی خورد ۱۰ ار محصول ڈاک شیشی کلان ۸ ر

پرانے ملیریا بخار کی گولیان

پرانہ بخار ہوجانے پر جلدی سے نہ اگر دن رات تھوڑا بہت چڑھا رہتا ہے جسم کا خون پانی سا ہوجاتا ہے اور رنگ پھیکا میلا ہوجاتا ہے اور محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ بھاری آتا ہے کبھی منھ اور ہاتھ پیرون مین ورم آجاتا ہے اور زندگی وبال ہوجاتی ہے ایسی حالت مین یہ گولیان فایدہ کرتی ہین اور چار پانچ ہی خوراک مین بخار کا آنا بند ہوجاتا ہے۔ قیمت ۲۵ گولیون کی ڈبیہ ۱۰ ار محصول دو ڈبیہ تک ۶ ر

کونین کی گولیان

یہ کونین کی خوبصورت چھوٹی چھوٹی ٹکیان کل مین بنی ہین اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ مین ہوتی ہین کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیان اپنے پاس رکھئے اسمین نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے مین تلخ ہے قیمت ۲۵ گولیون کی ڈبیہ عہ محصول ڈاک ۲ ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ دیہاوین اینڈ سنز گھاٹ گنج ...

رجسٹرڈ نمبر ا ۔ ۲۲

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی اے۔

جلد ۴۳ | جولائی ۱۹۲۴ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

تصویر۔ بار بہادر روپ جی (رنگین)

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

مقبول ڈیزائن

زمانہ

جلد ۴۳ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء نمبر ۱

موجودہ مسائل پر ایک سرسری نظر

مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد سے ہندوستان کی پالیٹکس نے جو صورت اختیار کر رکھی ہے اسپر غور کر کے کون شخص بغیر آنسو بہائے رہ سکتا ہے۔ کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی نے جو بظاہر سول نافرمانی کو کامیاب بنانیکے ذرائع تجویز کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی ایک ایسا گل کھلایا کہ قومی یکجہتی نا اتفاقی مین اور قومی کام زبانی شعبدون مین مبدل ہو گیا۔ لیڈران قوم داخلہ کونسل کے مسئلہ کی تائید و تردید مین اپنی تمام دماغی و جسمانی قوتین صرف کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۲۲ء کے آخری چند ماہ اس بحث و مباحثہ مین گذرے۔ لیڈران قوم مضبوط سے مضبوط دلائل سوچنے مین مصروف تھے۔ عوام کو بھی اس معاملہ مین ایک عجیب دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اخبارون مین ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اسی مسئلہ کے متعلق مضامین پڑھے جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء کی گیا کانگریس کے بعد ہی سوراج پارٹی کے قائم ہونے کا اعلان قدیم طرز کے نان کوآپریٹرون کیلیے ایک زبردست چیلنج تھا۔ اور ثبوت تھا اس امر کا کہ اہل ملک عام طور پر اُن قربانیون کے لیے طیار نہین ہین جنکو مہاتما گاندھی نے سوراج حاصل کرنے کی کوئی تراردیا ہے۔ گو مہاتما گاندھی کی تعلیم

کا اثر، اس وجہ عوام الناس کے دلون مین گھر کر گیا تھا کہ انکے اصولون کے خلاف کوئی خیال پیدا ہونا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سی۔ آر۔ داس۔ پنڈت موتی لعل نہرو اور حکیم اجمل خان کی پُر زور کوششون کے باوجود گیا کانگریس نے داخلہ کونسل کے خلاف فرمان جاری رکھا۔ لیکن مہاتماجی اسوقت قیدخانہ کے گوشہ تنہائی مین سوراج کے لیے ریاضت کر رہے تھے۔ انکی شخصیت کا مقناطیسی اثر اب اہل وطن کے دلون کو ہلا نہ سکتا تھا۔ مہاتماجی اور اہل وطن کے درمیان پردہ جیل کی دیوار حائل تھی۔ مسٹر راج گوپال آچاری کو ابھی اہل ہند کے دلون پر اسقدر قبضہ حاصل نہ ہوا تھا کہ وہ داس اور نہرو کی کونسلون کے ذریعہ سوراج حاصل کرنے والی نو ایجاد سکیم کے مقابلہ مین چرخہ کو مفید تر ثابت کر دکھاتے۔

نان کوآپریشن کے عملی طریقون سے لوگ ایک حد تک عاجز بھی ہو چکے تھے۔ روزمرہ کی ہڑتالون نے ناک مین دم کر رکھا تھا۔ متواتر سوراج دینے والے وعدون اور انکی عدم ایفا نے بھی دلون مین شکوک پیدا کر دیئے تھے۔ چنانچہ عام طور پر یہ خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ سوراج کی معراج پر پہونچنے کے لیئے کوئی دوسری سیڑھی بہم پہونچانا چاہیئے۔ سوراج پارٹی نے ایک ایسی سیڑھی بہم پہونچانیکا وعدہ کیا جسمین پریشانی کم ہو اور نفع زیادہ۔ لہذا اسکی آمد آمد مین خوش آمدید کی صدائین بلند ہونے لگین۔ سوراج پارٹی مین وہ عناصر کثرت سے موجود تھے جو موجودہ واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے کسی پولیٹکل جماعت کو عوام مین مقبول بنانے کے لیے ضروری ہوتے ہین۔ اسنے خدمت قومی کو بہت زیادہ آسان بنا دیا۔ محض شور و غل مچانیوالے لوگ جنکو ملکی بہبودی سے درحقیقت کوئی تعلق بھی نہ تھا سچے فدایان وطن کے مقابلہ مین زیادہ تر عزت و احترام کے قابل ہو گئے۔ وہ لوگ جنھون نے اپنے قیمتی ولایتی کپڑون مین آگ لگا کر کھدر زیب تن کیا تھا پیچھے پڑ گئے اور اب قومی فوج کے سپہ سالار اور افسر وہ لوگ ہین جنکے قبضہ مین ووٹرون کی کثرت ہو۔ موسم گرما مین موٹے کھدر کی پوشاک سے تکلیف کیون اُٹھائین۔ سوراج پارٹی مین شامل ہو کر باریک سے باریک ولایتی تنزیب پہنین انگریزی ہوٹلون مین دعوتین بھی کھائین اور ملکی لیڈر بھی کہلائین۔ جو عملی پروگرام مہاتما گاندھی نے ملک کے سامنے پیش کر رکھا تھا اسمین کوئی دلچسپی کا سامان نہ تھا۔ چرخہ چلانا اور باریک

سے باریک سوت کاتنا کوئی خارجی کا گھر تو تھا نہیں - اسمین صبر و مشقت کا امتحان تھا یہ ایسی قومی خدمت نہ تھی کہ جسمین مرحبا اور آفرین کی صدائین بلند ہوتین، خواہ تعریفی مضامین اخبارون اور رسالون مین چھپتے۔ قومی خدمت کی یہ ایک کسوٹی تھی جس سے نان کو اپریشن کے ظاہر و باطن مین تمیز ہونے لگی تھی - چنانچہ نان کو آپریٹرون کی ایک کثیر التعداد جماعت اس کشمکش مین تھی کہ کسطرح چرخہ کی مصیبت سے چھٹکارا نصیب ہو اور اسی کے ساتھ بات بھی قائم رہے - سوراج پارٹی نے اس مسئلہ کو آسانی کیساتھ حل کر دیا - چرخہ اور جیل سے رہائی ہوئی اور لیڈری کی کرسی بھی قبضہ مین رہی -

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی !

سوراج پارٹی کی کشش نے صرف انھین نان کو آپریٹرون کو اپنی طرف نہین کھینچا جو عملی پروگرام کی مصیبتون سے عاجز تھے، بلکہ اسنے داہنے بائین - آگے پیچھے ہر چہار طرف چھاپا مارنا شروع کر دیا - ان وکلا صاحبان کے لیے جو لبرل پارٹی مین اسوجہ سے شریک نہ ہو سکتے تھے کہ پبلک کی نگاہون مین ذلیل ہونگے اور اسوجہ سے نان کو آپریٹر نہین ہو سکتے تھے کہ وکالت چھوڑنے مین نقصان تھا اور کھدر پہننا ناقابل برداشت سوراج پارٹی انکے لیے لیڈران ملک کی فہرست مین داخل ہونے کا آسان ذریعہ ثابت ہوئی - کونسل الکشن کے لیے نام دینا ہی شہرت کا ایک ذریعہ تھا - نہ کہ جب سوراجسٹ بنکر کامیابی یقینی ہو، پس سوراج پارٹی مین لوگ کثرت سے شریک ہونے لگے - حتیٰ کہ مئی ۱۹۲۳ء مین اس روز افزون سیلاب نے وہ ہولناک شکل اختیار کر لی کہ کونسل بائیکاٹ کی کشتی ڈگمگاتی ہوئی نظر آنے لگی - اب خیال پیدا ہونے لگا کہ مقابلہ کی صورت مین داخلہ کونسل کے مخالفین کو شکست نصیب ہوگی - اگست ۱۹۲۳ء مین مولینا محمد علی کی رہائی نے نان کو آپریٹرون کو کسیقدر ڈھارس کا کام دیا تھا لیکن اس امڈے ہوئے طوفان کے سامنے مولانا صاحب کے قدم بھی اکھڑ گئے - دہلی کے خاص اجلاس کانگریس مین آپ نے باواز بلند یہ اعلان کیا کہ انکو یرودا جیل سے مہاتما جی کا ایک بے تار پیغام موصول ہوا ہے، کہ کانگریس کو داخلہ کونسل کا مسئلہ پاس کرنا چاہیے - گو یہ محض زبان کی صنعت تھی،

جسکو مولانا صاحب نے فن تقریر مین اس خوبی سے استعمال کیا کہ مخالفین کی زبان بند ہو گئی۔ گر یہ ظاہر ہے کہ مہاتما گاندھی کی ذات پر جو بھروسہ اہل قوم کو تھا اس کا بیجا استعمال اس تجویز کے پاس کرانے مین کیا گیا۔ یہ خیال کر کے کہ مہاتما گاندھی داخلہ کونسل کو اب پسند کرتے ہین۔ کانگریس مین کون شخص اس مسئلہ کے خلاف آواز بلند کر سکتا تھا۔

بالآخر کانگریس نے کونسل کے دلدادہ لوگون کو اجازت دیدی کہ کونسلون مین جا کر ان کی بیخ کنی کرین کانگریس اور مہاتما گاندھی کے نام پر جو کامیابی سوراج پارٹی نے الکشن مین حاصل کی وہ کسی سے پوشیدہ نہین ہے۔ لبرل پارٹی کے سربرآوردہ لیڈرون نے الیکشن کے میدان مین شکست کھائی۔ کانگریس سے لبرل پارٹی بالارادہ کنارہ کش ہوئی تھی مگر کونسلون سے انکو ایک اڑنچہ لڑا کر مجبوراً علیحدہ ہونا پڑا۔ اور جدید روش کے محبان وطن زہر آلود شربت کونسل کی تلخی سے مسرور ہونے لگے۔

اپنے الکشن سے ان صاحبان نے یہ عہد و پیمان کیا تھا کہ بہر صورت اور ہر حالت مین وہ حکومت کی خالص و پر زور مخالفت کرنا ہی اپنا ایمان سمجھین گے اور گورنمنٹ کو نظام حکومت مین ایک شمہ بھر بھی مدد دینا باعث نفرین سمجھتے رہین گے۔ جہان انکی کثرت ہوگی وہان عملی مخالفت کی آگ جلائین گے اور جہان قلت ہوگی وہان اپنی اپنی کرسیان چلتے ہوئے چراغون کی طرح خالی چھوڑ دین گے۔ دعوی یہ تھا کہ جبتک حکومت مطلق العنان بیوروکریسی سے عوام الناس کی طرف منتقل نہو جائیگی چھوٹی چھوٹی اصلاحون اور رعایتون کے لیے گورنمنٹ کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائین گے یہانتک کہ اگر کوئی تجویز مہاتما گاندھی کی رہائی کے لیے بھی پیش ہوگی تو اسکی تائید بھی مجوزہ پروگرام کے لحاظ سے نہ کرینگے، اس دلچسپ پروگرام کا تماشہ ہم دیکھ چکے۔ اور سوراج پارٹی کے اس اعلان جنگ کا لطف بھی جی بھر کر اٹھا چکے۔ خدا جانے اس پروگرام مین قدرت نے کس حد تک تبدیلی کا مادہ بھر دیا تھا کہ متواتر گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہا۔ اور یہانتک نوبت پہونچی کہ ہر تجویز کی مخالفت کرنا تو درکنار، اب سوراجسٹ ممبران کونسل رفاہ خلایق کے لیے خود تجاویز پیش کر سکتے ہین۔ کمیٹیون مین شریک ہونا اور ہر ایک متعینہ عہدہ کا حاصل کرنا۔ غرض ان تمام طریقون پر عمل کرنا جنکے لیے لبرل پارٹی اب تک مجرم قرار دیجاتی تھی، اب سوراج پارٹی

کا حق ہے۔ صرف بجٹ البتہ منظور نہ کرین گے تاوقتیکہ طرز حکومت مین اہل ملک کی رائے کے مطابق تبدیلی نہ کیجائے۔

غرض جو خیال اہل ملک کے دلون مین پیدا ہو گیا تھا کہ سوراج پارٹی ہندوستان کے لیے ایک نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دے گی۔ باطل ثابت ہوا اور مہاتما گاندھی کا قول صادق آیا کہ کونسلون مین ایسا تازہ بہریلا مادہ موجود ہے کہ اسکے اثر سے محفوظ رہنا غیر ممکن ہے۔ سوراجسٹ پروگرام کی ست نئی تبدیلیان دیکھ کر اور یہ خیال کر کے کہ فی الحال اسکی نشو ونما کیلئے آب و ہوا بھی ناموافق ہے، یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سوراج پارٹی اپنی موجودہ حالت پر کافی عرصہ تک قائم نہین رہ سکتی۔ مگر یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ اسکا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ بجٹ کی مخالفت کو بیکار سمجھ کر اس مد کو بھی اپنے پروگرام سے حرف غلط کی طرح مٹا دین، اور لبرل پارٹی سے "من تو شدم تو من شدی"، کی گفتگو شروع کر دیجائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کونسلون کے دو ایک مزید اجلاس کا خوشگوار تجربہ حاصل کر کے کونسل چھوڑنے اور سول نافرمانی کی طیاری کرنے پر مجبور ہو جائین۔ بہرحال جبتک انکا موجودہ پروگرام ہے اس سے بظاہر کوئی فوری نتیجہ برآمد ہونے کی امید نہین معلوم ہوتی۔

لبرل پارٹی بیشک اپنے اصول پر قائم ہے۔ وہ ہمیشہ سے اصلاحات پر عمل کرنے کا راگ الاپتی رہی۔ آئینی ترقی کی ضرورت محسوس کرتی تھی لیکن اسکی ساری قوت اصلاحات کے مخالفین پر نفرین بھیجنے مین صرف ہوا کی۔ نان کوآپریشن کی اسکیم اُسکے خیال سے ملک و قوم کے لیے بیحد نقصان دہ تھی۔ پس اسکے موجد اور مصنف کو لعنت و ملامت کرنا اسکا فرض منصبی ہو گیا۔ مہاتما گاندھی کی تحریک سے قومی بیداری مین دن دونی اور رات چوگنی ترقی تو ہو گئی۔ اُسی تحریک کا نتیجہ ہے کہ اب سوراج کے منور اور مقدس چہرے کا تصور ہندوستان کے بچے بچے کے دلمین موجود ہے۔ اہل ہند سوراج کی شاہراہ پر منزلون آگے بڑھ گئے، مگر لبرل پارٹی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ وہ اب بھی اصلاحات کی دھن مین مست ہے۔ لبرل پارٹیون کی نگاہ اب بھی برطانوی پارلیمنٹ کی غربا پروری کیطرف لگی ہوئی ہے۔ وہ اُس روحانی انقلاب سے فائدہ نہین اُٹھاتے جو گذشتہ چند سال کے عرصہ مین پیدا ہو گیا ہے۔ قدم پھونک پھونک کر رکھنے

گئے وہ اسقدر عادی ہو گئے ہین کہ رہنائی بر طرف اب وہ قافلہ کیساتھ بھی نہین چل سکتے آہستہ روی نے انکو قوم سے پیچھے کر دیا۔ اب اپنے کارنامون کا ذکر انکی زبان پر کم آتا ہے۔ سوراج پارٹی کی بے اصولی پر بحث کرنا اور مہاتما گاندھی کے پروگرام کو ناقابل عمل ثابت کر دکھانا ہی لبرل پارٹی کی تفریح طبع کا ذریعہ رہگیا ہے۔

مہاتما گاندھی کی رہائی کے بعد سے اہل وطن ملکی پروگرام پر مہاتماجی کے پیغام کے لیئے بیچین تھے۔ لبرل پارٹی اپنے دستور کے موافق آنیوالے پیغام پر نکتہ چینی کے لیے طیار ہو رہی تھی غیر تبدیل شدہ نان کوآپریٹر خوش تھے کہ سوراج پارٹی کے ڈھول کا پول کھلنے والا ہی۔ سوراج پارٹی اس کشمکش مین تھی کہ اگر مہاتما گاندھی کی رائے انکے خلاف ہوئی تو قوم کو کیا منھ دکھائینگے غرض ہر ایک پارٹی اپنے اپنے اعتقاد کے لحاظ سے اپنے خیال مین مست تھی۔ مہاتما گاندھی نے جسمانی کلفت سے نجات پاکر جدید واقعات کو نظر غور سے دیکھنا شروع کیا۔ انکو آسانی سے یقین نہ آتا ہوگا کہ انکی عدم موجودگی مین داس اور نہرو جیل کے پھاٹک سے منھ موڑ کر کونسل کے عظیم الشان چیمبر مین داخل ہو گئے۔ ہندو اور مسلمان آپسمین خانہ جنگیون پر آمادہ ہین، اہل وطن خود غرضی اور بد طینتی کا شکار ہو رہے ہین۔ قومی تحریکون سے عدم اشتداد کا نور کسطرح اڑ گیا۔ اب چرخہ اپنی چرخ چون کی سریلی آواز سے محبان وطن کے دلون کو مست نہین کرتا۔ اب کھدر کا وہ وقار قائم نہین رہا جو انکے جیل جانے سے پہلے تھا۔ ضعیف الاعتقادی دلون مین گھر کر گئی ہے۔ یہ واقعات تھے جنپر ٹھنڈے دل سے مہاتماجی کو غور کرنا پڑا۔ آخر نوبت یہانتک پہونچی کہ وہ لوگ جو نان کوآپریشن کی کامیابی کیوقت مہاتماجی کے معین و مددگار تھے اور اونکی اونگلی کے اشارون پر چلتے تھے خود مہاتماجی کو سبق دینے کے لیے طیار ہو گئے اور کونسلون کے سب سے بڑے مخالف کے سامنے کونسلون کے اوصاف بیان کرنے لگے۔ سوراج پارٹی کے سرغنہ لیڈرون نے مہاتماجی کو اپنی جگہ سے ہٹنے کے لیے مجبور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ مگر مہاتماجی اپنی راسخ الاعتقادی کے اس امتحان مین اوسی طرح کامیاب ہوئے جسطرح کہ اپنی زندگی مین اکثر مرتبہ انکو اتفاق پڑ چکا تھا۔ کانفرنس کے بعد بھی اُنھون نے اپنا اعتقاد انھین اصولون پر قائم رکھا جنکی بنا پر اُنھون نے اولکی جدوجہد شروع کی تھی۔ اُنھون نے صاف

الفاظ مین اعلان کردیا کہ انمین اور سوراج پارٹی مین محض طریق عمل کا نہین بلکہ اصولی اختلاف ہے۔ انکے خیال سے کونسلون مین داخل ہوکر اہل حکومت کی مخالفت کو نان کوآپریشن کے نام سے موسوم نہین کر سکتے۔ مگر اسکے ساتھ مہاتما گاندھی سوراج پارٹی کو اپنے اعتقاد کے مطابق کام کرنیکا موقعہ دینے مین رکاوٹ نہین پیدا کرنا چاہتے، وہ بظاہر ان سے وہی کام لینا چاہتے ہین جو اتبک لبرل پارٹی کا حق وحصہ رہا ہے۔ یعنی کونسلون کے ذریعہ ملک کے لیے مفید اصلاحات کا حاصل کرنا مثلاً سودیشی کی ترقی اور محکمہ افواج کے اخراجات مین تخفیف۔ اگر معاملہ یہین پر ختم ہو جاتا تو غالباً سوراج پارٹی حرفِ شکایت بھی زبان پر لاتی مگر مہاتما گاندھی زبانی مکالمون تک قومی خدمت کو محدود نہین کرنا چاہتے۔ کانگریس سے وہ قومی آزادی کا کام لینا چاہتے ہین۔ لہذا اگر اسمین ایسی دو مختلف الاصول جماعتین شامل ہون جو اپنے آپ کو ایک دوسرے سے بہتر ثابت کرنیمین اپنی ساری قوت صرف کرین اور ایک دوسرے کا قلع قمع کرنے پر طیار ہون تو قومی کام آسانی نہین چل سکتا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے رائے ظاہر کی کہ جو لوگ کونسل بائیکاٹ ونیز چرخہ اور کھدر کے متعلق کانگریس کی پاس کردہ تجاویز پر پورے طور پر عمل پیرا نہین ہین، انکو کانگریس کی کارکن کمیٹیون سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ یہ بات سوراج پارٹی کو کب بھلی معلوم ہوسکتی تھی۔ انکو اپنی قوت کا اس حد تک احساس ہے کہ وہ پولیٹکل میدان مین مہاتما گاندھی کو بھی شکست دینے کا دعوی کرتے ہین۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے گذشتہ اجلاس مین دونون پارٹیون مین کسی حد تک زور آزمائی ہوئی، فتح وشکست کے متعلق قطعی رائے دینا تو مشکل ہے لیکن اس اجلاس کی کارروائیون نے مہاتما گاندھی کی آنکھین کھولنے مین کوئی کسر باقی نہین رکھی۔ انکی عظیم جدوجہد کا عزیز ترین جز عدم تشدد تھا۔ مگر گوپی ناتھ ساہا کے فعل پر اظہار ملامت کی تجویز کے خلاف قریب قریب نصف ممبران کانگریس کمیٹی کے ہاتھ اُٹھانے پر مہاتما گاندھی کا دل کس حد تک دُکھا ہوگا۔ اس کا کسیقدر اندازہ اس مستقل مزاج لیڈر کے آنسوؤن سے ہو سکتا ہے۔ بہرکیف مہاتما جی کی جدوجہد نے قوم کے پولیٹکل زاویہ نظر مین کتنی ہی تبدیلی کیون نہ پیدا کردی ہو، اور موجودہ طرز حکومت کے فطری نقائص اہل قوم کے دلون مین کتنا ہی گہرے طور پر نقش کیون نہ کردیئے گئے ہون، اس بات سے انکار نہین ہو سکتا

کی تھی جد وجہد میں آپ بس کامیابی کے امیدوار تھے اسکا عشر عشیر بھی تکمیل کی حد کو نہ پہونچ سکا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اپنی تحریک کو مقبول عام بنانے اور اسکو عملی جامہ پہنانے کی اب کون سی صورت اختیار کرتے ہین۔ یہ تو اُنہون نے ظاہر ہی کر دیا ہے کہ انکی رائے مین ملک کی موجودہ ضروریات تین مدون مین تقسیم ہوسکتی ہین، اول۔ کھدر کا رواج۔ دوم۔ ہندو مسلم اتحاد۔ سوم۔ اچھوتون کا سدبار۔

جہانتک کھدر کے رواج کا تعلق ہے موجودہ حالات مین آثار اُسکے خلاف نظر آتے ہین۔ سارا ملک مہاتما جی کی طرح دنیاوی عیش وعشرت سے مبرا نہین ہوسکتا۔ اور نہ اسقدر جلد اس اثر کو اپنے جامہ سے دھو سکتا ہے۔ جو اس نے مغربی تمدن سے حاصل کر رکھا ہے۔ اب مستقل طور پر وہ سادگی ہندوستانیون مین پیدا نہین ہوسکتی جسکا پیش خیمہ کھدر ہے۔ جن آنکھون مین مغربی ساخت کی مشینون کا باریک سوت بس گیا ہے ان کو چرخہ کہان تک تسلی دے سکتا ہے وہ زمانہ اب نہین آ سکتا۔ جب لوگ ایک ایک مہینہ اس انتظار مین گنتے تھے کہ ایک سال مین سوراج ملنے والا ہے چند ماہ کھدر کی تکلیف برداشت کرنے کے بعد سوراج ملنے کا یقین ہوجائے تو چرخہ کاتنے مین بھی کسیکو انکار نہین ہوسکتا۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ یہ یقین کیسے ہو جب بڑے بڑے نان کوآپریٹر اس عقیدے سے منحرف ہوگئے تو اور ون کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے،

ہندو مسلم اتحاد بھی محض ظاہری تدابیر سے تکمیل کو پہونچتا نظر نہین آتا۔ ہر دو اقوام کے نقطۂ خیال مین اسقدر اختلاف ہے کہ قومی ترقی کی شاہراہ مین دونون قومین ہم آہنگ وہمقدم ہوکر مل نہین ہوسکتین۔ ہندوؤن کا ہندوستان کے علاوہ نہ کوئی مسکن ہے اور نہ جائے پناہ ہندوستان کی خاک سے پیدا ہوگئے اور اسی خاک مین انکو ملنا ہے۔ ہندوستان ہی انکے مادری محبت کے جوش کو تازہ کرتا ہے۔ انکے حب وطن کی روشنی کی کرنین ہمالیہ کی چوٹیون سے ٹکرا کر پھر اسی سرزمین مین واپس آتی ہین اور گنگا جمنا کی لہرون مین ایک لطف تازہ پیدا کرتی ہین۔ وہ سمندر جو ہندوستان کو غیر ممالک سے جدا کرتا ہے انکی حدنگاہ ہے۔ مگر اسلام ہندوستان سے اپنا رشتۂ حقیقی نہین سمجھتا۔ اس ملک کی خاک اسکے جوش محبت کو قانع نہین کرتی ٹرکی اور قسطنطنیہ سے مسلمانون نے اپنے آپ کو اسقدر وابستہ کرلیا ہے کہ ہندوستانی مسائل

اونکے قلب مین اسقدر حرکت پیدا نہین کرتے جسقدر کہ ہندوون کے دلون مین۔ انکی محبت ہندوستان اور ترکستان کے درمیان تقسیم ہوجاتی ہے انکا دل دونون کے سود و بہبود کا طلبگار ہے۔ وہ اس کشمکش مین پریشان ہین کہ آخر کسطرف رجوع ہون۔ دنیا داری مفاد انکو سوراج کی طرف راغب کرتا ہے۔ مذہبی جوش انکو "خلافت" کیطرف کھینچتا ہے۔ انکا سوراج یہین ہے کہ جملہ امور ملکی مین انکو ہندوؤن پر ترجیح ہو۔ مہاتماجی لاکھ چاہین کہ دونون قومون کی متحدہ کوششون سے موجودہ طرز حکومت سے رہائی حاصل ہو مگر انکی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنی رہے گی۔ سوراج کی جد و جہد مین شریک ہونے کے لیے ہندوؤن سے اپنے مرجح حقوق کا عہد و پیمان کرائین گے۔

اچھوتون کے مسئلہ بارہ مین البتہ رکاوٹین رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہین۔ سوائے کٹر اور قدامت پسند فرقہ کے اور کسی جانب سے اس مسئلہ مین مخالفت نہین معلوم ہوتی۔ لیکن اس مسئلہ مین پوری کامیابی کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ جب تک جہالت کی تاریکی تعلیم کی روشنی مین مبدل نہو جاوگی۔ قدامت پسند فرقہ اپنی پرانی چال پر قائم رہے گا۔

بہرحال مہاتما گاندھی کے لیے اب راستہ ہموار نہین ہے۔ نہ صرف اسلیے کہ ملکی مسائل کے جو صیغہ جات انھون نے اپنے ہاتھ مین لے رکھے ہین وہ مشکلات اور پیچیدگیون سے پر ہین۔ بلکہ اسلیے بھی کہ اہل ملک کو جو بھروسہ آج سے دو سال پہلے مہاتماجی کی ذات پر تھا اسمین کمی واقع ہوگئی ہے۔ باوجود اس امر کے کہ مہاتماجی نے صاف الفاظ مین سوراج پارٹی کے پروگرام سے اختلاف ظاہر کیا ہے اور باوجود اسکے کہ مہاتماجی کو وہ لوگ ایک قابل احترام لیڈر تسلیم کرتے ہین مہاتماجی کو ہر ہر قدم پر سوراج پارٹی کا مخالفت کرنا اور مہاتماجی کے طریقہ جد و جہد کو بے سود ثابت کرنے کی کوشش کرنا کوئی ایسا ذلیل اور کم وقعت واقعہ نہین ہے جسکا نوٹس مہاتماجی اپنے لشکر کی ترتیب دیتے وقت نہ لین۔ خلافت کی آگ اب بجھ رہی ہے چنانچہ اہل اسلام کو اپنے قومی پروگرام مین اب (ہندوؤن کی عموماً اور مہاتماجی کی خصوصاً) امداد کی ضرورت باقی نہین رہی۔ چنانچہ اب اس امر مین بھی شک کی گنجایش ہے کہ مہاتماجی کا وہ اثر اہل اسلام پر بھی قائم رہ سکے گا یا نہین

جو دو سال پیشتر تھا۔ البتہ اگر اہل اسلام کے مطالبہ کے مطابق مہاتما گاندھی انکو ہندوؤن کے مقابلہ مین مرجح پولیٹکل حقوق دلوانیکا وعدہ کرین تو شاید یہ مسئلہ حل ہو جائے مگر زمانہ کی موجودہ حالت دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ مہاتما گاندھی اس راستہ کو پسند کرینگے، یا انکو اسمین کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔ اہل ہنود نے اس امر کو بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد اس طریقہ پر نہین ہو سکتا کہ ہندوؤن کے حقوق مین کمی کر کے اسلام کے حقوق مین روز افزون اضافہ کیا جائے بلکہ اصل طریقہ یہ ہے کہ اہل ہنود اپنی جگہ پر اسقدر متحد اور مضبوط جماعت بنجائین کہ اسلام کو اپنے مرجح حقوق کی طرف ہندوؤن کی توجہ دلانے کی ہمت نہ پڑے۔ اتفاق اور اتحاد مساوات کے اصول پر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہندو سنگھٹن کا قائم ہونا گو چند روز کے لیے اہل اسلام کی نگاہون مین کھٹکیگا لیکن بالآخر ملک کے لیے ایک فال نیک ثابت ہونیوالا ہے۔ بہر حال ایک کثیر التعداد جماعت ہندوؤن کی اس دھن مین مست ہے اور مہاتما جی کا اس قسم کی قومی اسپرٹ سے ٹکر کھانا غالبًا بیکار ثابت ہوگا آریہ سماج کو بھی مہاتما گاندھی نے ایک حد تک ناراض کر دیا ہے۔

اس پارٹی کو بھی ملکی جدوجہد کی کسی اسکیم مین نظر انداز نہین کیا جا سکتا ہے، یہ ملک کی اُن چند جماعتون مین سے ایک ہے جنھون نے اپنے اپنے زمانہ مین سوتی ہوئی قوم کو جگایا اور اپنے اپنے وقت کی سوشل خامیون کو دور کیا۔ مذہبی اصولون سے قطع نظر تمدنی حالات کے لحاظ سے اس قسم کی اصلاحی جماعتون کی زندگی ایک محدود زمانہ کی ہوا کرتی ہے۔ مگر آریہ سماج کی نسبت یہ خیال کرنا کہ اسکی زندگی کا پیمانہ لبریز ہے شاید ابھی قبل از وقت ہو۔ جبتک ہندوستان مین چھوت اور اچھوت کی تمیز و تفریق قائم ہے۔ اسوقت تک آریہ سماج کے سوشل پہلو کی موجودگی ملک کیلئے لازمی اور ضروری ہے۔ مہاتما جی اسکو اصلاحات پر لا سکتے ہین لیکن اسکو معدوم نہین کر سکتے۔ مگر باوجود اس ناراضگی کے آریہ سماج مہاتما جی کے راستہ مین رکاوٹ پیدا کرنے کا اتہام بھی نہین لگا سکتے۔ کچھ اختلافات ہے

ضرور ہے لیکن دونوں کی وسیع الخیالی اور بلند نظری سے یہ امید کیجا سکتی ہے کہ قومی کام مین ذاتی اختلاف کو ہرگز جگہ نہ ملے گی۔

مہاتما گاندھی کا شمار دنیا کے سب سے بڑے لیڈرون مین ہو چکا ہے۔ آپ کی گذشتہ حالات سے مغربی قومین بھی سبق لیتی ہین۔ پیچیدہ سے پیچیدہ اور نازک سے نازک موقعون پر مہاتما گاندھی نے کبھی پست ہمتی کا اظہار نہین کیا کیونکہ انکو اہل ملک پر بھروسہ ہے اور اپنی ذات پر اعتقاد کامل ہے۔ قدرت نے بھی انکو روحانی قوت عطا کی ہے۔ وہ بے انتہا مصائب جھیلنے کی طاقت رکھتے ہین۔ سچائی اور نیک نیتی انکے افعال کی بنیاد ہے۔ اسیوجہ سے اہل وطن کے دلون پر مہاتما جی کی روحانی حکومت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ حالات مین مہاتما گاندھی متذکرہ بالا مشکلات پر کیسے عبور کرتے ہین، اور اب انکی عملی اسکیم کیا ہوتی ہے۔

اننت پرشاد نگم

موسم بہار

فرش زمین کو عرش کیا سبزہ زار نے — گل ہنس پڑے اُدھر کی جو دی بہار نے
برسائی ہے بہار مین ابر بہار نے — مجھکو پلائی رحمت پروردگار نے
جس ناتوان کو چھوڑ دیا چشم یار نے — پیسا ہے اُسکو گردش لیل ونہار نے
کی بر زبان کتاب جہان سبزہ زار نے — اُلٹا ورق زمین کا فصل بہار نے
بیہوش بوئے گل سے عنادل نہین ہوئے — بیخود کیا ہے پھول پلا کر بہار نے
وہ خاک راہ ہون کہ ہو آنکھو نہین گھر مرا — مجھکو دیا عروج مرے انکسار نے

قسمت چمک اُٹھی مرے اشعار پر نسیم
ڈالی نظر جو ساحر کیوان سوار نے

مذہبی جوش

ابتدائے افرنیش سے لیکر اسوقت تک دنیا مختلف ارتقائی مدارج طے کرتی جاتی ہے اورعام خیال یہ ہے کہ اب دنیا ترقی یافتہ حالت مین ہے اور روز بروز مزید ترقی کرتی رہی ہے تعلیمی روشنی کی شعاعین ایک امیر سے لیکر غریب کی جھونپڑی تک پہونچ گئی ہین انسانی زندگی نے بہترین تمدن حاصل کرلی جاتی ہے۔ آزادی اور مساوات کا دور دورا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مذہبی نقطۂ خیال سے دنیا سے انسانیت فنا ہورہی ہے۔ ست جگ ہوگیا اب کلجگ ہے۔ بنی کریم کا زمانہ اور تھا اب کچھ اور ہوگیا۔ جب کوئی اچھا اور صداقت کا کام ایک نیک نفس شخص کرجاتا ہے توکہا جاتا ہے کہ یہہ توست یوگی آدمی ہے۔ مسلمان بھی زمانۂ بنی کریم صلعم اور خلفا اکرام کے عہد کی تعریف کرتے ہین اور اوسکو خیرالقرون کہتے ہین۔ عیسایٔون کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ جو رحم دلی تحمل نیک نفسی عہد عیسیٰ مین تھی۔ اب ان کے پیرؤن سے مفقود ہوتی جاتی ہے۔ بودہ اور پارسی اور دیگر مذاہب کے اصول کے اعتبار سے موجودہ مقلدین مذاہب کو دیکھکر یہی حکم لگایا جاسکتا ہے کہ عہد ماضی زمانہ حال سے اچھا تھا

ان دو قسم کے متضاد کے خیالات نے دنیا اور اہل دنیا کو عجیب کشمکش مین مبتلا کردیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ دونو باتین بجائے خود درست ہین۔ ہم ایک مذہبی شخص کو دیکھتے ہین کہ وہ اپنے اصول کو بالائے طاق رکھکر مختلف قسم کے خودغرضیون اور بدکاریون مین مبتلا ہے۔ کہنے کے لیے وہ ہندو دہرم یا اسلام یا عیسائیت کا نام لیوا ہے۔ اور ایک ایسا شخص جو مذہب کی کوئی اور حاجت وقعت اپنے دل مین نہین رکھتا لیکن اس کا قول وعمل مذہبی نظر سے قابل ستائش ہوتا ہے اسی وجہ سے اس خیال کو تقویت پہونچ رہی ہے کہ مذہب ہی خفیہ اور تمام برائی کا باعث ہوگیا ہے۔ نیکی اور بدی مذہبی احکام کے احاطہ مین محدود نہین جس طرح ایک پابند

مذہب شخص نیک اعمال کرسکتا ہے (مثلاً: احسان - ہمدردی - وہ تمام اخلاقی خوبیاں جو دائرہ مذہب میں ہیں)
اسی طرح ایسا آدمی بھی کرسکتا ہے جو کسی مذہب کا اپنے کو پابند نہیں خیال کرتا جس طرح ایک مسلمان
اسکا دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کے مسلمان سب بھائی بھائی ہیں - اور باقی کافر - اور ایک ہندو دہرم کا مقلد
سوا ہندو کے سب کو ناستک کہتا ہے - اسی طرح اس زمانہ کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال جو
بہ ظاہر مذہب سے بیگانہ نظر آتا ہے سب اولاد آدم کو بھائی - بھائی مانتا ہے اور انکی بہتری کا خواہاں ہو

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذہبی جماعت میں بھی ایسے روشن خیال بزرگ
گذرے ہیں جنہوں نے قانون قدرت کے عام اُصول انصاف وعام اُصول اخلاق کی تعلیم دی ہے۔
اور اپنے ارشادات میں مذہب کی یہ تعبیر کی ہے کہ بنی نوع انسان سے ہمدردی کرنا مذہبی تعلیم کا اعلیٰ
مقصد ہے۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوی بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نہ ماند قرار

اسی طرح ہندو مذہب کے برگزیدہ گرنتھ یعنی مقدس گیتا میں تحریر ہے کہ (ترجمہ) عالم باعمل برہمن
" विद्या विनय संपन्ने वाम्हणे गवि हस्तिनि " گائے - ہاتھی - کتا - اچھوت اور
" शुनि चैव श्वपाके च पंडिता: समदर्शिनः " سے پنڈت مساوات برتتا ہے۔
بیسیوں جگہ اس مقدس کتاب میں یہی تعلیم ہے - جسقدر ہندوستانی ویدک دہرم گرنتھوں کو دیکھا
جائیگا ان سب کا یہی منشا اور اصول ملیگا کہ प्राणी मात्र समान ہر ذی روح کی روح یکساں ہو

اللہ اللہ کیا شان ہے - کہاں صرف بنی نوع انسان کی محدود ہمدردی اور کہاں ہر ذی روح
کو اپنے آتما کے برابر تصور کرنے کی تعلیم - صوفیائے کرام کا بھی یہی اصول رہا ہے جضرت جامی فرماتے ہیں کہ

"بخدا جز بخدا در دو جہان چیزے نیست" — "وکہ بجز وہم وگمان در دو جہان چیزے نیست"
"بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی" — "وکہ درین راہ فلان ابن فلان چیزے نیست"

باینہمہ آجکل انھیں مقدس مذہب کے نام پر ایک بدامنی پھیلی ہوئی ہے - یہ مذہبی دیوانے
اس خیال میں ہیں کہ ہماری تعداد میں اضافہ ہو جائے دنیا کے بھولے بھالے انسان نادار ومفلس انسان

عجیب ؟ چار انسان چاہے وہ کیسے ہی بد اعمال رہین۔ گرفتار ہماری جماعت مین ہو کاش ان سے کوئی پوچھتا کہ بھائی کن معنون مین دہرا تا ہندو ۲۲ کروڑ مین اور ۷ مسلمان ۸ کروڑ مین کتنے ہین۔ آپ دوسرون کو آدمی بنانا چاہتے ہین۔ لیکن پہلے خود تو کچھ بن جاہیے۔ اسوقت لاکھون کروڑون ہندو مسلمان دروغ گو۔ شرابی۔ دغاباز۔ غاصب۔ ڈاکو۔ ملینگے۔ کوئی اپنے اقتدار کا مست ہے تو کوئی دولت کا متوالا کوئی جوانی کا مدہوش ہے تو کوئی عارضی حُسن وخوبی کا دیوانہ۔ کسیکو اپنے علم ودانش پر ناز ہے۔ تو کسی کو اپنے حکمرانی کا گھمنڈ ہے۔ ایسے شاذ ونادر نظر آئینگے جو مذہبی اصول کو اپنی زندگی کا نمونہ سمجھتے ہین۔ پہلے آپ انکو مذہبی تعلیم دیجئے۔ پھر دوسرون کی تلقین کے لیے آگے بڑھیے۔ قند کا نام لینے سے منہ میٹھا نہین ہوتا۔ زبانی دعوے بیکار ہین۔ عمل چاہیے۔ نہ صرف ہندو رہنے سے کوئی سورگ مین جائیگا۔ اور نہ صرف مسلمان کہلانے سے جنت مل سکتی پس ہندؤن کو سچے ہندو اور مسلمان کو صادق مسلمان بننے کی بہت ضرورت ہے۔ پہلے ہندو اور مسلمان سچے ہندو اور صادق مسلمان بن لین۔ اس کے بعد پھر غور کرین کہ آیا اب کس کی نجات مین شک ہے۔ تب چاہے تبلیغ اور شدھی کا علم بلند کرین۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ اختلافات صوری کوئی معنوی وقعت نہین رکھتے۔

مولانا روم نے حضرت موسیٰ اور چرواہے کی حکایت مین جس محل پر یہ شعر فرمایا ہے کہ

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

اسکو سمجھو دیکھو اسکی تہ مین کتنی سیدھی سادھی سچی تعلیم ہے۔

غور فرمایے کہ اگر مسلمانون کا خدا یا ہندؤن اور عیسائیون کا خدا جُدا جُدا ہے تو رب العالمین کون ہے۔ ولشیو شود کون ہے۔ خدا کے لیے خدا کو کسی جماعت کا وتو کلم مخصوص خدا، نہ بناؤ بلکہ اسکو پروردگار عالم رہنے دو خدا تو خدا ہی ہے۔ آفتاب۔ چاند۔ تارے۔ زمین۔ آسمان۔ آب وہوا۔ سب ہمارے لیے مشترک ہین۔ اس مین ہمارا سب کا حصہ مساوی ہے۔ یہ برابر ہم سب کو استفادہ پہونچاتے رہتے ہین۔ ہم نے کبھی اسکے لیے اختلاف نہین کیا۔ نہ کبھی سُنا کہ فلان آفتاب ہندؤن کا اور چاند مسلمانون کا اور تارے عیسائیون کے ہین یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا اپنے بندون کی ایک جماعت کو چھوڑ دے اور دوسری جماعت کو اپنا بنالے غیر ممکن ہے کہ سچائی سے جو عمل کیا جائے۔ جس عمل سے خدا کی پرستش سچے دل سے مقصود ہو۔ وہ مقبول بارگاہ الٰہی نہ ہو۔

باہمی بر خاش کی صرف یہ وجہ ہے کہ ہر مذہب مدعی ہے کہ ہم راہ حق پر ہیں۔ مگر ایک وسیع النظر کیلئے یہ بیانات مظالم و خرافات سے زیادہ وقیع نہیں ہر مذہب خدا کا ہے اور اسی کی طرف لیجاتا ہے۔

ہم نے جس بدامنی کا اشارہ کیا ہے وہ شدھی اور تبلیغ سے متعلق ہے ہم اس واعظ سے خوش ہیں جو صداقت اور راست بازی کی تعلیم دے چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو مبارکباد وہ مسلمان واعظ صاحب جو اپنے پاکیزہ پند و وعظ سے ہندوؤں سے شراب نوشی بند کرا دیں گو کلمہ طیبہ نہ کہلوا سکیں قابل تعظیم ہیں وہ پنڈت جی جو اپنے اپدیش سے مسلمانوں کو رحم دلی اور صداقت پسندی کی تعلیم دیدیں۔ گو شدہ کر کے جنیو نہ پہنا سکیں۔ متبرک ہیں وہ پادری صاحب جو دنیا کے لوگوں کو اخلاق مسیح پر کاربند کرا دیں چاہے وہ عیسائی نہ بنا سکیں۔ غرضکہ ہر مذہب کے مبلغوں کو اپنے مذہب کی اعلیٰ تعلیم دینے کا پورا پورا حق ہے جو دنیا میں سکون اور انسانی جماعتوں میں مسرت و شادمانی کا دور دورا پیدا کر سکے کیا فائدہ اگر چند لاکھ عیسائی یا ہندو یا مسلمان ادہر سے اُدہر جا کر شامل ہو گئے۔ اور اپدیشک یا مبلغ صاحب خود اپنے مذہب کے پیرؤں کی عادات ذمیمہ کو نہ سدہار سکے۔ دوستو! دنیا سے بدی کو نابود کرو نیکی کی اشاعت کرو۔ یہی خدا کی قربت اور یہی راحت کی کلید ہے۔ عمل صالح ہی سے انسان خدا کی رحمتوں کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس دنیائے دوں کے عارضی اقتدار و عیش و راحت کے لیے خدارا اپنے دہرم اور ایمان کو قربان نہ کرو۔

یاد رکھو کہ حق اللہ کے ساتھ ساتھ حق العباد بڑی چیز ہے۔ خداوند عالم منتقم ہے۔ دل کی چھپی ہوئی باتوں سے واقف ہے۔ بہائیو اصلاح پہلے گھر سے ہوتی ہے۔ اولاً آپ اپنی گھر کی خبر لیجیے۔ کتنے مسلمان ایسے ہیں جنکو اخلاق محمدی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ کتنے ہندو ایسے ہیں جن کو آریہ سنتان کہہ سکتے ہیں جو شری رام اور سری کرشن کے سچے پیرو کہے جا سکتے ہیں۔ کتنے عیسائی ایسے ہیں جن کو حضرت مسیح کا حقیقی جانشین کہہ سکتے ہیں صرف برائے نام مسلمان ہندو اور عیسائی ہونے سے دنیا کی بدامنی میں کمی نہ ہوگی نہ عاقبت درست ہوگی اور نہ خدا یا ایشور یا آسمانی باپ دہوکے میں آسکیگا نہ مذہب یا دہرم کی غایت پوری ہوسکے گی۔ خداوند عالم کو زبان اور صورت سے نہیں اوسکو دل اور سیرت سے تعلق ہے۔ تم اپنے کھوٹے سکوں کو صداقت کی آگ میں تپاؤ اوسکو بدی کی آلایش سے پاک کرو اور خدا کی راہ میں چلنے کے قابل بنا دو۔ پھر جس مذہب کی کسوٹی پر پرکھوگے کھرا پاؤگے۔ یہ دہوم دہام یا غل و شور ایک عالم کو پریشان و مشوش کر سکتا ہے

[illegible] عارضی طور پر خوش کر سکتا ہے۔ لیکن خداوند عالم اس سے کبھی خوش نہ ہوگا۔ سلب آزادی کسی مذہب مین روا نہین۔ یہ ذرا دیر کے لیے تنہائی مین سوچو اور اپنے ضمیر سے اسکا جواب حاصل کرو۔ یہ قرین دانشمندی نہین ہے کہ غلت کے پیچھے اس درجہ پڑو کہ اصول و مقصود بھی معدوم ہو جائے۔ امر بالجہد تبلیغ اور بیجا مچھار سے بجز بدنفسی اور فساد کے اور کچھ حاصل نہین ہو سکتا۔ بے شک صداقت کی تبلیغ کرو دستکاری پہلو کرو۔ لیکن سب سے پہلے اس راہ مین قدم اوس وقت رکھو جب تم مین نفس پرستی نہ ہو۔ اور تم خود مجسم صداقت و تصویر سدا چار ہو۔ تم مین نخوت۔ انانیت۔ تعصب۔ سوارتھ بدھی کی بو نہ آتی ہو۔ خاکساری تمہارا مسلک ہو۔ خودنمائی و خودستائی و خودغرضی سے تمہاری ذات مبرا و منزہ ہو۔ پریم۔ اخلاق۔ خداپرستی اور وشو بھگتی کا ایسا رنگ چڑھا ہو کہ ہر کس و ناکس تمہارا گرویدہ ہو جائے۔

اے خدائے رب العالمین ہم کو توفیق خیر دے۔ اور اپنے رحم و کرم سے گمراہی سے محفوظ رکھ اور اپنے بے پایان بندہ نوازی سے رحمتین نازل فرما تاکہ ہم اطمینان و شانتی کے ساتھ پاکیزہ زندگی بسر کرسکین

چودھری دگمبر داس وکیل

ترانہ اقبال

(ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے)

نہ سلیقہ مجھ مین کلیم کا نہ قرینہ تجھ مین خلیل کا
مین ہلاک جادوی سامری تو قتیل شیوۂ آزری

مین نوای سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
مین حکایت غم آرزو تو حدیث ماتم دلبری

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفس عدم
ترا دل حرم گرو عجم ترا دین خریدۂ کافری

تری خاک مین ہے اگر شرر، تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہان مین نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

کوئی ایسی طرز طواف تو مجھے اے چراغ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشت سمندری

گلۂ جفا، وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے مین بیان کرون تو کہے صنم بھی ہری ہری

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہین منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھین دماغ سکندری

(معارف)

کلام چکبست

پنڈت برج نرائن صاحب چکبست لکھنوی کا مجموعہ کلام "صبح وطن" مطبوعہ ۱۹۱۸ء میرے پیش نظر ہے اور مین اسکی شاعرانہ حلاوت و لطافت سے لطف اندوز ہو رہا ہون، اس مجموعہ مین بیان و معنے کا وہ دریا موجزن ہے جسکے پرکیف مناظر سے چشم نظارہ کبھی سیر نہین ہو سکتی۔

چکبست صاحب کے کلام مین شاعری کے تمام جواہر اسطرح جگمگا رہے ہین جسطرح اماوس کی رات مین تارے شاعری کا سب سے بڑا جوہر تاثیر ہے اور تاثیر آپ کے کلام کا جزو لاینفک ہے۔ آپ کا کلام آپ کی کیفیات قلبی کا مرقعہ ہوتا ہے۔ جسکو سنکر اہل دل سر دھننے لگتے ہین۔

آپ کے کلام کی تاثیر کا خاص راز یہ ہے کہ آپ ہندوستانی فضا مین سیر کرتے ہین اور ہر منظر کو ہندوستانی نقطہ نظر سے دیکھتے ہین۔ آپ نے کوہ ہمالیہ، دریائے گنگ، کوئل، پپیہا، بھیم، ارجن، اکبر، رانا، گوتم، چتوڑ، کشمیر سے سروکار رکھا ہے۔ پس جہان کہین اور جس مقصد سے ان کا ذکر آتا ہے اسکا اثر فوری ہوتا ہے۔

تارون کی چھاؤن منہ اندھیرے "جبوقت نسیم سحری گنگا جمنا اور سرسوتی کی لہرون سے اٹکھیلیان کرتی ہوئی چلتی ہے اور دوشیزہ صبح مسکراتی ہوئی سُرور رنگین انداز سے گھونگھٹ الٹتی ہے اور شاما قلعے کی پشتے کے ایک پتھر پر بیٹھکر بیخودانہ انداز سے چھپا کر میٹھی آواز سے کسے نغمہ سحری چھیڑتی ہے" اور ہماری کشتی سطح دریا پر تیرتی ہوتی ہے۔ اسوقت جو سرور طبیعت کو حاصل ہوتا ہے وہی سُرور آپکے کلام کے مطالعہ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسی کا نام لطافت ہے۔

لطافت کلام کی صوری حیثیت پر بھی بہت کچھ منحصر ہے۔ یعنی اسکا راز انتخاب الفاظ و بندش الفاظ مین پوشیدہ ہے۔ اُردو مین لطافت پیدا کرنا زیادہ تر خالص اُردو محاورات کے طرز استعمال سے وابستہ ہے۔ خالص ہندی الفاظ کا استعمال بھی لطافت پیدا کرتا ہے۔ اگر مناسب طریقہ پر کیا جائے اور مخل فصاحت نہو۔ اسبات مین سُرور مہر ورجہان آبادی کو ید طولیٰ حاصل تھا، چکبست صاحب نے بھی۔

ہیں جنہیں سکو خوب نبا ہا ہے۔ تیسری بات جو ایک شاعر کو کامل فن ہونے کی سند دلاتی ہے تشبیہوں کا استعمال ہے، ممدوح کے کلام میں تشبیہیں بھی اس درجہ جامع اور مکمل ہیں کہ ذوق سلیم بے اختیار مرحبا کہہ اٹھتا ہے۔

ان تمام خوبیوں کے علاوہ چکبست صاحب نے ایک خاص رنگ سخن ایجاد کیا ہے، اور یہی ایک خاص بات ہے جو تنہا ایک شاعر کو نقش بندان سخن کی صف اولین میں جگہ دلانے کے لیے کافی ہے غزل میں خلقیا اخلاقی مضامین لکھنا آپ کا حصہ ہے۔ آپ کی غزلوں کے سلسلہ میں اسپر مفصل بحث کیجائیگی۔ یہاں یکہنا ضروری ہے کہ چکبست صاحب کی شاعری نئے رنگ کی شاعری کا اعلےٰ نمونہ ہے، تاہم آپنے فن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور اصول فصاحت و بلاغت سے ابا نہیں کیا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ "خاک ہند" میں فرماتے ہیں"

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو ۔۔۔ سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو ۔۔۔ سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

پہلے چار مصرعے خاک ہند کی عظمت و وقعت کو ذہن نشین کرتے ہیں ذرا "معبد کہن" پر تو غور کیجئے کس درجہ عقیدت آفرین ہے اور جس سے ہندوستان کی دینی عظمت و وقعت اتنی ہی دیرینہ ثابت ہو رہی ہے جتنی کہ ہے۔ چوتھا مصرع بھی قابل غور ہے چمن کو لہو سے سینچنا سبحان اللہ مصرعے میں کیا گلکاری کر رہا ہے۔ پھر اس مصرعے کی تاثیر بھی دیکھئے اور ان چاروں مصرعوں کی روشنی میں بیت کو دیکھئے جسکے مصرعہ ثانی کی تعریف ناممکن ہے کیا بلحاظ تشبیہ اور کیا بلحاظ تاثیر کھنڈر کی تشبیہ ہڈیوں سے کس درجہ جامع اور رقت انگیز ہے اور ہندوستان کی خاک کو کتنا مقدس ثابت کر رہی ہے۔ نظم "وطن کا راگ" بھی خوب ہے، فرماتے ہیں،

زبان کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز ۔۔۔ ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز ۔۔۔ چتا سے آئیگی مرنیکے بعد یہ آواز
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے ۔۔۔ نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

[illegible] جبہ مدوح کو تر کیب و بندش الفاظ سے معنی کی صورت گری میں کمال حاصل ہے ہر مصرعہ سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور ٹیپ کا بند تو تعریف سے بے نیاز ہے۔ "آوازۂ قوم" میں فرماتے ہیں۔

بیخاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار

جوش کے پیدا ہونے کی تشبیہہ دیکھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوش کی گھنگھور گھٹائیں اُترا کھنڈ سے اُمنڈتی چلی آرہی ہیں۔ جوش خون کے رفتار کی تشبیہہ برق کی رفتار سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔ چوتھے مصرعہ کا لطف حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ خاک کے پردے میں ہڈیوں کا بیدار ہونا کیا خوب ہے۔ ہڈیوں کو جو تعلق خاک سے ہو ظاہر ہے اسی نظم میں آگے چلکر فرماتے ہیں۔

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
تھا جسپہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی
غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی
نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

اس بند میں باشندگان ہندوستان کے لیے ہوم رول کی اہمیت و وقعت و ضرورت ثابت کی گئی ہے۔ اس موقع پر "دعا" کو دیکھئے "مسیحائی" کی صدا کو دیکھئے دلوں کو مسرت کرنیوالی ہوا کو دیکھئے پھر چوتھے مصرع پر غور کیجیے۔ بیت کے مصرع ثانی میں " لو لگائے ہوئے" کی داد ذوق سلیم ہی دے سکتا ہے۔

مسز بیسنٹ کی خدمت میں جو آپنے قوم کی طرف سے پیغام وفا بھیجا ہے اُسکی ابتدا یوں کرتے ہیں۔

قوم غافل نہیں ماتا تیری غمخواری سے
زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے
آگ بھڑکی ہے تری آہ کی چنگاری سے
خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزاری سے
دل ترا قوم کے دامن میں دیئے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تری زندان میں لیے جاتے ہیں

پہلے مصرع میں ماتا کے لفظ کی افسوں طرازی دیکھئے۔ اس لفظ سے فوراً مسز بسنٹ کی نورانی

تصویر یعنی ماتا کی پوری آب و تاب کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے وہ جھنی پہنا ہوتے ہوتے ماتا کی غمزاری کا دریا ئے جوش رگ رگ میں موجیں مارنے لگتا ہے اور پھر دوسرا مصرع اس جوش میں طوفان پیدا کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ بیت کے مصرع ثانی پر پہونچتے پہونچتے یہ جوش یا آہ بنکر ہوا میں شامل ہو جاتا ہے یا اشک ہوکر زمین پر بہہ چلتا ہے۔

مسنر بیسنٹ نے جو بیداری قوم میں پیدا کی اُس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

هند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے — جیسے برسوں کا مریض اُٹھا ہو بیماری سے
قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے — چاندنی پھیل گئی حسن وفاداری سے

تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نور ہے محفل بھر میں

ایسی شاعری پر اردو ادب جتنا ناز کرے بجا ہے۔ اسی نظم میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی — اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی
مادر ہند کی تصویر ہو سینہ پہ بنی — بیڑیاں پیر میں ہوں اور گلے میں کفنی

دوسرے مصرع میں سنیاس کے لفظ نے جو معنوی وسعت اور تاثیر پیدا کی ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے ہو نہیں سکتی۔ فقیر قوم کی تصویر اس سے بہتر لفظوں میں نہیں کھینچی جا سکتی۔ اسی نظم میں شوق وفا کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سنتری دیکھکے اس جوش کو شرمائینگے — گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے۔

فریاد قوم کی شان ملاحظہ ہو۔

ہے آج اور ہی کچھ صورت بیان میری — تڑپ رہی ہے دہن میں میرے زبان میری
چھید ڈالے قلب و جگر تیر ہے فغان میری — لہو کے رنگ میں ڈوبی ہے داستان میری

مبالغہ نہیں تمہید شاعرانہ نہیں
غریب قوم کا ہے مرثیہ فسانہ نہیں

ایک بند میں ہندوستانی مظلومین کی حالت زار کی یوں مصوری کرتے ہیں۔

لئے ہیں یوں کہ کسی کی گرہ میں دام نہیں — نصیب دال کو پیٹ بھر نے کا مقام نہیں

یتیم پن سسکنے کا انتظام نہین … جو صبح خیر سے گذری اُمید شام نہین

اگر جیے بھی تو کپڑا نہین بدن کے لیے
مرے تو وشش پڑی رہ گئی کفن کیلیے

آگے چلکر ایک مقام پر فرماتے ہین۔

پڑھی نماز تو اُجڑے گھرون کے صحرا مین
اگر نہائے تو اپنی لہو کی گنگا مین ؛؛

دیکھیے تو کس غضب کی بیت ہے دل ہلا دینے والی پھر ان دو مصرعون مین معنی کا کتنا خزانہ بھرا ہوا ہے اِسکے آگے قوم کی غیرت کو اُبھارتے ہوے فرماتے ہین۔

اگر دلون مین نہین اب [illegible] غیرت کا … تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزت کا
وفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا … جنازہ لیکے چلو قوم و دین و ملت کا

نشان مٹا دو اُمنگون کا اور ارادون کا
لہو مین غرق سفینہ کرو مُرادون کا

آخری بند کا زور ملاحظہ ہو فرماتے ہین۔

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے … نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل مین تو آرزو کیا ہے … نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہین تو فقط ہڈیون کا ڈھیر ہے وہ

"قوم کے سورماؤن کے الوداع" مین ممدوح نے اپنی صنعت بیانی کے خوب خوب جوہر دکھائے ہین اُردو شاعری کے لیے ایسی نظمین ہمیشہ سرمایۂ مباہات ہین۔ ابتدائی بند ملاحظہ ہو۔

ساحلِ ہند سے جرارِ وطن جاتے ہین … کچھ نئی شان سے جانبازکہن جاتے ہین
رن مین باندھے ہوے شمشیر و کفن جاتے ہین … تیغ زن، برق فگن، قلعہ شکن جاتے ہین

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ مین قضا چلتی ہے

جہاں مشنوی کیسے پر جوش و پر شوکت مصرعے ہیں دلیران وطن کی صولت و شوکت کی تصویر کھینچی ہے۔
قوم کے سورماؤں کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

ان کی رگ رگ میں ہیں پیوست شجاعت کے چلن   رن کا میدان ہے ان کے لیے ان کا وطن
موت میدانِ جنگ کی موت انکو ہے اک شب کی دلہن   مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن

جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دور نہیں
ساتھ لپشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

ہندوستانی سورماؤں کے لیے میدان کارزار میں جان دینا جنت ہے۔ اس موت کو "اک شب کی دلہن" کہنا چکبست صاحب ہی ایسے شاعر شیوا بیان کا کام ہے آگے چلکر فرماتے ہیں۔

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا   [illegible] مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا   ندیاں خون کی [illegible] میں بہا کر آنا

ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لیے
یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لیے

اس بند کی لطافت ذوق سلیم کے ادراک پر منحصر ہے معنویت کے علاوہ بندش کی چستی، اور تناسب لفظی قابل داد ہے۔ آگے چلکر سورماؤں کو ہدایت کرتے ہیں۔

یا ظفر یاب تمہیں دیکھ کے دل ہو بشاش   آئے یا سوئے وطن خون میں ڈوبی ہوئی لاش
سرحد اتن سے ہوا ہو تن بسمل صد پاش   گوشہ امن و امان کی نہ آنکھوں کو تلاش

موت معراج ہے اس دشت کے راہی کیلئے
آج تلوار کی جنت ہے سپاہی کے لیے

اس بند کی بیت اردو شاعری کی معراج ہے۔ خصوصاً مصرع ثانی کی تو داد ہی نہیں دی جا سکتی ناصحانہ انداز ملاحظہ فرمائیے۔

گو کہ دنیا سے مٹے شوکت قیصر کا سراغ   شعلۂ تیغ سے مرجھائے نہ تہذیب کا باغ
گل نہ ہو دل کے شوالے میں حمیت کا چراغ   بے گناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار میں داغ
راستہ ہے یہی قوموں کی تباہی کے لیے   خون معصوم کا دوزخ ہے سپاہی کو لیے

سبحان اللہ کیسے نادر نصائح اس بند میں بیان کئے ہین اور کس خوبی و لطافت سے کہ ذوق سلیم بے اختیار نعرۂ تحسین و آفرین بلند کر رہا ہے۔

"پھول مالا" کے عنوان سے جو نظم آپ نے لکھی ہے وہ اس قابل ہے کہ ہندوستان کے ہر گھر مین تعویذ بناکر رکھی جاوے اور اسکا مطالعہ لڑکیون کے لیے فرض کر دیا جائے مغرب کی نمود و نمایش کا اثر مردون سے گذر کر عورتون پر بھی جسقدر پڑا ہے وہ قابل بیان نہین۔ ہندوستان عام طور پر ذاتی جوہر اور سادگی کے لیے مشہور ہے اور یورپ نمائش اور بناوٹ کے لیے۔ آپ قوم کی لڑکیون کو یون تلقین فرماتے ہین

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و ریفارم
تم اس انداز کے دھوکے مین نہ آنا ہرگز

رنگ ہے جنمین مگر بوئے وفا کچھ بھی نہین
ایسے پھولون سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک مین غیرت قومی نہ ملانا ہرگز

جو بناتے ہین نمائش کا کھلونا تمکو
اُن کی خاطر سے یہ ذلت نہ اُٹھانا ہرگز

رُخ سے پردے کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

نقد اخلاق کا ہم مل کیطرح ہار چکے
تم ہو دیت ... دولت نہ لٹانا ہرگز

خاک مین دفن ہین مذہب کے پرانے پاکھنڈ
تم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ اُٹھانا ہرگز

اپنے بچونکی خبر قوم کے مردون کو نہین
یہ ہین معصوم انھین بھول نہ جانا ہرگز

ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو
پاس مردون کے نہین انکا ٹھکانا ہرگز

کاغذی پھول ولایت کے دکھاکر انکو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز

نغمۂ قوم کی لے جسمین سما ہی نہ سکے
راگ ایسا کوئی اُن کو نہ سِکھانا ہرگز

گو بزرگون مین تمہارے نہو اسوقت کا رنگ
ان ضعیفون کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز

ہم تمہین بھول گئے اسکی سزا پاتے ہین
تم مگر اپنے تئین بھول نہ جانا ہرگز

"برق اصلاح" مین فرماتے ہین۔

مل گئے خاک مین کتنے ہی غریبون کے شباب
ان گناہون کا ہے اس قوم کی گردن پہ عذاب

جو پرائی روشون کے لیے رہتے ہین خراب
ان کی صورت سے اب آتا ہے زمانہ کو حجاب

شان اخلاق نہین جبر کی تدبیرون مین
بےگناہون کو جکڑتے نہین زنجیرون مین

"قدردول" کی شان تمہید ملاحظہ ہو۔

موعظت ہے دل کے لیے، ورد دل انسان کیلئے ‏ ‏ تازگی برگ و ثمر کی چمنستان کے لیے
ساز آہنگ جنون تار رگ جان کے لیے ‏ ‏ بیخودی شوق کی بھی بے سر و سامان کیلیے

کیا کہون کون ہوا سر مین بھری رہتی ہے
بے پیئے آٹھ پہر بے خبری رہتی ہے

سبحان اللہ کیا پرجوش و پُرتاثیر بند ہے۔

اسی نظم مین آگے چلکر نوجوانان کشمیر کی ترقی کے سلسلے مین فرماتے ہین۔

بوئے نخوت سے نہین اِن کے گلون کو سروکار ‏ ‏ ہے بزرگون کا ادب ان کی جوانی کا سنگار
علم و ایمان کی طراوت کا دلون مین ہے گزار ‏ ‏ دھو گئے چشمۂ اخلاق سے سینون کے غبار

رنگ دکھلاتی ہے یون دل کی صفا یارون مین
"دشتی صبح کی جسطرح ہو گلزارون مین"

اس کل بند پر غور کیجے اور بیت کو دیکھئے اسکی صفائی رنگینی و لطافت کی کماحقہ داد دینا ناممکن ہے واقعی یہ بیت وہی عالم دکھا رہی ہے جو صبح کا نور چمن زارون مین دکھاتا ہے۔

اسی نظم مین آگے چلکر فرماتے ہین۔

گو کہ باقی نہین کیفیت طوفان شباب ‏ ‏ ہنس کے جنجال مین دنیا کے یہ قصہ ہوا خواب
مست رہتا ہے مگر اب بھی دل خانہ خراب ‏ ‏ شام کو بیٹھ کے محفل مین لنڈھاتا ہون شراب

نشۂ علم کی امید پہ جینے والے
سمٹ آتے ہین سر شام سے پینے والے

واہ کس شان کا بند ہے ایک ایک مصرع صہبا پرستان سخن کے لیے ایک ایک خم دامن مین لیے ہوئے ہے "سمٹ آتے ہین" اس ٹکڑے کی کیا تعریف ہو۔ اس سے بادہ گساران علم کے ہجوم کی کیسی لطیف تصویر آنکھون کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔

"گائے" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ حلاوت و لطافت و پاکیزگی میں آپ اپنی مثال ہے پہلا بند ملاحظہ ہو:

تو وہ مخلوق ہے خلقت میں نہیں جس کا گناہ کی ہے قالب میں ترے روح محبت نے پناہ
تیری صورت سے عیاں ہوتی ہے انساں کی چاہ رس بھری آنکھ سموئی ہوئی امرت میں نگاہ
نقش ہے دل پہ مرے موہنی صورت تیری
خوب دنیا کے شوالے میں ہے مورت تیری

دیکھیے کس درجہ لطیف بند ہے دوسرے مصرعے میں "روح محبت" کی لطافت ملاحظہ ہو۔ اور چوتھا مصرع تو واقعی امرت میں سمویا ہوا ہے۔ اس نظم میں آپ نے خوب خوب بند کہے ہیں ملاحظہ ہوں۔

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار بے پیے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزہ کا نکھار
ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحب دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں چشمۂ فیض خدا مرد خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں
کون ہے جس نے ترے دودھ سے منھ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

صورتیں یاد ہیں اُن بچوں کی پیاری پیاری زندگی کی جنھیں ایک ایک گھڑی تھی بھاری
تیرے دم سے نہ رہی یاس کی حالت طاری ہو گئیں اُن کے لیے دودھ کی نہریں جاری
کتنے گرتے ہوئے پودوں کو سنبھالا تو نے
ماں جنھیں چھوڑ چلی تھی انھیں پالا تو نے

چوتھے مصرع میں دودھ کی نہریں جاری کی فصاحت و لطافت تو دیکھیے۔

تیرے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار اپنی گردن پہ لیا پرورش قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار ہے یہ سب اُن کے لہو اور پسینہ کی بہار

آن کو منظور نہ تھا جو بہانا اپنا

ہند کی خاک اگلتی نہ خزانا اپنا

سلطانی جو ان نہار کھیتی کو گاتے ہیں بچوں کے لہو اور پسینہ کی بہار کہنا چکبست جیسے ہی ایسے شاعر رنگین بیان کا کام ہے۔ وہ بیت بھی کیا خوب ہے۔ سبحان اللہ۔ ذیل کے بند بھی کیا خوب ہیں۔

اہلِ دین نے تجھے جنت کا سہارا سمجھا — اپنے ایمان کی قسمت کا ستارا سمجھا
سو پیروں نے تجھے جان سے پیارا سمجھا — تجھکو اکبر نے اسد آنکھ کا تارا سمجھا
آبرو قوم کی ہے تیری نگہبانی پر
یہی دو حرف لکھے ہیں تری پیشانی پر

مشل پوتوں کے تہے دودھ کے ہیں متوالے — جو ضعیفی سے پڑے رہتے ہیں بستر ڈالے
مست رہتے ہیں ترے فیض سے کس بل والے — پیار سے کہتے ہیں ماما تجھے بچے پالے
تیری الفت سے انھیں منہ نہیں موڑا جاتا
تیری صورت کا کھلونا نہیں توڑا جاتا

میرے دل میں ہے محبت کا تری سرمایا — ماں کے دامن سے ہے بڑھکر مجھے تیرا سایا
یاد ہے فیضِ طبیعت نے جو تجھ سے پایا — میں قسمت جو ترا نام زباں پر آیا
اس ملاوٹ سے جو دعوی سخنگوئی ہے
دودھ سے تیرے لڑکپن میں زباں دھوئی ہے

"قومی مسدس" ایسے پاکیزہ اور سچے جذبات کا آئینہ ہے۔ جو ایک وطن پرست شاعر کے لئے مخصوص ہیں۔

انہی کون فرشتے ہیں یہ گدائے وطن — صفائے قلب سے جن کے یہ بزم ہے روشن
جھکی ہوئی ہے بڑوں کی لحاظ سے گردن — ہر اک زباں پہ ہیں تعظیم اور ادب کے سخن
صفیں کھڑی ہیں جوانوں کی اور پیروں کی
خدا کی شان یہ پھیری ہے کن فقیروں کی

کیا زور کے سانچے میں ڈھلا ہوا بند ہے۔ گویا ان وطن کی کیسی مقدس اور قابل تعظیم تصویر کھینچی ہے اور بیت تو سبحان اللہ خدا کی شان الحراس مصرع کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں طمع میں دولت دنیا کے یہ اسیر نہیں
امیروں کے ہیں ظاہر کے یہ امیر نہیں وہ آدمی نہیں ان کا جو دستگیر نہیں
تمام دولت ذاتی لٹا کے بیٹھے ہیں
تمہارے واسطے دھونی رما کے بیٹھے ہیں

یوں تو تمام بند نہایت خوب ہے لیکن بیت کا مصرع ثانی تو ایسا ہے کہ بایدہ شاید اور جو جذبات دل میں پیدا کرتا ہے۔ ان کا لطف دل ہی خوب اٹھاتا ہے۔ زبان بیان کر سکتی آگے چلکر فرماتے ہیں۔

گناہ قوم کے دھو جائیں اب وہ کام کرو مٹے کلنک کا ٹیکا وہ فیض عام کرو
نفاق وجہل کو بس دور سے سلام کرو کچھ اپنی قوم کے بچوں کا انتظام کرو
یہ کام ہو کے رہے چاہے جان رہے نہ رہے
زمین رہے نہ رہے آسمان رہے نہ رہے

کیا خوب بند ہے۔ بندش کی چستی اور مضمون کی روانی قابل داد ہے
مسز بیسنٹ کی نسبت فرماتے ہیں۔

مسز بیسنٹ کے احسان کی تمہیں ہے خبر کیا شار پڑھایا تمہارے بچوں پر
شریک وہ بھی ہیں اس کار خیر کے اندر نہ ان کی آنکھ ہو نیچی رہے یہ مد نظر
مٹے نہ بات کہیں تم پہ مٹنے والوں کی
تمہارے ہاتھ ہے شرم ان سپید بالوں کی

مالوی جی کی نسبت فرماتے ہیں۔

تمہارے واسطے لازم ہے مالوی کا بھی پاس کہ جسکی ذات سے اٹکی ہوئی ہے قوم کی آس
لیا غریب نے گھر بار چھوڑ کر بن باس جو یہ نہیں ہے تو کہتے ہیں پھر کسے سنیاس

تمام عمر کٹی ایک ہی قسمہ سینے پر
گرایا اپنا لہو قوم کے پسینے پر

ارباب قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہین۔

یہ کار خیر وہ ہو تمام چار سو رہ جائے | تمہاری بات زمانہ کے روبرو رہ جائے
جو غیر ہین انھین ہنسنے کی آرزو رہ جائے | غریب قوم کی دنیا مین آبرو رہ جائے

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو
فقیر قوم کے آئے ہین جھولیان بھر دو"

کیا خوب بند ہے اور کیسا پُر درد "فقیر قوم کے آئے ہین" الخ۔ اس مصرع کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ نظم کے پہلے مصرع مین آپ نے محبان وطن کے لیے گدایان وطن کا لفظ استعمال کیا اور آخر تک اسی پر زور دیا ہے۔

شام موہن لعل جگر

غزل

دشت غربت ہے، کُنج تنہائی | موت آئی بھی تو کہان آئی
ساری دنیا بنی تماشائی | اللہ اللہ تری خود آرائی
ہائے ری میرے غم کی رسوائی | مین جو رُویا اونھین ہنسی آئی
عاشقی کا مزا ہے فرقت مین | وہ بھی کیا آرزو، جو بر آئی
کچھ کہوں مُنہ سے کچھ نکلتا ہے | عشق نے کر دیا ہے، سودائی
حال بیمار غم۔ ارے توبہ | موت بھی پھر رہی ہے گھبرائی
میری تصویر دیکھنے والے، | سچ بتا کچھ تجھے پسند آئی
ہجر کا قصہ مختصر یہ ہے | مر گئے ہم مگر نہ موت آئی

کوئی تسکین کو بُرا نہ کہو،
ہو گیا ہے غریب سودائی

محمد یسین تسکین رسولپوری

گنجینۂ اُور کلدان

محاضرہ مسٹر سی۔ لیونارڈ۔ وولی

متعلقہ حفر خرابات اُور

تمدن عراق از زمانِ اُور۔ آنغور (۲۰۰۰ سال قبل مسیح) تا زمانِ بخت نصّر۔

اور۔ بغداد و بصرہ لائن پر ایک ریلوے اسٹیشن ہے جسکی نسبت قدیم زمانہ کی تاریخ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہاں پر بادشاہ اُور انغور کے تعمیر کردہ شہر اور خدائے قمر (GOD OF MOON) کی ہیکل کے آثار مدفون ہیں چنانچہ پچھلے دو ایک سال سے کچھ لوگوں نے اسکے خرابات کو کھود کر کچھ چیزیں برآمد کی تھیں لیکن امسال برٹش میوزیم اور پنسلوینیا یونیورسٹی نے بعض ماہرین علم آثار قدیمہ کو مسٹر سی لیونارڈ وولی کی ماتحتی میں روانہ کیا جنہوں نے بہت سی نادر اشیاء برآمد کیں چنانچہ مسٹر وولی لنڈن واپس جاتے ہوئے بغداد تشریف لائے اور مدرسۃ العسکریہ بغداد میں اپنی معلومات کا حال نہایت ہی فصیح اور بلیغ عبارت میں بیان فرمایا جس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

شہر اُور کی نسبت جسے لوگ غلطی سے کلدانیوں سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے کوئی شہر اس نام کا نہیں آباد کیا) مشہور ہے کہ وادی رافدین (دجلہ فرات) میں اگر سب سے قدیم نہیں تو کم از کم قدیم ترین شہروں میں سے ایک ضرور ہے۔ شہر اُور مساحت میں شہر بابل سے زیادہ مگر وسعت میں اس سے کم تھا۔ پھر بھی اسکے خرابات کو دیکھکر کہا جا سکتا ہے کہ اسکا رقبہ بہت بڑا رہا ہوگا۔ اتنے زبردست خرابہ کا کھودنا کوئی مہینہ دو مہینہ کا کام نہیں ہے۔ پہلے اسوقت تک جو حصہ اسکا ہمنے کھودا ہے اسکو اس حصہ کا جو کھدنے کو رہ گیا ہے ایک جزو سمجھنا چاہیئے۔

اس سے پیشتر ۱۸۵۴ء میں مسٹر ٹیلر MR. TAYLER نے بھی اس خرابے کو کھودا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہمارے پاس ان کی کارگزاریوں کی بہت ہی کم اطلاع ہے کیونکہ اس زمانہ میں لوگ حفر خرابات کا کام محض قسمت کا سودا سمجھکر کیا کرتے تھے۔ اور یہی وجہ

ہے کہ اپنی کھدائی کے دوران مین سنگے نتیجہ کو قلمبند کرنے کی پروا نہ کرتے تھے تاکہ [illegible]
کے حق مین جو ان کے بعد اس کام کو کرنا چاہتے ہین بیحد ہی مضر ہوتی ہے [illegible]
ہال صاحب (DR HALL) برٹش میوزیم BRITISH MUSEUM
سے اسی اُور کے کھنڈرون کو کھدوانے کی غرض سے بھیجے گئے چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف
کچھ اس ضمن مین کیا وہ بذات خود جلیل القدر تھا لیکن سب سے بڑا فائدہ جو اُس سے
ہوا یہ تھا کہ آیندہ اسی قسم کے کام کرنے والون کے حق مین ہدایت کا کام دیتا رہیگا۔ چنانچہ ہم آج
کے نقش قدم پر چل رہے ہین۔

اس زمانہ مین ہمنے جن دو خندقون مین کھدائی کا کام شروع کیا تھا ان کا پتہ ہمکو ڈاکٹر
ہی کی کتاب یادداشت سے چلا تھا۔ کام شروع ہوتے ہی معلوم ہوگیا کہ بغیر محنت شاقہ کے
خندق کی کھدائی کا نتیجہ حاصل نہو گا۔ اسلیے ہمنے اسکو چھوڑکر دوسری خندق مین کام لگایا۔
کانات برآمد ہوے۔ جنکی تحقیق مین ہمنے اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ صرف کیا ہے۔ اُن
سے جو ہوائی جہاز کے ذریعہ سے لیگیئین۔ پتہ چلا کہ قدیم آبادی ایک وسیع قصبہ کی شکل مین
چارون طرف دیوار سے گھری ہوئی تھی۔ دیوار کے بیرونی طرف ایک اچھا خاصہ میدان تھا اور
طرف ایک اور احاطہ قلعہ کی شکل کا تھا۔ اس دفعہ ہمنے حضر عادیات کے مقابلہ مین خندق کی کھدائی
زیادہ وقت صرف کیا جس سے مقصد یہ تھا کہ ہمکو یہانکی جغرافیائی حالت بخوبی معلوم ہوجائے
پہلے ہی سے عزم کرلیا تھا کہ حال مین ڈاکٹر ہال صاحب ہی کی تقلید کرینگے اسلئے پہلے کام
احاطہ مین شروع کرایا، اس احاطہ کی لمبائی تخمیناً ۴۰۰ گز اور چوڑائی ۲۰۰ گز ہوگی، احاطہ
کی خاص خاص عمارتین ہین۔

اس احاطہ کی ساخت کا نقشہ یہ ہے کہ اسکے ہر پہلو مین بجائے ایک کے دو دیوارین ہین
مین متعدد حجرے اور غرفے بنے ہین، ہر دیوار قریب ۹ فٹ کے چوڑی ہے اور درمیانی حصہ کی
چوڑائی ۱۳ فٹ ہے، اس طرح سے بیرونی جانب سے دیوار تقریباً ۳۰ فٹ چوڑی نظر آتی
دیوارون کی بلندی دس فٹ سے زیادہ ہے، اور ہر دیوار اب تک بالکل ہی عمدہ حالت
دیوارین کچی اینٹ کی ہین اور ان کی دوہری تعمیر سے مدعا یہ تھا کہ احاطہ کے اندر کی جانب

مساجد سے ملحقہ مقدس رہیں۔ دیوار کے باہری سمت پر نمائشی پشتے بنے ہوئے ہیں اور جا بجا گہرے خط کھچے ہوئے ہیں جس سے ہموار دفاعی نمائش ہی ہوگی اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان چیزوں سے دیواروں کی کما حقہ زینت ہوگئی ہے۔

اس دیوار کی تاریخ بھی عجیب و دلچسپ ہے۔ میں نے آپ حضرات کے سامنے بیان کیا ہے کہ اُور ایک نہایت ہی قدیم شہر ہے اور قدامت کے لحاظ سے اس ولایت کے بعد پرانے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُور اوّل اوّل ایک قریہ تھا اور رفتہ رفتہ قصبہ ہوگیا۔ اس زمانہ کا رواج یہ تھا کہ لوگ اپنے اسلاف کے منہدم مکانات کے کھنڈروں پر مکانات بناتے تھے اسلئے قدرتاً کچھ عرصہ میں اُور کی آبادی کے زمین قرب و جوار کی زمین سے اونچی ہوگئی یہاں تک کہ بالکل ٹیلہ کی شکل اختیار کرلی جیسے جیسے قصبہ کی آبادی بڑھتی گئی ویسے ویسے نئے ہیکل بنتے گئے جنکی صفائی اور مرمت مذہبی عبادت گاہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ہوتی رہی خلاصہ یہ کہ ہیکل تو نشیب ہی میں رہی اور قصبہ کی زمین حسب معمول اونچی ہوتی گئی گو ٹھیک زمانہ نہیں بتایا جاسکتا لیکن قیاس کہتا ہے کہ ۲۰۰۰ یا تقریباً ۱۰۰۰ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا ہوگا۔

اُور انگور (۲۳۰۰ سال قبل مسیح) کا جو خاندان اُور کا بانی تھا۔ یہ ارادہ ہوا کہ شہر پناہ کے اندر ہیکل والے رقبہ کے گرد ایک احاطہ تعمیر کرائے چنانچہ اسنے ایسا ہی کیا مگر اس احاطہ کو ہیکلوں کے رقبہ سے ذرا کچھ بڑھاکر بنانا چاہا اور اسی لیے مسکونہ آراضی کا ایک حصہ اسکے اندر شامل کرلیا جس سے اسکا منشا غالباً یہ رہا ہوگا کہ معبد سے الگ مگر ہیکل سے بالکل ہی قریب اپنی سکونت کے لیے ایک محل تیار کرائے گو ابھی تک اس محل کا پتہ نہیں چلا لیکن گمان غالب ہے کہ ہیکل کے قریب ہی کہیں پر ہوگا اب رہا یہ امر کہ اس احاطہ کی دیواروں کے زیادہ تر حصہ تعمیر کرانے والوں کے نام کیا تھے، اسکے لیے ہمکو ۲۰۰۰ سال قبل مسیح کی تاریخ دیکھنی ہوگی۔

الغرض کھودتے کھودتے ہمکو اس احاطہ کے داخلے کے پھاٹک نظر آئے ہر دروازہ کے دونوں طرف صندوق نما چھوٹے چھوٹے مربع چبوترے ملے جو پختہ اینٹوں سے بنے تھے ان کی تعمیر کا مقصد یہ رہا ہوگا کہ دروازوں کی چوبوں کے قریب کے دروازوں سے گرد و غبار اندر نہ جانے۔ غالباً ہر دروازہ کے سنگ بنیاد پر کندہ عبارت کندہ نظر آئی اور ایک پتھر پر بورسین کا نام کندہ ہوا ملا جو اُور کا بادشاہ تھا اس انکشاف سے پتہ چلا کہ صرف دو ہی پشتوں کے بعد ضروری مرمت کی حاجت لاحق ہوئی

چنانچہ عبادت کے معافت کرنے کے لیے کہ مرمت کا خیال سب سے پہلے کس کے دل میں پیدا ہوا تھا انھوں نے
اُن مسطح دقی ناچیزوں میں سے ایک کو توڑا جسکی اینٹوں پر کندہ شدہ عبارت سے پتہ چلا کہ اکثر تو
۲۰۰۰ قبل مسیح کی اور بعض اس سے بھی پیشتر کی تھیں کچھ اینٹیں عہد بابل کی بھی ملیں اسکے تو دیسی تھیں جنپر
بخت نصر کا نام لکھا ہوا تھا۔ ایک پر نبونیدس (۵۵۵ ق۔م) کا نام تھا اور ایک اور ملی جسپر کورش کا نام
؛ SYRIUS THE GREAT کا نام کندہ تھا مگر تاریخ بابل میں کورش کے علاوہ اور کسی کا
پتہ نہیں چلتا جنے شومری خداؤں SUMERIA GODS کے ہیکل کی خدمت کا قلادہ اپنی گردن
میں ڈالا ہو۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ کورش سا بادشاہ جسکی نسبت عام طور پر مشہور ہو کہ یہودیوں کے
اللہ کی پرستش کرتا تھا اور جسکی بابت ایرانیوں کا خیال ہو کہ پکا زردشتی تھا اُور کلدان کے خدا سے
ڈر کے لیے ہیکل تعمیر کرائے۔ لیکن کورش کا تقلب اعتقاد کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ اُسی کے
ایسے ایک اور زبردست بادشاہ ہنری چہارم (۱۹۱۰ - ۱۵۵۳) شاہ نوار HENRY IV
KING OF NAVARRA نے بھی ایک مرتبہ کہا تھا کہ مجھے بھی ہو تو میں پیرس PARIS کو ایک
خداس MASS کے عوض میں لینے کے لیے تیار ہوں۔

احاطہ کی چار دیواری سے قطع نظر کرتے ہوئے، فتح ترین تعمیر جو ہمکو ملی وہ زقرتا ZIGGURANT
ہے۔ یہ ایک نہایت ہی مضبوط اور متین عمارت ہے جسکی شان بالکل ہی بابلی عمارتوں کی سی ہے۔ اس
زقرتا میں چار درجے ہیں اور اوپر کے تین درجے نیچے والے درجہ سے چھوٹے ہیں زقرتا کی ساخت ایک مینار
یا برج کلیسا کی سی ہے بظاہر اسکی تعمیر سے کوئی فائدہ مقصود نہیں ہوتا لیکن اسکی ساخت بتلاتی ہے کہ یہ
تھا سے زمین و آسمان یعنی وہ مقام جہاں پر زمین و آسمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص
اسکی چوٹی پر جا کر کھڑا ہو تو بس سمجھ لیجیے کہ عالم بالا میں داخل ہو گیا۔ اس زقرتا کی تعمیر اُور نمو کے
ہاتھوں شروع ہوئی تھی لیکن اسکی شش سالہ حکومت کی قلیل مدت میں حد تکمیل کو نہ پہونچ سکی آخرکار
اُسکے بیٹے نے جسنے ۵۰ سال تک حکومت کی اپنی وفات سے پہلے (غالباً ۲۲۰۰ ق۔م میں) اسکو تکمیل
کرا دیا۔ اور بعد ازاں (غالباً ۵۵۵ ق۔م میں) نبونیدس نے اسکے برج میں نیلے رنگ کی چمکدار اینٹیں
جڑوا دیں۔ چنانچہ اس قسم کی چند اینٹیں ہمکو ملیں جنکو دیکھکر بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ سطح میدان
سے قریب دو سو فٹ بلند عمارت جسکے برج کی چمکدار اینٹوں پر شعاع آفتاب میں کیا منظر [illegible]

شان کی ہوگی۔

ہمارے مزدوروں کو کھودتے کھودتے ایک بوسیدہ چھت ملی جسکی ساخت بالکل زمانۂ حال کے بغداد کی چھتوں کی سی ہے۔ اس چھت کے نیچے ایک سنگی بت ملا جسکو ہمنے لندن روانہ کر دیا ہے۔ وہاں کے علمائے عادیات اسپر کندہ کی ہوئی عبارت کو پڑھنے کے بعد اسکو پھر واپس کر دینگے۔ اور تب یہ بت عراق کے عجائب خانہ مین رکھدیا جائیگا۔ اس بت کا سر غائب ہے اور یہ بت اینا توم ENNATUM نامی بادشاہ کا ہے جو ۲۹۰۰ سال قبل مسیح حکمران تھا۔ لیکن اُور کا نہین بلکہ کسی اور مقام کا۔ میرا قیاس ہے کہ ایک وقت مین اُور اور شہر لغاش LAGASH مین کسی بات پر نزاع ہوئی چنانچہ شہر لغاش پر چڑھائی کی گئی جسمین اُور کے لشکر کو فتح ہوئی اور وہان سے واپسی کے وقت لوگ اس بت کو نشان فتح کے طور پر لے آئے، اور لاتے ہی اسکا سر توڑ ڈالا تاکہ فریق مخالف کو معلوم ہو جائے کہ دشمن کی سرکوبی اسطرح کیجاتی ہے۔

خدائے قمر کا حرم اُور کے اُسقف اعلیٰ کا جو عموماً شہزادہ ہوتا تھا مسکن تھا جسکو یہ حق بھی حاصل تھا کہ خود ہیکل کے اندر والے عالیشان قصر مین رہے۔ یہان پر ۲۳۰۰ سال قبل مسیح کی تعمیر کردہ پکی دیوارین ملین جو اب بھی قد آدم سے زیادہ بلند کھڑی ہین۔ حرم کوئی عام لوگون کی پرستش کا مقام نہ تھا بلکہ خدائے قمر کے لیے وقف تھا۔

واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کئی مرتبہ اس ہیکل کی تعمیر از سر نو ہوئی مگر جیکے اصلی نقشہ مین ذرا بھی فرق نہین ہوا، تیسری مرتبہ اسکی جدید تعمیر اُور انگور کی طرف سے ہوئی تھی اور اسکے بعد اسکے بیٹے بورسین نے ضروری مرمت کراتے ہوئے اسکی ایک دیوار کو نئے سرے سے پکی اینٹون سے بنوا دیا۔

ابتدائے زمانۂ تعمیر سے جو غالباً ۳۶ سنہ ق.م ہوگا (کیونکہ کوئی معین زمانہ معلوم نہین) سنہ ق.م تک عمارت کے نقشہ مین ذرا بھی تغیر نہین ہوا۔ جو نیا بادشاہ ہوا اپنے سلف کی تعمیر مین کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا گیا اور اب اس ۱۲ فٹ پختہ دیوار کی تعمیر مین جو زمانہ کی دستبرد سے باقی رہ گئی ہے تین ہزار سال کی تاریخ مضمر ہے، اور صرف چنانچہ دستکاری کے نمونہ مین متعدد تعمیر کنندون کے نام نہان ہین۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ ایک وقت مین قصبۂ اُور پر کسی دوسرے بادشاہ کا قبضہ ہوگیا جنے اسکے

وسعت و مضافات کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ حتیٰ کہ خدائے قدیر کے ہیکل کو بھی نقصان پہنچایا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ایک بادشاہ نے (جس کا نام معلوم نہیں ہوا) لیکن پھر اس بادشاہ سے ہمیں لیا اور پھر اس ہیکل کی تعمیر کرائی اور اس مرتبہ وہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں جنہیں خدائے قدیر کے سامنے نذر مانی گئی ہوں جو مانی تھیں ہیکل کی بنیاد کی تعمیر کے لیے گارا وغیرہ ملانے میں استعمال کی گئیں۔ چنانچہ ایسی محلوں کی متعدد کشتیاں ہم کو فرش ہیکل کے نیچے دستیاب ہوئیں۔ انہی سے بعض منقش تھیں لیکن عجیب ساخت کی تھیں کچھ پر ۲۰۰۰ سے لیکر ۲۲۰۰ ق۔م تک کے کتبے نظر آئے۔ علاوہ ازاں کے ایک سمندھ کا بنا ہوا صندوق بھی نکلا جو غالباً مصر سے آیا ہوگا۔ یہ ساری چیزیں باقاعدہ طور پر فرش کے نیچے چنی ہوئی تھیں۔ اب میں آپ حضرات کے سامنے اُس زمانہ کا کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں جبکہ خدائے قدیر کے ہیکل میں زبردست تغیر واقع ہوا۔ نبوکدنضر جب بادشاہ ہوا تو سب سے پہلا کام جو اُس نے کیا یہ تھا کہ خدائے قمر کے ہیکل کو ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ قدیم معبد میں تو اُس نے ذرا بھی دست اندازی نہیں کی اور بیرونی دیواریں جوں کی توں رہیں لیکن معبد کے سامنے کے کمروں کو گروا کر ان کی جگہ پر ایک بڑا سا دوہرا احاطہ تعمیر کرا دیا۔ ہم کو اسی نبوکدنضر کی تعمیر کردہ قربانگاہ بھی ملی جس پر چونے کا پلاسٹر کیا ہوا ہے۔ لیکن قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اُس پر سونے یا اور اسی قسم کی کسی دھات کے پتر چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ہی منبر یا دری کی نشست والی چوکی بھی ملی۔ ہیرودوطس کا بیان ہے کہ بابل میں بھی اسی قسم کا ایک ہیکل ہے۔

زِگرات کے قریب ہی ایک متوسط درجہ کا ہیکل ملا جس کے اندر سونے کے تخت پر ایک طلائی بت نصب کیا ہوا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ اسی ہیکل کے سامنے قربانی والے وہ جانور پیش ہوتے تھے جو دراصل ذبح نہیں کیے جاتے تھے چنانچہ اس کے ایک بڑی قربانگاہ ہوگی جس میں جانور ذبح کیے جاتے ہونگے گو اس قسم کی کوئی قربانگاہ برآمد نہیں ہوئی لیکن صحن ہیکل میں معبد کے قریب ایک نالی نکلی جس سے سوا اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ قربانگاہ نہیں رہا ہوگی اور یہ نالی اس اندازے بنائی گئی ہوگی کہ خون کی برکت سے کل عمارت بھی مقدس ہو جائے۔

انجیل کی کتاب دانیال میں لکھا ہے کہ نبوکدنضر نے حکم دیا کہ ایک بڑا سا بت تیار کیا جائے کہ ہر شخص اُس کے آگے سر عبادت خم کرے۔ چنانچہ اس حکم کے ذریعہ سے اُس نے ایک نئی رسم کی بنیاد ڈالی۔ علاوہ

واسطے خدا کو حجرہ سے نکلوا کر ایک کھلی جگہ میں رکھوا دیا تاکہ ہر خاص و عام اسکے سامنے
عبادت ادا کرنے کا موقع پا سکے۔ اور اسی وجہ سے ایک شاندار اونچا ہوا عالیشان مندر تعمیر کرایا ہے
بلکہ قدیم معبد میں جدت کر کے بخت نصر نے جمہور کو بھی خاص عبادت سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔
اسی سلسلہ میں ہمنے ایک منہدم کنوئیں (چاہ) کو بھی کھدوانا شروع کیا ابھی صرف ۲۰ فٹ کی گہرائی
تک کھدا ہو گا کہ بارش شروع ہو گئی جس سے کنواں لبریز ہو گیا اسلئے مجبوراً اس کام کو آیندہ فصل
کے لیے اٹھا رکھا گیا۔

میرا خیال ہے کہ اس کنوئیں میں انکشافات کا بہت بڑا ذخیرہ ملے گا۔ کیونکہ صرف نصف
گہرائی تک کھودے جانے پر اسمیں بہت سی مخروطی شکل کی مٹی کے ٹکڑے جنپر بادشاہوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔

ہیکل بخت نصر کے معبد کے ایک خوشنما کمرہ کا فرش ایرانیوں کے زمانہ کا ملا اور اسکے قریب
والے کمرے کا فرش بابلیوں کے زمانہ کا ہے۔ میرا ارادہ ہوا کہ ایرانیوں والے فرش کی ایک تہہ کو کھود کر دیکھوں کہ اسکے
نیچے کوئی فرش بابلیوں کے زمانہ کا سا ہے یا نہیں۔ چنانچہ میں نے عربی قلی کھودنے کے
لیے لگا دیے۔ اور خود ایک دوسری طرف کھدائی کا کام دیکھنے کے لیے چلا۔ ہنوز راستہ ہی میں تھا کہ
ایک عربی لڑکا ہانپتا کانپتا دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ آپ فوراً واپس چلیں۔ الغرض اسکے کہنے
پر جب میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قلیوں نے اس فرش کے نیچے سے کچھ قدیم جواہرات کھود کر
نکالے ہیں اور ایک عربی کی عبا پر سونے چاندی کے متعدد ٹکڑے اور دیگر اقسام کے زیورات
پھیلے ہوے ہیں۔ میں نے قلیوں کو تو باہر نکال دیا اور خود تحقیقات کے لیے اندر گھس گیا۔ تلاش
کرتے کرتے متعدد ٹوٹے پھوٹے قیمتی پتھروں کے دانے یشب عقیق اور فیروزہ کے نگینے اور
متعدد چاندی اور سونے کے زیورات نکلے تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا جا کر میرے خیمہ سے کئی ایک
صندوقچے اور روئی لے آیا۔ چنانچہ قلیوں کے جمعدار نے ایک صندوقچہ کو اٹھایا اور ایک آہ
سرد بھر کر اپنی جیب سے زیورات نکالے اور کہنے لگا "صاحب پہلے میں نے آپ کو یہ چیزیں
نہیں دکھلائیں کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں دوسرے عربی مار نہ ڈالیں"۔

ایک دوسرے موقع پر خدائے قمر کے حرم کے ایک گوشے کے کھدوانے کی نیت سے میں نے
قلیوں کو حکم دیا کہ اسکو نیو تک کھودنا چاہیے پھر تکونی پختہ مٹی کے صندوق میں ایک پتھر کا ایک بُت

بیان کیا کہ ان عربون کو اس بات کا پورا یقین تھا لیکن کہتے تھے یا نتک کہ بت جس کا یہ خود اکد اہور کا مجسمہ تھا اسکے سر پر اس جدید عمارت کی پہلی اینٹ رکھی تھی۔ اسکے بعد مین نے ان مزدورون سے کہا کہ مجھے امید ہے کہ اس بت کے نیچے ایک پتھر کا تختہ ملیگا جسپر ہیکل کی تعمیر کا سارا حال لکھا ہوا ہوگا چنانچہ مینے خود ہی گھٹنون کے بل جھککر گڈھے کے اندر ٹٹولا اور پتھر کو کھینچکر باہر نکال لیا بجلی دیکھنے سے پتہ چلا کہ پتھر بالکل صاف تھا اور اسپر کچھ بھی لکھا نہ تھا۔ مینے ان مشتاق نگاہ قلیون سے کہا کہ کاتب لکھنا چاہتا تھا مگر یہ سمجھکر کہ جب زمین کے اندر رہیگا تو لکھنا نہ لکھنا دونون برابر ہین اُسنے قصداً لکھنے سے گریز کیا یہ سنتے ہی قلیون کا جمعدار بولا "واہ رے عرب چار ہزار سال گذرنے پر بھی عادت نہ بدلی کیونکہ آجکل بھی اگر کسی عرب کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلان کام کرنے مین کا حصہ اجرت نہ ملیگی تو وہ بھی ٹال مٹول کر دیگا" اس پتھر کو دیکھکر ان عربی قلیون کے دلونپر بہت بڑا اثر ہوا کیونکہ انہون نے سمجھا کہ ایک عجیب چیز ملی جس سے یہ پتہ چلا کہ صدیان گذر جانے پر بھی طبیعت مشکل سے بدلتی ہے۔

اب مین اپنی تقریر کے اختتام پر یہ عرض کرنا چاہتا ہون کہ موجودہ کامیابی کو دیکھتے ہوئے مجھے ہر طرح امید ہے کہ آیندہ کئی سال کھدائی کا کام جاری رہیگا اور کامل یقین ہے کہ صرف چند سال کی محنت اس ملک کی تاریخ پر کافی روشنی ڈال سکیگی، اُور کا مقام قدامت کے نقطۂ خیال سے بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسنے مختلف سلاطین کے زمانے دیکھے ہین اور اس وقت تک بالکل ہی محفوظ حالت مین ہے برخلاف اسکے بابل صرف بخت نصر کے وقت کا ہے جسکو بہت زمانہ نہین ہوا، اُور ہی مین ایسی اینٹین ملی ہین جو ۲۳۰۰ سال قبل مسیح بلکہ اس سے بھی پیشتر کی ہین اور ان کے علاوہ اور چیزین ہین جو ۲۹۰۰ سال قبل مسیح کی ہین۔ آیندہ فصل مین کھدائی کے بعد ہم یہ کہنے کے قابل ہو جائینگے کہ اہل جرمنی کو گیارہ سال کی لگاتار اور جانتوڑ کوشش کے بعد بابل کا جو کچھ حال معلوم ہو سکا اس سے کہین زیادہ ہمکو اُور کی بابت علم ہے۔

اس قسم کی کامیابی کا دارومدار قسمت پر ضرور ہے لیکن ہمین بھی شک نہین کہ اس سے آیندہ اس قسم کے کام کرنیوالونکو بہت مدد ملیگی اور کیا عجب ہے کہ صرف چند ہی سال کی محنت ہمارے علم مین جو عراق کی قدیم تاریخ کے بارہ مین ہے ایک تغیر عظیم پیدا کر دے۔

(ترجمہ)

سید مظہر حسین جعفری

کھدر کا ہار

عابد دو سال کی قید سخت بھگتنے کے بعد مکان واپس آ رہا تھا۔ تمام عزیز و اقارب اس خادم قوم کا استقبال کرنے کے لیے اسٹیشن پر جمع تھے، عام طور پر دلوں میں ایک قومی جوش موجزن تھا، اور سب کو ہمارے نوجوان دوست کی عزت افزائی منظور تھی۔ گاڑی آنے سے گھنٹوں پہلے باشندگان شہر ریلوے اسٹیشن پر جمع ہونے لگے۔ اسوقت پلیٹ فارم پر ایسی بھیڑ ہے کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں ۔ ہر شخص جوش مسرت سے پھولا نہیں سماتا۔

آج وہ جان نثار قوم دو سال تک جیل کی سختیاں جھیلنے کے بعد واپس آ رہا ہے جس نے اپنی ساری مسرت و آسائش ملک اور قوم پر نثار کر دی ایسے مایۂ ناز نوجوان کے خیر مقدم کرنے میں کسے فخر نہ ہوگا۔ گاڑی آتے ہی قومی نعروں کی آواز گونجنے لگی۔ عابد مسکراتا ہوا پلیٹ فارم پر اترا ہار پہنائے جانے لگے۔ چاروں طرف سے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ راستہ ملنا دشوار تھا، غرض قومی نعروں کی جوش میں اور پھولوں کی بارش میں عابد اسٹیشن کے باہر آیا، اور ایک بڑا شاندار جلوس عابد کے ہمراہ شہر کیطرف روانہ ہوا

عابد مکان پر آیا۔ باہر لوگوں سے ملکر اندر گیا۔ ماں نے کلیجے سے لگا لیا۔ پیشانی پر بوسہ دیا، اپنے بچھڑے ہوئے لال کو دیکھکر ماں کو جو خوشی ہوئی بیان نہیں ہو سکتی۔ گائے اپنے کھوئے ہوئے بچھڑے کو پاکر جس قدر خوش ہوتی ہے، اتنی ہی خوشی عابد کی ماں کو بھی ہوئی،

بلائیں لیتی جاتی تھی اور جیل کے حالات دریافت کرتی جاتی تھی۔ اتنے میں ایک نوجوان حسین لڑکی آئی اور ہار پہنانے کو آگے بڑھی۔ عابد نے اسکی طرف دیکھا۔ نگاہیں ملیں ۔ لڑکی کا چہرہ چمکنے لگا۔ آنکھیں خود نیچی ہو گئیں۔ ہار ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ عابد کی ماں نے کہا

پتنالہ بھلا [illegible] معلوم کس بات کی ہے۔ بیچا عابد یہ یوسف جنگ کی صاحبزادی [illegible] کو ترک
ملاقات سے پوری ہمدردی ہے۔ امینہ نے جی کڑا کرکے ہار پہنا دیا۔ ہار گلے میں پڑنا تھا کہ عابد کے
جسم میں ایک سنسناہٹ پیدا ہو گئی۔ گویا رگ رگ میں ایک بجلی کی رو دوڑ گئی۔ عشق و محبت
کی لہر بجلی سے بھی زیادہ ہوتی ہے

(۲)

جلوۂ معشوق دنیائے عشق کا ایک دلپذیر فرحت بخش منظر ہے۔ اس نظارے کی ایک سرسری جھلک ہی انسان کو از خود رفتہ کر دیتی ہے۔ صرف ایک جھلک کے لیے عاشق خوش نصیب اپنا دین و ایمان سب کچھ قربان کر دینے کو طیار رہتا ہے۔

اوروں کو تو جلوۂ محبوب کی تمنا ہی رہتی ہے۔ مگر عابد خوش نصیب تھا۔ کہ محبوبۂ دلنواز سے ملاقات بھی ہوئی۔ اوس ظالم نے ہار بھی پہنایا۔ جسکے پہنتے ہی عابد میں عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ صدہا خوابیدہ خیالات جذبات اور اُمیدیں یکایک بیدار ہو گئیں۔ سین تبدیل ہو گیا۔ دنیائے خوشگوار کا ایک نہایت دلکش نظارہ پیش نظر ہو گیا۔ جیسے خواب سے یکبارگی آنکھیں کھل گئی ہوں۔

عابد اس ہوشربا نظارے کے بعد اپنے کو بالکل بھول گیا، اب اسے اپنی بالکل خبر نہیں، جیل میں جب تک خوراک وغیرہ کے معاملے میں اکثر جیلر سے لڑا۔ اکثر خراب کھانا ملنے پر فاقہ کشی کی ○ اور جیل کے افسروں کو انکی مذموم روش پر تنبیہ کی لیکن اب وہ سب بھول گیا نوکر ابھی آیا تھا کہ لالہ میاں کھانا تیار ہے اس سے کہدیا چلو آتے ہیں " پھر بھول گیا " اور اپنے خیالات میں محو ہو گیا، گھنٹوں سے اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا امینہ کی خیالی صورت کا نظارہ کر رہا ہے، اُسکی وہی نازک نازک کلائیاں ...... اُسکی وہی سرگیں آنکھیں۔ اُسکا وہی ادا سے آگے بڑھنا، رکنا، اور آنکھیں نیچی کر لینا۔ نظر کے سامنے ہے۔

پھر خود بخود چونک کر کہتا ہے آہ موقع نکل گیا شومی قسمت کو دل ہی دل میں کوستا ہے کہ افسوس اُس وقت اُسی جان موجود تھیں دل کا ارمان دل ہی میں رہ گیا۔ لیکن اظہار

تھی اب کیون فکر کرون ہماری امینہ تو موجود ہے۔ نہین اس امینہ اور اُس مین فرق ہے
وہ امینہ تھی اور یہ اسکا خیال۔ وہ مجسم امینہ تھی اور یہ اُسکا خیالی پرتو

—— ۳ ——

امینہ کا دل بھی انکی انقلاب جدید سے متاثر تھا، کیوپڈ کے زہر آلودہ تیر دونون جانب چلتے ہین۔ جب امینہ عابد کو ہار پہنانے آئی تھی تو اُس کے دل مین صرف اس جانباز قوم کی حوصلہ افزائی کا خیال تھا، جب سورما اور بہادر راجپوت مسلح ہوکر جنگ کے لیے تیار ہوتے تھے یا میدان کارزار سے فتحیاب واپس آتے تھے تو اُنکی عزیز راجپوت دیویان خود اپنے ہاتھون سے زرہ بکتر پہناتی تھین اُنکے پیشانی پر صندل لگاتی تھین اور محبت سے آرتی کرتی تھین۔ امینہ نے بھی انھین جذبات سے متاثر ہو کر عابد کو ہار پہنایا تھا۔ اسکے دل مین وہی پاک جذبات موجود تھے جو اُن راجپوت مستورات کے دلون مین موجزن ہوتے تھے، امینہ عابد کی دل سے عزت کرتی تھی۔ یہ خیال اسوقت پیدا ہوا تھا جب عابد کے مکان کو پولیس نے گھیر لیا تھا۔ امینہ اپنے مکان کی چھت سے دیکھ رہی تھی۔ کہ عابد نے کس ہنسی خوشی سے اپنے کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ چہرے پر جوش مسرت کے آثار نمایان تھے۔ وہی تصویر امینہ کے دل مین ابھی تک موجود تھی۔ تنہائی مین وہی تصویر دل سے نکلکر آنکھون کے سامنے آجاتی تھی۔ وہی خندہ پیشانی وہی سبزہ آغاز وہی سرخ و سفید رنگ وہی کھدر کی پوشاک نہایت محبوش وضع معلوم ہوتی تھی۔ امینہ سمجھتی تھی، کہ عابد انسان نہین فرشتہ ہے اُس کا دل بھی ہے۔ قومی جذبات کا گہوارہ بنگیا اور اُسنے چرخہ کاتنا شروع کیا، باپ کی خفگی برداشت کی ماں کی جھڑکی سہی، لیکن اُسنے سوائے کھدر کے کچھ پہننا منظور نہ کیا۔ آخر عابد کے رہائی کا وقت نزدیک آگیا، امینہ نے اپنے کاتے ہوئے سوت سے ایک ہار بنایا۔ یہ وہی ہار تھا جو عابد کے گلے مین پڑا تھا، وہی ہار تھا جس نے کسی کے پوشیدہ خیالات کو زبان حال سے دوہرا دیا۔ امینہ کی زبان اگر بیان کرتی تو شاید اس خوبی سے بیان نہ کر سکتی

اُس روز کی ملاقات کے بعد امینہ کے نظرون مین عابد کی عزت دوبالا ہو گئی، اور اسکے

دل مین محبت کا پودا باقاعدہ نشو و نما پانے لگا۔

(۴)

عابد کا دل ایک عجیب کشمکش کا جولانگاہ بن گیا۔ اس مہم کے دو فریق تھے فرض اور محبت فرض یہ کہتا تھا کہ یہ حسن و عشق کا موقع نہین۔ زمانہ کے موافق کام کرنا دانشمندی ہے۔ قومی فرائض کا تقاضا تھا کہ محبت اور ارمانون کی ان لہرون کو دبا دو جو دل کے جذبات کو دوسری طرف بہائے لیے جاتی ہون اور عشق کے ان دونون کو قومی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دو جو جذبات قومی کے سد راہ ہون، لیکن عشق ایسا جادوگر ہے کہ پھر کسی منتر کا اثر نہین ہوتا، کالے کے آگے چراغ نہین جلتا، مشعل کی روشنی آفتاب کے سامنے نہین ٹھہر سکتی۔

انجام کار عابد محبت کا بندہ بنگیا اور اسکے خیالات پر جذبات محبت کی حکومت ہوگئی وہ چاہتا تھا کہ یہ خیال دل سے دور ہو جائے لیکن ناکامیاب رہا، وہ اشاعت و تحریک کے سلسلے مین گانوئن مین گھوم گھوم کر کسانون مین جوش پھیلا، کھدر پہننے چرخہ چلانے اور کانگریس کے ممبر بننے کے لیے ہر شخص کو مجبور کرتا۔ غرض دن دن بھر انہین خیالات مین مستغرق رہتا البتہ رات کاٹے نہین کٹتی تھی۔ تنہائی خوشگوار ضرور ہوتی ہے لیکن بعض حالتون مفید ثابت نہین ہوتی۔ تنہائی سے تصور کو خوب مدد ملتی ہے۔ سوئی ہوئی تمنائین بیدار ہو جاتی ہین۔ اور پھر اُن سے جان چھڑانا محال ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت مین کسی سے بات چیت کرکے جی بہلانا بھی ناگوار ہے موسم بہار اگرچہ ایک حرمان نصیب کے لیے بہت پریشان کن موسم ہے لیکن بسنت کے بعد آنیوالا چیت اور بھی بلا ہے۔ آم کے بور کی بھینی بھینی خوشبو چاندنی رات اور کوئل کی کوک کسی گرفتار محبت کے دل مین آگ لگا دیتی ہے اور محبوبۂ دلنواز کا شوق دیدار آتش مشتعل کی طرح بھڑک اٹھتا ہے۔ عابد اپنے خیالات مین مستغرق آم کے درختون کے نیچے ٹہل رہا تھا، اتنے مین کسی نے ایک چیتی کا ٹکڑا چھیڑا "نا ہی بھولے تمری صورتیا ہو را" عابد ٹھٹھک کر رک گیا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل سے یہ آواز نکل رہی ہے "نا ہی بھولے تمری صورتیا ہو را" اس کا دل اُس مرغ بے پر کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا جسکو صیاد نے پر کاٹ کے چھوڑ دیا ہو۔ عابد کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا اور

ہر وقت یا س ہی یاس نظر آنے لگی ۔ اسکے دل میں خیال آیا کہ اگر جلوۂ یار نہیں تو سجدۂ آستان یار ہی سہی ، ارادہ مصمم ہوگیا کہ اسی وقت چلنا چاہیے ، چنانچہ بغیر کسی کے کہے گھر میں پڑا ، ریلوے اسٹیشن ایک میل کے فاصلہ پر تھا جانے والی گاڑیاں سب جا چکی تھیں لیکن اتفاق سے ایک مال گاڑی اسی وقت آ گئی عابد نے گارڈ سے مکرر روانگی کا ارادہ ظاہر کیا ۔ گارڈ بھی قوم پرست تھا انہیں کھدر پہنے دیکھا کہا اچھا ، آؤ بیٹھ جاؤ ، ٹرین روانہ ہوئی ۔ گارڈ نے کانگریس کے حالات دریافت کرنے لگا لیکن ہوں ہاں کے سوا کوئی جواب نہ پا کر چپ ہوگیا ۔ عابد اپنے خیال میں محو تھا ، اسے دوسرے سے بات کرنے کی کہاں فرصت تھی ، جب گاڑی منزل مقصود پر پہونچی تو ۴ بج چکے تھے گاڑی سے اتر کر عابد سیدھا شہر کی طرف چلا گھر پہونچا تو صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی سامنے یوسف جنگ صاحب کا مکان تھا ، یہ ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگا ایک کھڑکی کھلی اور کسی نازنین نے مشرق کی جانب دیکھا ، آفتاب ابھی طلوع نہیں ہوا تھا ۔ باد نسیم کے خوشگوار جھونکے اس حسینہ کی زلفوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگے ۔ یہ منظر دیکھکر عابد کے دل پر سانپ لوٹ گیا ۔ نازنین نے عابد کو دیکھا اور مسکرا کر گردن جھکا لی ، یہ امینہ تھی ، عابد ابھی محو نظارہ ہی تھا کہ اسکا دوست واجد ادھر ہوا خوری کے لیے آنکلا ، عابد کو دیکھکر آگے بڑھا اسلام علیک کے بعد پوچھا

"کیوں بھائی عابد خیریت تو ہے ۔ کیسے پریشان نظر آ رہے ہو"

عابد کے جی میں آیا کہ واجد کو ساری کہانی سنا دے اور اسکو اپنا راز دار بنا لے لیکن حیا نے منہ پر مہر لگا دی ۔ کسی نے اندر سے کہا "راز دل افشا نہ ہو" بات بنا کر کہنے لگا ۔ "دورے پر گیا تھا دہیں سے آ رہا ہوں ۔"

(۵)

شمع کی روشنی پردۂ فانوس میں اور تیز ہو جاتی ہے ۔ محبت فانوس ہے ۔ سوز دل شمع ، پھر کیسے ممکن ہے کہ دل کے اندر کی جلن چہرے سے نہ نمایا ہو واجد تاڑ گیا کہ ضرور اس پردے میں کوئی راز ہے ۔ پریشانی سراسیمگی اور بیجا اسی اس امر کی شاہد ہے

کہ عابد کا دل کسی کے نگاہ ناز کا شکار ہو گیا، واجد نے کئی بار دریافت کیا اور اصرار کیا لیکن عابد نے کوئی بات نہ بتائی - واجد کو عابد سے دلی تعلق تھا - دونوں قریبی رشتہ دار ہونے کے علاوہ تھر بھی تھے - ایک ہی ساتھ تعلیم پائی ایک ساتھ کھیلے کودے - اپنے دوست کی یہ حالت دیکھکر اُسے صدمہ ہوا - اُس نے پوشیدہ طور پر پتہ لگانا شروع کیا کہ معاملہ کیا ہے - اکثر عابد امینہ کے مکان کی جانب دیکھا کرتا اور کبھی کبھی منہ سے ٹھنڈی ٹھنڈی سانس نکل جاتی - یہ دیکھکر واجد کو یقین ہو گیا کہ ہونہ ہو ناوکِ ناز جگر کے پار ہو گیا - تصدیق کی ضرورت تھی ایک دن واجد عابد کے کمرے میں بیٹھا تھا، عابد غسل خانے میں تھا میز پر عابد کی ڈائری پڑی تھی - اُٹھا لیا، دل نے کہا "کسی کی پرائیوٹ چیز دیکھنا مناسب نہیں"، پھر خیال آیا اچھا اسکینا ہو گا کیا، ورق اُلٹنے لگا ایک جگہ لکھا تھا "آہ محبت کیسی ظالم ہے جتنا میں اپنے کو اس کے پنجے سے چھڑانا چاہتا ہوں اس کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے - امینہ پیاری! امینہ تیری نگاہ میں کیا جادو تھا - واجد نے ڈائری بند کر دی - دل میں ایسا محسوس ہونے لگا گویا اس نے کوئی جرم کیا ہے - عابد غسل کر کے آیا تو اس سے نگاہ ملا کر باتیں کرنا دشوار ہو گیا - دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر دیکھتے دیکھتے عابد سے اجازت لیکر کمرے سے نکل گیا - واجد کو بار بار یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے گناہ کیا، واجد بھی آخر انسان تھا، اس کا دل اتنا سخت نہ تھا کہ حسن کے تیر اس پر اثر نکریں اس نے بھی امینہ کو دیکھا تھا - اُس کو بھی اُس سے محبت تھی، لیکن اس حد تک نہیں جتنی عابد کو - اس کے دل میں رشک پیدا ہوا - دل میں رقابت نے جوش مارا لیکن جذبۂ خلوص غالب آیا وہ دوست کے لیے اپنے جذبات کی قربانی کر سکتا تھا اُسنے رقابت کی آگ کو بجھا دینے کی کوشش کی - وہ سوچتا تھا کہ میں گنہگار ہوں کسی کے راز سے مجھے کیا تعلق - اگر عابد خود بتانا نہیں چاہتا - تو مجھے جاننے کی کیا ضرورت تھی میں نے اپنے دوست کے اعتبار سے ناجائز فائدہ اُٹھایا - اس گناہ کا کفارہ کیونکر ادا ہو سکتا ہے ہاں ایک طریقہ ہے کہ اپنی تمناؤں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے دوست کی بہبودی کے لیے کوشش کروں -

واجد نے اس معاملہ میں یوسف جنگ صاحب سے گفتگو کی - یوسف جنگ ایک سرکاری

ملازم تھے۔ اسلئے ان موالات سے آپ بہت خائف رہتے تھے عابد کے والد اگرچہ انکے دوست تھے لیکن عابد کے ترک موالات کرنے پر انہوں نے بلا مراسم ترک کر دئے تھے وہ دل ہی دل میں غور کرنے لگے کہ عابد کے ساتھ امینہ کا عقد ہوا تو مجھکو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ گھر میں اتنا سرمایہ نہیں کہ بیٹھ کر کھا سکوں۔ اسلئے انہوں نے واجد سے قطعی انکار کر دیا۔

ابھی تک امینہ کی شادی کے بارے میں آپ بالکل خاموش تھے لیکن اب نئی فکر سوار ہو گئی۔ امینہ کی شادی بہت جلد کر دینا چاہئیے نہیں تو خدا جانے کیا معاملہ پیش آئے۔ گھر میں جاکر بیوی سے ذکر کیا۔ بیوی نے جواب دیا ٹھیک تو ہے لڑکی بھی یہیں رہیگی۔ عابد بھی سنجیدہ لڑکا ہے یہیں نزدیک ہی شادی ہو جائے تو کیا برا ہے۔ لیکن یوسف صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اور بیوی سے بولے اب امینہ کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ بیوی بیچاری بہت روتی گاتی رہی لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ امینہ کو سہارنپور اپنے بڑے بھائی کے یہاں پہونچا آئے اور خود شادی کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔

امینہ کی شادی طے ہو گئی نواب افتخار علی کے یہاں سے منگنی آئی۔ یوسف صاحب نے منظور کر لیا۔ امینہ کی ماں ناراض تھیں۔ بہت روئیں اور سمجھایا۔ اُنکے دل میں بار بار یہی آتا تھا کہ اسکا برا نتیجہ ہوگا۔ لیکن اُنکی بات کون سنتا ہے۔ خاموش ہو گئیں۔ اور روز روز شب بیٹی کی خیریت کی دعا کرنے لگیں۔

(۶)

اس معاملے کو کئی مہینے ہو گئے۔ عابد کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ یوں تو جیل سے ناتوان ہو کر آیا ہی تھا باہر آتے ہی یہ سودا سوار ہوا۔ کھانا پینا دشوار ہو گیا نقاہت بڑھنے لگی۔ ہر وقت کی پریشانی اور فکر نے اور بھی گھلا ڈالا۔ بخار آنے لگا۔ علاج شروع ہوا لیکن مرض بڑھتا گیا جیوں جیوں دوا کی۔ مرض کچھ اور تھا اور دوا کچھ اور ہو رہی تھی۔ وہ مہینے گذر گئے لیکن مرض میں کچھ افاقہ نہ ہوا۔ اور افاقہ ہوتا تو کیسے عشق کا علاج ہی کچھ اور ہے۔ یوں تو کبھی کبھی دیدار جاناں ہی میسر ہو جاتا تھا لیکن اب اسکی بھی کوئی صورت

[illegible] تھی یعنی امینہ کے ہاتھ کا بنا ہوا [illegible] ۱۹۱۱ ہو گئی تمام ہو دامنوں میں صرف ایک زرد و اثر۔ [illegible] کو سکون تھا عقد کی تاریخ نزدیک آگئی۔ لیکن آمینہ خوش نہ تھی، عابد کی یاد اس کے دل کی [illegible] ناز تھی۔ اُسکا یہ خیال تھا کہ ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ فدائیان قوم و ملت کی پرستش کرے۔ سہارنپور آنے پر اُس کا دل بہت بے چین تھا۔ اُسی بہادر نوجوان کی صورت ہر وقت سامنے رہتی تھی اُسے شادی کے ذکر سے بے چین ہو جاتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ کیا میں اپنی شادی ہو جانے کے بعد بھی عابد کی پرستش کر سکتی ہوں۔ جتنا غور کرتی اُسے سوائے نہیں کے کوئی جواب نہ ملتا۔ کسی کی منکوحہ بیوی کسی غیر کو خواہ وہ کیسا ہی نیک چلن انسان کیوں نہ ہو۔ اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتی۔ اس نے ارادہ کیا میں کسی دوسرے کی پرستش نہیں کر سکتی۔ اکثر اس کے دل میں آتا کہ وہ اپنے والد سے صاف انکار کر دے۔ لیکن حیا منہ بند کر دیا کرتی تھی

عقد کا دن آگیا۔ سہارنپور ہی میں بارات آنے والی تھی۔ بڑی دھوم تھی۔ امینہ کے چچا سہارنپور کے مشہور رئیس تھے۔ گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ سب خوش نظر آ رہے تھے لیکن امینہ کو کوئی خوشی نہ تھی۔ آج اُس کا دل بہت بے چین تھا۔ امینہ سوچتی تھی کہ آج ہی میرے امتحان کا دن ہے۔

رات کے آٹھ بج گئے۔ بارات دروازے پر آگئی۔ سب عورتیں دیکھنے کے لیے باہر کے حصہ میں چلی گئیں۔ امینہ نے سوچا رہائی کا یہی موقع ہے۔ صندوق کھولا کچھ روپیہ اور زیور نکالا اور پیچھے کے دروازے سے مکان کے باہر نکل گئی۔ امینہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اُسے اپنے اوپر پورا بھروسہ تھا تاہم وہ کبھی اکیلے باہر نہیں نکلی تھی۔ باہر نکلتے ہی دل دھڑکنے لگا۔ لیکن اسمیں اب ایک جوش تھا جو اسکی کمزوریوں پر غالب تھا۔ اُسکی حالت اُس بے گناہ قیدی کی سی تھی۔ جو جیل کی سنگین دیوار پھاند کر باہر آگیا ہو۔ اور ذرا سی آہٹ پر اُس کا دل دھڑکنے لگتا ہو۔ بایں ہمہ امینہ اپنی آزادی پر بہت مسرور تھی۔ وہ ایسی تیزی سے چلی جا رہی تھی کہ اپنی تیز رفتاری پر اُسے خود حیرت تھی۔

عابد نے جس وقت سے امینہ کی شادی کی خبر سنی تھی اس وقت سے اسکی دنیا تھی میں انقلاب آگیا یاس نے امید زندگی کو پامال کردیا وہ کسی مایوس العلاج کی طرح موت کا منتظر رہنے لگا زیست کی کوئی امید باقی نہ رہ گئی۔ اسکے مکان پر ہر وقت عیادت کرنیوالوں کی بھیڑ سی لگی رہتی تھی عابد ایک ہر دل عزیز نوجوان تھا۔ شہر کے تمام ہندو اور مسلمان عابد کے لیے دست بدعا تھے

رات کے نو بج چکے تھے، کامل دو گھنٹے کی بیہوشی کے بعد عابد نے آنکھ کھولی۔ واجد سرہانے بیٹھا تھا عابد نے ہاتھ سے اشارہ کرکے پانی مانگا۔ واجد نے ایک شیشے کے گلاس میں پانی دیا۔ پانی پیکر عابد نے کہا "واجد تم میرے دلی دوست... ہو اسلیے مرنے سے پہلے میں تم کو اس راز سے مطلع کرتا ہوں۔ جسکے آغاز سے میری زندگی اور موت کی کشمکش شروع ہوئی؟" میں امینہ کو پیار کرتا ہوں۔ اب میرا آخری وقت آگیا۔ دیکھو یہ ہار امینہ نے مجھے اپنے ہاتھ سے پہنایا تھا، میری تمنا ہے کہ قبر میں یہ ہار میرے گلے میں ہو، مجھے امید ہے کہ تم اپنے مرنے والے دوست کی یہ تمنا پوری کروگے، بھائی آؤ ایک بار تم سے مل لوں گا واجد کی آنکھوں سے آنسوں جاری تھے۔ دونوں دوست لپٹ کر رونے لگے پھر ایک ہچکی آئی اور عابد ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔،، آنکھوں کی روشنی زائل ہوگئی۔ سانس رک گئی جسم بے حس و حرکت ہوگیا۔

قبرستان جیسے سنسان مقام پر بھی خلق خدا کا ایک عظیم الشان اژدہام تھا۔ ہر شخص مغموم و رنجیدہ تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے تاہم جو سنتا تھا ننگے سر ننگے پاؤں پہونچ جاتا تھا۔

عابد کی لاش دفن کردیگئی۔ فاتحہ پڑھا گیا۔ لوگ کف افسوس ملتے گھر واپس ہونے لگے۔ قبرستان میں پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ عابد کی یاد میں ایک شمع آنسو بہا رہی تھی۔ اسی یاس افزا سناٹے میں ایک مہ جبین زلف بکھرائے ہوئے آئی۔ اور عابد کی قبر سے ہم آغوش ہوکر بیہوش ہوگئی یہ وہی غریب نصیب امینہ تھی،۔ اس واقعہ کو عرصہ ہوگیا۔ اگر کوئی صبح کے وقت قبرستان کے بغل والی سڑک سے نکل جائے تو عابد کی قبر پر کچھ مرجھائے ہوئے پھول اور ایک بجھی ہوئی شمع ہر روز نظر آئیگی۔ عوام کا خیال ہے کہ عابد کی قبر پر جنات کو پریاں آکر ناچتی ہیں۔ اور وہی پھول چڑھا جاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام غریب امینہ کا ہے۔ عابد کے انتقال کے بعد اُسنے اپنی ناکام زندگی

کو ان کی محفلوں میں تلف کر دیا ہے۔ دن بھر کسی سوز میں مشغول مصروف رہتی ہے، اور رات کو قبرستان میں جاکر جب کہ تمام اپنے اپنے گھروں میں آرام کرتے ہیں، وہ ایک مزار پر چراغ جلاتی ہے۔ شمع روشن کرتی ہے۔ اور کبھی کبھی کوئی پرسوز غزل گا یا کرتی ہے۔

رامیشور پرشاد سنگھ

WIT HUMOUR & FANCY OF PERSIA

یہ مجموعہ ان کی نئی کتاب ہے جو فارسی زبان کے ادبیات سے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں پہلا حصہ جدید گوئی، تشبیہ و استعارہ وغیرہ کی مثالوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً "ناصر بخاری ایک بار حج کو جا رہے تھے، اثنائے راہ میں انکی ملاقات سلمان شاہ سے ہوئی جو اسوقت دجلہ کے کنارے غسل کر رہے تھے۔ سیاس سال طغیانی پر تھا سلمان نے امتحاناً کی غرض سے یہ مصرع پڑھا "دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ است" اور ناصر کو دوسرا مصرع لگانے کو کہا ناصر نے فوراً جواب دیا "پائے در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ است"۔ دوسرے حصے میں لطائف و ظرائف ہیں، پاکیزہ ظرافت کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

ایک روز ملا ناصر الدین ایک مسجد میں وعظ کیلئے کھڑے ہوئے اور حاضرین کو خطاب کر کے کہا، "اے ایمان والو! تم جانتے ہو میں کیا کہنے والا ہوں" لوگوں نے کہا، "نہیں" ملا نے کہا "اگر تم اتنا بھی نہیں جانتے تو ایسے بیوقوف لوگوں کو سمجھانا بالکل فضول ہے"۔ دوسرے جمعہ کو انہوں نے پھر پوچھا "اے اسلام والو تم کو معلوم ہے کہ میں کیا کہونگا" لوگوں نے کہا "ہاں" ملا نے کہا "اگر ایسا ہے تو میرا وعظ بالکل بے سود ہے" تیسری بار جب ملا نے یہی سوال کیا تو لوگوں نے کہا "ہم میں سے کچھ جانتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے" ملا نے جواب دیا "اگر یہ بات ہے تو تم میں سے جو جانتے ہیں انکو چاہیئے کہ جو نہیں جانتے ہیں ان کو بتادیں"۔

غرضکہ یہ کتاب ظرافت سے پُر ہے اور کسی بہترین ناول سے کم دلچسپ نہیں ہے

مسٹر کوکا کی کوشش قابل قدر ہے کہ انہوں نے مختلف ایرانی شعرا کا چیدہ کلام یکجا کر دیا ہے۔ اُن حضرت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بیحد مفید ہے جنکو شعرا ایران کے بلند پروازیوں اور نکتہ سنجیوں میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے خصوصاً انگریزی داں اصحاب کیلئے یہ کتاب فارسی لٹریچر کی رہنمائے اعظم بن سکتی ہے کیونکہ انگریزی زبان میں ہے ہمیں امید ہے کہ مسٹر کوکا کی یہ تصنیف مقبول عام ہوگی۔ جلد خوبصورت، ٹائپ صاف، صفحے [illegible] قیمت [illegible] ملنے کا پتہ۔ مسٹر ایم این کوکا سودیشی اسٹور کمپنی لمیٹڈ کو ساری بلڈنگس ہارنبی روڈ بمبئی

طفلی کی یاد

(۱)

جھٹپٹے وقت کا ہے سناٹا　　ابر چھایا ہوا ہے ہلکا سا
شام کی تیرگی سے ہین مدھم　　دشت مین رہروون کے نقشِ قدم
چلتی ہے دھیمی دھیمی موجِ ہوا　　جیسے کوئل کی دردناک صدا
بے جھجک ایک گاؤن کی لڑکی
کسقدر سادہ، کسقدر بھولی
عمر ابھی جسکی نو برس کی ہے　　ایک چھوٹے سے پل پہ بیٹھی ہے
خال و خط نرم، لب درخشندہ　　سانس آہستہ، شکل تابندہ
ڈالتی ہے ہر ایک سمت نظر　　گال رکھے ہوئے ہتھیلی پر
سر پہ آنچل پڑا ہے ساری کا　　داہنے ہاتھ مین ہے جسکا سرا
پونچھتی جا رہی ہے کاجل کو　　موڑ کر اک ذرا سا آنچل کو
ڈھیر ہین زرد زرد پھولون کے　　سامنے جھنڈ ہین ببولون کے
قابلِ رشک یہ مسرت ہے
کتنی معصوم یہ فراغت ہے
آہ یہ بات ہے کسے معلوم　　شادمان یہ رہیگی یا مغموم

(۲)

کوئی یہ بات کہہ نہیں سکتا　　"کیونکر اسکا شباب گذریگا؟"

خواہ اسکو الم ہوں، خواہ خوشی
اتنا کہہ سکتے ہیں مگر اب بھی

یاد اسکو جب آئیگا یہ سماں — دل سے اُٹھنے لگیگا غم کا دھواں
آہ جب وہ یہ دل میں سوچیگی — "کن دنوں میں کیا فراغ بالی تھی"
کیسے ہوتی تھی شام صحرا میں — تھا مرا جب قیام صحرا میں
ہر طرف جوشِ لالہ و گل تھا — جو نہر کے قریب اک پل تھا
کھیلتی کودتی میں آتی تھی — خوشنما پل پہ بیٹھ جاتی تھی
کیسی خوشبو تھی زرد پھولوں کی — ہائے کیا چھاؤں تھی ببولوں کی
مجھکو کس پیار سے کھلاتے تھے — کیسے ماں باپ مسکراتے تھے
آہ جب اُس کو یاد آئے گی — اپنی ننھی سی گائے کی گھنٹی"
نہ رہے گا دماغ قابو میں — دل مچلنے لگیگا پہلو میں
کون دنیا کی بہترین خوشی — اسکو رونے سے باز رکھے گی!
سچ ہے طفلی کی گرد کے آگے — جس میں ہوتے ہیں سینکڑوں تارے

ہیچ خوشیاں ہیں زندگانی کی
خاک ہے کیا جوانی کی!

جوش ملیح آبادی

دولت کی ہوس، اصل گدائی ہے یہ — ساماں کی حرص، بینوائی ہے یہ
حاجت کم ہو، تو ہے یہ شاہنشاہی ز — اور کچھ نہ ہو حاجت، تو خدائی ہے یہ

مولانا حالی

فنا کے سامنے ہم کیا ہماری ہستی کیا — برائے نام مگر اک نشان پا ہی لیا
ہوا جو ہم نفس، قطرہ بنگئی دم بھر — حباب نے بھی خودی کا مزا اٹھا ہی لیا

اکبر

نیچرل شاعر

اس سکوتِ شب میں جس دم سب ہوں سالکِ نجات — کیا وحوش و طیر کیا انسان حیوان کیا نبات

ایک خاموشی کا عالم جب ہو تا چشم بہ بند — کر چکی ہو جس دم آپ کو ہر ایک ذات

نیند نے مارا ہو شبخون جب سپاہِ ہوش پر — ایک عالم پر ہو طاری جب گھڑی کیفِ ممات

بیکسی چھائی ہو یکسر سرحدِ ادراک میں — امتیازِ ذات باقی ہو نہ احساسِ صفات

جب ستو نیچر کی رعنائی کا کوئی قدردان — کس مپرسی دیکھی ہو جلوۂ فطرت کو مات

ہو کا منظر ہو جہاں میں مثلِ روزِ اولین — ذاتِ واحد کے سوا ہو نیچر کل کائنات

چار سو جس دم ہو سناٹا عجب چھایا ہوا — اور وجودِ ممتنع کی حد میں ہوں سب ممکنات

جاگتا ہے تو فقط او واقفِ اسرارِ حق
دل ہی دل میں لے رہا ہے رازِ فطرت سے سبق

(۲)

منہمک تو جستجوئے رازِ یزدانی میں ہے — مشتغل ہر دم حصولِ حظِّ روحانی میں ہے

صورتِ تصویر خود رنگِ عرفانی میں ہے — تو مجسم ذوق بنکر لطفِ پنہانی میں ہے

اُٹھا بیٹھے ہیں سب دنیا و مافیہا کا درس — نسخۂ عرفان کی تو اوراق گردانی میں ہے

شرق سے تا غرب ہے تیرے تخیل کی اُڑان — توسنِ طبعِ رسا سرگرم جولانی میں ہے

تجھ سے باتیں کر رہا ہے دہر کا ہر ہر وجود — بے سبب مشغول کب تو زمزمہ خوانی میں ہے

تیری نظریں دوڑتی ہیں چار سو آفاق میں — وسعتِ کون و مکان تیری قلمرانی میں ہے

گاہ اجرامِ سماوی سے ہے مصروفِ کلام — گاہ اجسامِ زمین سے تو سخن رانی میں ہے

[illegible] سبزے میں تجھے آثارِ یزدانی سبق — نکتہ سنجِ معرفت تو بزمِ امکانی میں ہے

واقف انجام و نتائج پر تری چشم بصیر | تو حقیقت بین حکمت [illegible] مین ہے
ہے نصیحت ریز و عبرت خیز تیرا ہر مقال | تو بقا آموز ہستی عالم فانی مین ہے
کھینچتا ہے جذبۂ فطرت کے تو نقش و نگار | تو عجب تمثال گر بزم ہیولانی مین ہے
مرحبا او قدرت کے مصور مرحبا | کب یہ قدرت خامۂ بہزاد و مانی مین ہے
ترجمان راز نیچر ہے مگر تیری زبان | سچ کہا ہے سچ کہ تو گلبند رحمانی مین ہے

کاشف اسرار حق ہے زمزمہ خوانی تیری
متفق ہین سب کہ دہی ہے خوش لحانی تیری

۳

مرحبا لذت فزائے گرم و سرد روزگار | آفرین عبرت فروز گردش لیل و نہار
سچ تو یہ ہے ذات ہے تیری جہان مین مغتنم | صفحۂ ہستی پہ ہے جسکی ضرورت آشکار
جو نہ ہوتا گلشن ایجاد مین تو گلفشان | رنگ دکھلاتا نہ کچھ کیف خزان لطف بہار
بزم ہستی مین نہ ہوتا اگر ترا نقش وجود | خوشنما اتنے نہ ہوتے قدرتی نقش و نگار
یون پرکھتا کون کیفیات و کمیات کو | صیرفی ذہن تیرا گر نہ بنتا یان عیار
رنگ قدرت کو جلا دیکر جلا دیتا ہے تو | صیقل جدت سے نقش ہو دیتا ہے ابھار
عالم معنی مین ہے تو گاہ نقاش صور | اور کبھی تو بزم صورت مین ہے اک معنی نگار
جن مواقع کی کبھی تصویر کھنچ سکتی نہین | وان قلم تیرا بناتا ہے نئے نقش و نگار
تو ہی محسوسات سے لیتا ہے وجدانی اثر | کیف وجدانی کو تو لاتا ہے صورت مین تمام
تو سمجھ لیتا ہے ہر انجام پر آغاز کو | تو سجھا دیتا ہے ہر آغاز پر انجام کار
موسم گل کا مزہ لیتا ہے تو وقت خزان | اور اٹھاتا ہے خزان کا لطف ہنگام بہار
تیری نظرون مین ہین آلام و مصائب عیش خیز | مستی عیش و طرب تیرے آگے زہر مار
زمزمہ سنجی کبھی تیری نہین لغو و دروغ | خامہ فرسائی نہین تیری فضول و ہرزہ کار
انقلابات زمانہ کے نتائج دیکھکر | تو ہی ابن الوقت کو کرتا ہے آگاہ و ہوشیار
[illegible] نکلتا ہے تو افسردہ قوم مین | خواب غفلت کا کبھی آنے نہین دیتا خمار

کہیں تو شاہد رعنا کے زلف مشک شکن
تو جتا کر عہد اور معبود کے قول و قرار

یون انھیں ترغیب دیتا ہے ادائے فرض کی
یون انھیں ڈیوٹی پہ انکی چاہتا ہے استوار

دیو پیکر تا ہے تہذیب و تمدن پر کبھی
مذہب ملت کا دل سے چاہتا ہو تو سدھار

اسطرح ہوتا ہے ملک و قوم کی بہبود مین
تو اٹھا رکھتا نہین کوشش مین اپنی کچھ ادھار

زجر اور توبیخ کر کے نفس کو کرتا ہے رام
نفس امارہ کو مثل مار تو دیتا ہے مار

تیرا نقد و تبصرہ یان شہرۂ آفاق ہے
تو ادیب نفس ہے تو شیخ اخلاق ہے

(۴)

زمزمہ سنجی تری بیشک مفید عام ہے
سبکو کہتے ہین رفاہ عام تیرا کام ہے

ہر زمان پند و نصیحت مین ہے تو رطب اللسان
چشمۂ فیض الغرض تیرا دہان و کام ہے

تیرا ہر ہر شعر ہے اک نکتۂ حکمت نما
تیرا ہر ہر لفظ گویا کلمۂ الہام ہے

ہے نظر تیری سدا اصل و حقیقت کیطرف
حق شناسی حق نمائی تیرا پہلا کام ہے

تاکہ سب کثرت مین وحدت جلوہ آرا دیکھ لین
خوش نوائی سے غرض تیری صلائے عام ہے

ہین وہ نادان جانتے ہین جو تجھے ہرزہ سرا
خام و ناقص ہین جنکا یہ خیال خام ہے

فی المثل گر روز روشن کو نہ دیکھے شپرک
کیا ضیاء مہر و نور پہ کوئی الزام ہے

مٹ نہین سکتا ابد تک مثل نقش کالحجر
ثبت ایسا دفتر عالم مین تیرا نام ہے

تیرے جذبات و تجارب ہین وہ دستور العمل
جنمین آ سکتا نہین زنہار ذرہ بھر خلل

محمد عنایت نبی ارشد کندرکھوی

بزمِ سخن

انتخاب مشاعرۂ بزمِ گلشن الہ آبادی

ابوالمعانی مرزا یاس صاحب عظیم آبادی نے از راہ عنایت قدیمانہ ہمارے پاس مشاعرۂ بزم گلشن الہ آباد کا مختصر انتخاب ارسال فرمایا ہے جو ۱۸ فروری ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے سی ایس آئی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ مین دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ ملک کے اور شعرائے نامدار بھی شریک تھے مستحق ستائش ہیں دیوان رادھے ناتھ صاحب گلشن جنکے التفات خاص سے الہ آباد مین مشاعرہ بزم گلشن قائم ہے۔

جناب سائل دہلوی

تسلی یون مری کر دی ستمگر نے دم رخصت — کہ شامین بھی ہوا کرتی ہیں دنیا میں سحر ہوکر
دکھاتی ہیں مزے آہیں مری مجکو بھی اونکو بھی — کسی دن بے اثر ہوکر کسی دن با اثر ہوکر

جناب نوح ناروی

مجازی سے پتہ ہم کو ملا عشقِ حقیقی کا — کہاں ہوکر کہاں پہنچے کدھر سے ہم کدھر ہوکر
دم آخر مریضِ عشق نے یون کروٹین بدلین — کہ دنیائے محبت رہ گئی زیر و زبر ہوکر

جناب ڈپٹی جگموہن ناتھ شوق

ابھی شام شب غم ہی میں ہے ایسی ردی حالت — خدا جانے طبیعت تنگ کیا ہو سحر ہوکر

جناب مرزا ثاقب لکھنوی

ہر امید کا روانِ غم ہیں منزل بیخبری ہے خالی — یہ دل کتنا پر معاصی ہے دست تیری رہگذر ہوکر

جناب ناتک لکھنوی

عدو ہمسر ہوا ہے خدا کی شان تو دیکھو ۔ ہمیں سے ناز کرتا ہے ہمارا نامہ بر ہو کر

جناب بسمل الہ آبادی

ہمیں نے شوق مرگ اب اسکو ملکر آزمانا ہے ۔ خدا کے گھر پہنچ جاتے ہیں کیونکر اوسکے گھر ہو کر
ادھر ہو کر تو مجبور دل نے انکوں آنکھیں دکھائیں ۔ خدا جانے کرے کیا کیا ستم اب یہ ادھر ہو کر

جناب پنڈت رام ناتھ آغا

اثر ہوتا ہے الٹا بد نصیبوں کی دعاؤں کا ۔ ہمارا نالۂ دل کیا کرے گا با اثر ہو کر
خدا کا گھر سمجھ کر ہم نے پوجا دل کے مندر کو ۔ گذاری زندگی دیر و حرم سے بے خبر ہو کر

جناب عباس سہارنپوری

تمنائے رہائی میں نہاں رازِ تلوّن ہے ۔ قفس کی زندگی بھی یاد آئے گی بسر ہو کر
نہ ہو حسرت کش نظارۂ بے مدعا اے دل ۔ شہیدِ جلوہ زارِ حُسن ہو جا دیدہ ور ہو کر

جناب ڈپٹی محمد احمد صاحب وفا

سوا اسکے کہ سر اپنا ہی کھائیں حضرتِ ناصح ۔ نتیجہ اور کیا نکلے گا دیوانوں کے سر ہو کر

جناب وفا جونپوری

شبِ غم زندگی میں ختم ہو جاتی تو اچھا تھا ۔ جہاں سے اُٹھ گئے جب ہم تو کیا ہو گی سحر ہو کر

حضرت گلشن

دہن سے بات جو نکلے وہ نکلے با اثر ہو کر ۔ صدف سے نکلے جیسے آب کا قطرہ گہر ہو کر
نہ نکلے خاک بھی آدم نکل کر باغ رضواں سے ۔ رہا شیطان کا قبضہ خدا کا دل میں گھر ہو کر
تعلق دو جہاں کا ایک چکر ہے نہایت ٹیڑھا ۔ جو جاتا ہے ادھر ہو کر وہ آتا ہے اُدھر ہو کر

جناب یاس عظیم آبادی

قفس میں بوئے ہمسایہ بھی آئی دردِ سر ہو کر ۔ نویدِ ناگہاں پہونچی ہو مرگ منتظر ہو کر
جواب آیا تو کیا آیا صدائے باز گشت آئی ۔ دہن سے آہ نکلی مبتدائے بے خبر ہو کر

و شفق سے کیا کسی گلوں کا دل دھڑکتا ہے
مبادا رنگ و بو اُڑ جائے پامالِ نظر ہو کر

کمال ہو گا رسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر جل کر بال و پر ہو کر

فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں
مسافر در وطن خانہ بدوشِ رہگذر ہو کر

مزہ کیا نہیں دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو
لہو کا گھونٹ اتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر

رہائی کا خیالِ خام ہے یاں کان بجتے ہیں
اسیر و بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز در ہو کر

عجب کیا وعدۂ فردا پسِ فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آ جائے نہ شامِ بے سحر ہو کر

مبارک نام آزادی سلامت دام آزادی
دعائیں دوں کسے یا رب اسیرِ بال و پر ہو کر

حسیات نازش

چھیڑ پر دل کی اُمنگیں ہیں وہ انجانوں میں ہے
ایک بھولی شکل کتنے شوخ ارمانوں میں ہے

مبتلا ہونا ہے ناصح کوئی اپنے بس کی بات
دل گواہی دے رہا ہے تو ہی دیوانوں میں ہے

یاد ہے کہنا کسی کا ہم تمھارے ہو چکے
منتظر ہوں میں ابھی تک یہ صدا کانوں میں ہے

لٹ رہی ہے حسن کی دولت بڑی اونچی جگہ
کیا بتاؤں شمع روشن کس کے ایوانوں میں ہے

طلعتِ زیبائے ساقی ہے بہارِ میکدہ
پھر بہارِ میکدہ کا عکس پیمانوں میں ہے

میں ہوں غیروں میں کہ میرا عشق ہے رسوائے عام
تو ہے اپنوں میں کہ تیرا ذکر بیگانوں میں ہے

کیا ہماری خاک ہے عہدِ جنوں کی یادگار
جو اُڑائی تھی کبھی اب تک بیابانوں میں ہے

رخنۂ دیوار پر ہے طوقِ زنداں کا گماں
اے جنوں سازِ اسیری خانہ ویرانوں میں ہے

خوف تھا مسجد میں نازش کو عصائے شیخ کا
بوریا بندھنا بڑی مدت سے میخانوں میں ہے

نازش بدایونی؛

علمی نوٹ

بعض نوخیز حضرات نے سرقۂ مضامین اپنی مفروضہ شہرت کا زیور بنا لیا ہے، نظم تو نظم نثر کے سرقے سے بھی نہیں چوکتے،

اس سے پہلے ہم، سردار صاحب کی بیتی کی خطرناک عبارت کو منظر عام پر لا چکے ہیں، آج مکرمی سرشار صاحب کسمنڈوی کے مضمون کا اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، جس میں سردار حسین صاحب لکھنوی کی بیباکی پر روشنی ڈالی گئی ہے،

وہ زمانہ ماہ فروری ۱۹۲۳ء کے صفحہ ۱۲۱ پر جناب منشی نوبت رائے نظرؔ مرحوم لکھنوی کی ایک ۱۳ شعر کی غزل شایع ہوئی تھی، غزل کیا تھی درد و اثر سوز و گداز کی مکمل تصویر تھی، اشعار میں وہ دلکشی اس درجہ تھی کہ اب تک مجھے تمام شعر یاد ہیں۔

اسی زمین میں ایک غزل جناب محمد سردار حسین صاحب بہزادؔ لکھنوی کی بھی رسالہ ترجمان نظر لکھنؤ بابت ماہ مئی ۱۹۲۶ء میں صفحہ ۲۲ پر شایع ہوئی ہے جس میں تین شعر حرف بہ حرف نظرؔ مرحوم کے نقل کر لیے گئے ہیں۔ ایک آدھ لفظ کا تغیر اور تبدل کیا گیا ہے باقی سب وہی ہے جو نظرؔ مرحوم کہہ گئے ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ نظرؔ مرحوم۔ روشن رکو رنگِ محفل کچھ معتبر نہیں ہے	ہے اک زبان گویا شمع سحر نہیں ہے
۱۔ بہزادؔ۔ روشن رکو رنگِ دنیا کچھ معتبر نہیں ہے	ہے اک زبان گویا شمع سحر نہیں ہے
۲۔ نظرؔ مرحوم۔ دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی	تھے جیتے جی اب کہ مردہ مجھکو خبر نہیں ہے
۲۔ بہزاد صاحب۔ دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی	زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھکو خبر نہیں ہے

[illegible]

... بہزاد گو کہیں اُستاد بہزاد کی ... سہل کا ہے جگہ ... ہے

پہلے شعر میں عقل کی جگہ دنیا ہے مگر دوسرا مصرعہ لفظاً بہ لفظاً ہے۔ تیسرے شعر میں ردکیا۔ اور مداول انکا کر بہزاد کا اضافہ کر کے مقطع بنا یا گیا ہو، ایسا لطیف شعر ہو، اسکے ساتھ یہ بھی ... اتنا کھلا ہوا سرقہ کہ جسکو جس میں توارد کا احتمال بھی نہیں کیا جا سکتا، غریب اُردو پر رحم کرنا ... پرائے مال کو غصب کرنا انتہائے دشرافت کے منافی ہے۔ جو حضرات دوسروں کے مضامین کو الٹ پلٹ کر اپنا بنا لینے کے عادی ہو گئے ہیں۔ انہیں اس مذموم عادت سے باز آنا چاہیئے اور اگر وہ درحقیقت شاعری کے اہل نہیں تو ہمارا مشورہ ہے کہ شعر گفتن چہ ضرور،

اس رسالہ میں باز بہادر اور روپمتی کی تصویر ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہے۔ روپمتی سردار دھرم پور کی عفت مآب بیٹی تھی اور باز بہادر منڈو کا راجہ۔ نربدا کے کنارے اتفاقاً دونوں میں ملاقات ہوئی اور دو معصوم دلوں میں محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ روپمتی کا باپ درشت مزاج ٹھاکر تھا، اسے گوارا نہ تھا، کہ روپمتی ایک مسلمان سے محبت کرے، چنانچہ اُس نے روپمتی کے سامنے زہر کا پیالہ پیش کیا، عین اُسوقت جب روپمتی پاکی ظنی اور خاندان کی شرم سے زہر کا پیالہ ہونٹوں تک لا چکی تھی باز بہادر پہونچ گیا اور لڑ بھڑ کر روپمتی کو اپنے ساتھ لے گیا، باکمال مصور نے اس منظر کو نمایاں کیا ہے جب روپمتی اور باز بہادر، گھوڑوں پر سوار دریا کو عبور کر رہے ہیں، تماشگین نگاہیں دونوں کنارے پر تعاقب و پیشوائی میں معروف ہیں، مگر ایک طرف سے مایوس اور دوسری طرف سے مسرور۔ آیندہ نمبر میں انشاء اللہ اس صداقت شعار دوشیزہ کی مفصل داستان پیش کیجائیگی،

اگست دسمبر کا پرچہ زیر طبع ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد عاضر خدمت ہوگا۔



ہماری نیک صلاح

اگر آپ تندرست رہنا چاہتے ہیں؟
اگر آپ کو کسی طرح کی بھی کمزوری ہے؟
اگر آپ کو دھات کی کوئی بھی بیماری ہے؟
اگر آپ کسی قسم کے جریان میں مبتلا ہیں؟
اگر آپ میں دماغی کمزوری ہے؟
اگر آپ کو رات کو نیند نہیں آتی؟
اگر آپ کا ہاضمہ اور حافظہ خراب ہے؟
اگر آپ کسی بیماری کے سبب دبلے پتلے ہو گئے ہیں؟
تو ڈیڑھ سو برس کی آزمودہ

مصری جیون پربھا گٹکا

[illegible] پانی یا دودھ کے ساتھ [illegible] استعمال [illegible] کہ جسمانی اور دماغی کمزوریوں کیلئے [illegible] ویدک شاستر کی دوا ہے [illegible] کمزوری [illegible] کمزوری بیماری [illegible] سے پیدا ہونیوالی [illegible] سے پیدا ہونیوالی کمزوری [illegible] کی کمی [illegible] کمزوری [illegible] سے پیدا ہونیوالی کمزوری [illegible] جلد جلد اور زیادہ ہونا [illegible] عورتوں کو دودھ کم آنا [illegible] کا کام کرتی ہے۔ اردو۔ ہندی۔ سنسکرت [illegible] اور انگریزی [illegible] کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ [illegible] استعمال کرنے کے لائق دوا کی قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ

مصری آیورویدی جیون پربھا دواخانہ نمبر ۱۔ فیضانہ [illegible]

[illegible]

باٹلی والا کی

۴۰ برس کی سودیشی دوائین

باٹلی والا کا ایگو مکسچر۔ یہ دوا انفلوئنزا بخار اور موسمی بخار اور جاڑے سے آنے والے بخار کے لیے اکسیر ہے۔
باٹلی والا کی ٹانک گولیاں
باٹلی والا کا ... شربت۔ یہ دوا کمزور اور دبلے بچوں اور ضعیف انسانوں کے لیے بہت مفید ہے۔
باٹلی والا کا کیمرل بام۔ یہ دوا درد سر اور درد سینہ اور رگ پٹھے کے کھنچاؤ کے لیے اکسیر ہے۔
باٹلی والا کا ڈائریا مکسچر۔ یہ دوا ہیضہ کی بیماری اور گرمی سے آنے والے دست روکنے کے لیے اکسیر ہے۔
باٹلی والا کی کونین کی گولیاں۔ یہ دوا پیلے چہرے اور دبلے اور کم خون والے ... کے لیے اکسیر ہے۔
باٹلی والا کی کونین کی ٹکیاں۔ ایک گرین دو گرین کی بوتل میں ۱۰۰ اعلیٰ خالص کونین سے بنی ہوئی۔
باٹلی والا کا مرہم۔ یہ دوا کھجلی اور جلدی بیماریوں کے لیے بہت مفید ہے۔
باٹلی والا کا دانت کا منجن۔ یہ منجن دانتوں کو موتی کے مانند سفید اور بہت مضبوط بناتا ہے۔

TELE ADDRESS — GAWASHAPUR BOMBAY — تار کا پتہ

ڈاک کا پتہ ڈاکٹر ایچ۔ ایل باٹلی والا اینڈ سنس کمپنی لمیٹڈ پوسٹ وڈالہ بمبئی نمبر ۱۸

جنگ میں فتحمند کون ہوگا

لڑائی میں فتحمند وہی ہو سکتا ہے جو تندرست، طاقتور، توانا، ہوشیار، عقلمند، چست، چالاک ہو کیونکہ طاقت ... ہمیشہ ...
سکتا اسلیے اگر آپ دنیا میں ہر ایک کام میں فتحمند ہونا چاہتے ہیں تو ہماری تیار کردہ
مقویات سرتاج عالم آتنک نگرہ گولیاں وہر قسم کی کمزوری کو دور کرکے ... طاقتور، توانا ... قوت حافظہ اور ہاضمہ کو تیز کرتی ہیں۔ دماغ کو تراوٹ دیتی ہیں عقل کو
زیادہ کرتی ہیں چستی اور چالاکی بخشتی ہیں سستی کو دور کرتی ہیں منی اور خون کو درست کرکے زیادہ کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ...
جریان۔ احتلام۔ نامردی۔ سرعت انزال وغیرہ وغیرہ تمام شکایتوں کی بیخ کنی ... کو دور کرکے تندرست ...
... آدمی ہر قسم کی جنگ میں کامیاب ہو سکتا ہے ہماری گولیاں استعمال کرنے سے ... ۳۲ گولیاں ...
... ہیں۔ اسی طرح ہزار ... آپ ... کی ...
...
...

ملنے کا پتہ — وید شاستری ... شنکر گوندجی آتنک نگرہ فارمیسی جام نگر کاٹھیاواڑ



فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار اور طحال کے لیے ایک دوا ہے

ہمیشہ سیکڑوں ہزاروں شخص فصلی بخار اور طحال کی دوا کے آزمانے سے تھک گئے [illegible] کونین [illegible] ہے اسلیے یہ دوا یعنی بخار کو کم کرتی



[illegible] سکتی ہیں [illegible] ڈاکٹر ایس کے برمن کی مشہور بخار و طحال کی دوا [illegible] قیمت بھی بہت کم [illegible] (۱) [illegible] استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ (۲) یہ [illegible] کو کم کرتی ہے اور [illegible] (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے قیمت فی شیشی کلان [illegible] شیشی خورد ۱۰ [illegible] شیشی کلان ۸ [illegible]

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

[illegible] بخار پرانا ہو جانے پر بادی ہے [illegible] اگر دن رات [illegible] جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے اور رنگ پیلا [illegible] سا ہو جاتا ہے [illegible] سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے [illegible] ہمیشہ [illegible] ہے [illegible] پیروں میں ورم [illegible] ہو جاتی ہے۔ ایسی حالتوں میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں [illegible] قیمت [illegible] گولیوں کی ڈبیہ [illegible] ایک ڈبیہ سے دو ڈبیہ تک [illegible]

کونین کی گولیاں

[illegible] کی خوبصورت چھوٹی چھوٹی گولیاں [illegible] اور سنہری [illegible] ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں اپنے پاس [illegible] ہے [illegible] میں [illegible] ہے۔ قیمت ۵۰ گولیوں کی ڈبیہ ایک روپیہ چار آنہ [illegible]

ڈاکٹر ایس۔ کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

ایجنٹ [illegible] انڈیا [illegible] گنج۔ کانپور

[illegible]

[illegible]

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی اے

جلد ۴۶ | اگست و ستمبر ۱۹۲۴ء | نمبر ۲-۳

فہرست مضامین

تصاویر - مطالعہ و کارٹون

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

زمانہ

جلد ۴۳ اگست و ستمبر ۱۹۲۴ء نمبر ۲-۳

غیر ملکون مین ہندو آبادیون کے نشانات

بیس پچیس سال ہوئے پنڈت ہربلاس سارداؔ نے ہندو سپیریارٹی (تمدن ہند کی عظمت) کے نام سے ایک کتاب تالیف کی تھی۔ جس مین مغربی محققون اور مصنفون کی کتابون کے اقتباسات سے ہندو تمدن کی بے نظیر عظمت و لطافت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کیا تھا۔ کہ اگلے وقتون کے ہندو بڑے اولوالعزم اور عالی ہمت تھے جنھون نے سائبیریا۔ ترکستان۔ مغربی ایشیا یونان مصر وغیرہ وغیرہ مغربی اور مشرقی ملکون مین جا کر ہند و تمدن کی عظمت کا جھنڈا گاڑ دیا اور جابجا بستیان بسائین۔ جب غیر ہندو موصوف کی کتاب پڑھتے مین تعجب سے پوچھتے ہین کہ کیا موجودہ ہندو انھین بزرگون کی اولاد سے ہین۔ جنکی نسبت پنڈت ہربلاس داس جی یہ دعوی کرتے ہین کہ انھون نے ممالک غیر کو تمدن کا سبق پڑھایا۔ اور غیر ملکون مین اپنی بستیان بسائین بعض حق پسند ہندو بھی اسی قسم کے سوالات کرتے ہین۔ اور اس دعوے کو حقیقت سے بیگانہ سمجھتے ہین۔ یہ مغالطہ غالباً اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ پنڈت صاحب موصوف نے ان تصانیف پر اعتبار کیا ہے جو اب سے ساٹھ ستر سال کی تحقیقات کے نتائج سے مملو ہین۔

یہ مسئلہ بہت نازک ہی اور ایک مختصر مضمون مین اس کے اہم اور دلچسپ پہلوؤن پر مفصل وضاحت سے بحث کرنا ناممکن ہے۔ لیکن ہمین شبہہ نہین کہ اسلاف ہند اور موجودہ ہندوؤن کے درمیان کوئی مناسبت نہین۔ خیالات اور عادات مین زمین وآسمان کا فرق پیدا ہوگیا ہے پانچوین صدی عیسوی سے پہلے کے ہندو ایسے تنگ دل نہ تھے جیسے کہ اب ہین۔ اس زمانہ مین ہمارے بزرگون کو غیرون سے کسی قسم کا پرہیز نہ تھا۔ جوکہ موجودہ ہندوؤن کا حیرت انگیز خاصہ ہے۔ اغیار ہندو دھرم قبول کرکے ہندو دان آشرم مین جگہ پاتے تھے۔ یہ بات نہ صرف مہابھارت۔ رامائن۔ پوران۔ دھرم شاستر ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ گذشتہ چوتھائی صدی کی تحقیقات (آرکیالوجی) سے بخوبی ثابت ہے۔ بیلہسہ (ریاست گوالیار) سے چار میل پر دیش نگر نامی ایک گاؤن ہے۔ وہان پر ایک پرانا ستون ہے جس پر ایک سنسکرت کتبہ کندہ ہے اور جو ۔۔۔ق م مین بنایا گیا تھا، اسکا بانی ہندو دھرم کا معتقد ایک یونانی ہیلیو ڈورس تھا۔ جو شاہ تکشلا کی طرف سے مالوہ کے راجہ کے دربار مین سفیر تھا۔ اب تمام لوگ اس ستون کو کھمبا بابا پکارتے ہین اور اسکی پوجا کرتے ہین۔

بعض سکون اور کتبون سے اب واضح ہوگیا ہے کہ مہیرکل اور تورامان جو ہنون کے سردار تھے ہندو دھرم کے پیرو تھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندو ایسے فراخ دل اور بالغ نظر تھے تو اغیار سے نفرت اور چھوت چھات کیسے اور کب پیدا ہوئی۔

اس سوال کا جواب البیرونی نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الہند کے شروع مین دیا ہے وہ لکھتا ہے کہ جب خراسان اور میسوپوٹامیہ کے بودھ لوگون پر وہان کے حکمرانون نے ظلم اور تشدد شروع کیا۔ اور وہ لوگ بھاگ کر ہندوستان کو چلے آئے۔ تو غیر ملکون کے خلاف ہندوؤن کے دلون مین نفرت پیدا ہوگئی، دوسرا سبب البیرونی نے یہ بیان کیا ہے کہ جب ابو القاسم فتح کرتا ہوا ملتان مین وارد ہوا۔ تو وہان پر آدتیہ دیوتا کی پوجا زورون پر تھی۔ لوگ بڑے دولت مند اور آسودہ حال تھے اسکی وجہ پوچھنے پر لوگون نے آدتیہ کی مورتی کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ابو القاسم نے گائے کے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا مورتی کے گلے مین لٹکا دیا۔ کچھ تعجب نہین کہ عربون کی انہین حرکات سے ہندوؤن کے دل مین اغیار سے

نفرت پیدا ہو گئی،

اگر واقعی ہندو ایسے تنگ ظرف اور اغیار سے متنفر ہوتے۔ جیسے کہ وہ اب ہیں۔ تو وہ غیر ملکوں میں جا کر نہ ہندو تمدن پھیلا سکتے۔ اور نہ شان دار بستیاں اور حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوتے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندو غیر ملکوں کو اس مقصد سے نہیں جاتے تھے کہ وہ اغیار کو زیر کر کے مالا مال ہوں۔ بلکہ انہیں شائستہ بنانے کی کوشش کرتے تھے اور انہیں وہ کامیاب ہوتے رہے۔ صرف دنیا میں ایک ہی قوم ایسی تھی۔ جو ملک گیری کے عام اور مسلمہ مقصد سے بہت کچھ الگ تھی۔ اور وہ پرانے زمانہ کے ہندو قوم تھی بیشک فنشیا اور کارتھیج والے بھی ملک گیری سے گریز کرتے رہے۔ مگر وہ غیر ملکوں کو تجارت کے لیے جاتے تھے۔ اور تجارت کے لیے بستیاں بساتے تھے،

تمدن سے نا آشنا قوموں کو متمدن اور شائستہ بنانا اور انہیں اپنے مذہب اور اخلاق سے بہرہ اندوز کرنا وہ مبارک کام ہے۔ جس پر ہر ایک ہندو جائز فخر کر سکتا ہے۔ اور یہ ان کی قدیم ترین متبرک روایات کے عین مطابق ہے۔ جس اعلیٰ انسانیت اور اخلاق سے ہندو آراستہ تھے۔ اس کی نظیر پرانے زمانہ کی قوموں میں شاذ ہی ملے گی،

گزشتہ تیس سال کی اثری تحقیقات سے جو مشرق اور مغرب میں ہوتی رہی ہے۔ ایشیا کے تین مختلف خطے ظاہر ہوتے ہیں۔ جنہیں اسلاف ہند کے اعلیٰ تمدن کا فیض نصیب ہوا تھا اور جو نشانات برآمد ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ قریب قریب ایک ہی وقت میں ہندو قوم کے دستے شمال۔ جنوب اور مشرق کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ چینی ترکستان میں ختن اور یارقند کے صوبوں میں صحرا کے اڑتی ہوئی ریت کے نیچے دبے ہوئے شہروں سے ہزاروں تحریریں اور کتبے نکلے ہیں۔ جو سنہ ۱۹۰۱ اور سنہ ۱۹۰۸ کے درمیان ڈاکٹر اورل اسٹائن کی تحقیقات کے دوران میں دستیاب ہوئے تھے، جنوب میں جزیرہ سماٹرا اور جاوا اور بالی میں شان دار نشانات اور کھنڈر پائے گئے ہیں۔ اور مشرق میں ہند چینی کا وہ خطہ ہند و تمدن کی یاد تازہ کئے ہوئے ہے۔ جو کمبوڈیا کے نام سے مشہور ہے۔ مغربی ایشیا اور مصر سے ایسے آثار

نہیں نکلے جن سے ہندو بستیوں کی ہستی کا پختہ ثبوت مل سکتا۔ گزشتہ ۱۹۱۰ء میں بوغاز کوئی کے کھنڈروں سے ایک خشتی تحریر ہاتھ لگی تھی۔ جس میں اس علاقہ کے سرداروں اور ویدوں کو ماننے والی قوم (ہندوؤں) کے درمیان ۱۴۰۰ ق م میں ایک معاہدہ طے پانے کا ذکر ہے۔ رہا مصر۔ اسکی نسبت اکثر محقق استدلال تمثیلی سے کام لیتے اور اسے ہندوؤں کی بستی ثابت کرتے ہیں مگر ایسے نشانات نہیں ملتے۔ جیسے جاوا اور کمبوڈیہ میں پائے جاتے ہیں۔ صرف شہر منفس کے کھنڈروں کے درمیان پنجاب کے ایک آریہ پرش اور استری کی تصویر ۱۹۱۱ء میں برآمد ہوئی تھی، جسکی نسبت پروفیسر سر فلنڈر پیٹری نے یہ گمان ظاہر کیا کہ پرانے ہندوؤں اور مصریوں کے درمیان براہ راست راہ و رسم قائم تھی

جاوا میں ہندوؤں نے بستیاں بسانے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ بہت بڑی سلطنت قائم کی جو کئی سو برس تک رہی۔ اس شوکت کے زمانہ میں بورو بدر کا عظیم الشان مندر تعمیر ہوا تھا جو عجائبات روزگار میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی نازک اور نفیس سنگ تراشی کے نمونے جو اس بے نظیر مندر کی دیواروں پر نصب ہیں۔ مغربی سیاحوں کی حیرت و استعجاب کے باعث ہیں، کرنل ٹاڈ کی رائے میں سورج بنسی کھشتریوں نے مجمع الجزائر ہند میں بستیاں بسائی تھیں۔ الفنسٹن کی رائے میں کالنگ دیش کے لوگوں نے جاوا آباد کیا اور وہاں کے اصل باشندوں کو ہندو تمدن سکھایا تھا۔ پروفیسر ہیرن اور سر اسٹامفرڈ رفلز کی رائے میں براہمنوں نے جاوا کے مشرقی ساحل پر بستیاں بسائی تھیں،

فرگیوسن لکھتا ہے کہ ۶۰۳ء میں گجرات دیش کا ایک راجہ پانچ ہزار ہمراہیوں کے ساتھ جاوا میں وارد ہوا تھا۔ فاہیان چینی سیاح کے بیان کے رو سے چوتھی صدی میں جاوا میں ہندوؤں کی بستیاں بڑے عروج پر تھیں، جاوا کی معاشرت پر ہندو تمدن کا مستقل اثر پڑا ہے۔ وہاں کا لٹریچر مہابھارت اور دیگر مسلمہ ہندو کتابوں پر مبنی ہے۔ زبان میں سنسکرت الفاظ نے تصرف حاصل کر لیا ہے۔ رسم و رواج ہندوانہ ہیں۔ گو اب جاوا کے لوگ اسلام کے معتقد ہیں مگر معاشرت اور روایات میں ہندو ہیں، بہت سے جغرافیائی نام ہندو اصل اور سنسکرت کے ہیں۔ جیسے سیمرو۔ پرم تن۔ مدورہ۔ سنگ بومی (سنگھ بھومی)،

امت بدھ (بھارت بدھا) اور ارجن بودہ کا جاوا کے ادبیات میں بڑا درجہ ہے۔ کئی سنسکرت زبان کے کتبے مختلف مقامات سے برآمد ہو چکے ہیں جن سے اس ملک کی تاریخ پر معمولی روشنی پڑتی ہے۔ نیو ورلڈ انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا میں مذکور ہے۔ کہ جاوا میں ہندو اقتدار پانچویں صدی میں شروع ہوا اور اس جزیرہ کے مذہب اور نظام ملک داری۔ اور زبان اور لٹریچر پر اسکا گہرا اثر پڑا۔ جاوا کے ہندو تمدن کی شوکت کا اثر سماترا۔ بورنیو۔ اور مجمع الجزائر ملایا تک پہونچا تھا۔ بعض اسے پالوا (نیوگنی) اور آسٹریلیا تک بھی غالب مانتے ہیں،

جاوا کی حکومتی شوکت پندرھویں صدی تک رہی۔ اس کے باج گزار کئی اور حکمران بھی تھے۔ اور اس کا اثر دور دور تک پہونچا تھا، مشہور مندر آٹھویں اور دسویں صدیوں کے درمیان بنے تھے، مگر منانگ کے کتبہ سے ظاہر ہے کہ سات منزلہ وہاراما راجہ دھرم آوتیہ نے ۷۵۶ء میں تعمیر کرایا تھا، جاوا کے ہر حصہ میں کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ شاندار مندر وسطی خطہ میں ہیں، جو سطح مرتفع دیانگ کہلاتا ہے۔ اس پہاڑی کی بلندی (۶۵۰۰) فٹ ہے۔ اوپر چڑھنے کے لیے چوڑے زینے ہیں۔ جو شمار میں (۴۷۰۰) ہیں۔ اوپر سے پانی کے نکاس کے لیے ایک زیر زمین نہر بنی ہوئی ہے۔ جو ہندوؤں کی ہنرمندی کا قابل قدر نمونہ ہے۔ اس پہاڑ پر بورو بدر کا مشہور زمانہ عظیم الشان مندر ہے۔ اسکی بلندی ڈیڑھ سو فٹ ہے، اس کی چار منزلیں ہیں۔ یہ عمارت نہیں، پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ لاوا کے پتھروں کے بڑے بڑے ڈھیلے کاٹ کر بغیر گارے چونے سمنٹ کے پیوست کئے گئے ہیں، اسکی آرائش سنگ تراشی کے بہترین ہنر سے کی گئی ہے۔ دیواروں پر سینکڑوں مناظر تاریخ ہند۔ ہند روایات۔ ہندو دیوی دیوتاؤں اور مشہور واقعات کی تصویر بڑی نازک صناعی سے منقش ہیں، مندر کی زیریں منزل کا ہر ایک ضلع (۴۹۷) فٹ اور ارتفاع پچاس فٹ ہے۔ باقی تین منزلیں بھی اسی قسم کی ہیں۔ سب کے اوپر بہت بڑا گنبد ہے جس کا قطر ۵۲ فٹ ہے۔ اس کے گرد سولہ اور چھوٹے گنبد گھنٹی کے شکل کے ہیں۔ اگر آرائشی پتھر اور مورتیاں ایک میدان میں آراستہ کیجائیں

توقعہ تین میل تک لمبی قطار بن جائے۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجئے۔ کہ بوروبدر کا مندر کیسا عظیم الشان فن تعمیر کا کیسا اعلیٰ اور بے نظیر نمونہ ہے، اس کی صناعی کے بیان سے قلم اور زبان دونوں قاصر ہیں، یہ ہندو شوکت کی زندہ جاوید یادگار ہے،

کمبوڈیہ کو سنسکرت میں کمبوج کہتے ہیں۔ مہابھارت اور نیز پورانوں میں کمبوج لوگوں کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے۔ یہ ملک ایشیا کے مشرق میں واقع ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانکا میں لکھا ہے کہ ہندو کمبوڈیہ میں سنہ عیسوی سے کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے مشرقی ساحل سے جا کر آباد ہوئے تھے۔ اور پرانے باشندوں کو تمدن اور مذہب سکھایا تھا جس کے نشانات ابتک جابجا نظر آتے ہیں۔ پانچویں صدی میں ہندو دھرم اور ادبیات اور علوم و فنون نے زور پکڑا۔ راجہ شتر ورمن کی زیر ہدایت کمیر قوم نے بہت اقتدار حاصل کیا مگر ساتویں صدی میں شتر ورمن کے شاہی خاندان کا نام مٹ گیا۔ کمبوڈیہ کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ مگر نویں صدی کے شروع میں دونوں ہندو شاہی خاندان باہم مل کر ایک ہو گئے۔ اور جے ورمن کے شاہی خاندان کا راج شروع ہوا۔ جسکے دوران میں ہندو شوکت انتہائی درجہ پر پہونچ گئی۔ اسی زمانہ میں وہ شاندار مندر تعمیر ہوئے تھے۔ جو اب تک رخصت شدہ ہندو عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔ تیرھویں صدی میں کمبوڈیہ کی ہندو سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ مگر اصلی اسباب معلوم نہیں۔ کہ کیوں ہندو اقتدار تباہ ہوا تھا۔ کمبوڈیہ کے لوگ اب تک ہندو رسم و رواج اور روایات کے معتقد چلے آتے ہیں۔ انام کے لوگ بھی چھتری پوجہ یعنی شرادھ وغیرہ کے پابند ہیں۔ گو وہ برائے نام بدھ مت کے معتقد ہیں۔

ہندو عظمت کے نشانات انگ کر میں پائے جاتے ہیں جس کی بنیاد جشو وامن نے ۸۹۰ء میں ڈالی تھی۔ یہ شہر اب جنگل میں واقع ہے۔ ایک طرف بڑی جھیل اور دوسری طرف دریا ہے۔ دور تک کھنڈر پھیلتے چلے گئے ہیں۔ ان کھنڈروں میں سب سے مشہور انگ تھم اور انگ وٹ کا مندر ہے جو دریائے سیم ایپ کے کنارہ پر واقع ہے۔ بقول فرانسیسی محققوں کے انگر تھم کی تعمیر جے وامن سوم کے عہد میں ۸۶۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ اور چالیس سال تک بنتا رہا۔ اس کا نقشہ مستطیل ہے جو ہر طرف دو دو میل تک لمبا ہے۔

اس کے اردگرد بیس بیس فٹ اونچی دیوارین کھڑی ہین۔ اسکے پانچ بڑے بڑے دروازے ہین۔ اس احاطہ کے اندر محلات اور مندر ہین۔ جو بیلون اور درختون سے ڈھکے ہوئے ہین۔ یہ مخروطی شکل کا مندر ہے جس کی نازک سنگ تراشی پرانے ہندوؤن کی صنعت پر دال ہے۔ مگر سب سے بڑا اور مشہور مندر انگر وٹ کا ہے۔ جو پرانے شہر کے جنوب مین واقع ہے۔ یہ ایک مستطیل پارک مین ہے۔ اسکے اردگرد پانی کی خندق تھی، جس کا محیط چھ ہزار گز سے اوپر ہوگا۔ ہی کی رائے مین یہ بارھوین صدی کا ہے۔ اسکی تین منزلین ہین یہ برہماجی کی پوجا کے لیے مخصوص تھا۔ اور مندرون پر برہماجی کی چوکھی مورتیان بیسون کی تعداد مین بنی ہوئی ہین بیچ مین مخروطی مینار ہے۔ اور دونون سرون پر بھی بڑے بڑے مینار ہین، دیوی دیوتاؤن اور جانورون کی صدہا مورتیان نہایت خوبی کے ساتھ دیوارون کی زینت کا کام دیتی ہین۔ علاوہ ازین تاریخی واقعات کے اور مذہبی مسائل بھی سنگ تراشی کی اعلیٰ صنعت مین نمایان کئے گئے ہین، اس مندر کی وسعت اور نیز فن تعمیر اور سنگ تراشی سے یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ کمبوڈیہ کے ہندوؤن نے یہ فن کس کمال پر پہونچایا تھا۔ بعض سیاحون کی رائے مین انگ کے مندر اور محلات جنوبی ہند کی دراوری فن تعمیر کا نمونہ ہین۔ جسکے ابتدائی باشندے جنوبی ہند کے بتائے جاتے ہین، اور بعض اہل الرائے اندرپت یعنی دہلی اور یوپی کے لوگ بتلاتے ہین۔

جے۔ آر۔ رائے

مسدس حالی مولانا حالی کی نہایت مشہور و معروف نظم جسمین مسلمانون کی گذشتہ ترقیون اور موجودہ تنزل کا نہایت عمدگی سے خاکہ کھینچا گیا ہے۔

پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

رامائن کے فارسی ترجمے

یہ قابل قدر مضمون جناب مولوی محفوظ الحق صاحب ایم-اے لکچرار فارسی و عربی پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے انگریزی میں تحریر فرمایا تھا ہم اُسکا ترجمہ ناظرین کی تفریح طبع کے لیے پیش کرتے ہیں جو ترجمہ کو فاضل ممدوح کی نظر سے گذر چکا ہے

زمانۂ حال کے ماہرین علوم مشرقی میں سے ایک کا قول ہے کہ اسلامی تہذیب کو سمجھنا اور اُسکی قدر کرنا ناممکن ہے تاوقتیکہ اُسکے مقدس کلام الٰہی (یعنی قرآن پاک) اور بہت سے اُن علوم کی شاخوں سے جو اس سے نکلی ہیں اور اُس کے چاروں طرف پیدا ہو گئی ہیں اور اسلامی زندگی اور اسلامی اعتقاد کا ساڑھے تیرہ سو برس سے جزو لاینفک بن گئی ہیں پورے طور پر واقفیت حاصل نہ کرلیں۔ اور ہمدردی کے ساتھ اُسکے معنی نہ سمجھ لیں قدیم ہندو تمدن کے متعلق بھی غالباً ٹھیک اسی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ اس غیر مشترک فلسفیانہ تہذیب کے معیار اور زندگی کا اسی پر انحصار ہے اور رزمیہ نظم اور رزمیہ اور تفسیری لٹریچر نے اس پر لاتعداد حاشیہ چڑھایا ہے اسلیے قدرتی طور پر رامائن اور مہابھارت انسانی نسل کے پانچویں حصے کے لوگوں کے خیالات و رسم و رواج پر حاوی ہیں جو آریہ خون اور آریہ تہذیب کے خصوصیات برقرار رکھنے کا دنیا میں غالباً سب سے زیادہ دعویٰ رکھتی ہے۔ ویدک اور تفسیری لٹریچر کی باہمی بناوٹ قدیم ہندوستانی تہذیب کے تار و پود میں اسقدر نمایاں تھی کہ البیرونی نے تقریباً چار سو برس پیشتر ہندوستان فتح کرنیکے بعد سب سے پہلے اسباب کو قلمبند کیا۔ تواریخ میں اس اہم واقعہ کو یوں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ فاتح فوج کیساتھ کوچ کر رہا تھا اُسنے دیکھا کہ سادہ لوح ہندوستانی دہقانوں کا ایک گروہ پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا ہے اور خانہ بدوش مہندسنیاسی کتھا پڑھ رہا ہے اور اُسکے سننے میں یہ لوگ اسقدر محو ہیں کہ عظیم الشان فوج کی شان و شوکت کو نظر اُٹھا کر دیکھنے کی بھی پروا نہیں کرتے جو اپنی پوری فاتحانہ شان کے ساتھ کوچ کر رہی ہے اگر ہندو دماغ پر ویدک لٹریچر کا اسقدر اثر ہے تو بلا کسی دلیل و حجت کے یہ تسلیم کرلینا پڑیگا کہ اسکے باقاعدہ مطالعہ اور اُسکے سمجھنے سے ہندو قوم کے ساتھ کامل باہمی تعلق و قربت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

یہ قول بالکل صحیح ہے کہ سمجھنے سے قبل ہمدردی کا ہونا فروری ہے اور ہمدردانہ خیال ہی صرف میل و یکجہتی مساوات کا منبع ہے۔ ان دو پاک و صاف ادبی بہنوں یعنی سنسکرت و فارسی کے درمیان باہمی اختلاط و باہمی کاروبار آج سے سات سو برس پیشتر پٹھانوں کی حکومت کے آغاز ہی سے ہندو مسلم تعلقات کی ایک نمایان خصوصیت رہی ہے مگر کشادہ دل شہنشاہ اکبر ہی تھا جسنے اپنی تیز فہمی سے علم و ادب اور تہذیب کی دنیا میں رواداری کے اصول کو برتا۔

ہندو مسلم لٹریچر میں پند آمیز مضامین فلسفہ، علم الحساب، علم الادویہ کے صیغوں میں ایسی تصنیفات اقتباسات اور ترجمے چاہے وہ بلا واسطہ ہوں یا کسی دوسری کتاب سے ترجمے کیے گئے ہوں عام طور پر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن شہنشاہ اکبر کے حکم سے سنسکرت کی مشہور کتابوں کے حاصل کرنے اور فارسی میں ترجمہ کرنے کی ایک پرجوش اور معنی خیز کوشش کیگئی۔ اگرچہ یہ کوشش ابتدائی نہ تھی۔ خاندان عباسیہ بغداد کے مشہور و معروف شہنشاہ المامون ([illegible]) کی طرح اس بزرگ اور آزاد خیال شہنشاہ نے اس کام کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا تھا۔ اس بزم علمی میں قابل اور سرگرم علما و فضلا کا ایک مجمع رہا کرتا تھا جو اپنے روشن خیال شہنشاہ کی حکم برداری میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے اور ہندو علمی مختلف کتب کا ترجمہ کیا کرتے تھے چنانچہ ان مترجمین میں فیضی۔ ابوالفضل۔ حاجی محمد سلطان۔ ملا شاہ نقیب خان۔ اور عبدالقادر خصوصاً نہایت قابل سنسکرت دان تھے۔ یہ انھیں لوگوں کا طفیل ہے کہ اُس ادب کا جسے ہم لوگ «ہندو مسلم لٹریچر» کہتے ہیں اکثر حصہ وجود میں آیا۔ اُن تمام کتب میں جو اکبر کے دور حکومت میں ترجمہ کی گئیں راماین خصوصیت سے قابل قدر ہے مسلمانوں میں بھی عام طور پر اس کتاب کی وقعت بڑھنے لگی۔ یہ مقبولیت عامہ صرف اکبر ہی کے دور حکومت تک محدود نہیں رہی بلکہ بعد میں بھی بدستور جاری رہی۔ راماین کی عالمگیر شہرت و مقبولیت کا راز اسکی نظم کی دلچسپیوں میں مضمر ہے۔ اس واقعہ سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ نظم کی صنعتی خوبصورتی، سوز و گداز، سلاست، ترکیب کی دلآویزی اور برجستگی میں دوسری زبانوں کے لٹریچر بہت کم اسکا ثانی رکھتے ہیں کیونکر ہوسکتا تھا کہ فارسی لٹریچر جو ہر قسم کے مضامین سے مکمل اور مالا مال ہے اور دنیا کے دوسرے لٹریچروں کے جواہر ریزوں کو جذب کرنے میں ہمیشہ بے نظیر رہا ہے باوجود موقع حاصل ہونیکے اسکا ادب اس نظم کے بیش بہا حسن اور اس ضخیم مثنوی کی رنگا رنگ بچیکاری سے محروم رہے چنانچہ اکبر نے اس کمی کو محسوس کرنے پر حکم دیدیا کہ سنسکرت راماین کا فارسی (آئین اکبری (ترجمہ بلوکمین) جلد اول صفحہ ۱۰۵) نثر میں ترجمہ کیا جاسے یہ کام عبدالقادر بدایونی

جیسے دیندار و متشرع مسلمان کو جو ابوالفضل اور دوسروں کو "کافر" کے لقب سے یاد کرتا تھا سپرد کیا گیا یا بقول اُسکے یہ بدقسمتی اُسکے سر تھوپی گئی۔ اور واقعۂ یہ قسمت کا تماشا تھا کہ اُسکی شخصیت کا دیندار آدمی "کافروں کی کتاب" کا ترجمہ کرنیکے لیے مامور کیا جائے۔ چنانچہ اس واقعہ پر وہ اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں اپنی قسمت کا رونا ان الفاظ میں روتا ہے۔ الیٹ جلد پنجم صفحہ ۵۳۷)

"لیکن یہ میری قسمت کی خوبی ہے کہ میں ایسے کاموں پر تعینات کیا گیا ہوں" اسکے بعد لکھتا ہے

"تاہم مجھے اس خیال سے صبر ہے کہ قسمت کا جو لکھا ہے وہ پیش آنا ضرور ہے"

یہ ریمارک صاف طور پر ظاہر کر رہے ہیں کہ رامائن کا ترجمہ کرنے کے لیے بدایونی ہرگز رضامند نہ تھا لیکن اکبر کا حکم جسکو ٹالنا ممکن نہ تھا جسکو وہ ٹال (دیکھو بدایونی (مترجمہ لو) جلد دوم صفحات ۳۴۶ و ۳۴۷) نہیں سکتا تھا۔ آخر کار وہ اسکو چار سال کی مستقل محنت و سعی کے بعد ۹۹۹ھ ہجری میں کام ختم کرنا ہی پڑا۔ ان واقعات کو وہ اپنی تواریخ میں اسطرح قلمبند کرتا ہے (الیاٹ جلد پنجم صفحہ ۵۳۷۔ بدایونی (لو) جلد دوم صفحہ ۳۷۴) میں سال تالیف رامائن ۹۹۲ھ ہجری دیا ہے الیاٹ نے ۹۹۱ھ درج کیا ہے جو غلط ہے "ماہ جمادی الاول ۹۹۹ھ ہجری میں میں نے رامائن کا ترجمہ ختم کیا چار سال اسمیں صرف ہوئے جب میں نے اس کتاب کو پیش کیا تو بیحد تعریف کی گئی۔ رامائن (اس رامائن) کا ایک خوبصورت اور منقش قلمی نسخہ جسکی قیمت بیس ہزار پونڈ ظاہر کیجاتی ہے۔ کرنل ہنٹا کی لائبریری واقع واشنگٹن (ریاستہائے متحدہ امریکہ) میں موجود ہے (دیکھو آسمتھ کی تاریخ فنون لطیفہ در ہند و سیلون صفحہ ۴۵٦) کا یہ پہلا ترجمہ ہند و مسلم لٹریچر کی تاریخ میں سنگ بنیاد خیال کیا جاسکتا ہے کیونکہ اُسنے آنیوالے شعراء و مصنفین کے لیے راستہ صاف کر دیا اور فارسی نثر میں ایسا مصالحہ فراہم کر دیا کہ وہ اُس سے عمارت کھڑی کر سکیں اسکے علاوہ ایک دوسرا جزو جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور جس نے رام اور سیتا کے قصہ کو زیادہ ہر دل عزیز بنا دیا تلسی داس کی رامائن ہے جو سولھویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصہ میں تالیف ہوئی۔ اس ہندی رامائن کا ظہور بے نظیر اہم تھا کیونکہ اسنے رامائن کی ناموری اور شہرت میں چار چاند لگا دیے اور غالبًا یہی سبب ہے کہ جب ہم جہانگیر کے عہد حکومت (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) میں آتے ہیں تو رامائن کے کم از کم دو مزید ترجمے یا خلاصے پاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا تو مُلا سعد اللہ مسیح پانی پتی (یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر ریو (فہرست برٹش میوزیم جلد دوم صفحہ ۳۰۹ بی) اور مولوی عبد المقتدر (فہرست خدا بخش خان لائبریری جلد سوم صفحہ ۱۰۰) اور چند دیگر اشخاص نے حکیم

رکن الدین مسعود کو رامائن کا مصنف قرار دیا ہے جن کا شاعرانہ تخلص مسیح تھا اور جنہوں نے جہانگیر کے عہد حکومت میں شہرت حاصل کی لیکن ان فہرستوں کا بیان صریحاً غلط ہے کیونکہ رکنائے مسیح کسی رامائن کا مصنف نہیں تھا - علاوہ برین قریب قریب تمام مورخین جنہوں نے ملا مسیح کی سوانح عمری لکھی ہے اس رامائن کی تالیف کا سہرا انہیں کے سر باندھتے ہیں اس بیان کی تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو ماثر الامرا جلد سوم صفحہ ۴۸ ، ہمیشہ بہار ، شاہ سپر نگر صفحہ ۱۲۹) کلمات الشعرا (قلمی) ورق ۶۹ بی ، تذکرہ حسینی صفحہ ۳۲۵ ۔ مقالات شبلی صفحات ۱-۲ کا منظوم ترجمہ ہے دوسرا بھی ایک منظوم ترجمہ ہے جسکا مصنف ایک ہندو گردھر داس ہے ۔ ملا مسیح شہنشاہ جہانگیر کے ایک امیر مقرب خان (ماثر الامرا جلد سوم صفحات ۳۷۹ - ۳۸۲) کا ملازم تھا اُسنے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی کی ملازمت میں گزارا - اُس کی تالیف کردہ رامائن کی اُسکے تمام معاصرین اور بعد کے مورخین نے بہت تعریف کی ہے اور تقریباً سب نے بجنسہ اس شعر کو نقل کیا ہے جو اُسنے سیتا کی تعریف میں لکھا تھا ۔

تنش را پیرہن عریان ندیدہ — چو جان اندر تن و تن جان ندیدہ

بعض ناقدین اور متعصبین نے ملا مسیح پر کفار کا فسانہ لکھنے پر اعتراض کیا ہے لیکن اُسنے اپنے دیباچہ میں نہایت قابلیت سے اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے اور الزام سے بری ہونیکی کوشش کی ہے ۔ اس کا طرز بیان اعلیٰ اور دل پسند ہے لیکن اسمیں ایک خاص بات یہ ہے کہ اسنے مناظر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہندی نہیں ہے بلکہ ایرانی ہے جسکا اثر یہ ہوا ہے کہ ایک ہندوستانی پلاٹ ایران کے دلکش وادیوں اور گلزاروں میں منتقل ہو گیا ہے ۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیتا کا سادہ اور پاک کیرکٹر ایک ایسا مجموعہ ہو گیا ہے جسمیں ایک ہندوستانی ہیروئن گویا ایسی نظر آتی ہے کہ اسمیں شیرین کا حسن لیلےٰ کی دلربائی اور عذرا کی راستبازی آکر جمع ہو گئی ہے ۔ جو کہ فارسی افسانوں کی معشوقہ ہیں - مثال کے طور پر یہاں پر چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جنمیں سیتا کے خد و خال کا ذکر ہے جیسا کہ اپنے بھائی راون سے بیان کیا - ناظرین اسکو پڑھکر ایرانی حسن کی رامائن (قلمی) موجودہ کتب خانہ رامپور ورق ۳۰ اے) خصوصیات کو فوراً ملاحظہ کر سکتے ہیں -

رخش از خندہ صبح انتخابی — جہان آرزو را آفتابی
چو چشم خود سراپا مین مستی — مثال آئینہ در خود پرستی

بعہد مہ جمالش بے نقاب ست　　　نہ شیخ مہکہ میں آفتاب ست

بعہد جان آرزو خورشید تابان　　　زبش میرفت از جاروب مژگان

جمالش در کمال نو جوانی　　　چو عکس جان در آب زندگانی

مسیح نے ایک خاص باب ہندوستان کی مدح سرائی کے لیے مخصوص کر دیا ہے وہ اسطرح لکھتا ہے (راماین (قلمی) موجودہ کتب خانہ راقم ورق ۱۴ بی)

زمین عشق ست ہندوستان زمین را　　　کہ عشق آنجاست مذہب کفر و دین را

آگے چل کر شاعر ہندوستانیون کے سچے عشق کی گرمی اور حقیقی تعریف کرتا ہے اور ہندوستانی عورتون کو شان دار ہدیہ پیش کرتا ہے جو اپنے مردہ خاوندون کی ارتھی پر بیٹھکر اپنے کو آتش سوزان کے حوالہ کر دیتی ہین۔ آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ عشق عالمگیر ہے اور جس جگہ سچا عشق موجود ہے وہ اُس ملک تک کی پرستش کرنے کو تیار ہے اور وہ ہیرو جو اُسکی نظر مین حقیقی اور دائمی عشق کے درجۂ کمال کا پتلا معلوم ہوگا اُسکو دیوتا تسلیم کرنے سے بھی دریغ نہ کریگا۔ چاہے وہ مجنون لیلے کا عاشق ہو یا فرہاد شیرین کا خواہ رام سیتا کا وہ اسطرح لکھتا ہے ،، (راماین مصنفہ جلد ایم ایس ورق ۱۶)

دمے ہشیار باش اے دل زمستی　　　بکفر عشق کن یزدان پرستی

نہ فہمد راز وحدت غیر عاشق　　　کہ گرد کعبہ گردد دیر عاشق

نہ عاشق کافر ست و نے مسلمان　　　کہ داند عشق را خود دین و ایمان

ابھی تک تو ہمنے صرف مُلا مسیح کی یادگار زمانہ راماین ہی کا حال لکھا ہے اب ہم اس عالمگیر لٹریچر کے دوسرے ہمعصر ترجمہ کی طرف متوجہ ہوتے ہین۔

جو دہلی کے ایک ہندو گردھر داس (فہرست کتب فارسی قلمی جلد اول صفحہ ۱۵۶ موجودہ برٹش میوزیم) کی موزونیت طبع کا نتیجہ ہے یہ شاعر جہانگیر کے عہد سلطنت مین گذرا اور اسی کے نام سے اُسنے اپنی مثنوی معنون کی ہے۔ اس مثنوی مین اُسنے جہانگیر کی اُسکے علم و علما کی حمایت پر بیحد مدح سرائی کی ہے یہ مثنوی ۱۰۳۲ ہجری (۱۶۲۳ء) مین ختم ہوئی جیساکہ شاعر خود اپنے کلام کے آخر مین ظاہر کرتا ہے۔ اور اُسکے بیان کے موجب اسمین ۱۵۹۰۰ اشعار ہین مگر اس مثنوی مین کوئی نئی بات نہ تو طرز تحریر کی جدت ہی مین ہے اور نہ اس موضوع کی آرائش مین۔ اور گو اس امر کا ضرور اعتراف کرنا ہوگا کہ ایک ہندو

مصنف نے ایک غیر ملکی زبان میں اپنی مجبوریوں کے باوجود معقول جدوجہد کی ہے لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسکی رامائن اس معیار سے فرو پست ہے جو اس رزمیہ نظم کے شایان شان ہے

اب ہم چند رمن تبدیل غلف سر رام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جسکو رامائن کے دو مختلف ترجمے کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان ترجمون میں سے ایک تو نثر میں ہے اور دوسرا نظم میں۔ اسکا نثر ترجمہ لفظی نہیں ہے بلکہ آزاد ہے اور پُر زور اور اولوالعزمانہ طرز تحریر سے مالا مال ہے جسمین تازگی اور خیالات کی شگفتگی عام طور پر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے مگر بدقسمتی سے اسنے اپنے کلام مین رنگین عبارت اور تصنع کلامی کی نمائش کرنا چاہی ہے جو صدیوں سے فارسی لٹریچر مین علمی کمال کا عام طور پر معیار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس قابل افسوس طرز انشا کا بُرا اثر اس زمانہ کی اور انشا پردازیون کی طرح اس رامائن مین بھی موجود ہے غالباً اس مصنوعی کمال انشا کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ تاریخی واقعات کی ایک بھلی اور دلاویز جھلک غائب ہو گئی ہے لیکن تعجب ہے کہ اسکے ابتدا کے سات یا آٹھ اشعار حقیقت مین بہت اچھے ہین اور یقیناً اُس کے شاعر ہونے کی شہادت دیتے ہین اس لحاظ سے اُس کی دوسری رامائن جو نظم مین ہے قدرتاً ایک بہتر تصنیف ہے۔ مؤخر الذکر مثنوی ترجمہ کو جس کو وہ نرگستان (یہ بیانات تذکرہ نرگستان کے دیباچے سے منتخب کیے گئے ہین (مکتوبہ ۱۲۹۲ہجری بمطابق ۱۸۷۵عیسوی) کے نام سے موسوم کرتا ہے اُسنے اپنے محب صادق کہا تملداس کی فرمایش سے ۱۰۴۰ھ ہجری (مطابق ۱۶۲۹ء) مین تصنیف کیا۔ اُسوقت اُسکی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ بیدل تاجدار وقت عالمگیر کا بہت مداح تھا اور اُس کو وہ عادل اور فرشتہ خصلت کے لقب سے یاد کرتا ہے ایک موقع پر (نرگستان صفحہ ۴) اس طرح لکھتا ہے کہ ؎

جہان را شاہ تا اورنگ زیب است ۔ بہ ہندوستان نہ نیرنگ و نہ زیب است

اس کتاب کے آخر مین بیدل نے ان کتابون اور مثنویون کی فہرست درج کی ہے جو خود اس کی تصنیف ہین اور ان دو زیر بحث کتابون کے علاوہ تعداد مین کُل چھ ہین وہ خاتمہ پر کہتا ہے۔

نماندست در ما بجز عشق رام ۔ چگویم ازین بیشتر والسّلام

یہان پر میرے خیال مین یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس عام غلط فہمی کو جو اس رامائن کے

مخالف کے متعلق پھیلی ہوئی ہے دور کردیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ رامائن کا ترجمہ مرزا عبدالقادر بیدل نے کیا ہے جو ہندوستان کا سب سے زبردست آخری فارسی شاعر تھا اور مذکورۂ بالا رامائن کے متعلق یہی غلطی پنجوا ایڈیشن میں مکرر درج کی گئی ہے لیکن یہ امر بجا ناقابل وثوق ہے کیونکہ مرزا موصوف نے کبھی رامائن کا ترجمہ نہیں کیا علاوہ اسکے اندرونی معتبر شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ یہ چندر من بیدل کی مثنوی ہے نہ کہ اسکے مشہور و معروف مسلم ہمعصر کی۔

اسکے بعد ایک ضخیم رامائن کا نمبر آتا ہے جو فارسی میں ترجمہ کی گئی ہے اسمیں تقریباً ۰۰۰ ۱ صفحے ہیں اور ہر صفحہ میں ۲۴ سطریں ہیں یا یوں سمجھنا چاہیے کہ اس مثنوی میں کل ۰۰۰ ۴۰ اشعار ہیں جو امانت رائے (امانت رائے کی رامائن کے متعلق حالات اسکی رامائن کے ایک قلمی نسخے سے بالکل جداگانہ طور پر لیے گئے ہیں) متوطن موضع لال پور یوپی (دیگرستان صفحہ ۱۱۴) کے جسے اس کے دادا گوپال نے آباد کیا تھا تیار کردہ ہیں اس کے والد شہامت تھے اُسے بہت اعلیٰ تعلیم دیکر علم شاعری میں طاق کیا۔ ایک مرتبہ کا اتفاق ہے کہ اُسکا آبائی گانوں سیلاب سے غرقاب ہوگیا۔ اور یہ شاعر دہلی جانے پر مجبور ہوا۔ دہلی ہونچکر اسنے اعلیٰ امجد کی ملازمت اختیار کی جسکو وہ "علم دوست" کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اس کے انتقال کے بعد یہ شاعر اعلیٰ امجد کی بہن رحیم النساء کے زیر سایہ رہا اور یہی ملازمت کا زمانہ تھا جبکہ اُسنے اپنی یادگار زمانہ مثنوی تالیف کی درحقیقت امانت رائے کو صرف بہترین رامائن لکھنے ہی کا فخر حاصل نہیں ہے بلکہ نہایت ہی ضخیم رامائن مثنوی لکھنے کا بھی ہے۔ یہی وہ شاعر ہے جسے مخصوص باب کے آخر میں ایک ایک غزل ایزاد کر دینے کا بھی شرف حاصل ہے جو پوری مثنوی میں تقریباً دو سو سے زائد ہیں۔ اسمیں کلام نہیں کہ ہر ایک خاص باب کے آخر میں ایک غزل بڑھا دینا ایک عمدہ اختراع ہے اور ایک حد تک اس سے وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے جو زمانۂ قدیم میں ڈراما کے کورس ادا کرتے تھے لیکن نہایت تعجب ہے کہ امیر خسرو۔ امانت رائے اور چند دوسرے شعراء کے سوا کوئی اس اختراع کو اپنی مثنوی میں کام میں لایا ہے۔ یہ قابل اظہار ہے کہ امانت رائے کی غزلیں خوبصورتی اور دل آویزی سے پُر ہیں۔ اور درحقیقت اسکی مثنوی رامائن کی زینت ہیں جو اپنے طرز میں فردوسی کے لازوال شاہنامہ کی نقل ہے۔

اس فارسی رامائن کی تصنیف میں امانت رائے کو کئی سال صرف کرنا پڑے ہونگے لیکن

اس بارے میں مثنوی کے کسی حصہ میں کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ بیرونی شہادتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اُس نے اِس ترجمہ کو پچیس برس تک نہایت استقلال کے ساتھ کام کر کے ختم کیا۔ اس کتاب کی تاریخ اختتام ۱۶ شوال ۱۱۶۱ھ ہجری مطابق ۵۔ساون ۱۸۰۱؁ ہے۔

ذیل میں وہ غزل درج کی جاتی ہے جو ہنومان جی کے حال میں لکھی گئی ہے اور جس میں وہ سیتا جی کو نہایت بےچینی سے تلاش کر رہے ہیں۔ واقعی یہ غزل نہایت دلآویز اور رقت آمیز ہے اور ناظرین کی ہمدردی حاصل کرنے میں ناکامیاب نہ رہے گی۔ (راماین قلمی امانت رائے ورق ۲۱۹ بی)

شدم بسیار شب بیہودہ بر گردِ جہاں اینجا — نہ شد پیدا مہِ تابان ز بام آسمان اینجا
بسے سرگشتہ و آوارہ گردیدم درین صحرا — نہ شد از ہیچ پیدا غبار کاروان اینجا
بگردِ لالہ و گل چون صبا بسیار گردیدم — ندیدم نازِ گلِ رعنا اثر در گلستان اینجا
بگفتند از مکان و لامکان اہلِ مجاز آخر — نہ داد از حسنِ معشوقِ حقیقی کس نشان اینجا
بہر جا روبپائے بُتانِ شہر افتادم — نہ شد مقصود من حاصل ازین سنگین دلان اینجا

نہ شد وا پردۂ حسنِ یقین زنہار بر زدیم
امانت وار گشتم صرف در وہم و گمان اینجا

انڈیا آفس لائبریری لندن (انڈیا آفس لائبریری۔ فہرست فارسی ایم ایس ایس صفحہ ۱۰۹۹) میں کئی راماین مثنویاں ہیں ان میں سے ایک مثنوی کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے یہ ضخیم مثنوی ہے جس میں تقریباً ۵۰۰ ورق ہیں اور اُس کے دو ابتدائی اشعار جن کو ایتھی نے انڈیا آفس کے قلمی نسخوں کی فہرست میں نقل کیا ہے، ظاہر کرتے ہیں کہ نظم کی بحر بالکل ناموزون ہے اور اُسکا پڑھنا اُسیقدر دشوار ہے جسقدر حکیم سنائی کی حدیقۃ الحقیقۃ کا جو فارسی میں غالباً سب سے زیادہ خشک کتاب ہے۔ (تاریخ ادبیات ایران مؤلفہ براؤن جلد دوم صفحہ ۳۱۹)

دوسرے نامعلوم مصنف کی تصنیف کردہ فارسی راماین مثنوی اسر ولیم اُس کے کتب خانہ میں ہے فہرست کتب خانہ ہذا نمبر ۱۸۹)۔ لیکن اس نسخہ کے مزید تفصیلی حالات نہیں ملے اس لیے مجبوراً ہمیں اسی اطلاع پر کفایت کرنا ہوگا۔

آخر میں اب ہم راماین کے بقیہ نثر ترجموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جنکی کئی جلدیں اب بھی موجود ہیں

لیکن انکا حال بیان کرنے سے پیشتر مین ان کتب کے متعلق ایک دقت کو بتادینا چاہتا ہون اور وہ یہ ہے کہ انکے مختلف نسخون کے درمیان فرق کرنا بیحد دقت طلب ہے کیونکہ وہ آپسمین ایک دوسرے سے اپنے طرز عبارت مین اسقدر ملتے جلتے ہین کہ ان مین صرف خفیف سا لفظی فرق نظر آتا ہے ۔ ایک واقعہ ہے جو بلا محالہ ہم کو اس نتیجہ پر پہونچاتا ہے کہ وہ سب صرف ایک ہی نسخہ کی غیر صحیح نقلین ہین مگر چند ترجمے ایسے بھی ہین جنکے متعلق ایسی کوئی دقت پیش نہین آتی ۔ ان مین سے ایک تو موجخ لائبریری (دیکھے آرسفوہ ۱۴۰ نمبر ۳۴۹) مین ہے دوسری جلد دیو یداس کی تالیف کردہ برٹش میوزیم مین ہے (ریو صفحہ ۵۵) اسکا ترجمہ تلسی داس سے کیا گیا ہے اسمین دو باب زائد ہین جنمین راجچندر جی کی سوانحمری دیتا ہے ۔ برٹش میوزیم مین جو جلد ہے وہ بہت ضخیم معلوم ہوتی ہے اور غالباً بہت صحیح جلد ہے جس کے مصنف کا کچھ پتہ نہین ہے (اتھی نمبر ۱۹۶۳)

آخری جلد فارسی رامائن یا بموجب اصل کتاب بالمیک کی رامائن کا ترجمہ ہے یہ جلد بہ نسبت دوسری کتابون کے بالکل جدید ہے جسکا مصنف انند گھن المتخلص بہ خوش ہے یہ مترجم کئی کتابون کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ایک حد تک معروف ہے ان تصنیفات مین خاص خاص یہ ہین ۔

(۱) رامائن نجات کاشی کھنڈ یا تاریخ شہر بنارس ۔ (۲) گیتا بھارت ۔ (۳) مثنوی گلبکاولی (۴) ایک دیوان جسکا نام شاعر نے اپنے تخلص "خوش" پر دیوان خوش رکھا ہے ۔ اس کا ترجمہ رامائن نامکمل ہے اور آخری کانڈ کا ترجمہ باقی ہے ۔

انمین سے چھ تو نظم مین ہین اور باقی چار نثر مین ، یہان ہر ایک کتاب سے بحث کرنا مقصود نہین بلکہ صرف اسقدر کہکر اپنا مضمون ختم کرنا ہے کہ یہ کل ترجمے نہایت دلآویز ہین اور مجھے یقین ہے کہ اگر انکا صحیح ناقدانہ اڈیشن شایع کیا جائے تو ادب فارسی کے ہوا خواہون کے لئے انکا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا ۔

محفوظ الحق ۔ ایم ۔ اے

یورپ کی تہذیب اور مشرق کا فرض

موجودہ تہذیب کا درخت یورپ کی سرزمین پر اُگا ہے لیکن اُسکے تباہ کن اثر سے دنیا کا کوئی حصہ پاک نہیں ہے "اسمین جدائی" و فساد کا زہریلا مادہ ہے۔ اس تہذیب کا اصلی منشا یہ ہے کہ دوسرے پریشان رہیں، بلکہ تباہ برباد ہو جائیں۔ اسکا وحشیانہ رویہ ہمیشہ متقاضی ہے کہ دوسرون کی بضاعت ختم ہو جائے اور وہ آیندہ کسی زمانہ مین بھی پنپنے نہ پائین۔ دوسرونکی ترقی کو یہ حاسدانہ نظر سے دیکھتی ہے اور اسے دوسرونکے فلاح میں (خواہ مخواہ) خطرات نظر آتے ہیں۔ دوسرونکی قومیت کو ضعیف کرنے مین یہ اپنی بہترین کوشش صرف کرتی ہے۔ دنیا میں جنگ و غارتگری ہمیشہ سے ہوتی آتی ہے لیکن یہ خونخوار و آدمیت سوز تہذیب سب سے بڑھ گئی۔ پہلے کوئی تہذیب ایسے ایسے مہلک آلات سے مدد حاصل نہین کر سکتی تھی۔ اب قوم کی قوم اس آگ کی ایندھن ہوتی جاتی ہے۔ اس تہذیب مین انسانیت کی بو تک نہین اس کی مثال اوس کروڑپتی کی ہے جو اپنی روح کو بیچکر دولت جمع کر رہا ہو۔ نہ تو اسے سچ کے لاج ہے اور نہ جھوٹ کی شرم۔ لالچ کے بڑے بڑے بت اس نے اپنی مندروں میں بنا رکھے ہیں اور انھیں پوج پوج کر وہ قومی خدمت کا فرض ادا کرتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کاغذ کی ناؤ ہے "آج نہ ڈوبی تو کل ڈوبیگی"۔ قانون ربانی ہر ایک انسان اور قوم کیلئے یکسان ہے۔ خدا کی لاٹھی مین آواز نہیں۔ ظلم کی کوئی انتہا ہونی چاہیے۔ قوم کا نام لیکر ظلم کرنا کب تک نبھے گا۔ ظالم ظلم کا عادی ہو کر اپنے قوم پر بھی ظلم کرنے لگتا ہے اور اسی سے قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ ایسی تہذیب جسکی بنا ایسی قومی خدمت پر ہو زیادہ دنوں تک برسر عروج نہین رہ سکتی۔ یونان قدیم کی تہذیب کا چراغ اوسی کی سرزمین میں گل ہوا اور رومی شان و شکوہ کے نشان کا مدفن خود اطالیہ کا میدان ہے۔ چین ہندوستان کی پاک زمین کو دیکھو اسکا مقصد عام انسانوں کی فلاح اور اسکا نصب العین انسان کی روحانی ترقی ہے۔ بظاہر ہندوستان اور چین کی تہذیب کا چراغ ٹمٹماتا ہوا نظر آتا ہے اور یورپ کے مصنوعی و فانی بجلی کے لیمپ بڑی شان سے جگمگا رہے ہیں لیکن مشرق کا چراغ اُس چھوٹے اور ذلیل بیج کی مانند ہے

جو نشو و نما پاکر سارے عالم کو اپنے میوے سے پرورش کرسکتا ہے۔

نوعمر مغرب اپنی دوڑ سے آپ پریشان ہو کر جب تھک جائیگا تو اسے معمر مشرق کے پاس آنا پڑیگا مشرق نے اپنے اندر آفتاب کی کرنوں اور ستاروں کی خاموشی مین یہ پختگی کروڑوں برس میں حاصل کی ہے۔ یورپ اپنے کاموں میں اسی طرح سے مشغول ہے جس طرح ایک گاڑی کا سوار اپنے سفر میں۔ یہ مسافر جب بجلی کی طاقت سے تیز چلنے والی ریل گاڑی پر سوار رہتا ہے تو اس غریب کسان کو جو زمین جوتنے میں صبح سے شام تک لگا رہتا ہے ذلیل نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن جب مسافر سفر ختم کرکے بھوک کی تکلیف سے نجات پانے کے لیے اتر پڑتا ہے تو اوسی غریب کسان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر غذا مانگتا ہے۔

دنیا کے خرید و فروخت کبھی بھی بند نہ ہوگی۔ عشق و حسن کی کہانیاں ہمیشہ زندہ رہینگی۔ مصیبت و صبر کو کبھی بھی فنا نہیں۔ مشرق شوق سے اوس وقت کا انتظار کریگا جب مغرب تہذیب کے باب مین اس سے سبق لینے آئے گا۔

مشرقی ایشیا اپنی تہذیب پر آپ وجد کر رہا تھا۔ اس کی تہذیب میں دنیاوی خیالات نہ تھے اسکو روحانی ترقی کا خیال تھا۔ اوسمیں اپنی کلوں کی مضبوطی نہ تھی۔ بلکہ انسان کے روحانی تعلقات کا اظہار تھا شاہی تاج و تخت کے جھگڑے اور غیر ملکی حملوں کی اسے ذرہ برابر بھی پرواہ نہ تھی کیونکہ اسکا کام زندگی کے گتھیوں کا سلجھانا تھا۔

اگرچہ ایشیا کے متصوفانہ خیالات یورپ کی موجودہ تہذیب میں قائم نہ رہ سکے لیکن ہمیں اسکا افسوس نہ کرنا چاہیے بلکہ دنیا اب بھی ہماری جولانگاہ ہے۔ اسکو اپنی مشرقی تہذیب کے فراغ کی روشنی سے منور کرنا چاہیے

(ٹیگور)

سید محمود شیر بی اے

بحرِ ترنم

دیش بندھو داس ایک مشہور پولیٹیکل لیڈر ہونے کے علاوہ بنگال کے ایک نامور شاعر و پردازانشاپرداز بھی ہین، آپ کی ایک مشہور تصنیف سانگیت کا ترجمہ ہمارے مکرم منشی بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی نے "بحرِ ترنم" کے نام سے کیا ہے - اس سے پہلے گیارہ نظمون کا ترجمہ مارچ ۱۹۱۳ء مین ہدیہ ناظرین ہو چکا ہے آج ہم اس تصنیف لطیف کی دوسری قسط پیش کرتے ہین۔ "اڈیٹر"

(۱) اے مصور گلکار - مین تیری صنعت پر نثار - کس قدر چابکدستی سے تو نے ان حیرت انگیز پھولون کے رنگون کو عالم شہود مین آشکارا کیا ہے - اف انکا تو شمار و قطار ہی نہین - اور وہ پھول بھی کیسے جو تیرے گلکدہ مین بہار ہستی کا مزہ لے رہے ہین!

اور وہ گلکدہ کیسا؟ پھولون سے لدا ہوا - زرخیزی مین بے مثل - اس سرے سے اوس سرے تک معجزہ نور!

میری مشتاق نگاہین پھولون کے حسن و جمال کے نظارے کے لیے ہر طرف دوڑتی ہین -

لیکن آج مجھے تیرے گلکدہ کی تلاش نہین - مین صرف تیرے راگ کا مشتاق ہون - ترنم ساز ہو جا - مین اسکی آواز کی موجون پر بڑی دور تک تیرتا ہوا چلا جاؤن گا - اور ان موجون کی تہ مین ڈوب جاؤن گا -

اپنے موقلم سے میری آنکھون کے پردے پر عمیق تاریکی نقش کر دے - مین اپنی آنکھین بند کیے ہوئے چپ چاپ لیٹا رہون - کچھ نہ دکھلائی دے - مین اس آواز کے سمندر مین ڈوب جاؤن گا - ہان ڈوب جاؤن گا - اور بس یہی سمندر رہوگا - اسکے سوا اور کوئی سمندر نہوگا - چاہے دنیا لاکھون اور راگون کی بے شمار تانون سے گونج اٹھے

راگ نمبر ۱۳

(۲) یہ کون چیز ہے - جو ادھر ادھر چمک چمک کر اس چاندنی رات مین خواب نورانی کیطرح تیرے سینہ کو

آئینہ بنا دیتی ہے۔!

اس کے نور مین راحت لافانی مستور ہے۔ ذرا ہم آہنگی اور سرمستی کا عالم دیکھنا۔ بے روک ٹوک۔ مسرت بے پایان کے ساتھ تیرے دل مین اتری جا رہی ہے۔

کیا یہ گذشتہ زندگانیون کے خواب کا پرتو ہے۔ یہ کس گذشتہ نیکی کا ثمرہ بنکر تیرے دل مین لہرا رہی ہے۔ تیری مدت ہستی مین کون مٹا ہوا خیال اس خواب کو نقش کرنے کے لیے ابھر آیا ہے۔!

صرف میرے دل مین اسکی تنویر کا عالم چھایا ہوا ہے۔ اور اس چاندنی کی موجون مین سیکڑون پھول یادون کے کھل جاتے ہین۔ پھر جب سیکڑون زندگانیون کی اشکباری اور قہقہہ ریزی کا میرے دل پر اثر ہوتا ہے تو اس راگ کے سمندر مین وہ بھی ترانہ سنجی پر مائل ہو جاتا ہے۔ اس وقت میری تمام زندگیان ایک ہی سلسلے مین منسلک ہو جاتی ہین۔ اور محض ایک پھول کی طرح خواب کے سمندر مین تیرنے لگتی ہین۔

راگ نمبر ۱۴

(۳) — لو بادل چھا گئے۔ مطلع ابر آلود ہو گیا۔ اور ہر طرف تاریکی پڑا جانے لگی۔ لہر پر لہر اچھلتی ہوئی چلی آ رہی ہے مگر درد سے بے چین مضطرب۔ تھرتھرائی جاتی ہے۔ کانپ رہی ہے۔ ذرا جوش و خروش دیکھنا۔ گویا کوئی چیخ رہا ہے۔ آج عالم بالا پر ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اور ادھر میری روح نے عجیب غوغا مچا رکھا ہے۔

کیا یہ نعرۂ مسرت ہے؟ کیا یہ نالۂ دلگداز ہے۔ یا کوئی گہری محبت سے نکلی ہوئی صدا۔ یہ کس قدر متوحش ہے کس قدر جنون خیز ہے۔ معاذاللہ مجسم اضطراب ہے۔ اے دل یہ کس قسم کا راگ تونے چھیڑا ہے۔ آخر کس چیز کی طلب ہے۔ تو کیا چاہتا ہے۔؟

دیکھنا آج عالم بالا پہ ہر طرف تیرگی کا عالم طاری ہے۔

راگ نمبر ۱۵

(۴) — دیکھنا آج گردون کس قدر تیرگی خیز ہے۔ اور تیرے بازو عالم وحشت مین مائل پرواز ہین۔ تیرے سینۂ تاریک پر روز قیامت کے طوفان کا جمگھٹا ہے۔ اور تیرا راگ فرط جنون سے متوحش میرے دل مین برق آسا ادھر ادھر چکیدہ رہا ہے۔ ہان اس عالم مین۔ اے بحر جنون انگیز آ۔ تموج خیز ہو کر اس عالم

تیرگی میں میرا سینہ تیرے لیے بے حجاب نہ کھلا ہوا ہے۔ میں تجھ پر تیر دونگا، میں تجھ میں ڈوب جاؤنگا۔
دیکھو موت کی تاریکی آسمان پر چھائی ہوئی، اور ہوا کے جھونکوں میں ملے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب باتیں مجھے قیامت کے آثار دکھا رہی ہیں۔

راگ نمبر ۱۶

(۵) - یہ صدا جو کسی دلکش ساز سے نکل رہی ہے۔ نہ تو خوابوں کے گلکدہ کا کوئی ہار ہے نہ کوئی سرود لطیف، ! یہ تو درد ہے۔ دیکھو دنیا غرقاب فنا ہو رہی ہے۔ قیامت کا چشمہ نہایت خشم آگین ہو کر سرعت کے ساتھ بڑھتا ہوا چلا آرہا ہے۔

تیرہ و تار آکاش میں وحشت انگیز طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں۔ بے تھاہ سمندر آسمان پہ اچھلے جا رہے ہیں۔

اور موت کی اس ہنگامہ خیز صدا اور بقا کے ان ہولناک نغموں میں یہ شب تیرہ و تار بے نور ہے۔ کہیں روشنی کا پتہ نشان نہیں۔ صرف کوندا لپک رہا ہے۔

اور موت تیرے سینۂ فگار کے اندر سے پکار رہی ہے۔ تیری وحشت خیز موجوں میں بقا کے بے شمار اژدہے منہ پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یہ ہے قیامت کا ہولناک منظر۔ لاکھوں (عفریت) دہشت سے صدائے خشمگین بلند کر رہے ہیں۔

اور موت بے انتہا تیرگی کے عالم میں اپنی صدا لگا رہی ہے۔

راگ نمبر ۱۷

(۶) یہ طوفان جاؤدانی میری روح میں سما گیا ہے۔ بادبان شکستہ ہو گیا۔ لنگر ٹوٹ گیا۔
ہاں، میرے دل کا سفینہ غرقاب ہوتا ہے۔
اس بحر قیامت میں۔ اس بحر چشمۂ فنا میں میرا دل کبھی نہ دور ہونیوالی تاریکی کے سبب بے بس ہے

اے قلزم مواج

آج تو میرے سینہ میں اپنا قیام کر۔ میں اسکے اندر تجھکو منور رکھونگا۔

راگ نمبر ۱۸

(۷) اے جٹا داری جتی۔ اے کال (موت) پلٹ جا پلٹ جا۔ انھیں پاؤن لوٹ جا اپنا پر لے کا ترسول اپنے پاس رکھ۔ باہمت بکال۔ حیات کو باحیات رہنے دے۔ اسکو اپنی روح کے راگ مین وصل اور اپنے کاشانہ مین فنا ہو جانے دے۔

لے بجو قیامت۔ اے رؤدر۔ کال۔ (وقت) کے بے تھاہ سمندر کے رنج و راحت سے لبریز کائنات کا کنول تیرتا اور ڈگمگانے لگتا ہے۔ اسکو چھوڑ دے۔ اسکو دل بھر کے کھیل لینے دے ہان اسکو مرجھانے دو فنا ہو لینے دے

راگ نمبر ۱۹

(۸) اے۔ زعم نصرت مین دنیا سے بے خبر فاتح۔ ٹھہر لے۔ اپنا رتھ ٹھہرا لے۔ ہاتھ سے تیر زمین پر ڈال دے۔ دیکھ شام ٹپک پا۔ چپکے چپکے بڑھی چلی آ رہی ہے۔ اور آسمان پر ہلکا ہلکا نور چھایا ہوا ہے روک لے اپنا مرکب۔ اے میرے فاتح۔ ذرا سستا لے۔ آرام کر لے۔ بیٹھ جا۔ ہان ٹھہر جا۔ تو ہنگامۂ کارزار سے تھک گیا ہوگا۔

میرے دل پر فتح پانے کے لیے۔ جو جنگ تو نے میرے ساتھ چھیڑی تھی۔ بالکل بیکار تھی۔ یک قلم بے سود تھی۔

کیونکہ مین تو خود مسرت سے تیرا دم بھرنے۔ تیری اطاعت کرنے۔ ہان تیرا حکم بجا لانے کے لیے تیار تھا۔ اب مین تیرے شوار مین شام کا چراغ روشن کرون گا۔

اور میری استیان بھجن۔ میرے عبادت کے گیت تیرے کاشانۂ دل مین شرف پائین گے۔

مین تیرے لیے ایک فرح بخش پلنگ بچھا دون گا۔ تو اس پر آرام کر۔ استراحت فرما ہو۔ مین تیرے پائنتی آب سرد کا ایک برتن رکھ دون گا۔

ہان۔ تو یہ جنگ جو تو نے میرے ساتھ چھیڑی تھی۔ بالکل بیکار تھی۔ یک قلم بے سود تھی۔ کیونکہ مین تو خود بکمال مسرت تیرا دم بھرنے۔ تیری اطاعت کرنے اور تیرا حکم بجا لانے کے لیے تیار تھا۔

٭ کال شیو جی کا نام ہے شیو جی کا روپ جٹا داری ہے شیو فنا کرنے والی طاقت کو کہتے ہین۔ اس لیے موت کو جٹا داری کا لقب دیا گیا۔ شیو جی جتی یعنی (مرتاض) ہین اس لیے موت کو بھی جتی کی صفت سے متصف کیا گیا۔

راگ نمبر (۲۰)

(۹) ۔ اے میرے مالک تو نے میرے نہاں خانہ قلب کی جانب پھر رُخ پلٹ دیا ہے ۔ جہاں خوشگوار عطر ریز ہواؤن مین ہرطرف پھلوں اور پھولون کا ڈھیر لگا ہوا ہے ۔ آج تیرا ترانہ قیامت نہین چھیڑا ۔ اور زندگی تیری آنکھون اور لبون مین مسکن گزین ہے ۔ تیرے اس راحت بخش ظہور پر مین آج چشم غور سے نگاہ ڈال رہا ہون ۔ آہ کس قدر مسّرت اُمنڈ اُمنڈ کر ایک دل سے نکلکر دوسرے دل مین گھر کر رہی ہے ۔

اور میری رُوح جو تیرے ترانہ سنیون کی طلب مین بیقرار ہے ۔ پھر اس اسکے دل کا غنچہ کھلیگا ۔ کھلکر اپنی بہار دکھائیگا ۔ اور جب تو اس کو طلب کریگا ۔ تو وہ راگ بنکر ہرطرف روان ہو جائیگا ۔

ذرا دیکھنا آسمان پر تیرے ترانون کی دلکش صدا گونج رہی ہے ۔ اور ہوائین پھولونکی نگہت سے مالا مال مین

راگ نمبر ۲۱

(۱۰) ۔ لے بحر شوارع صبح خیزکی تنویر طلائی نگیون کی مانند تیری لہردن پر اپنی بہار دکھارہی ہے اور ایک ایک پل مین ایک نیا اور نرالا خواب اپنی جھلک دکھا جاتا ہے ۔

آج تو کسی عاشق شاہانہ مزاج کے مانند جامہ زیب ہوکر ایک مسند زرین مین جلوہ افگن ہے ۔ اور تیری محبت ان سنہری سنہری لہردن مین محو روانی ہے ۔ تیر رہی ہے ۔ !

اور مین تیری خدمت مین نذر کرنے کے لیے اپنے ساتھ ایک ایسی رُوح لایا ہون جو سرتاپا نور سحر سے معمور ہے ۔ مین اسکو تیرے قدُوم پر نثار کردن گا ۔ ہان اسکو تجھے نذر کردن گا

میرے ہاتھون نے سُنہرے رنگ کے کنولون کا ایک ہار تیار کیا ہے اور مین اسکو تیرے گلوئے زرین مین پہناؤن گا ۔ اور پھر مین اور تو یک جان ودو قالب ہوکر ایک ہی رشتۂ محبت سے جکڑکر دکھا کے نازک نازک آغوش مین لیٹ جائین گے پھر ہم پر ایک عالم خواب طاری ہوجائیگا ۔ اور دین ودنیا کی خبر نرہیگی ۔

راگ نمبر ۲۲

(۱۱) ۔ آج آسمان رقت آمیز لہجہ مین ترانہ ریز ہے ۔ ایک دل بیقرار کے مانند نہایت ماتم خیز دھن مین اس نے اپنا راگ چھیڑا ہے ۔

آہ مین ۔ یہ کیا بات ہے ۔ ذرا دیکھو تو بادل زبان حال سے کیا کہہ رہے ہین ۔ ہوائین گردون پر

چاکاٹ کاٹ کر اور بحر مواج کو گنگنی کے ساتھ چوم چوم کر کیون نالہ زنی کر رہی ہین - ؟
اُف - آج میرا دل بیٹھا جا رہا ہے - اور اسکے نالہ سوز و گداز سے بھرے ہوئے ہین
ذرا بتا تو اے دل مجھے کیا چاہیے - ؟ تجھے کس شے کی تلاش ہے - آج تو نے اپنا قیام کہان کیا ہے - ؟
تو کس طرف اُڑا جا رہا ہے - کبھی دور اور کبھی نزدیک - دیکھو دیکھو - بادلون کی طرف کس لیے لپکتا ہے -
کیون وقت کے عالم مین ڈوب کر ایک ماتم خیز لہجہ سے راگ ادا کر رہا ہے - نئے کا خیال ہے - تان کی پروا
ہان - دیکھو آج آسمان کیسی دل گداز دھن مین ترانہ ریزی کر رہے ہین -

راگ نمبر ۲۳

(۱۴۲) اے میرے بحر مواج سوجا سوجا - اپنی ترانہ سنجی سے تھکی ہوئی آنکھین بند کر لے - سوجا
دوپہر کا وقت ہے - آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہین - ایک سناٹا سا ہر طرف چھایا ہوا ہے - اس وقت
آسمان پر کوئی ہے بھی نہین - بالکل تنہائی کا عالم ہے - ایسے عالم مین تو آرام کر - استراحت فرما - مَین
مین تیرے ساحل پر بیٹھا ہوا ہون - اور اپنی دونون آنکھون سے تیرے چہرۂ نورانی کو گھور گھور کر دیکھ
رہا ہون - مگر تو سوجا ہان سوجا - میرا دل جاگ رہا ہے - اے یار غمگسار - مین تجھکو کب پہچانون گا
تو مجھے اپنی اصلی صورت کب دکھائیگا - ؟ - کب اس خواب ناز کے عالم سے بیدار ہوگا - ؟
مین تیرے لیے کتنی طویل نظم تیار کرون - مین تیرے لیے چشم براہ ہون - مجھے تیرا انتظار ہے -
ہان تو کسی روز جب شام کا جھٹپٹا وقت ہو - تو اپنے دست شوق میرے لیے دراز کر لینا -
(تاکہ مین تجھ سے بغلگیر ہوجاؤن) -

راگ نمبر ۲۴

(۱۴۳) - اے میرے شاہد طناز -
کیا مین پہلے بھی تیرے دیدار فرحت آثار کی دولت لوٹ چکا ہون -
کیا مین کبھی دست شوق کو تیرے ہاتھون سے ملا چکا ہون - کیا مین نے تیری چشم پُر فن کے حسن پنہانی کی کبھی پہلے داد دی ہے
اگر ایسا ہے تو للہ مجھے بتا دے کہ وہ کون زمانہ تھا - کس خطۂ فراموش شدہ مین میری اور تیری آنکھین چار ہوئی تھین
اور کیا اُسوقت مجھے تجھ سے ہمکلام ہونیکا موقعہ بھی حاصل ہوا تھا -

ہان اُسوقت کون خوشگوار ترانہ چھیڑ کر تو نے مجھے مسرت کیا تھا۔؟
اے محبوب دلنواز کیا تو نے تبسم ریزی کے ساتھ مجھ پر نگاہ ڈالی تھی۔؟
گہرے سے گہرے جذبات نے بھی جن آنسوؤن کو اُبل پڑنے پر آمادہ نہین کیا۔
کیا اس وقت میرا دل انھین آنسوؤن سے لبریز طغیانی برپا کرنے پر مائل تھا۔؟
اور کیا اسوقت میرے دل کے اندر ایسے خیال تشنگی پھیلا رہے تھے کہ ایسی محویت کا عالم مجھ پر طاری تھا
کیا اسوقت ایسی سرد آہین میرے دل سے نکل رہی تھین۔ اور کیا اسوقت تو نے دست شوق بڑھا کر مجھے
اپنی آغوش محبت مین اس طرح جگہ دی تھی۔ جس طرح گہری اور سچی اُلفت سے مسرت کوئی دوست
بغلگیر کر لیتا ہو۔؟ ۔ کیا اس وقت محبت کے سحر آمیز منترون کے ذریعہ سے تیرے خیالات کی دنیا
نے میرے کاشانۂ قلب مین نزول فرمایا تھا؟
یہ سب باتین مجھے یک قلم یاد نھین۔ ہان صرف اس قدر یاد ہے کہ ایک زمانہ دراز گذرا جب
میرا دل تیری آرزو مین بیقرار رہا کرتا تھا۔
جانمن مین تجھکو جانتا ہون۔ ہان اچھی طرح پہچانتا ہون۔
تجھ سے بغلگیر ہونیکا ماجرا ابھی میرے دل و دماغ مین تازہ ہو گیا ہے۔ اسی لیے اب مین پھر تیری
طرف بہتا ہوا چلا آ رہا ہون۔
اور میرا خیال ہے کہ کسی عجیب و غریب خلوت خانہ مین ہم دونون آخر کار باہم دیگر مل جائین گے۔
مجھے تیرا تقرب نصیب ہوگا اور تجھکو میرا۔ پھر مین تجھکو پہچانونگا اور تو مجھے پہچانے گا۔ اور پھر ایک
سحر خیز اور فرحت انگیز عالم مین جب آدھی روشنی اور آدھی تاریکی کا سمان پیش نظر ہوگا۔ ہماری اور
تیری اُلفت دیرینہ پھر بیدار ہو کر ہمین یکجان دو قالب کر دیگی۔

راگ نمبر ۲۵

(۱۴) ابھی میرے سوا اور کسی کی آنکھ نہین کھلی ہے۔ اسوقت صرف مین ہی جاگ رہا ہون۔ اور
اس سناٹے اور تنہائی کے عالم مین تو میرے مقابل جلوہ آرا ہوگا اور مین تیرے سامنے استادہ۔
ابھی آفتاب عالمتاب نے مطلع مشرق کو اپنی نورانی شعاعون سے منور کیا ہے۔ لیکن مین بیخودی

شوق مین ہو۔ تیرے روحانی جمال کے دریا مین نہانے کے لیے قدم بڑھائے ہوئے جارہا ہون

تیرے یہ ترانے جو دنیا پر آشکارا ہوگئے ہین۔ اب آشکارا ہی رہین گے۔ ان کو اب کسی نہان خانہ مین جگہ نہین مل سکتی۔ تیرے راگ ایک زمانہ کے کانون تک گونج گئے ہین۔ وہ ساری دنیا کیلئے ستمع ہین

مگر تو مجھے اس راگ سے محظوظ کر جو دن رات برابر تیرے سینہ مین ہر نفس جاری رہا کرتے ہین۔ مین اس راگ کو لیکر اپنے سینہ مین مخفی رکھون گا۔ اور اس کو اپنی روح مین جذب کرون گا۔

اے بحر زخار۔ اے یار غمگسار۔ مین تیرے پاس تنہا آیا ہون۔ اور صرف تیرے اس ناشنیدہ راگ کی امید مین میری آنکھ کھل گئی ہے۔

راگ نمبر ۲۶

(۱۵)۔ آفتاب عالم تاب کا چہرۂ نورانی ابھی گوشۂ مشرق سے نمودار نہین ہوا۔

اور ایک دلفریب تاریکی پردۂ محبت کے مانند تجھ پر اور تیرے گرد و پیش جلوہ افگن ہے۔ اور خواہ تو اس نمایان تاریکی کے پس پردہ تنویر کے عالم مین محو خواب ہو۔ یا بیدار۔ تیرا چہرہ ایک تصویر سکوت اور تیری آنکھین جلوہ گاہ عافیت بنی رہتی ہین۔

اے قلزم مواج۔ تیری نگاہ کی دلکشی اور سکوت آمیزی کے تصدق اس دھندلی دھندلی نصف روشنی اور نصف تاریکی کے عالم مین دفعتاً میری گفتار اور میرا ترانۂ خوشگوار دونون وقف سکوت ہوگئے ہین۔

عزیز سمندر کیا مجھ مین اور تجھ مین حبل اخوت کا رشتہ قائم نہین ہے۔ اسی لیے مین تجھسے عرض پرداز ہون کہ وقتاً فوقتاً تو میری خبر لے لیا کر اور مجھ پر چشم محبت رکھا کر کہ کاش اس سرود لطف انگیز کی صدا۔ جو تیرے قلب فراخ مین پیہم جاری ہے۔ کبھی کبھی میرے سینہ مین بھی گونجا کرے۔

راگ نمبر ۲۷

(۱۶) ۔ سورج کی کرنین تیرے چہرے پر بھی بہار دکھا رہی ہین اور وہ کرنین بھی کیسی۔ خود تیرے شوکت واجلال کے مانند خاشت خیز اور سکون آمیز۔

تو نے میرے گلزار روح سے میرے تمام خیالات کے زرین پھول یک قلم نکال لیے ہین۔ اور اب وہ ہار کے مانند تیرے زیب گلو ہین۔

اے بحر مواج مین تیرے ساحل پر بستہ دست استادہ ہون۔

ذرا بہر خدا میری تسکین خاطر کے لیے اور ایک ترانۂ جانفزا چھیڑ۔

اسکو میرے سینہ کے اندر بے انتہا آب حیات کے مانند تموج خیزی پر مائل کر دے۔ کہ یا ابد الآباد اسکی

صدا صدا گونج گونج کر میرے دل کو عجیب و غریب سرور سے مست کرتی رہے۔

اور اے بحر بے پایان آج مین ملکون ملکون مین گھومتا ہون۔ ہر جگہ تیرا ہی راگ گاتا پھرون گا۔

(ترجمہ) (منور لکھنوی)

مغربی جواہر ریزے

زندگی کے فرائض اُسکی پایداری کیساتھ قائم اور پیدا ہو جاتے ہین۔ اگر ایکدن کا کام نامکمل چھوڑ دیا جائے تو دوسرے دن دگنا ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے (ڈاکٹر جانسن)

شریف آدمی وہ ہے جو اپنے ضمیر کی ہدایات کو نظر انداز نہین کرتا جیسے وہ اپنی قدر کرتا ہے ویسے ہی دوسرون کی عزت کا بھی اُسے خیال رہتا ہے (سمائلز)

جب ہم اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہین تو ہم ذرا بھی تعریف کے مستحق نہین ہوتے کیونکہ ہم نے صرف وہی کیا ہے جسکا کرنا ہمارے لیے نہایت ضروری تھا (ہمرسٹن)

کوئی چیز ایسی بری نہین جیسا کہ وقت کا ضایع کرنا۔ انسان کا دل چکی کی مانند ہے جبمین گیہون پیسا جاتا ہے تو آٹا ہو اگر خالی گھمایا جائے تو اسکا اپنا نقصان ہو (مارٹنسل لوتھر)

نرمی بہترین طرز عمل ہے۔ دنیا مین عمدہ عادات سے بہتر کوئی چیز نام پیدا کرنے یا اُسکی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نہین ہے (لارڈ ملٹن)

اپنے دوستون اور رشتہ دارون کی بخوبی تواضع اور تکریم کرو اور اُن کے نیک کامون مین اعانت کرو کیونکہ اس طریقے سے رشتہ محبت دوچند اور مستحکم ہو جائیگا مگر خوشامد یون سے پرہیز کرو (لارڈ برلی)

وہ لوگ کبھی خوش نہ تھے جنکی حالت سمندر کی مد و جزر کی طرح متزلزل تھی اور جن کی خوشحالی دریا کی طرح غائب ہو گئی (کوپٹر)

اقتدار الرسول بدا[illegible]

روپ متی

روپ متی حسن و موسیقی کی دیوی تھی، وہ ایک گلاب کے پھول کی طرح رئیس دھرم پور کے بہارستان امید مین کھلی اور انگور کے نرم و نازک بیل کی طرح اسکے چمنستان آرزو مین ہرطرف لہرانے لگی، اسکی بہار آفرین ہستی سردار دھرم پور کے گھر کا چراغ تھی، نربدا کی موجین اوسکی تخیلات مین ایک لطیف روانی پیدا کیا کرتی تھین، وہ اس کی موجون سے بہرون کنول کے پھول کی طرح کھیلا کرتی، اور ان نغمون کو سنا کرتی جو اسکی لب کھانے والی لہرین زبان حال سے گاتی رہتی تھین،

وہ موسیقی کی دلدادہ تھی، اور اکثر گھر سے نکلکر، نربدا کے کنارے درختون کے کنج مین بیٹھکر، ساری فضا کو اپنے نغمۂ مخمور سے، متوالی بناتی رہتی، شام کے دلفریب سناٹے مین (جب مناظر فطرت، آفتاب کی آخری شعاعون مین نکھرنے کی کوشش کرتے ہین) اُس کی آواز گرد و پیش کی فضا کو ہنساتی رہتی تھی۔

ایک دن وہ ایک گھنی کنج مین بیٹھی ہوئی مناظر فطرت پر موسیقی کی بجلیان گرا رہی تھی جنگلی جانور نغمون کی بے پناہ کشش سے اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، ستار کی آواز اس کے نغمون کا زیور بنی ہوئی تھی، اسکی نرم نازک، انگلیون کی گردش تارون مین ایک اضطراب پیدا کر رہی تھی، اور اون کے ارتعاش و اضطراب سے نمایان تھا، کہ وہ ذرا دیر کے لیے بھی اون انگلیون کے جان بخش اشارون سے جدا ہونا پسند نہین کرتے،

روپ متی گانے مین اسقدر محو تھی کہ گرد و پیش کے فطری مناظر بھی اسکی محویت کو نگہت

خدمت سکتے تھے، اتفاقاً اس کی نگاہ ایکطرف اٹھ گئی جہاں کھجوروں کے جھنڈ مین ایک حسین نوجوان حسن وموسیقی کی زنجیرون مین جکڑا ہوا محویت کے عالم مین ہمہ تن گوش بنا ہوا کھڑا ہوا تھا، اسکے چہرے سے سراسیمگی و بدحواسی ٹپکی پڑتی تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ اسپر ایسی کیفیت طاری ہے کہ اسکو اپنی ہستی کی بھی خبر نہین،

یہ مالوہ کا نوجوان راجہ، باز بہادر تھا، جو نربدا کے کنارے شکار کھیلتا کھیلتا لشکر سے جدا ہوکر اسطرف نکل آیا تھا، وہ فطرتاً حسن وموسیقی کا دلدادہ تھا، نغمون کی آواز اسکو یہانتک کھینچ لائی اور وہ کھجورون کی کنج مین چھپکر اپنی روح کو شراب موسیقی سے مخمور کرنے لگا۔ وہ ایک قیدی تھا جسکو نغمون کی کشش اور روپمتی کے حسن دلفریب نے دوہری زنجیر مین جکڑ رکھا تھا لیکن اسکو خبر نہ تھی کہ ابھی تیسری زنجیر بھی باقی ہے، جو روپمتی کی نگاہ ناز لیکر آنیوالی ہے، چنانچہ روپمتی کی متوالی نگاہون نے بڑھکر اپنے قیدی کو محبت کی ایک زنجیر اور پہنا دی،

باز بہادر اسوقت گویا ایسے عالم مین محو تھا جہان انسان کو موت کا بھی خوف نہین ہوتا، اسکے دلپر بیخودی کی حکومت تھی، اور وہ مادیت سے الگ ہوکر روحانی لطافتون مین غرق ہوچکا تھا، وہ دیکھتا تھا مگر آنکھون کی خبر نہ تھی، سنتا تھا مگر کانون سے آشنا نہ تھا، دلمین ایک لذت محسوس کرتا تھا مگر دل کا ہوش نہ تھا،

روپمتی بھی گانے مین ایسی محو تھی، کہ اُسے اپنے شکار کی پروا نہوئی، وہ باز بہادر کو اپنی غلط انداز نگاہون سے دیکھتی جاتی تھی، مگر اپنی دھن مین مست تھی، تھوڑی دیر مین نغمون کا تلاطم کم ہوا، روپمتی، سنبھل کر بیٹھ گئی، باز بہادر بھی ہوش مین آیا اور وہین گھاس پر بیٹھ گیا، اب نگاہین باقاعدہ محبت کا پیام دینے لگین، روپمتی بھی اپنے دلمین محبت کی کھٹک محسوس کرنے لگی، نگاہون نے زبان کو اُبھارا، اور راز ونیاز مین زبان بھی شریک کرلی گئی۔

باز بہادر نے روپمتی کے سامنے اپنا دل پیش کیا، اور نہایت پرسوز لہجہ مین تمنا ظاہر کی کہ اس حقیر تحفے کو قبول کرلے،

روپمتی خود بھی محبت کا شکار ہوچکی تھی، لیکن قوم اور عزت کا اسقدر پاس تھا کہ وہ باز بہادر

کے ہر بیٔہ محبت کو اُسکے مقابلہ مین ہیچ سمجھتی تھی، اُسنے باز بہادر کی عرض نیاز کی پروانہ کی اور کہا کہ مین آپ کی شریک محبت تو ہون، مگر شریک زندگی اسوقت تک نہین بن سکتی جبتک دریائے نربدا کی روانی اپنی مستانہ خرامی سے منڈو کو سیراب نہ کرے،

محبت کی یہ شرط بھی کسقدر مشکل تھی۔ نربدا کا پانی شہر منڈو مین کیونکر پہونچ سکتا تھا جو سطح نربدا سے ایک ہزار دو سو فٹ اونچا ہے لیکن اسی ان ہونی بات پر باز بہادر کی کامیابی منحصر تھی۔ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہین جہان سچی محبت ہوتی ہے وہان مشکل سے مشکل شرط بھی آسان ہو جاتی ہے۔

باز بہادر مین جوش محبت نے استقلال پیدا کر دیا، اُسنے اپنی ریاست کی تمام طاقت اکٹھا کی اور پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ اور ہاتھ مین خود کلھاڑی لیکر پہاڑ کاٹنے مین مصروف ہو گیا اسکا جنون محبت دیکھکر سمندر کے دیوتا کو بھی ترس آگیا اور وہ باز بہادر کے سامنے آکر بولا ٹھہرو نہین اپنی محبت کا انعام ملے گا۔ منڈو جاؤ۔ اُس تمام پرگہان سے نربدا کا بہاؤ نظر آتا ہو) ایک املی کا درخت ہے، اُسکے نیچے کھود، وہان پاک چشمہ ملے گا جو دریائے نربدا کا منبع ہو چنانچہ باز بہادر نے ایسا ہی کیا اور زمین کے نیچے وہ چشمہ مل گیا جسکا نام ریوا کنڈ ہے اس نے چشمے کے کنارے ایک محل بنایا اور محل کے غسل خانہ مین پانی لیجانیکے لیے چشمہ سے ایک نفیس نہر جاری کر دی

—— ۲ ——

روپمتی کا باپ ایک تند مزاج رئیس تھا، جب روپمتی اور باز بہادر کی محبت مشہور ہوئی تو وہ بیٹی کے ان کرشمون کو سُنکر بہت آزردہ ہوا اور روپ متی سے کہا کہ روپ متی تو نے کل مین داغ لگایا، اور ایک مسلمان سے محبت کی، تو نے دھرم کو ناس کیا، اسکی سزا یہ ہے کہ تو موت کے لیے طیار ہو جا، زہر کا پیالہ محبت کا خوشگوار تحفہ ہے، یہ تجھے پینا پڑے گا۔ تیری لاش چتا پر جلائی جائے گی، اور راکھ نربدا کے صاف و پاک پانی مین بہا دیجائیگی۔ آگ تجھکو جلا کر، اس محبت کی آلایش سے پاک کر دے گی، اور نربدا کی موجین تیری راکھ کو ابد تک اپنے آغوش مین کھلاتی رہین گی،"

تو چاہتی ہے کہ میرے ملک کو ظالم مسلمانون کے ہاتھ مین دیدے، مانا کہ مین دولت وقوت

میں انکے برابر نہیں، لیکن میں دھرم پر ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے طیار ہون ، یہ قربانی تیری محبت کی قربانی ہوگی، لے یہ زہر کا پیالہ حاضر ہے، جس نے تجھ سے پہلے بھی بہتون کی عزت و عصمت کا پردہ رکھ لیا ہے،

باپ کے یہ الفاظ رانی روپمتی کے دلمین تیر کی طرح چبھ رہے تھے، لیکن اُسکا خیال ایک ایسے ملک مین سیر کر رہا تھا جہان اُسکی تمناؤن کی شاندار عمارت کھڑی تھی،

باپ نے پھر کہا۔ بیٹی روپمتی! مین دو چیز تیرے سامنے پیش کرتا ہون۔ ان مین سے جو پسند آئے قبول کر۔ یا تخت یا تختہ، یا تو مسلمان کی ملکہ بننے کا خیال اپنے دل سے نکال دے یا زہر کا پیالہ قبول کر ہمیشہ باعصمت راجپوت دیویون کی عزت بچاتی ہے،

روپمتی نے کہا پتاجی، مرنا مجھے منظور ہے مین آپ کی عزت کو برقرار رکھونگی مین خاندان پر کلنک کا ٹیکا نہ لگاؤنگی، مین ایسی بیٹی بننا نہین چاہتی، جسکے نام کے ساتھ خاندان کی رسوائی کی داستان مشہور ہو،

تند خو اور غضبناک باپ زہر کا پیالہ لیکر آگے بڑھا، روپمتی باپ کے ہاتھ سے پیالہ لیکر حسرت بھری نگاہ سے اُسکی طرف دیکھنے لگی اور آخری سلام کے بعد بولی، پتاجی، جب کبھی میرا تذکرہ آئے تو اِس زہر کے پیالے کو بھی یاد کر لیجیے گا، اُسنے پیالہ کو ایسی نظر سے دیکھا جسمین، محبت اور یاس دونون شریک تھین، اور دریاے نربدا کیطرف دیکھکر بولی، مستانہ خرام لہر والی میری آخری التجا سن لو، مین شاید اپنے اب اس زندگی مین تم سے ہم آغوش نہ ہو سکونگی مگر میری خاک، میری جلی ہوئی تمناؤن کی نشانی تمہارے دامن مین ہوگی، اس خاک محبت کو برباد نہ کرنا بلکہ ایسے بہارستان مین لیجاکے ڈالدینا جہان سدا بہار پھول کھلے ہون اور بلبلین نغمہ رنگین سے ساری فضا کو ہمیشہ مترنم بنائی رہتی ہو،

نربدا تو اپنی لہرونکو حکم دے کہ وہ میرے جنازہ کے آگے آگے نوحہ خوانی کرتی چلین کہ ایک مظلوم ہے جس کا غنچہ تمنا بے کھلے مرجھا گیا اور اس سے پہلے کہ کوئی بھونرا اُسکی آرزو کی کلی کا طواف کرے وہ اس چمن سے رخصت ہوگئی، ہان بازبہادر سے کہدینا کہ وفادار روپمتی نے تمہاری یاد مین خوشی خوشی زہر کا پیالہ پی لیا، ابھی وہ پیالہ پینے کا ارادہ کر رہی تھی کہ

یکایک گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آنے لگی، روپمتی کا ہاتھ کانپنے لگا اور دل میں ایک دھڑکن سی محسوس ہونے لگی،

خدا کی شان عجیب ہے ایک طرف تو روپمتی کا باپ اپنی عزت کے بچانے کی غرض سے بیٹی کو زہر کا پیالہ پلا رہا تھا اور روپمتی تھی! باز بہادر کی جدائی میں موت کو زندگی سمجھتی تھی۔ دوسری طرف باز بہادر روپمتی کا دیوانہ حسن شرط محبت کے لیے سرگرداں تھا! اور موت اس افسانۂ محبت کو ختم کرنے کے لیے زہر کے پیالے میں روپمتی کے لب لعلین کا انتظار کر رہی تھی، یا! تاکید کر رہا تھا کہ اس شربت تلخ کو جلد پی جاؤ، مایوس روپمتی، پیالہ ہونٹوں تک لا چکی تھی کہ نوجوان بادشاہ منڈو باز بہادر پہونچ گیا،

روپمتی اس غیر متوقع منظر کو خواب سمجھنے لگی اور زہر کا پیالہ جو ہونٹوں تک پہونچ چکا تھا، جام جم نظر آنے لگا، وہ خاموش تھی مگر دل کی دھڑکن سے پیالے کے زہر میں بہم موجیں اُٹھنے لگیں اور یہی موجیں اسکی افسردہ تمناؤں کا تبسم ناز بن گئیں،

سردار دھرم پور باز بہادر کو دیکھتے ہی زخمی سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا، اور تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اگر عاشق مزاج، باز بہادر، فنون حرب سے واقف نہ ہوتا تو عشق و محبت کی ساری داستان ایک ہی وار میں ختم تھی؛

باز بہادر، سردار دھرم پور کے حملوں کو روکتا ہوا، روپمتی کے پاس پہونچا اور روپمتی کے ہاتھ سے زہر کے پیالے کو چھین کر زمین پر گرا دیا۔ اتنی دیر میں باز بہادر کے ساتھ والے سپاہی بھی پہونچ گئے اور شور دار و گیر بلند ہوا۔ آخر محبت کی فتح ہوئی اور کامیاب باز بہادر روپمتی کو لیکر اس ہنگامے سے صاف نکل گیا،

شتاب رائے

جواہرات عالم

شاہی خزانہ کی چوری

ستمبر ۱۷۹۳ء مین انقلاب فرانس کا بہت زور تھا، بادشاہ وقت معزول ہو چکا تھا۔ ہر طرف
ں و غارت کا بازار گرم تھا شہر فاو سعز زین شہر زندان کی اذیتین برداشت کر رہے تھے، اس ہل چل مین
لڑون بدمعاش چور، اُچکے جیل سے نکل بھاگے اور پیرس کو علی الاعلان اپنا جولانگاہ بنا لیا،
ایک دن دو بدمعاش، جوزف ڈوگنی اور جان جنکویش ایک ہوٹل مین بیٹھے شراب پی رہے
، اتفاق سے اسی ہوٹل مین چند شریف اشخاص بھی بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے، اثنار گفتگو مین
ر آگیا کہ آجکل MENAATE G-RUE کی نگرانی خوشامدی افسرون کے سپرد ہے، جو شاہی خزانہ کی حفاظت
ں لاپروائی سے کام لیتے ہین، اور اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا نہین کرتے۔ ان بدمعاشون نے
ا یہ بات سُن لی اور اُسیوقت سے شاہی خزانہ مین چوری کرنے کا منصوبہ کرنے لگے، خزانہ شاہی
ں بہت سی نادر اور بیش بہا چیزین تھین، سامان شاہی طلائی و نقرئی ظروف کے علاوہ بیسون بکس
یون اور جواہرات سے بھرے رکھے تھے۔ ان بدمعاشون نے اس خزانہ پر پہلا دھاوا ۱۵ ستمبر
شب کو کیا، لیکن انکی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی، لیکن پھر دوسری بار زیادہ جمعیت کیساتھ
سرگرم غارت ہوئے، ان کے کچھ ساتھی بھیس بدل کر، پہرے پر کھڑے ہوگئے اور خود وہ دونون خزانے
کے اندر داخل ہوگئے۔ تھوڑی دیر تک چوری کا سلسلہ قائم رہا۔ اگر محافظون کا گرد اپنے مقررہ
وقت پر نہ پہونچ جاتا تو یہ بدمعاش خزانے کا صفایا ہی کر دیتے، پھر بھی خزانے کا ایک بڑا جزو
رائیگئے، چورون نے مال مسروقہ کا کچھ حصہ تو مختلف طریقون سے فروخت کر دیا، کچھ زمین کے
نیچے دفن کر دیا۔ اور کچھ بکس مین بند کر کے دریا مین پھینکدیا۔

* مشہور فرانسیسی محل کا نام ہے جہان بہت بڑا خزانہ رہتا تھا۔

چوری کی صبح کو عجب نظارہ تھا۔ گلی کوچوں اور سڑکوں پر جواہرات ٹھیکریوں کی طرح بکھرے پڑے تھے بعض بادیانتدار لوگوں نے تو ان جواہرات کو خزانہ سرکاری میں داخل کر دیا مگر عام طور پر لوگوں نے اٹھا اٹھا کے اپنے گھروں میں رکھ لیا۔ اسطرح شاہی محل کے بڑے بڑے قیمتی جواہرات غائب ہو گئے اسمبلی ASSEMBLY میں جب یہ خبر پہونچی تو رونینڈ وزیر ROLAND اور اُن کے ماتحتوں پر لعنت ملامت کی بوچھار شروع ہوئی۔ اور ایک تحقیقاتی کمیٹی تحقیقات کرنے لگی آخر وہ دونوں بدمعاش گرفتار کیے گئے اور قتل کا حکم سُنا دیا گیا۔ پھانسی کے ڈر سے وہ دونوں سرکاری گواہ بن گئے اور باقی مجرموں کی نشان دہی کی جس سے چند گرفتار کرکے پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔

رام سرن نگم ایم اے ایس سی

جذبات ہادی

دل میں چھپا تو دوں غم راحت اثر کو میں
اے ضبط کیا کروں نگہ پردہ در کو میں

اندوہ انتظار سے گھبرا گیا جو دل
کر دونگا ایک وسعت شام و سحر کو میں

اے درد عشق یاس کی صورت کرا ختیار
کیونکر اٹھاؤنگا ستم چارہ گر کو میں

او جانے والے گھر کی بھی رونق تجھی سے تھی
روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

اللہ رے جذب گردش قسمت کہ دشت میں
پھرتا ہوں اپنے ساتھ لیے راہبر کو میں

اس درجہ ہے مجھے تری رسوائیوں کا پاس
رکھتا ہوں بند چشم تمنا اثر کو میں

سو بار لٹ چکا ہے جہاں کاروان شوق
پھر ڈھونڈنے چلا ہوں اوسی رہگذر کو میں

خوگر بنا چکیں شب غم کی مصیبتیں
اب کیا کرونگا فرصت شام و سحر کو میں

پیدا ہے پھر وہی دل محزون میں انقلاب
پاتا ہوں پھر اوسی غم بیجا رہ گر کو میں

اسنے تو زندگی کو مری کر دیا تباہ
اب کیا کروں دل آشفتہ سر کو میں

قابو نہ دل پہ ہے تو بس سے ہے زبان پر
کیونکر چھپاؤں گا غم شورش اثر کو میں

کھینچی جان کا ہادی ہی ہو رنت
پھیلاؤں آپکے دامن شوق نظر کو میں

ہادی مچھلی شہری

قضیہ برار

(نوشتہ ایف ایچ براؤن اسکوائر سی آئی ای)

ہز اکزالٹیڈ ہائنس میر عثمان علیخاں نظام دکن کے مراسلہ موسومہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے گورنر جنرل کشور ہند کی اشاعت سے قبل لوگوں کو صرف اسقدر معلوم تھا کہ نظام دکن یار وفادار دولت برطانیہ اور گورنمنٹ آف انڈیا کے درمیان کچھ عرصہ سے کسی قطعہ ملک کے متعلق کچھ جھگڑا چلا آتا ہے لیکن مراسلہ مذکور الصدر کی اشاعت سے اس مسئلہ سے عام دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔

بظاہر حال اس مسئلہ کا زیادہ تر تعلق لارڈ کرزن کی عہد حکومت سے ہے لیکن لارڈ سالسبری مرحوم اور موجودہ نظام کے والد بزرگوار میر محبوب علیخاں مرحوم بھی جن کے اسماء گرامی بھی اس مسئلہ سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں ایک فریق تو گورنمنٹ برطانیہ اور وائسرائے ہند تھے اور دوسرے فریق ہندوستان کی ایک اعلیٰ ریاست اور صوبہ برار کے ۳۰ لاکھ باشندے تھے۔ موجودہ نظام کے پدر بزرگوار نے ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن سے ایک معاہدہ کر کے صوبہ برار کا دوامی پٹہ گورنمنٹ آف انڈیا کے نام لکھا۔ یا نظام موجودہ کا اب یہ دعویٰ ہے کہ ان کے والد مرحوم نے لارڈ کرزن کے دباؤ سے برار کا دوامی پٹہ لکھدیا حالانکہ ان کے اجداد سے مختلف اوقات میں اس صوبہ کے واپسی کے وعدے ہوچکے تھے۔

نظام دکن ہندوستان کے ایک بہت بڑے والیٔ ملک ہیں جنگ عظیم میں آپکے شاندار خدمات کے صلہ میں حضور شہنشاہ معظم جارج پنجم نے آپکو ہز اکزالٹیڈ ہائنس کا معزز خطاب عنایت فرمایا حضور نظام نے اپنے خاندان کی روایات یار وفادار و معاون دولت برطانیہ کو پورے طور پر قائم رکھا ہے۔ حضور نظام کی ریاست کا رقبہ علاوہ صوبہ برار کے ۸۰ ہزار میل مربع اور رعایا کی تعداد تقریباً

ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ہے

ریاست حیدرآباد کے بانی آصف جاہ جو اورنگ زیب کی فوج میں ترکمانی افسر تھے۔ ۱۷۱۳ء میں نظام الملک کا خطاب دیکر دکن کے نائب ناظم مقرر کئے گئے تھے۔ مگر بعد چندے آپنے سلطنت دہلی سے آزادی حاصل کرلی۔ آپ کے انتقال پر ۱۷۴۸ء میں آپکے ورثا میں جانشینی کے متعلق جھگڑا ہوا جسمین انگریزون اور فرانسیسیون نے حصہ لیا اور فرانسیسیون کے نامزدہ نے اپنی حکومت قائم کی، لیکن بالآخر جنوبی ہندوستان میں انگریزون ہی کا اقتدار قائم ہوا اور ۱۷۶۶ء میں برطانیہ نے نظام علی کے جانشینی کو تسلیم کرلیا اور جنوبی سرکار کا علاقہ برطانیہ کو دیدیا گیا جسمین خلیج بنگال کے ساحلی اضلاع شامل کیے اور اٹھارویں صدی کے بعد وسط سال کے دوران میں نظام علی نے دو معرکون میں سلطان ٹیپو کے خلاف شرکت کی اور حسب وعدہ علاقہ مفتوحہ بالعوض مصارف امدادی فوج انگریزون کو دیدیا۔ یہ فوج اسوقت سے حیدرآباد کی اندرونی اور بیرونی حفاظت کی ذمہ دار قرار دی گئی لیکن یہ فوج اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہی، اور نظام کے خرچ سے حیدرآباد کنٹنجنٹ کے نام سے ایک اور فوج لیکر جنرل مارکوئس ولزلی نے ۱۸۱۲ء میں قائم کی۔ جسکی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔

حیدرآباد کنٹنجنٹ کے مصارف کی بابت مشکلات اور جھگڑے پیدا ہوگئے۔ اور بلا اعانت گورنمنٹ برطانیہ کے روپیہ کی فراہمی ناممکن ہوگئی۔ ۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی نے اصرار کیا۔ کہ صوبہ برار کا انتظام فوجی مصارف کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر گورنمنٹ برطانیہ کے سپرد کردیا جائے۔ باقی آمدنی نظام کے حوالے کردیجائے گی۔ اس زمانہ کے کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ فوجی قبضہ کی دھمکی پر نظام نے اس تجویز کو قبول کرلیا۔ لیکن غدر کے بعد جس میں حیدرآباد کے حکام نے برطانیہ کو قابل قدر امداد دی تھی ۱۸۶۰ء کے ایک ضمنی معاہدہ میں یہ بات صاف کردی گئی۔ کہ حیدرآباد کنٹنجنٹ کے مصارف کے لیے بطور ضمانت کے برطانیہ نے صوبہ برار پر قبضہ کیا ہے اور گورنمنٹ نے اپنے رزیڈنٹ متعینہ حیدرآباد کی وساطت سے نظام کو یقین دلایا۔ کہ قبضہ برار عارضی ہے اور جب کبھی برار واپس دیا جائیگا۔ تو اسمین زیر انتظام برطانیہ جسقدر ترقیات کی گئی ہین۔ ان سے نظام مستفید ہونگے۔

۱۸۶۹ء میں مرحوم نظام میر محبوب علی خان ۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ اسکے کچھ عرصہ بعد شہرہ آفاق سر سالار جنگ اور امیر کبیر نے جو ریاست کے کارکن تھے۔ صوبہ برار کے حیدرآباد

کو واپس دیے جانیکا سوال اٹھایا اور اس دعوی کے تائید کیلئے بہت بڑے حشم و خدم کے ساتھ انگلستان آئے۔ لیکن یہ بات منظور نہ ہوئی۔ اور ۱۹۰۳ء میں لارڈ سالسبری نے جو اسوقت انڈیا آفس مین تھے۔ بیان کیا۔ کہ قبضہ برار کے معاہدہ مین معیاد درج نہین ہو۔ اور حضور نظام کی نابالغی کے زمانہ مین اس مسئلہ پر بحث کرنا دقت طلب ہے۔ لارڈ سالسبری نے یہ بھی فرمایا۔ کہ جب نظام سن بلوغ کو پہونچ جائین۔ تو انکی جانب سے ایک درخواست معاہدات پر عام نظر ثانی کیلئے پیش ہو سکتی ہے، تاہم کوئی باضابطہ درخواست پیش نہین ہوئی۔ اور صورت حال بدستور قائم رہی۔ لیکن انگلو انڈین اور ہندوستانی اخبارات اور سرکاری حلقون مین یہ مسئلہ اکثر زیر بحث رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ ہر وقت حضور نظام کے پیش نظر رہتا تھا اور ہندوستان کو بار بار یہ بتایا جاتا تھا۔ کہ برطانیہ کے یار وفادار جنکے ایماسے امپیریل سروس ٹروپس قائم ہوئی اور جو جنگ مین ہمیشہ معقول امداد کرتے ہین انکو برار کا بڑا قلق رہتا ہے۔

یہ شکایت صوبہ برار کی امانت کے متعلق نہ تھی بلکہ اسکے تعلیمی انتظام کی بابت بھی تھی صوبہ برار روئی کا دساور ہو گیا ہو اور وسائل آمد و رفت کی ترقی سے دیگر فصلون کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔ اور اسکو بہت کچھ مرفہ الحالی نصیب ہو گئی ہے۔ اس صدی کے ابتدا مین صوبہ برار کی آمدنی ترقی پا کر تقریباً ۸ لاکھ پونڈ یا ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ ہو گئی ہے۔

لارڈ کرزن کے زمانہ وائسرائلٹی کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ اس رقم کا معقول جز شاذ و نادر ہی بچت کی شکل مین خزانہ حیدرآباد مین پہونچا ہو حیدرآباد گورنمنٹ کا یہ بجا اعتراض ہے۔ کہ برار کا سول انتظام بیحد مصرفانہ ہے اور بالخصوص پبلک ورکس پر بہت زیادہ روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ فوجی انتظام برطانیہ کے ناقابل اطمینان اور حضور نظام کی رائے مین ناپسندیدہ ہین کنٹنجنٹ عملاً امپیریل فوج کا جز و بن گئی۔ اور ریاست حیدرآباد کی حفاظت کے لیے خاص طور پر اسکی کوئی ضرورت نہین رہی ہے۔ اسکے مصارف ضرورت سے زیادہ ہین۔ اسکی نقل و حرکت پر جو قیود عائد کی گئی ہین۔ انکی وجہ سے اسکی خوبیان کم ہو گئی ہین۔ اور اسکی فوجی پوزیشن بے قاعدہ ہو گئی ہو اسوقت حیدرآباد کو مالی مشکلات کے باعث پریشانیان درپیش تھین اور یہ مستقل شکایت رہی ہے کہ برار کی آمدنی کا وہ حصہ حیدرآباد کو نہین ملتا جس کا کہ وہ مستحق ہے (بحوالہ ہندوستان بزمانہ کرزن

دو ماہ بعد مصنف فریزر ۱۹۱۱ء جب لارڈ کرزن جنوری ۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن ہوگئے۔ تو ان کے نزدیک یہ حالت ناقابل برداشت تھی۔ دو ماہ بعد آپ نے اپنی کونسل سے کہا کہ میں نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ ۱۲ مسائل کو طے کردوں اور یہ سب فیصلے کے انتظار میں ہیں۔ اور یہ جملہ ایسے ضروری مسائل میں جنکو اب سے بہت پیشتر طے ہو جانا چاہیئے تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا۔ کہ آپ دیسی ریاستوں کے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی میں ترمیم کرنا چاہتے ہیں جس کا صریح نتیجہ زخم برار کا اپریشن ہے۔ جب ۱۹۰۲ء میں وائسرائے کے حیدرآباد جانے کے انتظامات ہوئے تو حضور نظام کو اطلاع دی گئی کہ لارڈ کرزن کا ارادہ آپ سے برار کے متعلق بالمشافہ گفتگو کرنے کا ہے۔

۳۔ مارچ ۱۹۰۲ء کو جو گفتگو ان کے درمیان ہوئی اسپر اس قضیہ کا زیادہ تر انحصار ہے۔ نظام مرحوم نے اس گفتگو کا جو خلاصہ تیار کیا تھا اس سے بہت زیادہ تفصیلی ریکارڈ لارڈ کرزن کا مرتب کیا ہوا ہے لیکن جب لارڈ کرزن کا مسودہ نظام کے پاس بھیجا گیا کہ آیا یہ اس گفتگو کا صحیح حال ہے؟ تو نظام نے اسکو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا۔ لیکن ہمکو معلوم ہوا ہے کہ اپنے عمائدین کے مشورہ سے ایک خط لکھوا کر حضور نظام نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا جسمیں لارڈ کرزن سے استدعا کی گئی تھی۔ کہ وہ شہنشاہ معظم ایڈورڈ ہفتم سے خاص نوازش کے طور پر بموقعہ جشن تاجپوشی واپسی برار کی تائید کردیں۔ یہ خط لارڈ کرزن کو نہیں دیا گیا۔ کیونکہ نظام جلد گھبرا جانے والے شخص تھے اور لارڈ کرزن کے رعب میں آگئے تھے۔ دوسرے لارڈ کرزن کے اس فیصلے سے بھی وہ نقصان پہنچا کہ گفتگو کے وقت وزیر اعظم یا کسی اعلی افسر نے حیدرآباد کے نظام کو کچھ امداد نہ دی اگرچہ وائسرائے کے ساتھ سرڈیوڈ بار، رزیڈنٹ موجود تھے اس ملاقات میں لارڈ کرزن نے اس سوال کے اٹھانے کے وجوہ بیان کئے اور کہا کہ سپردگی کی بجائے میں جن حالات کی بنا پر دوامی پٹہ کی آپ سے درخواست کرتا ہوں اگر ان کو قبول کرنے میں آپ پس و پیش کرینگے تو مجھ کو سخت مایوسی کا سامنا ہوگا۔ اگر آپ میری تجویز کو نامنظور کرینگے جسکا مجھ کو گمان تک نہیں ہے تو میرا جانشین وائسرائے اس مسئلہ کو پھر چھیڑے گا یا گورنمنٹ برطانیہ کوئی ناگہانی رکاوٹ پیدا کردے گی جو موقع اسوقت اس مسئلہ کو طے کرنیکا مجھے ملا ہے یہ دوبارہ نہ ملیگا اور حالت موجودہ بدستور قائم رہیگی معاملہ نے اور طول کھینچا۔ جب حضور نظام نے دریافت کیا کہ اگر دوامی پٹہ دیدیا جائے تو کیا برار کی واپسی کے لیے آیندہ ہمکو استدعا کرنے کا موقع حاصل رہیگا تو لارڈ کرزن نے جواب دیا۔ نہیں،

کیا قدیم انتظام کی رو سے صوبہ برار کی واپسی کا کوئی موقع نہیں ہے؟

وائسرائے نے فرمایا کہ معاہدات میں کوئی ایسی شرط نہیں ہے جس کی رو سے حیدرآباد کو واپسی برار کا کوئی استحقاق حاصل ہو۔ گذشتہ پچاس سال کے واقعات جو نظر انداز نہیں ہو سکتے۔ موجودہ حالت کی برقراری ضروری ہو گئی ہے، اور گورنمنٹ برطانیہ کے لیے اب اسکے سوائے چارہ کار ہی کیا ہے کہ وہ دوامی سپردگی کو جاری رکھے جو گذشتہ معاہدات کی رو سے اُسکے ذمہ عائد کی گئی ہے۔

حضور نظام نے فرمایا کہ اس حالت میں مجوزہ پٹہ کو میں منظور کرونگا کیونکہ مجھکو اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ آئندہ کبھی برار کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

لارڈ کرزن نے دوامی پٹہ۔ کے الفاظ تبدیل کر کے یہ تجویز اور پیش کی کہ اسکی رو سے ہز ہائنس اور ان کے جانشین اس معاہدہ کو بطور استمراری فیصلہ برار تسلیم کرینگے۔

حضور نظام نے جواب دیا کہ میں دوامی پٹہ کو اس لیے منظور کرتا ہوں کہ میری بادشاہت صاف طور پر تسلیم کر لی جائے گی۔

موجودہ نظام کے بیان کے بموجب اس ملاقات کا خاص واقعہ یہ ہے کہ ایک ہمعصر لاچار یار وفادار کو گذشتہ معاہدات اور وعدوں کے برخلاف نہایت زور کے ساتھ یہ باور کرادیا گیا کہ کسی حالت اور کسی وقت میں بھی گورنمنٹ برطانیہ صوبہ برار اُسکے مالک جائز کو واپس نہ کرے گی۔ دوامی پٹہ کے متعلق لارڈ کرزن کا مختتم فیصلہ ۱۸۶۰ء سے اعلان سپردگی اور لارڈ سالسبری کے مراسلہ ۱۸۷۸ء بنام حیدرآباد گورنمنٹ کے قطعی برعکس ہے۔ لارڈ کرزن کا یہ دعویٰ جسکی پابندی آئندہ گورنمنٹ برطانیہ پر ہے وزارت کے اُس فیصلہ کے مطابق نہ تھا جو اس سے کئی سال پیشتر ریاست میسور کے متعلق ہو چکا تھا جسکی رو سے نصف صدی تک قبضہ رکھنے کے بعد ریاست میسور ۱۸۸۱ء میں واپس دیدی گئی اگر لارڈ کرزن کے دعوے کے بموجب امتداد زمانہ سے اس حکم کی قوت بڑھتی جائیگی اور اسکا اطلاق برار پر ہوتا ہے تو یہ بات بیس سال قبل ریاست میسور کے متعلق بھی کہی جا سکتی تھی جب اٹھارویں صدی کے آخر میں ریاست میسور اس خاندان کو دیدی گئی جسکا اس سے پیشتر تعلق تھا۔ اسوقت مارکوئس آف ولزلی نے بحیثیت گورنر جنرل یہ استحقاق محفوظ رکھا کہ اس ریاست کو گورنمنٹ پھر کبھی جب اسکی ضرورت لاحق ہو گی اپنے قبضہ میں کرے گی، ونسنٹ اسمتھ مورخ کے مقولہ کے بموجب میسور کا انتظام نہایت قابلیت سے ہوتا ہے۔

حضور نظام فرماتے ہین کہ اس واقعہ سے کوئی انکار نہین کر سکتا ہے کہ ریاست میسور کی واپسی حکومت ہند کی تاریخ مین برطانیہ کی بہترین دانشمندی کا کارنامہ سمجھا جائیگا۔ اپنے ایک سالانہ ریویو مین لارڈ کرزن نے کونسل کے روبرو فرمایا تھا کہ ۱۹۰۲ء مین جو معاہدہ برار کے متعلق ہوا ہے اسمین جانبین نے پوری آزادی اور بے تکلفی سے گفتگو کی ہے اور اسکی کارروائی مین کسی مخالفانہ اثر کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا لیکن ہندوستان کی رائے عامہ نے لارڈ کرزن کے اس بیان کو صحیح تسلیم نہین کیا بلکہ اسکے بعد جب حضور نظام کو جی۔سی۔بی۔ کا خطاب مرحمت ہوا تو ہندوستان کے ہر ایک گوشہ کلب مین کہا گیا کہ یہ حروف اس فقرہ کے مخفف ہین GAVE CURZAN BERAR (کرزن کو برار دے دیا ہے)

یہ شہادت موجود ہے کہ نظام اس ملاقات سے سخت مایوس واپس ہوئے اگر اس کو مان بھی لیا جائے کہ والسرائے کے فیصلہ کی منظوری آزادانہ اور بلا اکراہ تھی تاہم موجودہ نظام کے اس دعوی مین بہت کچھ وزن ہے کہ انکے والد مرحوم نے وہ شے دیدی جسکے دینے کا انکو استحقاق حاصل نہ تھا، ۱۸۸۰ء مین لارڈ سالسبری نے تجویز فرمایا کہ معاملہ زیر بحث مین رقبہ۔ مالگذاری اور ذاتی تعیش کا سوال نہین ہے بلکہ ۳۰ لاکھ نفوس کی جان و مال پر حکومت کرنیکا سوال ہے اس لحاظ سے بھی حضور نظام کی درخواست بیجا نہین ہے۔

موجودہ نظام نہایت مستقل مزاج شخص ہین اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے پوری مستعدی اور تندہی سے کام کرتے ہین اُنھون نے ایک انتظامی کونسل بھی قائم کی ہو اور اسکے ذریعہ سے ریاست کے نظام و نسق مین بہت سی اصلاحین ہوگئی ہین۔

قانونی پہلوؤن کے علاوہ اس معاملے مین اہل برار کی رائے کو بھی دخل ہونا چاہیئے۔ حضور نظام کے دعوی واپسی برار اور لارڈ کرزن کے اس اصول سے کہ امتداد زمانہ سے وہ حق جاتا رہا یہ مسئلہ ختم نہین ہوجاتا۔ حضور نظام نے اپنی تحریر مین دکھلایا ہے۔کہ ۱۹۱۳ء سے ممالک متوسط کے تحت صوبہ برار کو دینے سے اہل برار کو بعض صورتون مین نقصان پہونچا ہے اور اُنھون نے جو مالگذاری ادا کی ہے وہ صوبہ متوسط کی خزانہ مین شامل ہوگئی ہے اور پولیٹکل حیثیت سے بھی برار کی وہ پوزیشن نہین ہو جو دیگر صوبجات برٹش انڈیا کی ہے۔ سنٹرل اور پراونشل کونسلون مین اُس کے نمایندے

ہندوستان میں محکومی بڑھ جاتے ہیں اگرچہ انکو رائے دہندے نامزد کرتے ہیں، حضور نظام یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ وہ اہل برار کو ہرگز اپنے شخصی حکومت میں نہ رکھیں گے بلکہ ایک آئینی گورنر کے ماتحت برار کو آزاد حکومت خود اختیاری دیدی جائیگی اور فوج و گورنمنٹ ہند کے معاملات کے علاوہ دیگر امور میں وہ خود مختار رہیں گے۔ یہ شکل فی الحقیقت صوبجات برٹش ہند سے کہیں بہتر ہوگی اور اسکی بدولت دیسی ریاستوں میں سیلف گورنمنٹ کی تحریک کو بھی ترقی حاصل ہوگی، اور دیسی ریاستوں کے مطلق العنان فرمان رواؤں کے اختیارات بھی محدود ہو جائینگے۔

اسلیے حضور نظام نے جو واپسی برار کا مطالبہ پیش کیا ہے اس کا دور تک اثر پڑتا ہے۔ بہرحال جو دعویٰ کہ حضور نظام نے اپنے مراسلہ بنام وائسرائے میں پیش کیا ہے وہ عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

اقوال فریڈرک اعظم

حالات موافق ہونے کی حالت میں خوشی سے پھول کر مغرور ہو جانا، اور فتح و فیروزی کے عالم میں کبر و نخوت کے احکام کی پیروی کرنا بالکل جائز نہیں۔

شجاعت و تدبیر بے مہارت جلد یا بدیر دھوکا کھا جاتی ہے۔

اس شخص کے لیے جو سپہ گری سے اشتغال رکھتا ہے ادبیات بہت سود مند ہیں، بڑے بڑے مشہور و معروف جنرل اور کمانڈر اپنی فرصت کے زیادہ اوقات میں ادبیات میں مصروف رہے ہیں۔

لڑائی کی حالت میں جس شخص کا قسمت پر بھروسہ نہیں ہے، وہ سب سے زیادہ لائق سپاہی ہے۔

ہاتف بھوپالی

طلسمی خطوط

گانے والی لڑکی جھینپی، مسکرائی، چہرا تمتما اُٹھا، آنکھیں چمکنے لگیں۔ خیال ہوا کہ سعیدہ کے علاوہ میری آواز کوئی اور بھی سُن رہا ہے۔ جمیلہ نے یکایک بڑی آنکھوں والی چھوکری کو گودی سے اتار دیا اور باجے کیطرف سے رُخ بدلکر کسی سے مخاطب ہوکر بولی یہ آپ یہاں کب سے ہیں؟

سعیدہ۔ خالہ جانی، گائے جاؤ۔ گیت ادھوری نہ چھوڑو، کپتان صاحب بھی سنیں گے ۔

جمیلہ۔ نہیں تو۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ سنو، وہ تمہاری کھلائی تمہیں پکار رہی ہے۔

ابھی سی بچی ذرا دوڑ تو جا!

سعیدہ۔ (مچل کر) بس پانچ منٹ اور

جمیلہ۔ (جھک کر منھ چومتے ہوئے) نہیں پیاری اب (ناخن دکھا کر) اتنا سا بھی نہیں۔

آخر سعیدہ دایہ کی آواز پر دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

کپتان صاحب۔ (جب لڑکی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی) اگر تم نہ ہوتیں تو اس غریب پر جانے کیا کچھ گزر جاتی، ماں کو مرے ہوئے چار برس ہو گئے۔ اوسوقت وہ کتنی ہی تھی؟

جمیلہ۔ میری بہن عرشہ، سعیدہ کو پورے ایک سال کی چھوڑ کر مری تھی۔ خیر سے پانچویں سال گرہ پچھلے ہفتہ میں ہوئی ہے۔

کپتان۔ کیا تم اپنی بہن کو بہت چاہتی تھیں؟

جمیلہ۔ ساری دنیا میں ان سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہ تھا۔ وہ مجھ سے تین برس بڑی تھیں، کبھی جدا نہیں ہوئیں۔ صرف دو بار۔ ایک تو شادی کے بعد چند روز کے لیے اور دوسری

بار ریل والے حادثہ سے کچھ دنوں پہلے۔ جسکے بعد.....

کپتان ہنسا۔ تم نے بھی بچپن میں کیسے کیسے داغ اُٹھائے۔ باپ کا جنازہ دیکھا ماں کی گود سے جدا ہوئیں۔ بہن سے چھوٹ گئیں۔ اسوقت تمہارا سن ہی کیا تھا۔

جمیلہ۔ اک ذری سی تھی۔ مگر اب احساس ہوتا ہے کہ جوانی مجھ سے اور میں جوانی سے ہمیشہ کیلئے چھوٹ گئی (کانپ کر) خیر ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔

نوجوان کپتان۔ تو میں نے بھی کیسی درد بھری بھولی ہوئی باتیں یاد دلا دیں۔ کچھ اور کہنے آیا تھا۔ آؤ گلابی ٹیلوں میں چلے چلیں دل بہل جائیگا۔

جمیلہ مڑی اور ساتھ ہولی۔ چہرے نے ابتک اوداسی ٹپک رہی تھی۔ ہونٹھ خشک ہو رہے تھے۔ گلاب کی پنکھڑیوں کی شکن۔ تڑپتی ہوئی بجلیوں کا مخزن میں ہوئی تھی۔ گویا ہلالی ہونٹھ۔ خمار سرد تھے۔ اور ان پر کی لکیریں تار، دیے دے، جن سے آپ ہی آپ مایوسیوں کے راگ نکل رہے تھے، اور گوش دل سے سننے والے تڑپ تڑپ جاتے تھے، یا میں: باغ کی عطر بھری ہوائیں سولوں میں ایک جوش بھر رہی تھیں، گلابی ٹیلوں میں پہونچکر نوجوان کپتان نے جمیلہ کے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا۔

جمیلہ"!

حسینہ نے چونک کر سر اُٹھایا، آنکھیں لڑیں۔ نگاہیں نیچی ہو گئیں۔

کپتان۔ (اپنی طرف کھینچتے ہوئے) پیاری تم جانتی ہو۔ میں کیا کہنے آیا ہوں،

جمیلہ۔ آہستہ سے ہاتھ کھینچ کر) تو پھر نہ کہئے۔ نذر کچھ نہ کہئے۔

نوجوان چونک پڑا، (نازنین نے کسی نامعلوم جذبہ کے جوش میں بے اختیار کپتان کے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا) یوں ہی چھیڑ رہی تھی، پریشان نہ ہوجئے۔ صرف یہی مجبوری ہے۔

کپتان۔ (بات کاٹ کر) کہ وہ کوئی اور ہے کیا جسے تم چاہتی ہو وہ کوئی اور ہے۔

جمیلہ۔ نہیں تو، (چہرے پر ہلکا سا اضطرابی رنگ دوڑ گیا) یہ بات نہیں۔

کپتان۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنی غلامی میں قبول کرلو، اور میری زندگی

ٹھکانے لگادو“

جمیلہ نے منہ پھیر لیا، اسکی آنکھیں آنسوؤں نہیں۔

کپتان۔ پیاری کیا تم مجھے ذرا سا بھی نہیں چاہتیں؟

نازنین نے آنکھیں اُٹھائیں اور نیچی کرلیں۔ بے باک نگاہوں نے رنگ رخسار سے سازش کرلی اور دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ گفتگو کرلی۔ جسے جمیلہ کی زبان کبھی نہ ادا کرسکتی۔

نازنین۔ اشیم! (بھرّائی ہوئی آواز میں) شادی کبھی نہیں ہوسکتی۔ میں نے ایک خفیہ عہدنامے پر دستخط کر رکھے ہیں۔ مجبور ہوں۔

کپتان۔ میری ننھی نادان پیاری، تیری بھی کیا بھولی باتیں ہیں، آخر تجھے کیا خیال ستا رہا ہے۔ نہ سعیدہ سے جدا ہونا پڑے گا نہ کاظم صاحب کے سایۂ شفقت سے ”نشاط افزا“ یہاں سے دو منٹ کی راہ ہے، اب کوئی گنجائش نہیں۔ پیاری شادی کا وعدہ کرلے۔

گر....

”میں اگر مگر کچھ نہیں سنتا کہہ دو کہ میں تمہیں نہیں چاہتی، تو ابھی چلا جاؤں“

جمیلہ۔ افسوس ہے میں نہیں۔ ارے نہیں۔ (شرما کر رک گئی) اور اپنا سر نوجوان کے شانے میں چھپالیا۔

کپتان۔ تو پھر دل کی بات چپکے سے کان میں کہہ دو (کچھ سن کر) میں تو خوشی سے پاگل ہوا جاتا ہوں۔ میں اور تمہارا محبوب۔ .... خوب

یہ لو کاظم صاحب۔ ٹہل رہے ہیں۔ چلی چلو شادی کے لیے تاریخ مقرر کرالیں۔

جمیلہ۔ مگر آپ اکیلے جائیے۔

حسینہ مسکراتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گو اسکے دولہا بھائی کاظم صاحب سائبان کے قریب کھڑے ہوئے آوازیں دیتے رہے۔ جمیلہ کھڑی رہو، اپنے نام کا خط لیتی جاؤ۔ گر مسکرانے والی دوشیزہ نے جوش مسرت میں مڑکر بھی نہ دیکھا، کہ کاظم صاحب کے ہاتھ میں ہلکے آسمانی رنگ کا ایک لفافہ واقعی موجود ہے۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب جمیلہ کھانے کے کمرہ میں آئی تو کاظم صاحب بھی تشریف لائے اور کہنے لگے ”سب سے پہلے میں مبارکباد دیتا ہوں“

خدا کرے تمہین تمام سزاوار مسرتین حاصل ہون۔ میری نگاہ مین ہاشم سے اچھا کوئی اور نہین ہے جسکے سپرد مین تمہین کر سکون،

جمیلہ۔ بھیّا اگر آپ ہمیشہ انکی خوبیان نہ بیان کیا کرتے تو شاید آج بھی مجھے انکے فرشتہ صفت ہونے کا یقین نہ آتا۔ مین اس معاملہ مین ایک حد تک آپ کی ممنون احسان ہون۔

کاظم صاحب۔ یہ ایک ہی کہی۔ اور مین تمہارا کس حد تک شرمندۂ احسان ہون۔

کاظم صاحب کی عمر ۴۸ کی تھی۔ مگر غم نصیب چہرے سے دس برس زائد کے معلوم ہونے تھے۔ زرد ہونٹھ اور زعفرانی آنکھون کے ارد گرد جھریون کے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ بالون مین کنپٹیون کے پاس سپیدی آچلی تھی، مگر اسوقت انھین بے کیف آنکھون مین جو نازنین کے مسرت فریب چہرے پر جمی ہوئی تھین، ایک ایسا خلوص و جوش کا پاکیزہ نور چھایا ہوا تھا۔ جس سے۔ تھوڑی کے لیے کاظم صاحب نئے سرسے جوان معلوم ہونے لگے۔ معصوم حسن کے بے داغ اثر نے کایا پلٹ کر رکھی تھی۔ وہ کہنے لگے۔

" مین تمہاری ان سالہا سال کی شفقتون کا مقروض ہون جو تم میری شیر خوار بچی پر نچھاور کرتی آئی ہو، تم نے اپنے شباب کے پورے چار انمول سال، مجھ زخمی دل رکھنے والے بد نصیب بھائی کی خدمت اور بیچاری کی بچی سعیدہ کے پالنے مین صرف کر دیے ہین۔ عائشہ کی موت کے بعد اگر تم نہ ہوتین تو مین نے خودکشی کر لی ہوتی یا پاگل ہو گیا ہوتا۔ مین نے زندگی بھر سوائے تمہاری بہن کے اور کسی عورت کو نظر بھر کے دیکھا بھی نہین۔ وہ میرے لیے سب کچھ تھین۔ خیر۔ یہ سب ایکطرف اسوقت کی مسرت سب سے زیادہ ہے اس بھری پوری دنیا مین کوئی خوشی ایسی گرانقدر نہین ہے جو تمہارے لیے سزاوار ہو اور (دروازہ کی طرف اشارہ کرکے) سوائے انکے کوئی ایسا نہین ہے، جسپر بھروسہ کرکے مین اپنی جان سے زیادہ پیاری بہن کو سپرد کر سکون۔

ہاشم صاحب سنتے ہوئے۔ ہنستے ہوئے کمرے مین داخل ہوئے۔ جمیلہ نے بھی کنکھیون سے بھرپور جوان کی مردانہ سج دھج دیکھی اور بے اختیار مسکرا دی،

صندلی دروازون والے شیشہ دار کمرے مین خاصہ چنا گیا۔ بہت مسرت جماعت نے مل جل کر کھایا۔

کاظم صاحب۔ (ختم طعام کے بعد) خوب یاد آیا۔ سعیدہ پیاری تم نے اپنی خالہ جان کو وہ لفافہ دیدیا کہ نہیں؟

ننھی نادان سعیدہ طفلانہ مجرمانہ انداز سے شرماگئی،

جمیلہ۔ (کچھ سمجھ کر) پیاری کچھ ہرج نہیں۔ کل سہی۔

سعیدہ۔ مگر مجھے ... مجھے یاد نہیں کہ کب کہاں رکھدیا ہے۔

جمیلہ۔ (تھپک کر) لو پریشان نہ ہو، صبح کو آپ یاد آجائے گا، وقت آگیا جاؤ سو رہو،

معصوم سعیدہ اپنی کرسی پر سے سرک کر اتری اور سلام کرکے چپ چاپ چلی گئی۔ مگر ننھا سا پاک ضمیر ایک نازک ترازو تھا۔ جسکے داہنے پلّہ پر کھوئے ہوئے خط کا مجرمانہ خیال بھاری پن سے جھکولے لیتا رہا،

جمیلہ سونے کے لیے جاتے وقت حسب عادت دایہ خانہ میں آئی تھی کہ بھولی بچی کی تیز آواز سنائی دی، خالہ جانی یاد آگیا وہ خط تیج سے آپ ہی کمرے میں ہے، اس بوڑھے سپاہی (کھلونا) کے صافہ پر رکھا ہوا ہے جو کونے والی سے لڑ رہا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں۔

نازنین نے اپنی خواب گاہ میں آتے ہی پچھم والی کھڑکی کھولدی۔ گرمیوں کی تاروں بھری سہانی رات سامنے تھی،

بنت اطا افزا،، سسرال بھی جو آج ہی کل میں دولہن کا گھر ہوا چاہتی ہی۔ سامنے ہے۔ جہاں ٹھیک اسی وقت ہاشم صاحب بھی کھڑے ہوئے اپنی جمیلہ کی یاد میں کھوئے ہوئے ہیں چمکتا ہوا چاند گویا لاسلکی پیام رسانی کا نورانی آسمانی مخزن ہے جہاں طالب و مطلوب کی محو سیر نگاہیں، جذبات محبت کا بر اسرار خزانہ بنکر پہونچتی ہیں۔ اور روحانی طور پر اسی میں راز و نیاز کی گفتگو، حسن و عشق کے پیام سلام ہو رہے ہیں۔ جمیلہ اور ہاشم دونوں چاندنی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ دونوں کی نگاہیں چاند پر اور دل ایک دوسرے کے پاس ہیں حسینہ سمجھ رہی ہے کہ ایسی خوشی دنیا میں کسی کو کبھی کاہے کو نصیب ہوئی ہوگی۔ جمیلہ کھڑکی کھولے جانے کتنی دیر تک دیوانہ مسرت تصویر بیخودی بنی ہوئی کھڑی رہی اور آج سہ پہر کی ساری خوشیوں بھری باتیں ایک ایک کرکے یاد آتی رہیں۔

گو یون بھی حسینہ کی معصوم زندگی چین سے گذری تھی۔ مگر سچ تو یہی ہے کہ آج کی سی خوشی کبھی حاصل ہوئی تھی نہ ہو سکتی تھی ایسے کو یا ہنے جا رہی تھی جس پر دل صدقے تھا، جان نثار تھی لطف یہ کہ شادی کے بعد بھی سعیدہ کو اپنے کلیجہ سے لگائے رہ سکتی ہے۔

سعیدہ کون؟ اسکی غریب بن عرلشیہ کی بیٹی۔ غریب عرلشیہ کا خیال آیا ہی تھا کہ دوشیزہ کو اپنے گرم دل پر غم کا برفانی ہاتھ جکڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بجلی سی جھرجھری آگئی۔ کھڑکی بند کر کے مڑ پڑی،، مین وہان بہت دیر تک کھڑی رہ گئی۔ حسینہ نے یہ کہنے ہی کہتے بٹن دبا دیا۔ روشنی ہو گئی، مگر حسن اتفاق سے پہلی نگاہ اسی آسمانی لفافہ پر پڑ گئی جسکا ذکر ابھی سعیدہ کر چکی تھی۔ جمیلہ اس خط کو لیے ہوئے روشنی کے قریب چلی آئی۔ لفافہ چاک کیا۔ دستخط دیکھتے ہی چہرہ پر ہوائیان اُڑنے لگین، ساری نقطین تڑپتی ہوئی بجلیون کے طرح تیزی کے ساتھ نگاہون سے گذر گیئن۔ تحریر آنکھون کے سامنے گھومنے لگی۔ چکر آ گیا۔ کرسی پر بیٹھ رہی۔ ساری جان سے کانپ رہی تھی بڑی مشکل سے مقصد تحریر سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ خط مین لکھا تھا۔

مجھکو خود بھی عہد توڑنے کا افسوس ہو۔ طے کر لیا تھا کہ اب کبھی زحمت نہ دونگا مگر انسان ہمیشہ آپ اپنا مالک نہین رہتا۔ آپ سے ملنا نہایت ضروری ہے۔ کل ضرور ملیے۔ ۶ بجے شام کو پرانے "ساون بھادون" مین منتظر ہونگا۔ اگر آپ کسی وجہ سے نہ آسکین تو مین خود راحت منزل آؤنگا" س۔ د"

"مگر یہ کہ آپ کو یاد ہوگا، دو برس ہوئے مین نے بتایا تھا کہ وہ "طلسمی خطوط،، جلا دیئے گئے۔ یہ بالکل غلط تھا۔ وہ اب بھی پوری حفاظت کے ساتھ موجود ہین۔ کل بھی کیے پاس ہونگے۔ کلیجہ سے لگا کر لاؤن گا۔ ان کا جلانا نہ جلانا آپکے ہاتھ ہے،

جمیلہ نے دوسری بار خط نہین پڑھا مگر دیر تک ایک سناٹے کا عالم طاری رہا۔ رات کی تاریکی مین اسکی تمنا ئین گم ہو گیئن۔ اور اسکا دل رات سے بھی زیادہ تاریک ہو گیا۔

دوسرے دن کاظم صاحب اور ہاشم صاحب ہوا گاڑی مین بیٹھ کر شہر چلدیئے۔ انکے جاتے ہی بیاری جمیلہ نے اپنا پرانے طرز والا سنگاردان کھولا جو ماں سے ترکہ مین ملا تھا، اسمین محل کے مختلف خانے۔ چندن ہار۔ کرن پھول، گوشوارے، جھومک، پہونچی، جوشن

اور نگون کے رکھنے کیلئے نہایت قرینے سے بنے ہوئے تھے نگاہ پڑتے ہی سناٹا آگیا۔ ہونٹون پر پھیکی سی ہنسی دوڑ گئی، وہی مخملی خانے جو کبھی، دکان جوہری کی جان تھے، آج خالی پڑے ہوئے ہین۔ تھوڑا سا معمولی کم قیمت زیور یہان وہان بچ رہا ہے وہ بھی اپنے بچھڑے ہوئے ہم نشینون کے سوگ مین ہے۔

آخرکار حسینہ نے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکالی، اور روشنی مین لاکر دیکھنے لگی، زبان پر بیساختہ جاری ہوگیا، یہ نگینہ بھی سو سوا سو اشرفیون کی مالیت کا ہوگا پھر بھی اُسکے لیے تھوڑا ہے

جمیلہ ا ساون بھادون، مین ٹھیک وقت سے پہونچ گئی، جہان سایہ دار درختون کی لپٹی لپٹائی ہوئی ڈالیون نے ایک خس پوش گنبد بنا رکھا تھا، دوشیزہ نے، دھندلکے مین قدم رکھا ہی تھا۔ کہ آفتاب کی جھٹ پٹے والی روشنی مین کوئی اور آتا ہوا دکھائی دیا، آنیوالا نوجوان۔ خوبصورت اور دُہرے بدن کا تھا۔

اجنبی۔ (رسماً ہاتھ بڑھاکر) آپ وقت کی بہت پابند اور مین بہت بے چین ہون۔

جمیلہ۔ (بڑھے ہوئے شوق والے ہاتھون سے۔ جان بوجھ کر آنکھین چُرالتے ہوئے) تم چاہتے کیا ہو؟

نوجوان۔ خط مین سب کچھ لکھا تھا۔

جمیلہ۔ (بے صبری اور ترش روئی کیساتھ) تم نے خط لکھنے کی ہمت کیسے کی؟

نوجوان۔ سب لوگ جن ضرورتون سے چھٹیان لکھتے ہین، مجھے ان سب سے زیادہ ضروری باتین کہنی تھین۔

جمیلہ۔ خیر تو جلدی سے کہہ سُن ڈالو،

نوجوان۔ مجھے تو ذرا بھی جلدی نہین، گلخپ کے لیے، ساون بھادون سے زیادہ اچھی جگہہ کہان ملے گی، سچ کہئے گا۔ یہان ہماری پہلی ملاقات نہین ہے۔

جمیلہ۔ (مٹھیان باندھ کر) ان وہ طلسمی خطوط، اب بھی تمہارے پاس ہین؟

نوجوان نے سر کے اشارے سے ہان کہدیا

جمیلہ۔ (طنز یہ سرد مہری سے) تو پھر کسقدر؟

نوجوان۔ انمول جواہر کی قیمت بھی ان گنت ہوتی ہے، مگر راجہ کے گھر موتیوں کا کال تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

جمیلہ۔ دو برس ہوئے میں نے تمہیں جواہر والے سارے زیور دیدیئے صرف سو اسو اشرفیوں والی ہیرے کی انگوٹھی بچ رہی ہے، وہ بھی لے لو، اور یہ زیادہ کچھ نہیں دے سکتی۔

نوجوان۔ میں تو سب کچھ لیکر رہونگا۔ دو برس ادھر ہم تم دونوں نادان تھے۔ میں اب سیانا ہو کر پکا جواری ہو گیا ہوں، سے دیے کی لت، پچھلے پنجے کی عادت جبھی جائیگی جب تم جیسی روپے رکھنے والی خاتون، میری بیوی بنے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تین کالے رہینگے نہیں تو کوڑیاں میں تمہارے پاس چار ہزار سالانہ اشرفیوں کی جائداد ہے، جو خیر، ہمارے ڈھاڑے، ہماری غریبا مؤ گذ ربسر کے لیئے کافی ہو جائیگی۔ میں اس واؤں پر اپنی جان بد چکا ہوں، کہ تمہیں جیت کر اور بیوی بناکر رکھوں گا۔

جمیلہ۔ (قہقہہ لگا کر) دیوانے ہوش میں آ

نوجوان۔ دیوانہ اور میں؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر ہوں بھی تو تمہارا دیوانہ ہوں۔ تم ہر بھید اپنے تک رکھ سکتی ہو،

ہاں ہاں تمہارے حسن کی کوئی خطا نہیں نہ میں حسن اتفاق سے دیوانہ ہو گیا،

جمیلہ واپس جانے کے لیے مڑی۔ نوجوان نے بڑھکر راستہ روک لیا۔ میں ہر پہلو کی سوچ بچار کر چکا ہوں، ہماری شادی بالکل خفیہ ہوگی۔ پروانہ شاہی خاص طور پر مل چکا ہے بیاہ کے بعد کمبخوں سے نپٹ لینا۔ رسموں کی بچاری بیکار ہے۔ اپنی جانب منھ دکھائی میں انہیں طلسمی خطوط کی تعمیل نذر کرینگے۔

جمیلہ۔ واہ۔ تم تو مزے میں آگئے۔ میری نسبت ہو چکی ہے اب میں ایک شریف النفس کی منگیتر ہوں۔

نوجوان۔ اونھ۔ نسبت کو کچے دھاگے کی طرح توڑ دو۔ رشتۂ محبت مجھ سے جوڑ لو، میں بھی آدمی کا بچہ ہوں، فرشتہ نہ سہی پھر بھی بہتیری بیگمیں مجھ پر مرتی رہی ہیں۔ خود تمہاری.....

جمیلہ نے خفا ہو کر اُٹھا ہاتھ گال پر رسید کیا۔ مگر دوسرے نے دست ناز کو آسانی سے پکڑ لیا

پیاری جمیلہ میری ننھی منی جمیلہ۔ اگر تم نے کل شام کو اسی جگہ آکر شادی کا اقرار نہ کر لیا تو پہلی سویرے ساری دنیا جان جائیگی کہ اُن طلسمی خطوط میں کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔

نوجوان یہ کہتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

دوسرے دن شام کو ہاشم صاحب ساون بھادوں کے ایک گوشہ میں چھپے ہوئے کھڑے رہے جمیلہ کہہ رہی تھی۔

ہاں ہاں۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ بیاہ کے لیے راضی ہوں، مگر جیسا تم کہہ چکے ہو طلسمی خطوط مجھے ابھی دیدو۔

اب ہاشم صاحب کو تاب کہاں؟ جھٹ سے نکلکر نازنین کا کانپتا ہوا ہاتھ تھام لیا

"جمیلہ"

حسینہ تڑپ گئی۔ مگر ہاشم صاحب کا داہنا ہاتھ رقیب کے گلے پر پہونچ چکا تھا۔ سلیم واسطی تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ بدمعاش اُٹھائی گیرے۔

سلیم واسطی۔ ہاشم تم بہت نازک وقت آدھمکے ہو (یہ ٹرا آدمی کترنی ہاشم کی مضبوط گرفت میں اسطرح تڑپ رہا تھا جیسے زبردست بلّے کے پنجوں میں چوہا) چہرہ سُرخ ہوگیا۔ زبان دو اُنگل باہر نکل آئی۔ بولا تم تو مجھے مارے ڈالتے ہو۔

ہاشم۔ ہو ساری دنیا کو تمہارے گندے وجود سے پاک کئے دیتا ہوں۔ آخر تم جمیلہ خاتون سے کیوں اُلجھے ہوئے ہو۔

سلیم۔ (حقارت سے) یہ معاملہ صرف میرا اور اس نازنین کا ہے۔ آپ ٹانگ نہ اڑائیے

ہاشم۔ یہ حسینہ میری منگیتر ہے۔

کبھی رہی ہوگی، اب مجھے پسند کرتی ہے۔ ابھی خود آپ نے بھی اپنے کانوں سے سنا ہوگا

ہاشم صاحب غضبناک ہوکر آگے بڑھے سلیم واسطی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پڑھنے والے نے مڑکر دیکھا تو نازنین چپکے چپکے بسور رہی ہے۔ گلے میں پھندے پڑ گئے گلوگیر سسکیوں کی دل ہلانے والی آوازیں آرہی تھیں۔ ہاشم نے پیار سے کہا۔

پیاری تم مجھے اس لفنگے کے ساتھ اکیلا چھوڑ دو۔ خوب سمجھ لوں گا۔ دس برس ہوتے

یہ اُٹھائی گیرا میرے ساتھ شیرزاری دستہ میں رہ چکا ہے۔ سپہ سالار نے نکال دیا، یہ بازی
کھیلنے والے تاش کے پتوں پہ بے ایمانی سے داؤں لگاتا تھا۔ دغابازی سے ٹھگتا تھا۔
چار برس ہوئے کہ ایک بار پھر ملاقات ہوئی تھی اور غالباً۔ خوب اب میں سمجھا، اُسی بات
پر یہ حضرت اپنی گیدڑ بھبکیاں دکھا رہے ہیں۔ اکڑفوں کی لے رہے ہیں۔

حسینہ مسکرا دی، گلابی پنکھڑیاں کھلکر رہ گئیں۔ پتلیوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی
ہاشم کی نگاہیں سلیم دہلوی کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں،

یہ حضرت مجھے بمبئی کے اسٹیشن پر ملے تھے۔ انکے ساتھ ایک خاتون تھیں۔ آواز
سے پتہ چل گیا کہ وہ بے چاری تمہاری بہن عرشیہ خاتون۔ میرے پیارے دوست کاظم صاحب
کی بیوی تھیں میں بغیر کچھ پوچھے گچھے دوڑ پڑا۔ کہ انہیں اس لفنگے سے چھڑالوں۔ مگر گاڑی
ہوا ہو گئی۔ میں تھک کر چپ چاپ ہو گیا۔ ایک گھنٹہ بعد خبر ملی کہ وہی گاڑی جبلپور والی ریل
سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی ہے، عرشیہ خاتون کا نام بھی دم توڑتے ہوئے زخمیوں کی گنتی
میں تھا۔ میں فوراً ہی جائے منزل پہونچا گیا دیکھتا ہوں کہ کاظم صاحب نیم دیوانہ اور غریب
عرشیہ آفتاب لب بام ہو رہی تھی۔ میں نے دل سے دعا کی کہ مرنے والی، اپنے بھید اپنی
قبر میں لیتی جائے اور دنیا والوں کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔

جمیلہ۔ مگر میری پیاری بہن نے، مجھ جیتی کو مرنے سے پہلے سارا کچا چٹھا بتا دیا تھا۔
انکو دولہا بھائی سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ سن کا فرق بہت بڑی چیز ہے۔ کاظم صاحب ان سے
بہت بڑے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی ساون بھادوں میں پینگیں بڑھتی گئیں خفیہ پیام و سلام
ہوتے تھے۔ پوشیدہ خط و کتابت جاری رہی اور آخر کار وہ اسی کمینہ خصلت شخص کے ورغلانے اور
خوشامدوں سے، بھاگ جانے پر راضی ہو گئیں۔ ۲۰ سی روز ریل والا حادثہ ہو گیا۔ غریب
عرشیہ۔ سلیم پیارے سلیم پکارتے پکارتے مرگئی مگر طوطا چشم سلیم دغاباز سلیم کہیں دکھائی
بھی نہ دیا۔ دو برس ہوئے اُنہوں نے مجھے ایک خط لکھا کہ اگر میری منہ مانگی رقم نہ دیدو گی
تو تمہاری بہن کے ہاتھ والے طلسمی خطوط تمہارے دولہا بھائی کے پاس بھیجدیے جائینگے۔ خیر میں نے
انکا منہ بھر دیا۔ زبان بند کر دی۔ پرسوں سے پھر چھیڑ خانی مچا رکھی ہے۔ کل اور آج

کی واہی تباہی باتوں نے ناک میں دم کر دیا ہے،

ہاشم۔ (خاموش سلیم کیطرف مڑکر) اب حضور فرمائیں۔ کیا زہر اُگلتے ہیں

سلیم ہاسکلی۔ مرتا کیا نہ مرتا۔ میں نہ دوں تو ہاشم صاحب مارکر چھین لیں گے۔

(جمیلہ کو دیکر) یہ لیجئے۔ "طلسمی خطوط" کی پوری نقل موجود ہے،

سلیم کے جاتے ہی ہاشم صاحب نے پیاری جمیلہ کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور خاموش دوشیزہ پیار بھری مسرت کیساتھ سر اوپر اُٹھا کر چپکے سے کہنے لگی آیئے یہ خطوط جلا دیں اور یہیں جلا دیں۔ جہاں سے غریب عرشیہ کی دیوانی بیٹیں بڑی تھیں دونوں لپٹے لپٹائے ہوئے۔ اُٹھتے ہوئے شعلوں کی سیر دیکھا کئے۔ طلسمی خطوط والی نقل کی جگہ اب راکھ کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ کہیں کہیں اب بھی ہلکی ہلکی چنگاریاں سنہرے ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں کہ اتنے میں معصوم سعیدہ کی تیز آواز بے لطف سناٹے کو توڑتی ہوئی ساون بھادوں میں گونج گئی

ابا جان۔ دیکھئے وہ یہیں ہیں۔ میں نہ کہتی تھی کہ یہیں ملیں گے۔ اوئی اللہ یہاں تو ہولی جلائی گئی ہے،

ہاشم۔ ہم دونوں جھگڑ رہے تھے کہ ساری عمر تمکو چاہے جائینگے۔ اور اسی خوشی میں یہ ہولی جلائی گئی ہے۔ کون جمیلہ؟

حسینہ سر جھکائے خاموش تھی۔ آخر سب لوگ ہنستے بولتے ہوئے راحت منزل میں واپس آ گئے،

طالب الہ آبادی

فریبِ محبت

(۱)

سیٹھ کشن نراین لکھنؤ کے دولت مند اور معزز طبقہ مین شمار کئے جاتے تھے، اقبال پاؤن دھوتا تھا عزت انکی بلائین لیتی اور دولت انکے قدمون سے لگی ہوئی تھی، سیٹھ جی کی اکلوتی لڑکی کامنی ابھی بارھوین برس مین تھی کہ اوسکے حسن و شعور کی شہرت پھیل گئی، خالق حُسن نے اُسے لا انتہا خوبصورتیون کا مظہر بنا دیا تھا، اوسکے سڈول اعضا مین بجلیان کوٹ کوٹ کر بھری تھین سیاہ آنکھون مین جادو تھا اور گھنی پلکین تیر و ترکش کا کام کرتی تھین، نگاہون مین متانت تھی اور ادا ؤن مین بانکپن،

دولتمند والدین کی اکلوتی اور حسین لڑکی کی خوش نصیبی کا کیا کہنا، کامنی کی ہر وہ خواہش جو اوسکے معصوم دل مین پیدا ہوتی، مان باپ کے لیئے باعث مسرت تھی، سیٹھ جی اگرچہ قدیم ہند تہذیب کے دلدادہ تھے، نئی روشنی کے خیالات اونکے دماغ سے دور تھے اور جدید فیشن کے رکھ رکھاؤ سے انھین طبعاً نفرت تھی، لیکن محبت کی مجبوری اور زمانہ کی روش کامنی کے معاملہ مین انکی سخت گیر طبیعت پر غالب آگئی تھی۔

کامنی ذہین تھی، اور علم کی شوقین، اوس نے ہندی مین خاصی قابلیت پیدا کرلی تھی انگریزی اور اردو بھی جانتی تھی، وہ فطرتاً درد آشنا اور حساس دل رکھتی تھی موسیقی اوسکی روحانی غذا تھی اور اس فن لطیف مین اوسے خداداد ملکہ حاصل تھا، کامنی کے حسن کی شہرت لکھنؤ اور اسکے گرد و نواح مین پھیل چکی تھی، جنس حسن کے خریدار ہاتھون مین دل لیکر اُسکے آستانۂ ناز پر حاضر ہونے لگے، لیکن سیٹھ جی کی نگہ انتخاب ہر ایک کے خرمنِ آرزو پر بجلیان گراتی رہی، ایک طرف سیٹھ جی اپنی اکلوتی لڑکی کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کیلئے سیکڑون جان نثارون کی تمناؤن کا خون کر رہے تھے، اور دوسری طرف تقدیر اونکی اس سعیٔ لاحاصل پر ہنس رہی تھی۔

آخرکار بنارس کے ایک مشہور دولتمند تاجر بابو ہردیو سنگھ کے لڑکے سندر سنگھ کا نصیب چمکا. قسمت نے پاوری کی یعنی سیٹھ جی کی نگاہِ انتخاب نے اُسے شرف دامادی بخشا، سندر سنگھ اگرچہ اتنا حسین، اور دولتمند تھا کہ کامنی جیسی نازآفرین حسینہ اوسکے آغوش مین جا کر اپنی خوش نصیبی پر فخر کرسکتی مگر اوسکا قلب تاریک تھا، وہ کامنی کی اُن جلوہ بار شعاعون کی قدر نہ کرسکتا تھا۔ جو اوسکی نین اور محبت پرور آنکھوں سے نگاہ بن بن کر نکلا کرتی تھین، اس کسوٹی کے ذریعہ شاید فطرت اُن قلوب کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی جو طمع کے دھوکے مین آکر پیتل کو سونا سمجھ لیتے ہین

دولتمند والدین نے سندر سنگھ کی تعلیم و تربیت کی طرف بالکل توجہ نہین کی تھی اور اب جبکہ وہ بیس برس کا تھا، علم سے ناآشنا، اور عقل سے بیگانہ تھا ہردیو سنگھ نے یہ دیکھکر کہ سندر سنگھ کی توجہ حصول علم کی جانب بالکل نہین ہے کچھ پروانہ کی اور جب اونکا کوئی دوست انہین اسطرف توجہ دلاتا تو وہ ایک شان استغنا کے ساتھ یہ جواب دیدیتے تھے کہ "میرا دھن سندر سنگھ اور اوسکی سات پشت کے لیئے کافی ہے"، شاید وہ سمجھتے تھے کہ علم صرف حصول دولت کا آلہ ہے آہ یہ دولت ہی تو اکثر بربادیون کی جڑ ثابت ہوتی ہے،

(۲)

بارات کی دھوم دھام کا کیا ٹھکانا، دونون فریق "لکشمی جی" کے منظور نظر، ایسا مبارک موقعہ، ونکسے نصیب ہوتا ہے، بات بات مین ہزارون لاکھون کے وارے نیارے ہو رہے تھے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سیٹھ جی اور بابو صاحب نے اپنے خونِ دل کے اُن قطرات کو شاید منجمد کر دیا ہے جو طمع اور بخل کی حرارت سے ہر لمحہ جوش مین رہا کرتے تھے، اور چند گھنٹون کے لیے فیاضی کی وہ شان پیدا کرلی ہے گویا اونکی دولت (جو مکر و فریب اور خدا جانے کن کن تکالیف جسمانی و روحانی کے ساتھ حاصل کی گئی تھی) وہ چمکتی ہوئی ریت ہے جسکے ذرون کو قدرت نے ایکجا کرکے اونکی بے خبری کی حالت مین صندوقون مین بھر دیا ہے

محفل کی شان طوائفون سے سمجھی جاتی ہے، اسلیئے آگرہ، بنارس، اور لکھنؤ کی کوئی مشہور طوائف ایسی نہ تھی جو مدعو نہ کی گئی ہو، اور جس نے اپنے عارضِ حسن، شوخ چتونون، اور ہوشربا نگاہون سے بندگانِ نفس کی ہوس پرست سینون مین ایک ہیجان عظیم نہ پیدا کر دیا ہو

اپنے بیباک تبسم کے ساتھ ایک زہر آمیز نشتر، اور اپنی شوخ نگاہ کے ساتھ ایک سم آلود تیر دلون مین نہ اُتار دیا ہو، اسی عصمت فروش طبقہ ورسی حیا سوز گروہ مین آگرہ کی مشہور طوائف موہنی بھی تھی۔

موہنی فن رقص و نغمہ کی ماہر ہونیکے علاوہ دلربائی کی صنعتون مین بھی کامل تھی، بوالہوس بندگان نفس تو اوسکی ہر جنبش ابرو پر رقص کرتے تھے بلکہ عزم صمیم رکھنے والے قدم بھی اوس کی سحر کار نگاہ کے سامنے ڈگمگانے لگتے، غرضکہ موہنی اپنے حسن فریبکار کی دلکش اداؤن سے ہمیشہ قلوب مین بھی ایک احساس مضطرب پیدا کر دیا کرتی تھی۔ ابھی وہ شباب کے اس مست و مغرور دور مین تھی، جس نے اسکی نگاہ شوخ کو ساقیہ حسن بنا رکھا تھا،

محفل گرم تھی اور اپنی دلفریبیون سے اندر سبھا کو شرما رہی تھی، دلکش نغمہ کی سُریلی تانون سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج یہ طبقہ زمین پر لگا کر اُڑ جائیگا۔ یکایک چھم چھم کی آواز نے وہ نگاہون کو اپنی جانب متوجہ کیا، موہنی بصد ناز و کرشمہ محفل مین آئی اور اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھکر مستانہ نگاہون سے جذبات شوق کے متوالون کو شراب محبت پلانے لگی،

موہنی سے محبت کی بھیک مانگنے والون مین سندر سنگھ بھی تھا، نہین کہا جا سکتا کہ موہنی کا تیر نگہ کس طرح اوس کے جگر کے پار ہوگیا۔ جبکہ اوسے ابھی چند منٹ پہلے آنے والی رات کا بیچینی کے ساتھ انتظار تھا۔ اور کامنی کے خلوت خانہ حسن کی تمنا اوسکے والہانہ دل کی شمع دل افروز تھی۔

بارات اوسی دھوم دھام کے ساتھ رخصت ہوئی، اب کامنی بے حسن کی شعاعین لکھنؤ کے بجائے بنارس کو جگمگانے لگین، ہردیو سنگھ نے بارات کی واپسی پر امرا بنارس کو دعوت دی مہمان کھانے کے بعد ایک وسیع ہال مین جمع ہوئے جو مخصوص طور پر رقص و سرود کے لیے سجایا گیا تھا۔ چند منٹ کے بعد وہ کمرہ پرستان کا نمونہ بن گیا، موہنی کی سُریلی اور دلکش تانین تیرون کی طرح لوگون کے دلون مین اُترنے لگین، "سندر" بھی ایک طرف بیٹھا ہوا موہنی کے بادہ حسن سے مست ہو رہا تھا، اُسکی حریص نگاہون سے معلوم ہوتا تھا کہ اوسکی شادی صرف موہنی کا دیدار ہے۔

آہ اس بے ثبات دنیا مین حقیقی مسرت کا وجود معدوم ہے، جسطرح گلاب کے خوشنما پھولون

کی نظر فریب شاخ کا نٹون سے خالی نہین ہوتی اوسی طرح حیات انسانی کی خوش ادا مسرتون کا دلفریب چمن خار زار الم سے لبریز ہوتا ہے، یا اسطرح سمجھ لیجیے کہ غم ایک کریہ المنظر تصویر ہے اور مسرت اوسکا منقش آئینہ، اس آئینہ کی نقوش دلکش اسقدر جاذب نظر ہین کہ انسانی نگاہین اسمین الجھکر رہ جاتی ہین اور وہ نہین دیکھ سکتین کہ آئینہ کے پیچھے کیا شئے ہے اس آئینہ کی نزاکت نگاہون کی متحمل نہین ہوتی اور فوراً یا چند لمحہ کے بعد آئینہ چور چور ہوکر گر پڑتا ہے اور تصویر سامنے آجاتی ہے مگر بیوقوف انسان اب بھی نہین دیکھتا، بلکہ خواہش کرتا ہو کہ اوسکی نگاہین چور چور آئینہ کے ہر ذرہ کو اُٹھا کر تصویر پر ہمیشہ کے لیے لگا دینے کی سعی لاحاصل مین کامیاب ہوجائین،

آہ گھر برباد ہو رہا تھا، خانہ بربادی پس پردہ کھڑی ہنس رہی تھی، مگر سب سمجھ رہے تھے کہ سندر سنگھ کی خانہ آبادی ہو رہی ہے، اور فرائض انسانی میں سے ایک ایسا فرض ادا ہو رہا ہے جس مین تخلیق عالم کا راز مضمر ہے۔

موہنی جہاندیدہ تھی، اور تجربہ کار، ایک عصمت فروش کے لیئے، بیوقوف اور ناتجربہ کار دولتمند سے زیادہ قابل توجہ شکار اور کون ہو سکتا ہے، موہنی کے ترکش مین اسوقت فریب محبت کے جسقدر تیر تھے اوسنے وہ سب سندر سنگھ پر صرف کر دیئے، غرضکہ محفل کے ختم ہونیسے پہلے سندر سنگھ بسمل تھا اور موہنی کے منتر کا سحر ہو

(۳)

دوسرے دن موہنی آگرہ جانے والی تھی، رات کے ۲ بج چکے تھے، محفل برہم ہو چکی تھی شمعین جھلملا رہی تھین اور موہنی اپنے کمرہ مین ایک مسہری پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی،

"کاش یہ سونے کی چڑیا ہاتھ آجائے، مین نے نشانہ مین تو کوئی کسر نہین اٹھا رکھی، مگر شکار کا زخمی ہونا قسمت کی بات ہے، ...."

وہ یہی خیال مین محو تھی کہ آہستہ سے دروازہ کھلا، سندر سنگھ کمرہ مین آیا اور بولا، "موہنی! کیا سو گئین؟" اوسکی آواز مین لرزش تھی،

موہنی نے مضطربانہ طور سے سر اُٹھا کر سندر سنگھ کو متحیر اور پرشوق نگاہون سے دیکھتے ہوئے کہا "جی نہین" اور جلدی سے اُٹھکر مسہری پر بیٹھتے ہوئے بولی "تشریف رکھیئے"،

سندر سنگھ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "مجھے معاف کرنا، میں نے تمہیں آرام کے وقت تکلیف پہنچائی، حالانکہ میں تمہارا مہمان ہوں"۔

موہنی نے خفیف تبسم اور ایسی ادائے دلربایانہ کے ساتھ جسکو صرف اہل نظر محسوس کرسکتے ہیں، جواب دیا "بابو صاحب! آپ یہ کیا کہتے ہیں، اگر عزت کسی کے لیے باعث تکلیف ہوسکتی ہے تو شاید میں آپکے اس محبت آمیز نیز ندامت کا نشانہ بننے کی جرأت کرسکتی لیکن میں سمجھتی ہوں اور دعویٰ سے کہتی ہوں کہ آپنے اپنی تکلیف کا اظہار مستحسن طرز بیان میں اداکرنیکی اچھی قابلیت پائی ہے، اسلیے میں آپ کی اس تکلیف فرمائی پر اظہار امتنان و تشکر کرتی ہوں"

سندر سنگھ "تمہارے پاس آنے میں مجھے تکلیف ہوگی؟ افسوس تم نے میرے اُس جذبہ کی توہین کی، جو مجھے باوجود تمہاری تکلیف کے احساس کے یہاں تک کھینچ لایا"

موہنی اسطرح ہنسی گویا ابھی نہیں سمجھی کہ سندر سنگھ کا لفظ "جذبہ" شرمندہ معنی بھی ہے، اور بولی "بہرحال اسوقت کیسے تکلیف فرمائی"

سندر سنگھ نے مسکرا کر دبے لفظوں میں جواب دیا، "یہ اپنی نگاہوں سے پوچھو"

موہنی نے بھولے پن سے سندر سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "صاف صاف کہئے، مجھے پہیلی بوجھنا نہیں آتا"، یہ الفاظ اس انداز سے ادا کئے گئے گویا موہنی کا دل اپنے مخاطب کے تاثرات سے متحرک ہے،

سندر سنگھ مضطربانہ لہجہ میں بولا "دیکھو موہنی! زخم پر نمک چھڑکنا اچھی بات نہیں، تیر لگا کر شکار کو تڑپتا چھوڑ دینا بڑی سنگدلی ہے، تم جان کر انجان بنتی ہو"

موہنی مسکرائی گویا حسن کی کلی کھل گئی اور بولی "میں تو کچھ نہیں سمجھی آپ اپنے دلکی بات توکہیں"،

سندر سنگھ بیقرار ہوگیا، اُسنے بیتابانہ موہنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا "ہاں ہاں! پیاری موہنی، میں تمہیں اپنے دل کی بات بتاتا ہوں، کیا تم مجھے محبت کی بھیک دے سکتی ہو؟"

موہنی نے بجلی کی سی سرعت کیساتھ سندر سنگھ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچکر جواب دیا۔ "جی نہیں! میں خود محبت سے محروم ہوں، آپ کو کہاں سے دے سکتی ہوں، بابو صاحب!"

طوائف وہ عورت ہے جسکے پاس محبت کا سودا نہیں ہوتا، آپ تو اسے وہان تلاش کیجئے۔ جہان آپ کو مل سکتی ہو،

سندر سنگھ "موہنی! تم یقین کرو مین اوسے وہین ڈھونڈھ رہا ہون جہان وہ مجھے مل سکتی ہے"

موہنی "کہان؟ کامنی کی اداؤن مین"

سندر سنگھ "نہین! موہنی کی آنکھون مین"

موہنی نے اپنے جذبہ مسرت کو چھپاتے ہوئے کہا "شاید ہی وہان مل سکے"

سندر سنگھ نے التجا آمیز نگاہون سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "مجھے یقین ہے، موہنی! اب زیادہ نہ ستاؤ اور وعدہ کر لو کہ اپنے ہونٹون کے امرت سے میری محبت اور شوق کی پیاس بجھاؤگی،

موہنی جانتی تھی کہ محبت کی تشنگی بجھانے کی تمنا محبت کی موت ہے، اسلیئے وہ سندر سنگھ کے آخری جملہ پر ملتفت ہوئی، اب اُسنے اپنے فریب کو ایک جدید سانچے مین ڈھالکر اور زیادہ دلکش بنانے کی کوشش کی، اور ایک نئے انداز سے بولی "مین آپ سے عہد تو کر سکتی ہون مگر افسوس کہ ایسا کر نہین سکتی،

سندر سنگھ "یہ کیون؟

موہنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اسلیئے کر سکتی ہون کہ آپ کے اصرار محبت نے مجھے مجبور کر دیا، اور جانتی ہون کہ آپ میری محبت کی قدر کر سکتے ہین، اور اسلیئے نہین کر سکتی کہ مین صبح آگرہ جانیوالی ہون اور سمجھتی ہون کہ میرے آگرہ جانے کے بعد "عہد محبت" ایک بے معنی لفظ ہو جائیگا۔

بوالہوس سب سے پہلے نفس کیجانب جھکتا ہے "عہد محبت" کے بے معنی ہو جانے کا بیتاب کن فقرہ ایک درد بھرے دل ہی کو وقف اضطراب کر سکتا ہے، لیکن نفس پرست انسان اس نشتر سے احساس درد نہین کر سکتا"

سندر سنگھ نے گھبرائے ہوئے لہجہ مین پوچھا "کیا تم صبح جانے کے لیئے بالکل تیار ہو؟

موہنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" ہاں اب میرے یہاں رہنے کی کوئی وجہ نہیں
سندر سنگھ نے ملتجیانہ انداز سے موہنی کی طرف دیکھا اور درخواست کیا" تو کیا میری ساری التجائیں پامال کر دی جائینگی ؟

موہنی " بابو صاحب! پھر آپ ہی بتلایئے میں کیا کر سکتی ہوں "

سندر سنگھ نے کہا " تھوڑے دنوں نہ جاؤگی تو تمہارا کیا حرج ہو جائیگا "

موہنی نے متین انداز میں جواب دیا" نہیں ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔ بابو صاحب! میں بے بس ہوں ، میری ماں اب ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتی "

سندر سنگھ نے کہا" انکا روک لینا میرے ابن کا کام ہے ۔ میں سو روپیہ روز دینے کو تیار ہوں ، مگر موہنی تم جانے کے خیال سے باز آؤ ، میں مر جاؤنگا "

موہنی نے دیکھا ، شکار پھنس چکا ، اب جھٹکے دینا بیکار ہے ، ممکن ہے کوئی تار ٹوٹ جائے اسلیئے بولی " بابو صاحب ! میرا دل خود یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا ، نہ جانے بنارس کی دلچسپیاں میرا دامن کیوں نہیں چھوڑنا چاہتیں ۔ ۔ ۔ "

موہنی کے ان جملوں نے سندر کی نیم مردہ آرزوؤں کے ساتھ آبحیات کا کام کیا اور گویا وہ یک بیک جی اٹھیں ، اس نے کرسی سے اٹھکر مسہری پر بیٹھتے ہوئے بیتابانہ انداز سے موہنی کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور کہا " تم بنارس کی دلچسپیوں کا فریب کھا رہی ہو ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میری محبت تمہارے قلب پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکی ، دیکھو تو سہی میں کتنا خوش نصیب ہوں ، محبت کی بازی میں آخرکار تمہیں میں نے جیت لیا ۔

موہنی نے ایک دلبرانہ انداز سے سندر سنگھ کیطرف دیکھا اور خاموش ہو گئی ، موہنی کیلئے یہ وقت بیش قیمت تھا ، یہ لمحے ، اسکی پر فریب اداؤں کے لیے مغتنم تھے ، اس نے اس مکڑی کی طرح جو اپنے شکار کو ذرا سا موقع ملنے پر چاروں طرف سے جالے میں جکڑ لیتی ہے ، سندر سنگھ کو اپنے دام میں اچھی طرح پھنسا لیا ۔

(۴)

وقت اور دریا کا بہاؤ یکساں ہے ، انہیں جتنا ہی غور سے دیکھو اتنا ہی تیز جاتے ہوئے

دکھائی دیتے ہیں، سندر سنگھ کی شادی کے ایام ہوا کے تیز جھونکوں کی طرح گذر گئے، سائنس کا ایک اصول ہے جو چیز جسقدر جلد گرم ہو سکتی ہے اُسیقدر جلد سرد بھی ہو جاتی ہے، جذبۂ نفس ایک قسم کی حرارت خون کا فوری نتیجہ ہے، اسلیے اوسکا چڑھا ہوا دریا بہت جلد اُتر جاتا ہے مگر سننے والونکو تعجب ہوگا کہ سندر سنگھ اس کلیّہ سے مستثنےٰ تھا، جسقدر وقت گذرتا گیا، اتنے ہی موہنی سے اوسکے تعلقات بڑھتے گئے اور اوسکے دل پر موہنی کا اقتدار استحکام ہو گیا۔

موہنی ایک تجربہ کار اور چالاک عورت تھی وہ خوب جانتی تھی کہ اوسکے حسن عریان کا راز آتش شوق کے شعلہ میں پنہان ہے۔ اس شعلہ کا افسردہ ہونا افشاے راز کی دلیل، و تمہیج طبیعت انسانی جس فعل کی عادی ہو جاتی ہے وہ طبیعت کا ایک جزو ہو جاتا ہے، سندر سنگھ کا نفس پرست دل، عریان اداؤن سے اسدرجہ مانوس ہو چکا تھا کہ انکے بغیر ہر وقت کھویا سا رہتا تھا،

جذبۂ گناہ کو جتنا ہی چھپایا جاے اُتنا ہی ظاہر ہو جاتا ہے، سندر سنگھ اگرچہ پوشیدہ طور پر موہنی سے ملتا تھا، لیکن تھوڑے ہی دنون مین یہ بات کھل گئی، ہردیو سنگھ نے بہت کوشش کی کہ کامنی کی برگشتہ قسمت راہ راست پر آجائے مگر وہ ناکامیاب رہا اور اوسوقت تک ناکامیاب رہا جبتک کہ اوسکی روح اس غم کے باعث جسم سے مفارقت نہ کر گئی، غریب بڈھا جسوقت دم توڑ رہا تھا اسوقت بھی کامنی کا مستقبل ایک تصویر بیکسی بنکر اوسکی نگاہون کے سامنے پھر رہا تھا، یہان تک کہ مرنے والے نے آخری سانس بھی بدنصیب کامنی کے نام پر وقف کردی

باپ کے مرجانے پر سندر سنگھ نے اور گل کھلانا شروع کئے، وہ دولت جسے ہردیو سنگھ سندر کی سات پشت کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ اب آدھی رہ گئی تھی اور نہین کہا جا سکتا تھا کہ وہ سندر سنگھ جیسے اوباش جاہل اور فضول خرچ آدمی کو کتنے دن کفایت کر سکتی ہے، دن کا زیادہ حصہ سندر سنگھ اپنے باہر والے کمرہ مین خودغرض اور بدچلن دوستون کی صحبت مین بسر کرتا اور شام سے صبح کی پہلی کرن کے جلوہ گر ہونے تک موہنی کے پاس رہتا۔ غرضکہ اوسکی حیات بدنام بندگیٔ نفس مین یون ہی بسر ہوتی رہی، ایسی بندگیٔ نفس مین جسمین زمانۂ تمدن وارتقا کی انسانیت کا کوئی جذبہ شامل نہ تھا،

کامنی کمسنی ہی مین بلا کی حسین تھی، مگر اب جبکہ اُسنے سولھوین برس مین قدم رکھا تھا، ایک فتنہ تھی یا قیامت، اوسکی آنکھون مین شباب کا نشہ، اور دلمین اُمنگون کا جوش پیدا ہوگیا تھا، وہ فطرتاً ذہین تھی، سینے مین حساس دل اور دماغ مین عقل سلیم رکھتی تھی۔ وہ اسوقت بھی جبکہ سندر سنگہ کی اوباشیان ظاہر بین نگاہون سے پوشیدہ تھین، اوسکے عدم التفات اور اوسکی نگاہ کی بےنیازی سے یہ سمجھ چکی تھی کہ میرے نصیب پھوٹ چکے، اب میری دنیا ویران ہی رہے گی،،

فطرت کا مبارک ترین انعام "حسن" اوس معصوم لڑکی کے حق مین ایک بدترین عذاب تھا اور حیات کا بہترین حصہ "شباب" اس بدنصیب کے صحیفۂ حیات کا غم آموز باب، کاش حسن کا احساس ہونے سے پہلے متخیلہ کی وہ قوت سلب ہوجاتی جو پندار ناز کی پیدا کرنے کا باعث ہے اور شباب آنے سے قبل دلکا وہ حصہ بےحس ہوجاتا جو رنگین تمناؤن کا آفریدگار ہے شاید تقدیر اُس بدنصیب کو فطرت کی تکمیل غم کے نذر کرنے کیلئے بیتاب تھی،

کامنی جب سوچتی کہ وہ حسین ہے، مگر اسکا خریدار اسکے حسن کا قدردان نہین تو دلکے فطری جذبات پژمردہ ہوجاتے۔ اور چند لمحون کے لیے اوسکی آنکھین اشک بار ہوکر اوسکی خوشنما ساری کے سُرخ رنگ کو اور شوخ کردیتین، اور جب سمجھتی تھی کہ وہ جوان ہے تو اوسکے دل پر ایک بجلی گرتی اور اوسکی آرزوؤن کا خرمن ناز خاکستر ہوجاتا، وہ اکثر ٹھنڈی سانسین بھر بھر کر کہا کرتی، "ایشورا تونے مجھے یہ خوبصورتی کیون دی ہے"۔ گھر والے سب اوسے حقیر نگاہون سے دیکھتے، بڑی بوڑھیان طعن کرتین "ایسی نیک قدم (نحس قدم) بہو آئین کہ سسُر تین ہی مہینے کے اندر کال دیو کی بھینٹ چڑھ گئے۔ چھوٹے بابو کی حالت ایسی بگڑی کہ پرماتما ہی انہیں راہ پر لگائین تو بیڑا پار ہو،، نندین کہتین "بھابھی بھیا کو ناخوش رکھتی ہونگی، جبھی تو وہ پھٹے پھٹے رہتے ہین، اڑوس پڑوس کی آنے جانے والی ہمجولیان یون ہنسی اوڑاتین کہ "انہین اپنے پت سے پریم ہی ہوگا نہین تو چھوٹے بابو کا ہے (کیون) کو ویشیاؤن سے پریم کرتے پھرتے،،

مگر بدنصیب کامنی سب کی باتین سنتی، اور گردن جھکا کر رہ جاتی، سب کی حقارت آمیز نگاہون کا نشانہ بنتی اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر دوسری طرف منہ پھیر لیتی۔ سبکے طعنونکا نشتر اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتی، وہ اکثر راتون کو چونک اٹھتی اور پہرون اس خیال مین محو رہتی، کیا مسرت نہین

ہیرا اون کا حصہ ہے،، کبھی بیساختہ اوسکی زبان سے نکل جاتا ور کاش موہنی کی قسمت میری نصیب ہوتی

،، سچ یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کی بیوفا جو کھٹ پر اپنی ناکام زندگی کی بھینٹ چڑھا سکتی ہے زمانہ کے دلگداز مصائب، دنیا کی سخت ترین تکالیف صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر سکتی ہو لیکن یہ اوسکی فطرت کے خلاف، اوسکی طاقت برداشت سے باہر ہے کہ اوسکا شوہر دوسری عورت سے محبت کرے،،

ایک دن کامنی اپنے کمرہ مین لیٹی ہوئی تھی، اوس کمرہ مین جس کے فرش پر بارہا اوسکے آنسو ٹپ ٹپ کا چھڑکاؤ ہو چکا تھا، جسکی دیوارین اوسکی معصوم بیکسی پر اکثر لرز اٹھی تھین، اسکا دماغ امید و یاس کی حوصلہ شکن کشمکش کا جولانگاہ بنا ہوا اسکی مایوس زندگی کے تاریک پہلو کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات مین ہمہ تن مستغرق تھی، واقعہ یہ ہے کہ تنہائی اور خیال مین چولی دامن کا ساتھ ہے انہین خیالات کے ہجوم مین اسکے دلمین دفعتًا یہ خیال پیدا ہوا۔

،، دنیا کیون کہتی ہے کہ مین حسین ہون، اگر مین حسین ہوتی، تو وہ کیون ایک بازاری عورت کے ساتھ اپنا دل بہلاتے، آہ مجھے یہ فریب کیون دیا جا رہا ہے، اندلا! مجھے تیری بات یاد ہے تو اکثر کہا کرتی تھی،، خوش نصیب ہے، وہ مرد جو کامنی کے پیر چومکر اوسکا دل حاصل کر سکے، میری پیاری سکھی تجھے کون بتلائے آج وہی کامنی ایک مرد کا پیر چومنے کو ترس رہی ہے — اندلا کیا تو بھی مجھے فریب دیتی تھی،

ہان اب مین سمجھ گئی، حسن اسکا نام نہین ہے جسکے فریب مین مین مبتلا ہون، حسن شاید اوس کشش کا نام ہوگا جسکی مالک دنیا مین صرف موہنی ہے۔ دنیا جانتی ہے مین ایک دولتمند کی لڑکی ہون اور بہو بھی، میری ہمجولیان کہتی تھین دولت کا دوسرا نام سکھ ہے،، آہ! مین اس فریب مین بھی پھنسی ہوئی تھی، سکھ بھی میرے پاس نہین ہے، اچھا کھانا اور اچھا پہننا سکھ نہین ہو سکھ شاید اُس لذت کا نام ہوگا، جسکی مالک دنیا مین صرف موہنی ہے،

اے پرماتما! حسن اور سکھ جو عورت کی حقیقی زندگی ہین اگر تو نے مجھے نہین دیئے تو صرف اتنا بتا دے کہ کیا تو نے مجھے انہین مایوسیون مین تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے پیدا کیا ہے مین تجھ سے یہ نہین چاہتی کہ تو وقت مقررہ سے پہلے میرے جسم کی متحرک تصویر کو ساکن کر دے، مین تو

صرف یہ پرارتھنا کرتی ہوں کہ اس تصویر سے تمام رنگ روغن جدا کر کے فضا میں منتشر کر دے تاکہ دیکھنے والے میرے سنگدل بت کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور اس طرح میری آتما بہت جلد وہ سکون حاصل کر سکے جو موت سے پہلے اسے ساکت کر سکتا ہے، مجھے یاد ہے، میں نے ایک مشہور کتاب میں پڑھا تھا، ویشیا سے بڑھکر دنیا کی ذلیل ہستی کوئی نہیں، تو کیا موہنی ذلیل ہے .....؟ ہرگز نہیں، کتنا سفید جھوٹ، کیسی کھلی ہوئی غلط بیانی، ....

مگر آہ شاید دنیا کے بڑے بڑے دانشمند اس فریب میں مبتلا ہیں۔

میں حسن اور سکھ کے متعلق اپنے تمام خیالات بدل دونگی، تمام سنے ہوئے الفاظ کو دل سے محو کر دونگی، مگر اے پرماتما! میں اس پر قادر نہیں ہوں کہ اُس تمنا کا گلا گھونٹ دوں جو میرے ٹوٹے ہوئے دل کی رونق ہے،

میری زندگی بربادی کے دامن میں تھی اور میں نے کبھی نہ سوچا کہ میری اس بربادی کا باعث کون ہے، میرے ماں باپ! نہیں وہ بے قصور ہیں، دولت اندھی ہوتی ہے، اور انسان کی ظاہری حالت اکثر و بیشتر ملمع اور بد قسمتی سے اوسکے دیکھنے والے اور پرکھنے والے بھی بے بصیرت اور کم سواد ہوتے ہیں،

پھر کون؟ میرا بت، نہیں وہ بھی نہیں، دل کسی کے اختیار کی چیز نہیں، جس طرح انہیں میں اپنی جانب نہیں کھینچ سکتی، اسی طرح وہ موہنی کی کشش سے نہیں بچ سکتے، تو موہنی ہوگی ہاں!..... مگر نہیں وہ بھی نہیں ہے، دنیا مطلب کی ہے حیات کا خمیر خود غرضی سے بنایا گیا ہے، جس طرح میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے ہو رہیں، کیا اوسی طرح موہنی کی خواہش نہ ہوگی کہ اوسکی ادائیں ایک لمحہ کیلئے اونکا دامن نہ چھوڑیں، اگر میری یہ آرزو جائز ہے تو اوسکی بھی وہ تمنا بیجا نہیں ہو سکتی،

پھر آخر کون اس سنگین خطا کا مرتکب ہے؟ میں! ہاں ہاں بیشک میں ہی، تو میرے ہی کرم میں یہ دکھ لکھے ہوئے ہیں!

پرماتما! میں خود اپنی گنہگار ہوں، آخر میری قسمت میری دشمن کس لیئے ہے! ایک عصمت فروش، ایک حیا سوز، ایک بد آموز ہستی کو سکھ اور حسن حاصل ہے، اور

اوسے بہن، جو شوہر پرست ہے، جس نے اپنی عصمت، اپنی عزت، اور اپنا سب کچھ صرف ایک ہستی پر نچھاور کر رکھا ہے۔

فطرت، فطرت! کیا تیرا یہ قانون منصفانہ ہے؟

خیالات کے سلسلہ مین یہان پہونچکر کامنی ضبط نہ کرسکی، اوسکے جذبات دل رقیق ہوگئے وسکی بڑی اور خوبصورت آنکھون سے آنسو ٹپکنے لگے، تھوڑی دیر تک یہ کیفیت طاری رہی! مگر جسطرح پانی برسنے کے بعد بادل کھل جاتا ہے اوسیطرح رونے سے بخار نکل جانے کے بعد دل ہلکا ہوجاتا ہے، آخر کار وہ ایک ٹھنڈی اور گہری سانس بھر کر اٹھی اور دل بہلانے کی غرض سے کوٹھے پر چلی گئی،

(۲)

آسمان کامنی کے دل کی طرح صاف اور نکھرا ہوا تھا، اشٹمی کا چاند بلند ہوچکا تھا، اور چھٹکی ہوئی چاندنی اوسکے پیرون پر لوٹ رہی تھی، تارے جھلملا رہے تھے اور ہوا کے نرم نرم جھونکے اوسکی سرخ ساری سے اٹھکھیلیان کر رہے تھے۔ یہ ہوشربا منظر اوسکے شباب کے نشہ کو تیز کر رہا تھا، وہ فطرت کی اس فیاضی کا لطف اٹھا رہی تھی، چند لمحون کے بعد اُسکا دل پھر مختلف خیالات کا آماجگاہ بن گیا، جسطرح سنگ مرمر کی ایک مورت سُرخ ملبوس مین کھڑی ہوئی اچھی معلوم ہوتی ہے، اوسیطرح کامنی اپنے خیالات مین مستغرق بےحس و حرکت کھڑی ہوئی بےحد دلفریب معلوم ہو رہی تھی،

یکایک پاس سے بانسری کی ایک سُریلی تان آئی جسکو سنکر کامنی چونک پڑی، اس کا سکون اُس باندھ کی مانند جو پانی کی رَو کو روکے رہتا ہے ٹوٹ گیا، خون رگون مین بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگا، اور نگاہ جو اُٹھی، تو دیکھا کہ سامنے والے کوٹھے پر ایک خوبصورت نوجوان ہاتھون مین بانسری لیے اوسے للچائی نگاہون سے دیکھ رہا ہے، گویا چاہتا ہے کہ اوسکی حسن کو اپنی نگاہون مین جذب کرلے،

اگر شرم عورت کی فطرت نہوتی، اگر غیرت، "نسائیت" کا جزو نہ ہوتی اور اگر خیالات پریشان سد راہ نہ ہوتے، تو کون کہہ سکتا تھا کہ کامنی اس حالت اضطرار و اضطراب

اور اس عالم محویت میں گردن جھکا لی، مگر اُسنے آنکھیں نیچی کر لیں، مگر بانسری کی سریلی تان اوسکے دل کے پار ہوگئی۔ اور من کا سانپ اسکی مست آواز پر لہرانے لگا، چند لمحون کے بعد کامنی کی معصومیت نفس پر غالب آگئی، مگر اب اوسکے خیال کی دنیا اور بھی وسیع ہوگئی

اوسیوقت ایکسیانی عورت کسی کام سے کوٹھے پر آئی، اُسے سب "رمتا" کہا کرتے تھے، رمتا کامنی کی ساس کے پیرون مین مہندی لگانے، بدن مین اُبٹنا ملنے، بالون مین کنگھی کرنے اور چوٹی گوندھنے پر نوکر رکھی گئی تھی، کامنی کی ساس کا سہاگ اُجڑ چکا تھا، اب وہ بہواور بیٹیون کی مشاطہ گری کرتی تھی،

رمتا ذات کی نائن تھی اور اپنی طویل عمر مین ہر قسم کے پاپڑ بیل چکی تھی اُسنے کامنی سے تعجبانہ لہجہ مین پوچھا، "ائین بہو! تم اتنی رات گئے اکیلے یہان کیا کر رہی ہو"،

جملہ ختم ہوتے ہی اوسکی نگاہ سامنے والے کوٹھے پر کھڑے ہوئے نوجوان پر پڑی، نوجوان اسی طرح بانسری ہاتھ مین لیے ہوئے کامنی کیطرف دیکھ رہا تھا۔

چالاک عورت نے کامنی کو مصنوعی غصہ کی نگاہون سے دیکھتے ہوئے کسیقدر سخت لہجہ مین کہا "اچھا تمہارے یہ ڈھنگ ہو رہے ہین، چلو نیچے، دیکھو تو سٹھانی جی سے کہکر تمہاری کیا گت کراتی ہون"،

جسطرح چور چوری کرنے کے بعد ایک معمولی راہگیر کے ٹوکنے پر کانپ اُٹھتا ہے، اوسی طرح کامنی اپنی ملازمہ کی تہدید سنکر سر سے پیر تک لرز گئی، خوف اوسکے حواس پر غالب ہوگیا، اور چاندنی رات مین چارون طرف اُسے تاریکی نظر آنے لگی وہ رمتا کو کچھ جواب نہ دے سکی، اور نگاہین نیچی کرکے رہ گئی، گویا وہ زمین پر گری ہوئی اس شراب کو دیکھ رہی ہے، جو تھوڑی سی اوسکے جام حیات مین باقی رہ گئی تھی،

مکار عورت نے اب سامنے والے نوجوان کو مخاطب کیا، "منوہر بابو! آپ کچھ پرائی بہو بیٹیون کا بھی لحاظ کرتے ہین"،

منوہر نے لاپروائی سے جواب دیا "کیون؟ کیا تم لوگون کی وجہ سے مکان چھوڑ دون" رمتا منوہر سے کچھ نہ کہہ سکی، اور خود منوہر بھی اب سامنے سے ہٹ چکا تھا، اسلئے غریب کامنی

پیار پر سنے لگی ؛

وہ بھلے گھر کی بہو بیٹی ہو کر تم دوسروں سے آنکھ لڑاتی ہو، کیا اپنے کل میں داغ لگاؤ گی، بابوجی سن پائیں، تو ابھی جانے کیا کر ڈالیں ،

کامنی کے حواس درست ہو چکے تھے ، ایک ناگن کی تنبیہ اسکے سینہ میں آگ بھڑکا رہی تھی آخر کار ضبط نہ ہو سکا۔ بگڑ کر بولی۔

"تو کیا بک رہی ہے میں آپ ہی اپنی تقدیر کو رو رہی ہوں ، میں نے تو دیکھا بھی نہیں کہ کون کھڑا ہے"

چالاک عورت نرم ہو گئی ، اور دوسرا رنگ بدلتے ہوئے تسلی آمیز لہجہ میں بولی " بہو میں سب سمجھتی ہوں ، میں اچھی طرح جانتی ہوں ، بابوجی ایک دیشیا کے جال میں پھنس گئے ، ہائے یہ بھری جوانی اور یہ غم ، پھر کیا کیا جائے - جو دکھ بھاگ میں بدا ہے بھگتنا ہی پڑے گا ،،

جلتی ہوئی آگ میں جو کام گھی کرتا ہے ، رتا کی تسلی نے کامنی کے دل کے ساتھ وہی کام کیا وہ بے چین ہو گئی ، بھرائی آواز سے بولی " میرا کون ہے ، ماں باپ نے اندھے ہو کر بھاڑ میں جھونک دیا ، جیسے پتلے سے بندھی ، سنے آج دو برس میں دو مرتبہ بھی اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھ کہتے ہوئے لاج آتی ہے ، میں نے تو یہ بھی نہیں جانا کہ پت کسے کہتے ہیں ، رہی دکھ کی بات اب تک جیسے بنا بھگتا ، اور اب جو کچھ کرم میں ہے بھگتوں گی ، شاید پرماتما کی یہی مرضی ہے کہ میں ابھاگنی کال دیو کی بھینٹ چڑھنے تک دکھ بھوگتی رہوں ،،

کامنی کا دل بھر آیا ، وہ زار زار رونے لگی ، چالاک عورت اُسے تسلی دے رہی تھی ، تھوڑی دیر کے بعد دونوں کوٹھے سے اُتر کر نیچے چلی آئیں ، سندر سنگھ کھانا کھا کر باہر جا چکا تھا ، کامنی کی ساس کھانے کے لیے کامنی کا انتظار کر رہی تھی ، رما اسے بلانے ہی کے لیے بھیجی گئی تھی ، باتوں میں کچھ دیر ہو گئی ، ساس نے بہو کے آتے ہی ایک فقرہ کسا " بہو ! کیا ہوا کہاں رہی تھیں کامنی خاموش ہو گئی مگر رما نے اُسکے جواب میں کہا " ستھانی جی ! کیوں بیچاری پر غصہ کر رہی ہو وہ آپ ہی بیٹھی رو رہی تھیں ،،

ستھانی جی آگ بگولا ہو گئیں ، بات کی بات کہاں تلووں سے لگی تو سر میں جا کر بجھی ، جھک کر

جواب ملا۔ "ایسی کونسی آفت آگئی تھی جو ڈالی بھی رو رہی تھیں، مین تو یہ سمجھ رہی تھی کہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا مین سیر کر رہی ہونگی"

کامنی کا زخم بات کا تیر کھا کر ہرا ہو گیا، لیکن آج یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ حسب معمول آنکھین ڈبڈبا گئین، اور آنسوؤن کی تری سے پلکین نم ہو گئین، دل سے ایک آہ اٹھی اور لبون پر خفیف جنبش پیدا کر کے مٹ گئی، رمتا بھی خاموش ہو گئی اور کامنی کے سوا سب نے سمجھ لیا: بات آئی گئی ہو گئی۔ کھانا لایا گیا، کامنی نے جسطرح بنا اگل نگل کر دو چار لقمے کھائے، اور اٹھ کھڑی ہوئی سچ مچ تو کیا، کوئی جھوٹون بھی یہ پوچھنے والا نہ تھا کہ "ہو کیا بات ہے آج کھانا اچھی طرح نہین کھایا"،

(۷)

رسوئی سے اٹھکر کامنی اپنے کمرہ مین جا کر پڑ رہی، آج وہ بہت بے چین نظر آتی تھی مشہور ہے کہ بیمار کی رات مشکل سے کٹتی ہے، کامنی بیمار سے بدتر تھی، ہر سانس اوسکی روح کو مضمحل بنانے مین سرگرم تھی، کامنی اگرچہ بانسری کی دلنواز تان کو بھول چکی تھی، مگر اسکا پرسوز اثر ابھی روح مین باقی تھا، وہ منوہر کی التجی نگاہونکو فراموش کر چکی تھی مگر اوسکا دل ایک نامعلوم خلش محسوس کر رہا تھا وہ اپنے خیال مین کچھ ایسی مستغرق تھی کہ اوسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کب اوسکی خادمہ آئی اور مسہری کے پاس بچھی ہوئی شطرنجی پر سو گئی، رات کے گیارہ بج چکے تھے، یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا کامنی کا سلسلہ خیالات ٹوٹ گیا، چند سکنڈ کے لیے اوسکے دماغ کی تمام قوتین بیکار ہو گئین سنبھلنے کے بعد وہ متحیر تھی کہ آج خلاف معمول اتنی رات گئے دروازہ کون کھٹکھٹاتا ہے۔

اے امید کی دیوی! تیری طاقت کے کرشمے بے مثال ہین، تنکے کے مقابل دریا کو حقیر بنا دینا سمندر کے سامنے ایک قطرہ کو ممتاز کر دینا، تیرے صرف ایک اشارہ پر منحصر ہے، مایوسیون کی زمین جب حملہ کر رہی ہون، اسوقت محض تیری یاد فتح کی ضامن ہو سکتی ہے۔

کامنی کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا، گلاب تازہ ہو گیا، اوسکے رخسارون سے سرخی پھوٹ نکلی، بجلی کی سرعت کی طرح ایک خیال دماغ مین پیدا ہوا۔ لبون کو خفیف جنبش پیدا ہوئی، خیال نے امید اور امید نے اضطراب کی صورت اختیار کی اور دفعتاً شوہر کی صورت آنکھون مین پھر گئی، وہ اٹھی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کانپتے ہوئے ہاتھون سے دروازہ کھولدیا،

سندر سنگھ اندر آیا۔ اسکے پیروں میں لرزش تھی، خادمہ جو دروازہ کھٹکنے پر جاگ اٹھی تھی، سندر سنگھ کو دیکھتے ہی متحیر ہو گئی مگر اسے کیا حق تھا کہ وہ خاموش چلے جانے کے سوا کسی دوسری حرکت کا اظہار کرتی،

جسطرح برسات کی پہلی بارش سے خشک گھاس ہری ہو جاتی ہے، اسی طرح سندر سنگھ کو دیکھکر غمزدہ کامنی کی مردہ آرزؤں میں جان پڑ گئی، اُسنے بڑے احترام و شوق سے شوہر کے چرن چھوئے اور گردن نیچے جھکا کر مہین شیریں آواز میں کہا:۔ "پران ناتھ بڑی کرپا کی"

سندر سنگھ اُسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھکر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "اچھا اب ہٹو بھی، مجھے ایک ضروری چیز لیکر ابھی واپس جانا ہے"

جسطرح بجلی پانی برسنے کی حالت میں بھی گرکر کسی ہرے بھرے درخت کو خاکستر کر دیتی ہے اسیطرح ظالم سندر سنگھ کے ان الفاظ نے غریب کامنی کی تمناؤں کو فنا کر دیا، مگر انسان کا دل سمندر ہے، جسمیں ہر لمحہ لہریں اٹھتی اور گرتی رہتی ہیں، اگر اسمیں سمندر کی لہروں کیطرح آرزوئیں اٹھتی اور ابھرتی نہ رہیں تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے، کامنی پیچھے ہٹ گئی اور جلد سندر سنگھ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی "رات زیادہ گئی ہے اب کہاں جاؤ گے"

سندر سنگھ نے جواب دیا "میرا جانا ضروری ہے، رات کچھ زیادہ نہیں گذری"

کامنی:۔ "بارہ تو بج چکے ہونگے"

سندر سنگھ "بہرحال میں یہاں رہنے کے لیے نہیں آیا ہوں"

کامنی نے سوچا، آج مدت کے بعد موقعہ ملا ہے، شرم کب تک کیجائیگی، آخر گھٹ گھٹ کر کب تک جان دونگی، اسلیئے ہاتھ جوڑکر بولی۔ ......

(باقی آیندہ)

عابد قصوری

رموز توحید

ہر پھول کے رنگ و بو مین تو ہے — کونپل مین نمو نمو مین تو ہے
یہ رنگ بہار کہہ رہا ہے — تو ہے میرے نمو مین تو ہے
جلوہ ترا چار سو عیان ہے — چھایا ہوا چار سو مین تو ہے
سر کیون نہ جھکے برہمن کا — بہتے ہوئے آبجو مین تو ہے
جھگڑا کسکا، کلیم کیسا — اس پیار کی گفتگو مین تو ہے
کیسا گوتم، کہان کا جنگل — خود اپنی ہی جستجو مین تو ہے
دل مین میرے آرزو ہے تیری — تو ہے مری آرزو مین تو ہے

جب شرق مین صبح مسکرائی — تو نے اپنی جھلک دکھائی
ذرے ذرے پہ ہے یہ تحریر — زیبا ہے تجھے تری خدائی
پھولون کو کیا ہے تو نے خوش رنگ — دلھن بنکر بہار آئی
ظاہر ہے ہزار رنگ سے خود — دنیا اسواسطے بنائی
ہر چیز مین تو ہے جلوہ فرما — اللہ رے تیری خودنمائی

سب ہو گئے محو سننے والے
افسر نے جو تیری حمد گائی

حامد اللہ افسر (میرٹھ)

حسن گریاں

اشک ہیں کیوں بھرے ہوئے چشم فسوں طراز میں
غم کی جھلک ہے کیوں بسی تیری جبین ناز میں

بیٹھی ہوئی ہے آہ کیوں اشکوں کو تو پیے ہوئے
ہاتھ پہ سر دھرے ہوئے نیچی نظر کیے ہوئے

جنبشِ قلب سے تری حشر ہے اک جہان میں
کانپ رہی ہے کائنات لرزہ ہے آسمان میں

تیرا سکوت اضطراب شرح خموش درد ہے
چہرہ کا رنگ زرد ہے جسم تمام سرد ہے

کانپ رہے ہیں ہونٹ ادھر کوششِ ضبطِ آہ سے
تھمتی نہیں پلک ادھر گریۂ بے پناہ سے

طرزِ لباس سے ہی خود راز عیاں کھلا ہوا
بال الگ ہیں منتشر رخ ہے جدا اکھلا ہوا

زلف سیہ میں ہے تری تیرگیٔ فضائے غم
سانس جو کوئی تو نے لی چلنے لگی ہوائے غم

ہونٹوں پہ کھیلتی تھی جو اب وہ ہنسی نہیں کہیں
حسن فسردگی تو ہے رنگ شگفتگی نہیں

کس کو بھلا یقین ہو تیرے اس اضطراب کا
حسن بھرا ہو اس پہ ایسا حسن اور یہ دن شباب کا

حسن و شباب کو بھلا رنج و الم سے کیا غرض
درد سے کوئی واسطہ، کاہشِ غم سے کیا غرض

کاش کہ میری آنکھ کا یہ بھی کوئی قصور ہو
کاش تجھے بجائے غم، خوشی و سرور ہو

رنج تو ہے مرے لیے تجھکو نہ ہو خدا کرے
لا مجھے دے، جو ہو تجھے رنج تری بلا کرے

حسن کی شان ہے نشاط عشق کا کام رنج ہے
حسن کا نام انبساط، عشق کا نام رنج ہے

غم کے نشان جب ترے پیکر دلستان میں ہیں
کون یہ کہہ سکیگا پھر عیش و خوشی جہان میں ہیں

میرے لیے تو مٹ گئیں دہر کی سب مسرتیں
غم نے ترے نکال دیں عیش و طرب کی حسرتیں

مجھکو خوشی سے کیا غرض، غم ہے ازل سے حبیب
میری خوشی تو ہے یہی تجھکو خوشی رہے نصیب

کاش کہ ہو یہ دسترس کاش بدل سکوں ابھی
تیرے ہر ایک رنج سے اپنا ہر ایک خرمی

لمحۂ حزن پر ترے صدقہ حیاتِ انبساط
کس کا تجھے یہ رنج ہے کیوں نہیں رغبتِ نشاط

عشق کا یہ تو کام تھا حسن نے کیوں لیا الم
کاش کہ مجھکو دے خدا رنج سے بڑھکے کوئی غم

گو یہ سمجھ رہا ہوں میں غمزدہ حزیں ہے تو
اپنی نظر کو کیا کروں پھر بھی بہت حسین ہے تو

[illegible]

کلام ناشاد

(نتیجۂ فکر جناب بابو رام پرشاد صاحب کوسلا ایم اے (آکسن))

زمانے مین کسی کو ناز ہے شیرین زبانی کا
ہماری خامشی مین ہے اثر جادو بیانی کا

ملی ہے بیخودی جس کو مئے وحدت کے ساغر سے
وہ دلدادہ نہین لطف شراب ارغوانی کا

خدا جانے تپش ہے کس بلا کی آتش دل مین
پتہ ملتا ہے کچھ کچھ آہ سے سوز نہانی کا

پرون کو نوچکر ڈالا قفس کی قید مین تونے
ٹھکانا بھی ہے کچھ صیاد تیری بدگمانی کا

مناسب ہے اسے دشت فنا کی راہ پیمائی
جو ہے جویا زمانے مین متاع زندگانی کا

جلاتی ہے جو پروانے کو خود بھی شمع جلتی ہے
ثمر ہے باغ دنیا مین یہی کچھ دلستانی کا

جہان والون کی ہستی اک خیال چند روزہ ہے
جو رہتا ہے تو کوئی دم جہان مین نقش پانی کا

نہ بیم موج ہے اسکو نہ ہے گرداب کا خطرہ
جو متلاشی ہے بحر عشق مین در معانی کا

ہوا جو غوطہ زن اسمین قضا کے ہاتھ سے چھوٹا
اجل ہے ایک قطرہ بحر عمر جاودانی کا

لگائے تم تو رہتے ہو لبون پہ مہر خاموشی
کہو کچھ تو سبب ناشاد اپنی سرگرانی کا

کلام اثر

قطرے عرق کے رخ پہ نہیں ہیں نقاب مین
تارے چھٹک رہے ہین شب ماہتاب مین

رکھتی ہے لطف برق کی چشمک سحاب مین
ہان ہان یونہین چھپائے رہو منہ نقاب مین

قطرہ ہون وہ جو بند ہے چشم حباب مین
دریا ہون وہ جو موج کشا ہے سراب مین

تڑپائے جا مجھے یونہین کچھ دیر ابھی کہ ہے
اک شائبہ سکون کا مرے اضطراب مین

بے ربط ہو گئی تھی عبارت کہین کہین
کافر نے نقل کی وہی خط کے جواب مین

اے مطرب خیال سنا دے پھر ایک بار
نغمہ شکست دل کا شکست حباب مین

اُف شرم و ہیبت کہ زبان لڑکھڑا گئی
مین! اور عرض حال! پھر ایسی جناب مین

آنکھون سے وہ نہان ہے مگر جلوہ آشکار
حیران ہون فرق کیا ہے شہود و حجاب مین

یہ کون سوئے گور غریبان گذر گیا
پھر ہچکیان اُلٹ گئین ارباب خواب مین

اس بیقرار دل کو مقابل مین برق کے
طغرائے امتیاز ملا پیچ و تاب مین

پژمردہ ہو کے پھول گرا شاخ سے تو کیا
وہ موت ہے حسین جو آئے شباب مین

تیرے ایاغ حسن سے جو بچ رہی شراب
تلچھٹ اُسی کی ہے قدح آفتاب مین

ہنگامہ فراق مین تھی دل کی کیا بساط
اک آبلہ تھا پھوٹ گیا اضطراب مین

دل خون کیا ہوا کہ زمانہ بدل گیا
سو انقلاب ہو گئے ایک انقلاب مین

شیرازۂ حیات بکھر جائیگا اثر
پیمان گسل مجھے تو یاد نہ کر اضطراب مین

مرزا جعفر علیخان صاحب اثر لکھنوی

سہرا

تبقریب شادی مسمی نراین نگم خلف منشی دیانراین نگم

از حضرت نازش بدایونی

نظام فطرت کی زیب سہرہ بہار فطرت کی آب سہرا
چمن میں ہے انتخاب سہرہ گلوں میں ہے لاجواب سہرا

چنے ہوئے باغ کے یہ گل ہیں تو کیوں نہ ہو شانِ دلفریبی
ہری ہری شاخ کی ہیں کلیاں تو کیوں نہ ہو لاجواب سہرا

بہارِ گلشن کی ہیں پڑی ہے ترانۂ دلکشا ہیں نغمے
ورق ورق گل کی پنکھڑی ہے فسانۂ لاجواب سہرا

تجلیاں ہیں کہ نورِ افشاں بنی ہیں گیتی ضرور لڑیاں
جھلک میں ہے ماہتاب سہرا چمک میں ہے آفتاب سہرا

مراد کی بو ہے عطر آگیں رخ سعادت ہے نقش رنگیں
مشام جان ہو جو زندگی میں دکھا رہا ہے وہ خواب سہرا

نسیم آئی ہے بن کے مالن کئے ہیں کچھ پھول زیب دامن
یہ آرزو ہے کہ بزم نوشہ میں ہو ابھی کامیاب سہرا

سپہر پائے وہ بے بہا شئے جسے کیا گم شعاع خور نے
بنے جو شیشہ کے آئینہ میں نمود گوہر کی تاب سہرا

صفائے رخ میں یہ کچھ لطافت محل ہے آئینۂ سکندر
تُنک تری میں یہ کچھ نزاکت بنا ہے رشکِ گلاب سہرا

چمن کو رنگینیاں مبارک صبا کو گلچینیاں مبارک
نشاط انگیز ہے دکھا کر ادائے حسن شباب سہرا

دیا نزاین نگم مبارک تمہیں ہو لخت جگر کی شادی
دعا کے آغوش میں اثر ہو اثر سے ہو کامیاب سہرا

دماغ تازہ ہے بوئے خوش سے چمن شگفتہ ہر ایک خوشی سے
اُبل رہی ہے شراب رنگین گھٹا سے ہے آب آب سہرا

نوا میں انداز نو دکھائے یہیں سے نازش کو وجد آئے
جو محفل عیش میں سنائے وہ شاہد بے حجاب سہرا

نازش بدایونی

فریبِ نظر

میں دیکھتا ہوں باغ میں چھوٹا گلاب جو لال | پھرتا ہے میرے دیدۂ دل میں ترا خیال
ہر گل میں حسن تیرا ضیا تیری خو تری | انداز تیرا رنگ ترا اور بو تری
نگہت تری جمال ترا دلبری تری | صورت تری ادا تری جلوہ گری تری

سب کچھ ہے آہ پھر بھی یہ دل مانتا نہیں
ان میں ترا سخن نہیں تیری صدا نہیں

جب دیکھتا ہوں سرو لب جوئبار کو | لگتی ہے ایک ٹھیس دل بیقرار کو
ہو جاتا ہے گمان ترے قد بلند کا | بڑھ جاتا ہے ملال دل دردمند کا

کہتا ہوں پھر یہ دل سے کہ اندوہگیں ہے کیوں
غافل وہی ہے گر تو خراماں نہیں ہے کیوں

اصغر حسین خاں نظیر

بزم سخن

(انتخاب گلدستۂ معیار سخن بابتہ جولائی ۱۹۲۴ء)

جناب کیفی کاکوری

قتل کا ارمان کیا کمبخت میرے دل میں تھا ‏ ‏ جب نشے میں پیدا ہوا تھا کوچۂ قاتل میں تھا
جلوۂ حسن صنم اللہ رے تیرا فسروغ ‏ ‏ شمع کا شعلہ بھی پروانہ تری محفل میں تھا
جان کر انجان بنجاؤ تو اس کا کیا جواب ‏ ‏ ورنہ صورت سے عیاں تھا جو دلِ سائل میں تھا

جناب اختر از المنیر

غضب تھا طور پہ برقِ جمالِ یار کا گرنا ‏ ‏ نکلتے ہیں شرارے نور کے وادیٔ ایمن سے

جناب جلیس نذر آبادی

نہ وہ انداز پہلے سے نہ پہلی سی نظر اُن کی ‏ ‏ الٰہی خیر ہو وہ اب نظر آتے ہیں بدظن سے

جناب منیر ناگپاڈہ

کہاں بالغیر وہ روشن کہاں بالذات نور اسمیں ‏ ‏ قمر کو کیسے نسبت دون تمہارے روئے روشن سے

جناب نوح ناروی

جنون میں کس طرح لیجاؤن چن کر پھول گلشن سے ‏ ‏ گریبان کے بھی ٹکڑے اب گرے پڑتے ہیں دامن سے
بہارِ جلوۂ گل دیکھنے کو ہم ترستے ہیں ‏ ‏ وہ کیسا وقت تھا نکلے تھے جب اپنے نشیمن سے
وہ آکر دیکھ لیں جن کو نہیں غم اپنے مرنے کا ‏ ‏ مری بربادیاں ہوتی ہیں ظاہر میرے مدفن سے
بہارِ باغِ اُلفت کا مزا اک ایک نے لوٹا ‏ ‏ مگر میں لے چلا پھولوں کے بدلے داغ گلشن سے

گرفتارِ قفس کو لے صبا بھولے نہیں اب تک — سلام شوق کہدینا مرے یارانِ گلشن سے

جناب مولانا حسرت موہانی

جس فتنۂ دوراں کو ابھی آتے تھے کل دیکھ — چلتے ہیں یہیں پھر تجھے اے دل وہیں چل دیکھ
یہ بھی ہے کوئی بات کہ وعدے ہی کئے جا — اور حال مرا آنکے دیکھو آج نہ کل دیکھ
دل کو مرے قابو میں بناکر وہ بصد ناز — بولے کہ نہ دیوانہ بن اتنا بھی سنبھل دیکھ
اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسینِ سخن کا — میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

جناب حفیظ جونپوری مرحوم

عقل حیران ہے جنونِ فتنہ سامان دیکھ کر — ناخدا کے ہوش اُڑے ہیں جوشِ طوفان دیکھکر
بے نیازی کیجئے بے التفاتی کیجیے — میری حالت میری حسرت میرے ارمان دیکھکر
کثرتِ داغِ جگر سے دل ہوا ہے باغ باغ — آپ سے باہر ہوا خرمن کو دہقان دیکھکر
غور سے دیکھو تو اک تاریخ ہے ہر آدمی — کیوں سبق لیتا نہیں انساں کو انسان دیکھکر

جناب دبیر

سرمگین چشم سے آئینہ نہ دیکھو۔ دیکھو — یہ فسون وہ ہے فسونگر پہ بھی چل جاتا ہے
ابھی آغازِ محبت ہے نہ گھبرا ناصح — آدمی آپ ہی گر پڑکے سنبھل جاتا ہے
رازِ الفت جو چھپاؤں تو چھپاؤں کیونکر — نالہ رکتا ہی نہیں مُنہ سے نکل جاتا ہے

جناب دل شاہجہانپوری

وعدۂ دیدارِ محشر کی خوشی کیا خاک ہو — یاس کہتی ہے کہ اس کو اک زمانہ چاہیئے
حُسن سرگرم تماشہ خود ہوا روزِ الست — ناصحِ ناداں کو وہ قصہ سنانا چاہیئے
دیر سے پھر کر حرم میں بھی رہے محرومِ دید — اب کہاں اے جستجوئے یار جانا چاہیئے
خاک ہو کر کوئے جاناں میں مثالِ گردباد — اے دلِ مضطر ہوا پر گھر بنانا چاہیئے
اے دلِ مجبور دفعِ غم کی صورت ہے یہی — واقعاتِ زندگی کو بھول جانا چاہیئے

علمی خبریں اور نوٹ

نہایت خوشی کی بات ہو کہ سر محمد اقبال صاحب کے اردو نظموں کا مجموعہ "بانگ درا" کے نام سے شایع ہو گیا ہے۔

حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب چوتھی صدی کے مشہور اسلامی سیاح حکیم ناصر خسرو کے فارسی سفرنامے کو ایڈیٹ کرکے چھاپ رہے ہیں اسکے ابتدا میں ایک عالمانہ دیباچہ لکھا ہے اور توضیح مطالب کے لیے تاریخی، جغرافیائی علمی حواشی بھی اضافہ کئے ہیں۔

منشی اقبال ورما صاحب سحر ہتگامی نے شیخ سعدیؒ کی کریما کا ہندی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ جو زیر طبع ہے۔

مسٹر حامد اللہ صاحب افسر کی نظموں کا مجموعہ "پیام روح" کے نام سے جلد شائع ہونیوالا ہے، اسمیں جا بجا تصویریں بھی دی گئی ہیں

افسوس کہ ۱۹ اگست ۱۹۲۴ء کو اردو کے ایک مشہور ادیب سید افتخار عالم صاحب مارہروی، نے اس دار فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کیطرف رحلت فرمائی، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری آپ کی مبسوط تصنیف ہے مرحوم امیر خسرو کی سوانح عمری (تاج خسروی) کی تالیف میں معروف تھے، مگر اسکی تکمیل نہ ہو سکی، اور پیام اجل آپہونچا۔

ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹیگور حال ہی میں چین کے سفر سے واپس آئے ہیں۔ چینیوں نے آپ کو چو چن ٹام کا لقب دیا ہے جسکا مفہوم چینی زبان میں "ہندوستان کا گرجنے والا طلوع ہے"۔ یہ چینی زبان میں لفظ جو کے معنی ہندوستان کے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانی فوج کے لیے اردو کو ایک "مشترکہ زبان" قرار دیا ہے ہر ایک سپاہی کے لیے اسکی تعلیم لازمی ہو گئی ہے اب خواہ کوئی سپاہی بالکل ان پڑھ ہو یا اپنے صوبہ کی زبان میں نوشت خواند کی مہارت رکھتا ہو۔ مگر فوج میں داخل ہونے پر اول ہی روز سے اسکو اردو کی باقاعدہ تعلیم دیجائیگی اور اسکا سلسلہ اول درجہ میں اسکی تعلیم مکمل ہونے تک جاری رکھا جائیگا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف رجمنٹوں کے سپاہی اپنی فوجی ضرورتوں کے وقت ایک بیڑہ یا دستہ میں ملکر کام کر سکینگے دیگر صوبوں کی دیسی زبانوں کی تعلیم انکو صرف اسقدر دیجائیگی کہ وہ سادہ عبارت میں اپنے مکان کو خط لکھ سکیں اور وہ دینی مذہبی کتابیں پڑھ سکیں۔ مگر فوجی ضروریات کے لیے تحریر کیواسطے رومن رسم الخط تجویز کی گئی ہے۔

امریکہ کا ایک دولتمند ڈاکٹر جس کا نام لز دون پنچ ہے اسوقت انگلستان میں نادر کتابیں جمع کر رہا ہے وہ کتابوں پر نہایت بے تکلفی کیساتھ روپیہ خرچ کرتا ہے حتی کہ اگر کسی دن اوسکے ۱۰ ہزار پونڈ بھی صرف ہوجادیں تو مطلق کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ خیال ہے کہ امسال یورپ کے سفر میں کتابیں خریدنے پر اوسکے تین یا چار لاکھ پونڈ صرف ہو جائینگے۔

ایک چھوٹے سے انگریزی کتب خانہ میں ڈاکٹر لزدون پنچ کو دس صفحہ کا ایک رسالہ جو سنہ ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا تھا جسکا نسخہ ۴۲ پونڈ دیکر خرید لیا۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں اسکے صرف ۲ نسخے ہیں ایک بوڈلین لائبریری میں اور دوسرا برٹش میوزیم میں۔

دیگر ممالک کی اولوالعزمی کا اندازہ اہل ہند کو مشکل سے ہوتا ہے۔ انجمن اشاعت توریت نے انیس زبانوں میں ۲۱۰ کروڑ نسخے طبع کرائے ہیں۔



اس نمبر میں ایک کارٹون . . . .
سوراج پارٹی کے متعلق ہمعصر بھالا کانپور سے
ماخوذ ہے۔ اور باقی تین کارٹون یورپین سیاسیات
کے متعلق ہیں۔ دو کارٹون روس کے متعلق ہیں
انگلستان کے اہل دول ابھی تک روس کو ہوّا
سمجھے ہوئے ہیں۔ اور اسکے نام سے بھاگتے ہیں۔
تیسرے کارٹون میں وزیر اعظم میکڈانلڈ روسی
وفد کے ساتھ معاہدہ روس و انگلستان کے متعلق
باتیں کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ معاہدہ
پر اب جانبین کے دستخط ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی
تک دلون کی صفائی پورے طور پر نہیں ہوئی ہے
اور انگریزی اخبارات میں روزمرہ روس کی ہجو
چھپتی رہتی ہے۔ اور روس کے مدبر اب بھی اپنے
ملک میں انگلستان کے خلاف زہر اُگلا کرتے ہیں
دیکھئے یہ افراط و تفریط کب تک رہتی ہے۔ یہ کارٹون
انگریزی صحائف سے ماخوذ ہیں۔




انگلستان اور روس کی کانفرنس


روس اور انگریز ساہوکار
روس





بخار کی گولیاں

کونین کی گولیاں

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ ۔ کلکتہ

[illegible]

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] भक्त [illegible] है [illegible] १॥)

[illegible] भक्ति जिसके लिये [illegible] १॥)

[illegible] - [illegible] ॥)

[illegible] चित्र - भारत [illegible] ३)

पृथ्वीराज चौहान १० बार मोह[illegible] भारत पर आक्रमण [illegible] ३)

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible]

मैस्मेरिज्म [illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

जादू विद्या - [illegible] है ।)

प्रणाम रहस्य तंत्र - महामाया [illegible] ॥)

भैरवी चक्र सर्व सिद्धि के देनेवाला शास्त्रों का परम गोप्य [illegible] टीका सहित है ॥)

यक्षिणी साधन - [illegible] १)

उल्लू कल्प भूमिगत धन देखना [illegible] है ॥)

बालचिकित्सा - बालकों के होनेवाले रोगों की चिकित्सा तथा उनके बचने का ।)

गुटका संग्रह [illegible] ॥)

भजन संग्रह - [illegible] ॥)

गौरक्षा - [illegible] ॥)

विचारु कुमारी - [illegible] ३)

زمانہ

[illegible]

نمبر ۴	اکتوبر ۱۹۲۴ء	جلد ۴۳

فہرست مضامین

قصاویر [illegible] ۱۲۱ [illegible] ۱۳۲ کارٹون

[illegible] زمانہ [illegible] پریس کانپور سے شائع ہوا

[illegible]

[illegible] ہندوستان کے [illegible]

اگر یونہی مسلمان تباہ ہوتے گئے

[illegible]
[illegible] قرضے [illegible] گرفتار ہیں [illegible]
[illegible] وجاہت اور عزت ایک بیرحم مہاجن کے [illegible] آج ہی دم توڑ رہی
ہے۔ جبکہ مسلمان تقریباً سات کروڑ اور انکا کوئی اسلامی بنک نہیں خاص کر
مسلمانوں کی اس زندگی پر جو آج مہاجن کے قرضہ پر ختم ہو رہی ہے۔ خود انکی تاریخ و قومی حیثیت
متبسم ہے وائے برحال مسلمانان کہ باوجود عالی دماغ و اہل ہنر ہونے کے اس
ترقی کے زمانہ میں بھی بے زری انکی ترقی کی ناکہ بندی کرکے انکی ہستی و عزت
پر حملہ کر رہی ہے اور یہ اب بھی پدرم سلطان بود کا بے مزہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ عزت
سے زندگی بسر کرنے کی واحد صورت پر عمل کرنے کے لئے **حریت اسلام** بلا قیمت
دو پیسہ کا ٹکٹ بھیجکر ذیل کے پتہ سے منگائیے اور پڑھیے۔ اپنی حالت پر روئیے اور
جب ہوش آئے تو اٹھیے اور حسب صراحت پراسپکٹس

ہندوستان انڈسٹریل بنک لمیٹڈ لکھنؤ کے حصے خریدیئے

اس اشتہار کو خود پڑھیئے اور احباب کو تقسیم کیجیے۔ خود سنبھلیئے اور قوم کو سنبھالیئے
اگر اب بھی آپ نہ چونکے تو خدا حافظ۔ والسلام

المشتہر منیجنگ ایجنٹ ہندوستان انڈسٹریل بنک لمیٹڈ امین آباد پارک لکھنؤ

نوٹ

ہر شہر و ہر قصبہ کے لئے ایجنٹوں کی ضرورت ہے معاوضہ معقول

زمانہ

جلد ۴۲ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء نمبر ۴

نارائن وامن تلک

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است (حافظ)

آج ہم اپنے ناظرین کرام کی خدمت میں ایک ایسے بزرگ کے حالات پیش کر رہے ہیں جو ہندوستان میں عیسائی مذہب کے اُفق پر روشن ستارہ بنکر چمکا، اور جو اپنی عملی زندگی سے اہل ہند کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی، یہ بیش بہا سبق دے رہا ہے کہ کس طرح دلدادگان مذہب اپنے اصول و روایات پر سختی سے عمل کرتے ہوئے بھی سچے دل سے قولاً و فعلاً ہند و اہل ہند کی حقیقی بہبودی کیلئے جانفروشی کر سکتے ہیں۔

مسٹر نارائن وامن تلک مہاراشٹر کے چت پاون برہمنوں میں سے ہیں۔ یہ فرقہ ہندوستان کے بہت سے سپوتوں کا جنم داتا ہے جسٹس مہادیو گوبند رانا ڈے۔ پنڈتا راما بائی۔ نہی میاگور[1] آنریبل گوپال کرشن گوکھلے بزرگ قوم پنڈت بال گنگادھر تلک موجودہ مشہور مہاتما مسٹر

[1] NEHEMIA GOREH

جی۔ کے۔ دیو دھر موجودہ مشہور قوم پرست مسٹر ایچ۔ سی۔ کیلکار اسی آسمان چت پاون برہمنان کے روشن ستارے ہین۔

مسٹر نارائن کا جنم موضع کرزگانون تعلقہ (پرگنہ) داپولی ضلع رتناگری صوبہ بمبئی مین تقریبا ۱۸۲۱ عیسوی مین ہوا۔ موضع مذکور بمبئی کے جنوب و مشرق مین سو میل کے فاصلہ پر مغربی گھاٹ کے سلسلہ کوہستانی مین واقع ہے۔ یہ مقام دلکش نیچرل سینریون اور جانفزا سبزہ زارون کیلئے مشہور ہے۔ ان کے بچپن کا زمانہ اپنے نانا کے مکان پر جو اک درویش صفت بزرگ تھے گذرا جب یہ چھوٹے سے تھے تو انکے نانا انکو اپنے ہمراہ جنگل کو لیجاتے جہان وہ اپنا وقت عبادت الٰہی اور بھجن گانے مین صرف کرتے۔ انکی والدہ ماجدہ کا نام جانکی بائی تھا۔ یہ بھی مذہب کی دلدادہ روشن خیال اور شاعرہ تھین۔ انکے والد بزرگوار وامن راؤ نہایت سخت مزاج اور تنہائی پسند تھے۔ یہ سرکاری ملازم تھے اور انکے حلقہ مین متعدد دیہات تھے جنمین انکو باقاعدہ متواتر دورہ کرنا پڑتا تھا۔ ان وجوہات سے انھون نے اپنی بیوی جانکی بائی اور اپنے بچے نارائن کو اپنے سسرال مین چھوڑ رکھا تھا۔ انکے دو بھائی سکھا رام اور مہادیو تھے اور دو بہنین تھین۔

دنیا کے اکثر بڑے آدمی دنیوی مصائب کا شکار رہے ہین۔ مسٹر نارائن بھی اس عام اصول سے مستثنٰے نہ رہے۔ ابھی اُنکی عمر گیارہ سال کی تھی کہ انکی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ وامن راؤ چونکہ اعلٰی پایہ کے جوتسی تھے اُنہون نے انکے زائچہ سے معلوم کرلیا تھا کہ یہ بچہ ترک مذہب اختیار کریگا اسلیے وہ نرائن سے محبت نکرتے تھے۔ ادھر سے بھی نفی کا جواب نفی مین تھا۔ جانکی بائی کی وفات کے بعد نارائن کو مکان سے وابستہ رکھنے کا کوئی ذریعہ نرہا اس اثنا مین نارائن کو مرہٹی زبان پر عبور حاصل ہوگیا تھا۔ وہ پڑھنے کے اسقدر شوقین تھے کہ انکو کتابون کا کیڑا کہنا بیجا نہوگا۔ مرہٹی زبان مین شعر کہنا شروع کردیا۔ ان کی ابتدائی نظمین اسی زمانہ کی ہین۔ جانکی بائی کی کریاکرم سے فارغ ہونیکے بعد یہ چپ چاپ ناسک چلے آئے اور وہان دریائے گوداوری کے کنارے بے یار و مددگار غم سے نڈھال ہوکر جا بیٹھے۔ اب قدرت خدا کے کرشمے دیکھیئے۔ شخصے از غیب برون آید و کارے بکند کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہان دریا پر ماپلے سے ملاقات ہوئی جو نارائن کے ہم عمر تھا اور دریا پر نہانے آیا تھا۔ نارائن اور ماپلے کی گفتگو ہونے لگی اور یہ اس کو

لپنے مکان پر لگیا۔ ماپالے اپنی بیوہ والدہ جیسو بائی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جیسو بائی نہایت نیک مزاج غریب خاتون تھین۔ نارائن کے ساتھ وہ شفقت مادرانہ سے پیش آتین لیکن ان کا افلاس روپیہ پیسے سے مدد کرنے مین مانع تھا۔ اسلئے نارائن دن مین مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتا اور رات کو ایک مندر مین چراغ کی دھندلی روشنی مین تحصیل علم کرتا۔ یہان ویدون کے مشہور عالم گنیش شاستری لیلے سے ملاقات ہوئی جنہون نے نارائن کی ذہانت و ذکاوت سے متاثر ہوکر اسکو مفت سنسکرت پڑھانا شروع کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نارائن سنسکرت کے فن تقریر کے امتحان مقابلہ مین جسکو مرحوم جسٹس راناڈے نے قائم کیا تھا اول نمبر رہا۔ نارائن کا بار بار یہ کہنا کہ صرف اسکی والدہ جانکی بائی اور شاستری لیلے اسکے دنیوی گرو ہین اور اسکی جملہ روحانی و دنیوی ترقی کا راز ان دونون کی تعلیم مین مضمر ہے نہایت درست ہے ہمارے وہ ہند و احباب جو اپنے ویدون اور شاستروں کی تعلیم کو بھولکر اس شعر

اگر نیک بودے سر انجام زن ‏ ‏ ‏ ‏ زنان را مزن نام بودے نہ زن

کی تعلیم کے معتقد ہوگئے ہین۔ ذرا صنف نازک کی تقدیس کو مسٹر نارائن کے مندرجہ بالا اقبال اور شت پتھ براہمن کے مقولہ "ماتر وان پتر وان اچاریہ وان پرشو وید" (یعنی صرف وہی شخص عالم باعمل ہوتے ہین جنکی اول مان دوم باپ اور سوم گرو عالم باعمل ہون) پر غور کرکے تسلیم کرین اور دیکھین کہ وہ کہان سے کہان پہونچگئے ہین۔ ہم عیسائی مشنری صاحبان کے مشکور ہین جنھون نے عورتون کے احترام کا سبق پڑھاکر ہمکو ہماری پرانی ویدک تعلیم یاد دلادی۔ جسمین تمام طاقتون کا مالک صنف نازک کو مانا ہے نہ کہ مردون کو، مثلاً دیکھئے سرستی علم کی لکشمی دولت کی شکتی جنگ کی دیوی ہین۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک دوست کی ترغیب سے جو انگلش ہائی اسکول ناسک مین تعلیم پاتا تھا نارائن کو انگریزی سیکھنے کا شوق ہوا۔ اور اُسکے ایما سے انگریزی زبان کی لغت حفظ کرنا شروع کردی۔ جب نصف کے قریب حرف ایم M تک نوک زبان کرلی تو نارائن ایک دن ہیڈ ماسٹر اسکول کے پاس گیا تاکہ آئندہ کیلئے تحصیل زبان کیواسطے ہدایات حاصل کرے۔ جب ہیڈ ماسٹر کو معلوم ہوا کہ نارائن نے ڈکشنری حفظ کرنا شروع کردیا ہے تو اس کی سادہ لوحی پر مسکرایا اور استقلال سے نہایت

متحیر اور خوش ہوا اور اسکو اسکول مین مفت تعلیم حاصل کرنیکے لیے داخل کرلیا۔ ابھی پانچوین درجہ کی تعلیم ختم ہونے پائی تھی کہ انکے والد وامن راؤ نے انکے بھائیون سکھارام اور بھادیو کو بھی بغرض تعلیم نارائین کے پاس بھیجدیا اور آٹھ روپیہ ماہوار دینے لگا۔ نارائن نے اپنے بھائیون کی تعلیم مین [illegible] دلچسپی سے کام لیا مگر مالی دقتون کی وجہ سے اسکو اپنی تعلیم چھوڑنی پڑی بھادیو نے میٹرکولیشن تک تعلیم پائی لیکن سولہ سترہ سال کی عمر مین اس عالم فانی سے سدھار گیا۔ سکھارام نے بی۔اے پاس کیا اور وکیل ہائی کورٹ بنگیا۔ تقریباً [illegible]ء مین نارائن کی شادی منوبائی کے ساتھ جو خاندان گوکھلے سے تھی ہوگئی۔ یہ نارائن کی خوش قسمتی تھی کہ اسکو بیوی بھی شاعرہ ملی۔ باوجود اس تمام مصروفیت کے نارائن نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ فن تقریر سے قدرتی شوق تھا اوس نے برک[1] پٹ[2] اور ڈیموستھینیز[3] کی تقاریر کے انگریزی تراجم حفظ کرلیے۔ سنسکرت، مرہٹی اور انگریزی کا شوق بدرجہ عشق تھا۔ سنسکرت زبان مین بھی کچھ نظمین کہین لیکن زیادہ شوق ہونیکی وجہ سے کچھ عرصہ بعد ترک کردیا۔ البتہ مرہٹی اور انگریزی زبانون مین مشق سخن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

[illegible]ء مین نارائن کا لڑکا دیادھر پیدا ہوا لیکن یہ ایک سال کی عمر مین مرگیا۔ اس موقعہ پر نارائن نے ایک نظم موسومہ "اشک پدری" لکھی۔ بعد مین ایک لڑکی پیدا ہوئی وہ بھی مرگئی ۱۸۹۵ء مین دوسرا لڑکا دتاتریہ نامی پیدا ہوا اور یہ زندہ رہا۔ اسی زمانہ مین اپا صاحب بوٹی نے جو ناگپور کے علم دوست رئیس تھے سنسکرت کی کتابون کا مرہٹی زبان مین ترجمہ کرنیکا اہتمام کیا اور اس کار عظیم مین نارائن سے طالب امداد ہوا۔ ترجمہ کا کام شروع ہوگیا۔ ایک رسالہ موسومہ رشی جاری کردیا گیا۔ ناگپور مین اسوقت مذہبی مباحثون کا بازار گرم تھا نارائن نے اسمین حصہ لیا اور خراج تحسین مین شاستری پنڈتون سے پنڈت کا خطاب حاصل کیا رسالہ رشی مین مذہبی اور فلسفیانہ مضامین پر مباحثے ہوتے تھے۔ نارائن کی آزادانہ روش بغیر رنگ لائے نہ رہی اور بہت سے مسائل مین وہ موجودہ برہمنون سے مختلف الرائے ہوگیا چندماہ کے اجرا کے بعد رسالہ رشی بند ہوگیا اور نارائن نے بھی جب نے ذات پات کی تفریق

۱ BURKE ۲ PITT ۳ DEMOSTHENESE

کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی ناگپور چھوڑ دیا۔ اور مثل سادھو کے جابجا اپنے خیالات
کی اشاعت کرتا پھرا۔ نارائن کا یہ خیال تھا کہ جبتک مراسم قبیحہ و بداعات ذمیمہ کا جنون سے
ہندو قوم کو بیدست و پا کرکے جان بلب کر رکھا ہے بالکل قلع و قمع نکر دیا جائیگا ہندو قوم اپنی
گذشتہ عظمت کو حاصل نہین کر سکتی۔ نارائن کی تمام تعلیم کا لب لباب یہ تھا

(۱) تمام دنیا کی خالق اک ہین شکتی ہے جسکے تمام انسان بچے ہین

(۲) تمام کتب مقدسہ وسماوی خواہ وہ کسی مذہب کی کیون نہو ان انسانی تصنیفات ہین
صحیفہ قدرت ہی محض وہ کتاب ہے جہان خدا اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔

(۳) تناسخ کوئی چیز نہین۔ انسان کی موجودہ حالت اسکی پیدائش گرد وپیش کے حالات
اور اسکی ذاتی کوششون کا نتیجہ ہین۔

(۴) خدا اور بنی نوع انسان سے محبت کرنا ہی جملہ مذاہب کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔

(۵) ہر سچے مذہب کا یہ فرض اولین ہے کہ بُت پرستی کا خاتمہ کردے مگر محبت سچائی
رحم وغیرہ صفات کی انسانی مورتیان قائم کیجا سکتی ہین اور انکی پرستش کیجا سکتی ہے۔

نارائن کا خیال تھا کہ کوئی مذہبی پرچارک اپنے خیالات کی اشاعت مین کامیاب
نہین ہو سکتا جبتک کہ وہ یوگ نہ کرے۔ اس خیال کو مد نظر رکھکر اس نے دو سال تک
سخت ریاضت کی۔ جب لوگون کو اس کا حال معلوم ہوا تو دنیوی اغراض کے اندھے جوق
درجوق اسکے پاس آنے لگے۔ اور اپنی حاجات برآری ہوتی دیکھ کر عقیدتمندانہ پرستش
کرنے لگے۔ لیکن اس سے نارائن کی طبیعت بیزار ہو گئی۔ اسکو تجربہ سے معلوم ہوا کہ دنیادار
اس کی نئی تعلیم کو قبول نہین کرتے محض اپنی دنیاوی اغراض کی تکمیل کے لیے اسکے پاس آتے
ہین۔

۱۸۹۲ء مین راجہ ریاست راج نندگانون کی طلبی پر جو ناگپور سے ایک سو ستر میل
کے فاصلہ پر ہے۔ نارائن وہان گئے۔ راستہ مین ایک یورپین عیسائی مشنری سے اُنکی ملاقات
ہو گئی۔ مذہب پر گفتگو ہونا قدرتی بات تھی۔ انکی آزاد خیالی کو دیکھ کر انہون نے مقدس انجیل
انکو پڑھنے کے لیے عطا کی۔ جسکو راج نندگانون پہونچکر نارائن نے غور سے پڑھنا شروع کردیا

جسکے متعلق نارائن نے لکھا ہے،

"میں نے حسب عادت یونہی سے کتاب (انجیل مقدس) پڑھنا شروع کر دی اور جا بجا پنسل سے نشانات بناتا چلا گیا۔ لیکن جب میں (پہاڑی کے وعظ) پر پہونچا تو میں اُس محبت مروت اور سچائی سے بھرے ہوئے کلام کو پڑھ کر اپنے آپ کو ضبط نکر سکا۔ ان تین بیانوں میں ہندو فلسفہ کے دقیق ترین مسائل کا حل تھا۔ مجھکو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کسقدر مکمل طور پر سخت ترین مسائل حل کر دیے گئے تھے۔ میں نے نہایت ذوق و شوق سے انجیل مقدس کو آخری صفحہ تک پڑھا"

اسکے بعد نارائن نے عیسائی مذہب کے متعلق دیگر کتب و رسائل دیکھے رفتہ رفتہ مذہب کی محبت اور اُسکی عزت اسکے لوح دل پر نقش ہوتی چلی گئی ۔ اور ۱۰ ار فروری ۱۸۹۵ء کو بمبئی جا کر وہ عیسائی ہوگئے۔ تبدیلئ مذہب کی بدولت ملازمت و احباب و رشتہ داروں سے تمام تعلقات منقطع ہوگئے۔ اب نارائن امریکن مرہٹی مشن میں اشاعت مذہب کا کام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک بعض متعصب اہل ہنود انکو ہر قسم کا نقصان پہونچانے کے درپے رہے، ایک مرتبہ کسی مہربان نے زہر آلودہ مٹھائی کا پارسل انکے پاس بھیجدیا لیکن کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے جسکی وجہ سے یہ اسکو اُس وقت نہ کھاسکے اور کہیں باہر چلے گئے واپسی پر دیکھا کہ ایک بلی جس نے وہ مٹھائی کھائی تھی مسموم ہوکر مرگئی ہے۔

لیکن تبدیلئ مذہب نے نارائن کو غیر ہندوستانی نہ بنایا۔ انکے دل میں سنسکرت و مرہٹی لٹریچر اور اہل ہنود کے مذہبی بزرگوں و فقرا کی وہی تعظیم و تکریم تھی جو عیسائی ہونیکے قبل تھی۔ بیوی مانو بائی (جنکا دوسرا نام لکشمی بائی بھی تھا) اور بچہ کی محبت نارائن کو بہت ستاتی تھی۔ جب ہندوؤں نے یہ دیکھا کہ مذہب کا تبادلہ محض خیالات کی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ اس سے ہندو مذہب سے دشمنی یا پرانے دوست و رشتہ داروں کی تحقیر مدنظر نہ تھی تو انہوں نے نارائن کو واپس لینے کی سرتوڑ کوشش کی۔ انجہانی بزرگ وطن پنڈت بال گنگادھر تلک نے بنارس اور مہاراشٹر کے پنڈتوں کی بیوستھا (مذہبی فتویٰ) نارائن کو شدھ کرکے ہندو مذہب میں واپس لینے کے لیے منگائی لیکن عیسائی مذہب کی عظمت اُنکے دل پر نقش ہوچکی تھی۔

نارائن سچے دل سے حضرت عیسیٰ کو اپنا گرو تسلیم کر چکے تھے اور مثل ایک سچے ہندو کے اپنے مذہبی اعتقاد کے لیے سب کچھ قربان کر چکے تھے وہ باوجود بیوی اور بچہ کی سخت محبت کے عیسائی مذہب کے ترک کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

جسقدر نارائن کو اپنی بیوی لکشمی بائی عرف ماتو بائی سے محبت تھی اُسی قدر وہ بھی اپنے خاوند کی دلدادہ تھی۔ عیسائی مشنریون نے بار ہا نارائن پر زور دیا کہ وہ اپنے بچے کو بیوی کے پاس سے لے آئے لیکن اس خدا ترس نیکدل شخص نے بیوی اور بچہ کی یاد مین خود تو مصیبتین اُٹھانا برداشت کیا لیکن بچہ کو وہان سے جدا نہ کیا۔ آخر جامع المتفرقین نے ان کی مشکلات کو آسان کیا اور ۱۹۰۰ء مین پانچ سال کے بعد جب لکشمی بائی نے اپنی مرضی سے عیسائی ہونا منظور کر لیا اور بچہ کا مذہب تبدیل کر دیا گیا اور یہ سب ایک جگہ عیش و اطمینان سے رہنے لگے۔

اکیس سال تک نارائن کا تعلق امریکن مرہٹی مشن سے رہا۔ یہ مشن ۱۸۱۳ء مین قایم ہوا اور اسکی شاخون کا جال تمام مہاراشٹر مین پھیلا ہوا ہے۔ مغربی ہند مین یہ سب سے بڑا مشنری نظام ہے۔ احمد نگر اسکا مرکز ہے اور اشاعت مذہب کی سہولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام علاقہ کو مختلف اضلاع مین تقسیم کر دیا گیا ہے ان مین سے ایک ضلع راہوری ہے۔ نارائن کا قیام زیادہ تر احمد نگر یا راہوری مین رہتا تھا۔

راہوری مین نارائن نے اپنا ذاتی مکان بنا لیا اور اسکا نام کرایسٹ سدن رکھا جہان ہر غریب بیکس، طالب امداد اور متلاشی حق انتہا آزادی اور سہولیت کے ساتھ رہ سکتا تھا۔ اسکا مکان خانۂ شعرا تھا خود شاعر۔ بیوی شاعرہ اور بچہ مین بھی شعر گوئی کا مادّہ تھا۔ مہاراشٹر کا مشہور شاعر تریا مبک تھومرے جو بال کوی کے نام سے مشہور ہے کئی سال تک یہان نارائن کے پاس رہا اور دونون لطف سخن سے بہرہ اندوز ہوتے رہے۔

مرہٹی زبان سے نارائن کو بدرجہ کمال محبّت تھی نظم و نثر دونون لکھتے تھے ان کا تمام وقت ادبی خدمات یا تبلیغ مذہب مین صرف ہوتا تھا۔ اور ان مین نئے نئے جدت طبع کے جوہر دکھاتے تھے۔ اوّل ہم ان کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہین۔ احمد نگر مین مشن کے زیر نگرانی ایک مذہبی کلب موسومہ تھیولوجیکل سیمینری تھا جسکے ذریعہ سے عیسائی مذہب کے پرچارک و مناظرہ کرنیوالے تیار کئے جاتے تھے۔ بھارت ورش نارائن [illegible] باقاعدہ وید [illegible] سنسکرت [illegible] مرہٹی و سنسکرت ادبیات

شری بہگوت گیتا۔ تفسیر گیتا مصنفہ شری سوامی سنکر آچاریہ پر باقاعدہ مسلسل لیکچر دیا کرتے تھے۔ اور اپنے لیکچروں سے ہندی عیسائیوں کے دلوں میں مرہٹی علم ادب و سنسکرت فلسفہ ادب کی تکریم اور دیش بھگتی کے آگ روشن کرتے تھے اور فنون لطیفہ مثلاً ڈراما نویسی۔ نقاشی۔ مرہٹی ادب ڈرامیٹک وغیرہ کی طرف لوگوں کو شوق دلاتے تھے۔

میدان نظم میں آپ کم و بیش تیس کتابوں کے مصنف ہیں جو آپ کی انگریزی و مرہٹی تصنیفات پر مشتمل ہیں۔ اسکے علاوہ آپ نے دو ڈرامے مرہٹی زبان میں بسلم پرتما ہوشنم اور گمراہ کرشنا لکھے ہیں جن میں سے ڈراما گمراہ کرشنا ابتک ناگپور میں وسلم پرتما ہوشنم ہائی اسکولوں میں کھیلے جاتے ہیں۔ آپ کی نثر نویسی کی قابلیت کا اظہار اس امر سے ہوسکتا ہے کہ آپ متعدد کرسچین انگریزی و مرہٹی رسائل کے نامہ نگار اور مدیر رہے ہیں۔ وین اودے۔ کرسچین سٹی زن Christian Citizen کرسٹی (Christi) بال بودھ۔ منورنجن رشی وغیرہ متعدد رسائل کو آپ کے زیر ادارت رہنے کا فخر حاصل ہے ان خدمات کے صلہ میں آپ مئی سنہ ۱۹۱۵ء میں ناٹیہ سمیلن کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ جو مہاراشٹر میں ادبی خدمات کا بہترین صلہ و اعزاز ہے۔ آپ ساروا پریشد منڈل کے سکریٹری اور روح رواں تھے منڈل مذکور موجودہ مرہٹی علم ادب کا جنم داتا ہے اور اسلیے آپ کو موجودہ مرہٹی لٹریچر کا ممتاز درجہ دیا جاتا ہے۔

ہندوستان کا کرسچین طبقہ نارائن کو نہایت عقیدتمندی و احترام سے یاد کرتا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ اہل ہنود اور ہند و تہذیب پر نکتہ چینی کرنے سے بیشتر معترضین کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ ہندو ادبیات اور فن موسیقی سے بخوبی واقفیت حاصل کریں۔ ہندوؤں کی جملہ لٹریچر وراگ و ویاریم و بھگتی کے جذبات سے بھرپور ہیں جنکے بغیر روحانی ترقی ناممکن ہے۔ اس روحانی ذخیرہ پر ہندو و اہل ہند جسقدر بھی فخر کریں بجا ہے۔ باوجود عیسائی ہوجانے کے نارائن کو سوامی تکارام کے ابھنگوں (روحانی نغموں) اور ایکناتھ اور گرو رامداس کی تصانیف میں اسیقدر لطف آتا تھا جسقدر کہ انجیل مقدس میں۔ چنانچہ دیسی عیسائیوں کی روحانی ترقی کے لیے۔ آپ نے مرہٹی زبان میں سوامی تکارام کے ابھنگوں کی تقلید میں عیسائی مذہب کی ابھنگانجلی نظم میں تصنیف فرمائی دوسری کتاب

کرسٹیان[۱] راماین کے طرز پر تصنیف کرنا شروع کی مگر وہ ختم نہ ہو سکی متعدد بھجنوں کی کتابیں جنکو بھجن سنگرہ کہتے ہیں لکھیں۔ عبادت کے وقت کیرتن کا رواج دیا۔ عیسائیوں کو ہندو مہاتماؤں کے کلاموں کے پڑھنے کی ترغیب دی جس سے انکے دلوں میں بھگتی و پریم کے جذبات اور بھارت ورش کی اصلی تہذیب اور لٹریچر پر فخر کرنے کے خیالات پیدا ہو سکیں تاکہ ہندوؤں عیسائیوں میں جو باہمی مذہبی منافرت کی دیوار پیدا ہو تی جاتی ہے۔ جو اتحاد ملکی میں بھی رخنہ زن ہو سکتی ہے۔ دور ہو جائے اور ایک دوسرے کے مذہب کو رواداری اور احترام کی نظر سے دیکھ سکیں۔ اور ہندوستان کی متفقہ قوم بنانے میں مدد دے سکیں۔

ہمارے مسلم لیڈروں کو نارائن کے مندرجۂ بالا خیالات سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور اہل اسلام کو ہندوؤں کے خلاف مذہبی اشتعال دلانے کے بجائے ہندو مذہب کی خوبیوں کو ان کے دلوں پر منقش کرنا چاہئے تاکہ اہل اسلام ہند باشندگان وطن کو کفاران عرب کے دوش بدوش خیال کرنا چھوڑ دیں۔ اور حقیقی معنوں میں ہندوستان پرست بن جائیں۔ جس سے ہندو مسلم اتحاد مستقل طور پر قایم اور حصول سوراج ممکن ہو سکے۔ جب تک ہند کے مختلف مذاہب کے پیروان کے دلوں پر دیگر مذاہب کی خوبیاں منقش نہ کی جائیں گی آئے دن کے مذہبی فسادات ہوتے رہیں گے۔ اور مذہبی رواداری مفقود۔ ہندو مسلم اتحاد ناممکن الحصول اور حصول سوراج کا خیال محض ایک دل خوش کن افسانہ بنا رہے گا۔

کچھ عرصہ کے بعد نارائن نے مشن کی ملازمت ترک کردی اور مفت پرچار کا کام کرنا شروع کردیا۔ ایک جماعت موسومہ والنٹیر کرسچین سروس قائم کی جسکے ممبران مذہبی پرچار کا کام مفت انجام دیتے تھے۔ دیسی عیسائیوں کو آپنے بتایا کہ مذہبی پرچار اور روحانی کام کے لیے غیر ہندوستانی لوگوں کا مالی طور پر محتاج رہنا بعید از دانشمندی ہے۔ دیسی عیسائیوں کو چاہیئے کہ انڈین کرسچین سروس کو اہل یورپ وامریکہ کی غلامی سے جو بوجہ مالی امداد کے ہے آزاد کرائیں اور ہندوستانی قومی جذبات وخیالات کو قائم رکھتے ہوے اور ہند واہل ہند سے سچا پریم کرتے ہوے عیسائی مذہب کا پرچار کریں۔ عیسائی مت کے خیالات وجذبات کو جذب کریں لیکن

---

[۱] Christayan

اپنی قومی ہستی خودداری خود اعتمادی وتفاخر کے خیالات کو فنا ہونے دین اور مغربی طرز معاشرت وتہذیب کے غلام نہ بنین۔

نارائن نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے کھدر پر چار کے بہت پہلے سے آپ ہاتھ کا بنا ہوا اور ہاتھ کا کتا ہوا کھدر استعمال کرتے تھے۔ ہندو اور اہل ہند کی سچی محبت دلمین موجود تھی نیز قوم آنجہانی مسٹر تلک کے خاص دوستون مین تھے۔ مرحوم نے جب اپنی مشہور عالم کتاب گیتا رہسیہ تصنیف فرمائی تو اسکی ایک جلد نارائن کو بھی نذر کی۔ آپ مہاتما گاندھی کے بڑے مداح تھے لیکن ہند کی اخلاقی تنزل کو مدنظر رکھتے ہوے آپ کو ستیاگرہ کی کامیابی مین شک تھا۔ آخر مین آپنے اہل ہنود کی تقلید مین اور عیسائی مذہب کی روایات کے خلاف سنیاس دھارن کرلیا۔ اور باوجود سخت مالی دقتوں کے عزیز سے عزیز کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا۔ آپ کو سینٹ پال سے خاص عقیدت تھی اور حضرت عیسیٰ کو اپنا مذہبی پیشوا اور گرو سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو عالم مراقبہ مین حضرت عیسیٰ کے درشن بھی ہوئے۔ گوشت وشراب قطعی استعمال نکرتے تھے۔ زمانہ سابق کے ہندوستانیون کیطرح اپنا وقت نوشت وخواند درس وتدریس اور عبادت الٰہی مین صرف کرتے تھے۔ عدم تشدد کے آپ زبردست حامی اور عامل تھے۔ اس کے متعلق یہان پر صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ ایک دن آپ کی چھوٹی بچی بازار مین سے کسی سبزی فروش کی دوکان سے ایک ادرک کا ٹکڑا اٹھالائی اور اسکو والدین کو دکھلایا اوسکو یہ ذرا بھی خیال نتھا کہ اسکا یہ فعل چوری کی حد تک پونچتا ہے نارائن اسکو اپنے کمرہ مین لے گئے اور یہ کہکر کہ تمہارا ادرک کا اٹھالانا صرف ہماری ناقص تعلیم کا نتیجہ ہے اپنے آپ کو بید سے پیٹنا شروع کردیا۔ اس عجیب وغریب سزا کا یہ اثر ہوا کہ لڑکی عمر بھر کے لیے تائب ہوگئی اور پھر وہ اخلاقی یا اور کسی قسم کے جرم یا گناہ کے مرتکب ہونے کی تمام عمر جرارت نہ کرسکی یہ ہے حضرت عیسیٰ کی تعلیم اور عدم تشدد کا سچا نمونہ۔

نارائن ابتدا ہی سے ذات پات کی تفریق اور چھوت چھات کے سخت خلاف تھے۔ گرے ہوون کو اٹھانا مصیبت زدون کی مدد کرنا اور جاہلون کو تعلیم دینا انسانی فرائض مین داخل سمجھتے

کے صوبجات بمبئی و مدراس کے ہندو قوم کے مذہبی رہنماؤں یعنی برہمنوں کے غیر برہمنوں اور اچھوتوں کے ساتھ نامنصفانہ و ظالمانہ سلوک نے آپ کو مروجہ ہندو مذہب سے متنفر کر دیا تھا۔ چونکہ ہندو رہتے ہوئے آپ اچھوتوں کا اپکار نہیں کر سکتے تھے۔ آپ عیسائی ہو گئے۔ اسطرح ہندوؤں کی تنگ خیالی اور ویدوں و دیگر مذہبی کتب کی تاویلات کی بدولت نارائن اور پنڈتہ راما بائی جیسے قابل رتن ہندو قوم کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ایشور کا شکر ہے کہ سوامی دیانند کی تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے اپنے فرائض کو پہچاننا شروع کر دیا ہے۔ اور اچھوت ادھار کیطرف قوم مائل ہو رہی ہے جنوری ۱۹۱۹ء میں نارائن بیمار ہو گئے۔ جب مہاتما گاندھی نے اپنی تحریکات کی ابتدا کی تو آپ صاحب فراش بنے ہوئے تھے۔ اور قبل اسکے کہ اہل ملک نے مہاتما جی کے ارشادات پر عمل کرنا شروع کیا آپ ۹ مئی ۱۹۱۹ء کو رگزائے عالم جاودانی ہو گئے۔

آخر میں ہم نارائن کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو آپ کے خیالات و جذبات مذہب و وطن پرستی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ آپکا دل بچوں۔ پھول اور مشن کی الفت سے معمور رہتا لہذا آپکی نظمیں بھی زیادہ تر بچوں پھولوں یا مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ہندی قسم میں وہ تمام نظمیں جو آپنے ہندوستانی چرچ مشن کے پیغام اور روحانیت کے جذبات سے پر ہو کر لکھی ہیں اختصار کو مدنظر رکھکر ہم انکا حتی الامکان اردو ترجمہ کرتے ہیں

(۱) نظم موسومہ جنگل کا پھول[1] میں فرماتے ہیں

"اے پھول تجھ سے زیادہ کسی شاعر کے ذہن الہامی کیفیت پیدا کرنیوالی کوئی دوسری چیز تمام دنیا میں نہیں ہے۔ اور اے پیارے پھول جسقدر نظمیں میں نے تیری تعریف میں لکھی ہیں کسی دوسری مخلوق کی تعریف میں نہیں لکھیں۔

(۲) نظم موسومہ اے میری لڑکی میں لکھا ہے:-

"اے لڑکی تو میرے لیے ایک چھوٹا خوبصورت پھول ہے رات کا روشن خوشنما ستارہ ہے میرے سر کا ایک بیش بہا جواہر ہے۔ ایک چھوٹا پرندہ ہے۔ نہیں نہیں تیری شان کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا وہ ان سب سے کہیں زیادہ ہے۔

(۳) نظم موسومہ امریکہ کی لڑکی[2] کا اختتام اسطرح کرتے ہیں۔

---

[2] Amrican Girl

[1] Flower of The Forest.

"وہ صبح کی روشنی کے مانند ہے جو روئے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خنداں خنداں چلی جاتی ہے یا خواب شیریں ہے جو کبھی شاعر کے دل کو خوشی سے معمور کرتا ہے یا مجسم سادگی ہے یا خوبصورتی کا اوتار ہے جو کہ آج ہی بہشت بریں سے ہماری دنیا کو زینت دینے کے لیے اُتر آئی ہے۔"

ہندوستانی کرسچین مشن کا شہسوار۔ آپ میں خودداری اور خود اعتمادی کی روح پھونکنا اور اُسکو غیر ملکی مشنریوں کی مالی اور عملی غلامی سے نجات دلانا نارائن کی زندگی کا نصب العین تھا آپ کا مندرجہ ذیل کلام اس تحقیر آمیز سلوک کا جو غیر ہندوستانی مشنری ہندی مشنریوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں اور اُن طریقوں کی جن سے کہ اول الذکر آخر الذکر کے دلوں سے قومی جذبات کو نیست و نابود کرنا اور اُنکو ظاہری اور باطنی طور پر غیر ملکی جذبات کا شکار اور غلام بنانا چاہتے ہیں جیتی جاگتی تصویر ہے آپ کا خیال تھا کہ انڈین چرچ مشن کی بہبودی کے واسطے غیر ملکی اور ملکی مشنریوں میں باپ اور بیٹے (یعنی حاکم و محکوم) کا تعلق نہیں رہنا چاہیئے بلکہ بھائی بھائی (مساوی) کا درجہ ہونا چاہیئے۔

شکر کا مقام ہے کہ نارائن کی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر ہندوستانی کرسچین انڈین کرسچین سروس کو غیر ملکی مالی امداد و نظامی غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"تم نے (ہندوستان میں) غلام مشنریوں کی سلطنت قائم کی ہے اس کا نام خدا کی سلطنت نہ رکھو۔ ہم مثل کٹھ پتلیوں کے ناچتے ہیں اور دھاگہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ مضحکہ خیز حالات کبتک قائم رہ سکتے ہیں"

"اُن تمام آدمیوں کو جنکو بھارت ورش پسند نہیں کرتا ہے اپنا بندھا بوریہ باندھکر فوراً ملک سے چلا جانا چاہیئے۔ یہ خیال نہ کرو کہ روپیہ اور حکومت ہم کو بچا سکتے ہیں۔ یہ محض باطل اور لغو خیالات ہیں ہمکو باپ اور دیوتا بننے والوں کی ضرورت نہیں ہے۔

آؤ تاکہ ہم آپس میں بھائی بھائی کا رشتہ قائم کریں۔ داس (نارائن کا تخلص ہے) کہتا ہے کہ زمانہ گذشتہ کو بھول جاؤ۔ اور دور جدید میں نئے خیالات اور جذبات سے آراستہ ہو کر کام کرو" [ابھنگا نجلی ابھنگ نمبر ۱۶۰]

پھر ابھنگا نجلی مین ابھنگ ۱۶۵ مین رقم فرماتے ہین۔

"ہندوستان کو بچون کا کھیل تصور نہ کرو اور نہ اُسکو کسی مسخرے کی رکیک حرکات خیال کرو۔ یہ اُن زبردست ہادیان مذہب کا جنم داتا ہے جنکے نام سے دنیا کانپتی ہے۔ یہاں بڑے بڑے رشی اور مہرشی پیدا ہوئے ہین جو یوگیشور تھے اور جنکے الہامات سے اہل عالم آجتک مستفیض ہورہے ہین۔ یہان اُن پوتر ہستیون نے جنم لیا ہے جنکا قول اُنکی جان کیساتھ تھا اور جو بات کیواسطے ہر چیز کو قربان کرسکتے تھے۔ اور جن کا گھر تمام دنیا تھی۔ ہان ہان اس ملک مین وہ رشی راج پیدا ہوے ہین جنکی فیضان تعلیم سے آجتک لوگون کے کاشانۂ دل منور ہین۔ تمکو اس مُلک مین (عیسائی مذہب کیساتھ ساتھ) غیر ملکی جذبات و رسوم و رواجات کی اشاعت سے کیا ملے گا؟ تمہاری تمام کامیابی بالآخر خاک مین ملجائیگی، اور بدنامی کا طوق تمہاری گردن مین ہوگا۔

نظم موسومہ سوشیلا مین ظاہری اور باطنی خوبصورتی کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہین،

"ظاہرا خوبصورتی اور عالم جوانی سے خواہشات نفسانی کو حظ حاصل ہوتا ہے لیکن اصلی محبت کا مرجع یہ چیزین نہین ہین۔ مین گو سرشار ہوا اسکا طلبگار رہون مجھکو صدف در کار نہین مین تیری صورت کا شیدائی نہین تیرے دل کا خواہشمند ہون۔ خواہ وہ ساغر زرین مین ہو یا مٹی کے ٹھیکرے مین مین بادۂ محبت سے سرشار ہوجاتا ہون اور مجھ پر اس سے ایک وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے،،

اُپاسنا سنگیت نمبر ۲۵ مین عبادت کی بابت مرقوم ہے۔

"عبادت صادق جو نیازمندانہ عقیدت کے ساتھ ہوتی ہے بہشت برین کا دروازہ کھول دیتی ہے،، کسی اردو شاعر نے کہا ہے۔ ؎

خضر طلب نے جوش مین خود کو مٹا دیا + یقین قلب کے تشنب مین راہین ثواب کی

کتاب کرشنا یان مین بھگتی کی تعریف مین یون نغمہ زن ہین:-

"بارہا یہ میرے تجربہ مین آیا ہے کہ بھگت کو پرماتما کے پیچھے دوڑنا نہین پڑتا بلکہ خود پرمیشور کو اپنے بھگت کی محبت اور سیوا مین اُسکے پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے،،

نارائن کا مندرجہ بالا عقیدہ ہندو فلسفہ و تعلیم "جگت کے بس مین بھگوان" کا صحیح نتیجہ ہے۔

جب انسان ایشور کے پریم مین غرق ہو جاتا ہے دوئی مٹنے لگتی ہے اسوقت کے جذبات کی تصویر یا سنگیت مین اسطرح کھینچتے ہین۔

"جسطرح چاند اور اُسکی کرنین ایک ہین اسیطرح اے پرمیشور مین تجھ سے واصل ہونا چاہتا ہون یہی میری پرارتھنا ہے اور یہی مین تجھسے بطور خیرات کے مانگتا ہون۔

جسطرح بیوی کا دل خاوند کی محبت سے معمور ہوتا ہے۔ جس طرح جوش محبت سے دوڑکر بیٹی ماں سے چمٹ جاتی ہے یا بہن بہن سے گلے ملتی ہے اسی طرح میرا دل تیری محبت مین محو ہے۔

جسطرح الفاظ اور انکے معانی بظاہر دو مختلف چیزین ہوتے ہوئے باطناً ایک ہی ہین اور دونون ملکر ایک ہی غرض و غایت کو پورا کرتے ہین اسیطرح اے بحر ابدی مین اور تو ملکر ایک ہو جائین اور میری زبان سے تیرے احکامات جاری ہون۔

اے نور حقیقی مین اپنے صاف و شفاف آئینہ دل مین ہمیشہ تیرے جمال ازلی کا شاہد رہون۔ اور میرا دماغ۔ میری گویائی اور میری زندگی تیری حقیقتون کا مظہر بنجائین۔

پریم اور نجات کے نازک تعلقات پر نظم موسومہ "جنگل کا پھول" مین روشنی ڈالتے ہوئے اسطرح دُرفشان ہین۔

"پریم ہی دنیوی خوشیوں کا منبع ہے۔ پریم ہی نجات یعنی موکش ہے پریم ہی بہشت برین ہے۔ اور خود خدا پریم ہے۔" فقط

ہری کشن (بلند شہر)

ورسیلیز کا عہد نامہ

(۱)

جنگ یورپ کو ختم ہوئے چار سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک یورپ کے سیاسی سطح سے لڑائی کے بادل دور نہیں ہوئے۔ روس کی حکومت ابھی تک باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ جرمنی ابھی تک انجمن الاقوام کے دائرہ سے باہر ہے۔ فرانس شکست یافتہ جرمن کو ابھی تک اپنا دشمن سمجھ رہا ہے۔ آسٹریا قومی ذمہ داریوں سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ رہا ہے۔ ہنگری والے بھی زیر باری کے جوئے سے آزاد ہونے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ انگلستان کے تعلقات عرب کی آزاد سلطنتوں کے ساتھ پورے طور پر طے نہیں ہوئے ہیں مصر کا سوال اب پھر سوڈان کے قبضہ کی بدولت پیچیدہ ہو رہا ہے۔ انگلستان یورپ کے سوا ہر ایک قوم قرضوں کی زیر باری سے گھبرائی ہوئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نئی سلطنتیں ابھی تک اپنی حیثیت سے واقف نہیں ہوئیں اور نہ ان کی ہستی خطرے کے دائرے سے باہر نکلی۔ یورپ میں اگرچہ جنگ کے شعلے شرر افشاں نہیں تاہم ابھی تک سیاسی فضا پر امن بھی نہیں ہوئی غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ سارے حالات ورسیلیز کے اُس عہد نامہ کے پیدا کردہ ہیں جسکے ذریعے سے دُنیا میں امن قایم کرنے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔

امن کے شاندار خواب دیکھنے کے لحاظ سے یہ عہد نامہ کوئی نرالی حیثیت نہیں رکھتا۔ دنیا میں جب کبھی کوئی خطرناک جنگ شروع ہوئی تو اُسکے خاتمے پر مدبران وقت ہمیشہ ہی جنگ کو دنیا سے مٹا دینے کا وعدہ کرتے آئے ہیں۔ ۱۸۱۵ء میں وی آنا کی کانگریس نے جب نپولین کی شکست کے بعد یورپ کا نقشہ نئے سرے سے کھینچا تھا اسوقت بھی یہی وعدے کئے گئے تھے۔ اور یہی موہوم اُمیدیں دلائی گئی تھیں وہ اُمیدیں بھی اسی طرح سے مدبروں کی چالوں کا شکار ہوئی تھیں۔ انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ مصیبت پڑنے پر توبہ کرتا ہے اور بھلے دن آنے پر پھر وہی پُرانی چالیں اختیار کر لیتا ہے۔

تاہم بیسویں صدی اور انیسویں صدی میں فرق ہے۔ پچھلے جنگ یورپ کے خاتمے پر امن کے

وعدے بہت ہی زور و شور سے کئے گئے تھے سائنس کی ترقی نے طرفین پر ثابت کر دیا کہ بیسوین صدی کی جنگ ایک بہت بڑی ہولناک چیز ہے۔ اسلیے اسبات کی کوشش ہونی چاہیے کہ آیندہ کے لیے جھگڑون کا فیصلہ کرنے کے لیے تلوار بندوق۔ اور ہوائی جہاز سے کوئی بہتر منصف اور ثالث بنایا جائے۔ جنگ کی طوالت نے بھی طرفین کو مجبور کیا کہ وہ معمولی مادی سوالات کے دائرے سے گذر کر ایک اونچے طبقے مین پہنچین اور بنی نوع انسان کی حمایت کرین۔ غرض امن قایم رکھنے کے لیے اس جنگ کے خاتمے پر زیادہ سنجیدگی سے غور کیا گیا اور اس غور و خوض کا سہرا مرحوم پریسیڈنٹ ولسن کے سر ہے جن کی وجہ سے انجمن اقوام وجود مین آئی۔

(۲)

پریذیڈنٹ ولسن ہی تنہا ورسیلیز کے صلح نامے کا مصنف نہ تھا بلکہ اورون کی بھی اسمین شرکت تھی صلحنامہ کو سمجھنے سے پہلے ہمین اسبات کو سمجھ لینا چاہیے۔ کہ ورسیلیز کی صلح کن حالتون مین ہوئی۔

ایک آسٹرین شہزادے کے قتل کا یورپ مین عظیم الشان ہولناک جنگ پیدا کر دینا بذات خود ایک حیرت انگیز معمہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بات یہ تھی کہ تمام یورپ بارود خانہ بنا ہوا تھا۔ اور جیسی ہی کہ کوئی جلتا ہوا عمداً یا قصداً شعلا اسکے نزدیک پہنچا۔ اس میگزین کا اڑجانا اور دنیا مین آگ لگا دینا یقینی تھا۔ یورپ دو مسلح جماعتون مین تقسیم تھا۔ اور دوسری طرف آسٹریا اور جرمنی تھے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو یورپ کے سیاست دان پچھلی زنجیرون سے بندھے ہوئے اس میدان مین کود پڑے۔ عرصہ دو سال کا ہوا جب ہمنے زمانہ مین ایک آرٹیکل بین الاقوامی تعلقات کے عنوان سے لکھکر مختلف قومون کے جنگ یورپ مین شامل ہونے کی وجوہ پر اصلی معاہدہ جات کے مطالعے سے روشنی ڈالی تھی۔ اور بتایا تھا کہ کس طرح (جب ایک طرف آزادی کے نام پر اپیلین ہورہی تھین) اتحادی سیاست دان آسٹریا۔ جرمنی۔ ترکی۔ اور غریب ایران کے حصے بخرے کرنے مین مشغول تھے۔ جب صلح کے لیے کوششین شروع ہوئین تو یہ سب عہدنامے موجود تھے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۶ء کو جب اتحادی طاقت زوال پر تھی اسوقت جرمنی نے اتحادیون کو صلح کے متعلق بات چیت کرنے کے لیے مدعو کیا لیکن شکست یافتہ اتحادی ابھی ہمت نہین ہارے تھے۔ اور انھون نے فرداً فرداً و نیز کلیتہً اس دعوت کو رد کر دیا اسپر پریذیڈنٹ ولسن نے ۲۰ دسمبر کو فریقین سے اپنے نقطۂ خیال سے لڑائی کے مقاصد کے متعلق استفسار کیا۔

اسکے جواب مین اتحادیون نے اپنے مقاصد بیان کر دیئے۔ لیکن جرمنی نے ٹال مٹول کرنا شروع کیا۔ آخر کار پریسیڈنٹ ولسن نے ہار کر اور جرمنی کی جنگی ریشہ دوانیون سے تنگ آکر ۲ اپریل ۱۹۱۷ء کو جرمنی کے برخلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس اثنا رمین آسٹریا علیحدہ طور پر صلح کرنے کے لیے بھی کوششین کرتا رہا۔ لیکن اتحادیون کے آپس کے عہدنامے جرمنی اور آسٹریا کی سلطنتون مین سے کچھ ٹکڑے اٹلی اور فرانس کے حوالے کرنے پر مُصر تھے۔ اسلیئے گو جرمنی کے مدبرّون نے بھی صُلح کے متعلق کوششین کین۔ لیکن یہ کوششین ناکامیاب رہین۔ فرانس والے جرمنی سے اپنی ۱۸۷۱ء کی شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ اور وہ علاقہ جو اس شکست کے بعد جرمنی کی سلطنت مین شامل کر لیا گیا تھا اس کے واپسی پر بضد تھے۔ جرمنی نے برسٹ لٹوسک کے مقام پر رجہان سے کہ زار کو نکالکر ایک نئی طرز کی جمہوری سلطنت قایم کر لی گئی تھی) اُس سے جو عہدنامہ کیا اسمین روس کا حصّے بخرے کر لیے گئے اور کئی سرحدی ریاستین قایم کر دی گئی۔ اس عہدنامہ نے صلح کو دُور ہی رکھا اور اتحادیون کے فاتحانہ صلح کے ارادے مضبوط ہوتے چلے گئے۔

جنوری ۱۹۱۸ء مین مسٹر لائڈ جارج نے اتحادیون کی طرف سے ان شرایط کا ذکر کیا جنپر صلح کی جاسکتی تھی۔ یہ شرایط دسمبر ۱۹۱۶ء کی شرائط سے بہت کچھ کم تھین۔ ۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء مین پریسیڈنٹ ولسن نے امن کے چودہ اصول قایم کئے۔ جنپر مستقل صُلح کی جاسکتی تھی۔ مختصراً ان مین اسبات پر زور دیا گیا تھا کہ ہر قسم کی رکاوٹین جو مختلف قومون نے ایک دوسرے کے برخلاف پیدا کر رکھی ہین دُور کر دیجاوینگی فرانس کو ۱۸۷۱ء کا علاقہ واپس ملیگا۔ بلجیم آزاد کر دیا جائیگا۔ پولینڈ کی ایک آزاد سلطنت قایم ہوگی۔ نوآبادیون کے متعلق کامل غور و خوض کر کے فیصلہ کیا جائیگا۔ اور سب سے زیادہ لازمی امر یہ کہ سب صلحنامہ کُھلے بندون روز روشن مین کیے جائینگے۔ اور اقوام عالم کی ایک انجمن بنائی جائیگی جو کہ دنیا کے امن کو قایم رکھنے کی ذمہ دار ہوگی۔ اس طرح صلح کو فاتحانہ اصولون سے آزاد رکھنے کا اعلان کر دیا گیا۔ امریکہ کی فوجون نے اب آکر جنگ کی صورت بدل دی۔ اگست ۱۹۱۸ء مین فرانسیسی محاذ جنگ پر جرمنی کے جارحانہ حملے ناکامیاب ہوگئے۔ اور انگلستان اور فرانس کی متحدہ فوجون نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ آسٹریا نے ستمبر کے مہینے مین زبانی بات چیت کے لیے پہل کی اور ۲۹ ستمبر کو بلگیریا نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۳۱ اکتوبر کو ترکی بھی ہمت ہار بیٹھی اور اس نے ایک عارضی صلحنامہ پر دستخط کر دیئے ۵ اکتوبر کو جرمنی نے بھی صلح کے لیے

پریسیڈنٹ ولسن سے درخواست کردی اور ۲۸ اکتوبر کو آسٹریا نے بھی صلح کے لیے کوشش کی۔ صلح جنگ کے ختم ہونے سے پہلے ہی ۱۱ نومبر کو آسٹریا ہنگری کی سلطنت کا فاتحہ پڑھ دیا گیا ۹- نومبر کو جرمن مین بھی جمہوری سلطنت قائم ہو گئی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو نئی گورنمنٹ نے عارضی صلحنامہ کے کاغذون پر دستخط کر دیے۔

(۳)

ان سب واقعات کا اعادہ کرنا ضروری تھا۔ ان سے دو باتین ظاہر ہوتی ہین۔ امریکہ کے شامل جنگ ہونے سے پہلے اتحادیون کی مختلف طاقتون کے درمیان عہد نامے ہو چکے تھے جنکے ذریعہ سے اونھون نے فتح کی حالت مین مختلف علاقون کو آپسمین بانٹ لینے کا عہد کر لیا تھا جب اضلاع متحدہ امریکہ ۱۹۱۷ء مین شریک جنگ ہوا تو وہ ان بہت سارے عہد نامون سے بے خبر تھا۔ صلح کے چودہ اصول اسی بے خبری کا نتیجہ تھے۔ لازمی طور پر جب ورسیلز مین صلح کے متعلق بات چیت شروع ہوئی تو دو طاقتون کی آپسمین مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایک طرف تو فرانس اور اٹلی دوران جنگ کے عہد نامون کی رو سے جرمنی اور آسٹریا کی سلطنتون مین سے حصہ لینے پر مصر تھے دوسری طرف پریسیڈنٹ ولسن اس بات کے خواہان تھے کہ ان اصولون کے مطابق ہر ایک قوم کو اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنیکا حق دیا جائے۔ دوران بحث مین عام طور پر یہ پایا گیا کہ انگلستان کا چونکہ یورپ کے براعظم کے جھگڑون سے کوئی واسطہ نہ تھا اس لیے وہ غیر جانبدارانہ روش سے انصاف کے لیے امریکہ کا ہم آہنگ تھا۔ لیکن پھر بھی ۱۹۱۸ء کے انتخاب پارلیمنٹ کے دوران مین مسٹر لائڈ جارج نے کئی ایسے وعدے کر دیے تھے جو ان چودہ اصولون سے بالکل مختلف تھے۔ اس بات کو چھوڑ کر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا اوسوقت پریسیڈنٹ ولسن کے اصولون کے مطابق ایک صلحنامہ مرتب کیا جا سکتا تھا یا نہین۔ مدبران یورپ پچھلے جھگڑون مین جکڑے ہوئے ابھی ایسی آزادانہ اور منصفانہ تجاویز کے لیے طیار نہ تھے۔

ایسے صلحنامہ کا ہونا اسوقت ممکنات سے نہ تھا۔ جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ صلح کانفرنس کی کارروائی پیرس مین کی جائے اور ولسن کے اصولون کے برخلاف یہ قرار دیا گیا کہ اخبارات کے قائم مقامون کو آزادانہ طور پر کانفرنس کی کارروائی کو شائع کرنے سے منع کر دیا جائے،

اگر جنیوا یا ہیگ مین یہ کانفرنس منعقد ہوتی اور اخبارات کو اسکے کارروائی شائع کرنے کی اجازت ملجاتی تو ممکن تھا کہ صلح کانفرنس فرانس کی خود پرست اور خود غرض کارروائیون سے ساری تہذیب یافتہ دُنیا کے طبقون کے ڈر سے باز بھی جاسکتی لیکن ابھی امن دور تھا۔ اور صلح کانفرنس کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکی۔

ولسن۔ لائڈ جارج اور کلیمنشو اس کانفرنس کے بانی مبانی تھے۔ پریسیڈنٹ ولسن مونشیر کلیمنشو کے دعوون کے برخلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا گئے۔ ولسن صاحب کے سامنے سوال یہ تھا کہ آیا وہ تھوڑی سی خامیون کو مان لین یا کانفرنس کو چھوڑ کر چلے جائین اور دیانتداری کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائین۔ اٹلی کا وزیر اعظم مسٹر اورلینڈو بھی بہت سے جھگڑون کا موجب بنا اور جب اوسے فیوم کا علاقہ دینے سے انکار کر دیا گیا تو وہ کانفرنس چھوڑکر اٹلی کو چلا گیا۔ لیکن شروع سے ہی صلح کے ارادے بجائے اسکے کہ کانفرنس کے مدعو کردہ ممبرونکی وساطت سے طے پاتے۔ یہ کام انگلینڈ۔ فرانس۔ اٹلی۔ امریکہ اور جاپان کے وزراء اعظم اور وزراء خارجہ نے بطور خود کرنا شروع کیا۔ کانفرنس کا کام اِن دس آدمیون کے فیصلون کی تصدیق کرنا ہی رہ گیا۔ ۱۸ جنوری کو کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا۔ مارچ کے مہینے مین کانفرنس کے کام دس آدمیون کے ہاتھ سے نکلکر صرف چار آدمیون ولسن۔ لائڈ جارج۔ کلیمنشو اور اورلینڈو کے ہاتھ مین رہ گیا۔ اس دوران مین کانفرنس کی پہلی ناکامیابی رونما ہو چکی تھی۔ کیونکہ روس کے متعلق کانفرنس کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ فرانس والے ایک جمہوری سلطنت ہوتے ہوئے بھی۔ روس کی نئی جمہوریت کے مخالف تھے اور مسٹر لائڈ جارج مین اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ فرانس کی مخالفت کر سکتے۔ کانفرنس کے سامنے۔ روس کو چھوڑکر آٹھ ضروری سوالات درپیش تھے۔ جرمن کی مغربی سرحد کا سوال نہایت پیچیدہ بن گیا کیونکہ فرانس دریائے رائن سے اوس پار کے سارے علاقے کا دعوے دار تھا۔ دوسرا سوال انجمن الاقوام کے قائم کرنیکے متعلق تھا۔ یہ سوال چندان مشکل نہ تھا۔ لیکن جب آسانی سے اس کے متعلق سمجھوتہ ہو گیا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم فرانس کی رائے اسکے متعلق بہت سنجیدہ نہین تھی تیسرا سوال قیصر ولیم اور اسکے ساتھیون پر باقاعدہ مقدمے چلا کر انہین اُس کشت و خون کے لیئے ذمہ دار

ٹھہر ایا تھا جو دوران جنگ مین رونما ہوا تھا۔مسٹر لائیڈ جارج نے پارلیمنٹ کے انتخاب کے دنون مین وعدے وعید کیے تھے۔اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ولسن صاحب قیصر ولیم کو بچانے مین کامیاب ہو جاتے۔تاوان جنگ نے چوتھی بڑی مشکل پیش کی۔امریکہ نے دیانت داری سے اس بات پر زور دیا کہ تاوان جنگ کے ذریعے سے صرف وہ رقم وصول کیجائے۔جس کے ذریعے سے وہ نقصانات جو مختلف علاقون مین شہریون کے ہوئے ہون۔پورے کیے جاسکین۔اسکے برخلاف مسٹر لائڈ جارج اور فرانس کا وزیراعظم دونون اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ تاوان جنگ کے ذریعے سے لڑائی کا سارا خرچ وصول کیا جائے۔یہ بات صریحًا پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ اصولون کی مخالف تھی۔اور ایک طرح سے جرمن والون کو صریحًا دھوکا دینا تھا۔اٹلی اور اس کے نئے ہمسائے جگوسلیو (یوگو سلاویا) کے درمیان حد و دبندی کا کام بھی بڑی ٹیڑھی کھیر تھی۔اٹلی کو اپنی طرف کرنے کے لیے اتحادیون نے ۱۹۱۵ء مین کئی وعدے کیے تھے جو صریحًا چودہ اصولون کے خلاف ورزی کرتے تھے۔لیکن جنگ کے خاتمے پر اٹلی نے ان وعدون سے بھی بڑھکر دعوے کرنے شروع کر دیے جسکی وجہ سے مسٹر ولسن اور اٹلی کے وزیراعظم اور لینڈو کے درمیان ایک بڑی خطرناک بحث شروع ہوگئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی کا وزیراعظم آخرکار کانفرنس چھوڑ کر چلا گیا۔چھٹی بڑی مشکل پولینڈ کی حدبندی تھی۔صدیون سے یہ سلطنت روس۔آسٹریا۔اور جرمنی کی چیرہ دستیون کا شکار بنی ہوئی تھی۔اس لیے اب پولینڈ کے باشندون کا دعوی یہ تھا کہ پولینڈ اتنی بڑی سلطنت بنا دی جائے جس پر ان تینون مین سے کسی کے بھی دانت نہ ٹھہر سکین۔یہ دعوی ایسا ہی بے معنی تھا جیسا کہ فرانس کا اصرار جو رائن کے اس پار کے علاقے سے متعلق تھا۔اس دعوے کی مخالفت صرف مسٹر لائڈ جارج نے کی۔مسٹر ولسن قومیت کے اصول کے زیر اثر تھا۔فرانس پولینڈ کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتا تھا۔اس لیے اوسے زیر احسان بنانیکے لیے وہ اُس کا ساتھ دینے کیلئے طیار تھا۔

ساتوان سوال ایشیا کے حدود مین پیدا ہوا جب کہ شانٹنگ کے چینی علاقے مین جاپان نے جرمنی کا وارث بننے کا دعوی کیا۔ٹرکی کے سوال نے بھی کافی مشکل پیدا کی۔لیکن یہ اس صلحنامہ کا کوئی جزو نہ تھا۔آسٹریا کی حدبندی کا سوال بھی پیچیدہ تھا۔آسٹریا کے دو ٹکڑے

حصے تھے۔ ایک مین تو جرمن نسل کے لوگ آباد تھے دوسرے مین کروٹ۔ بیگا ر۔ سیلو اور دوسری نسلون کے باشندے تھے۔ اسکا سیدھا سا حل تو یہ تھا کہ جرمن نسل کے باشندون کو جرمنی کی نئی جمہوریت کے زیراثر کر دیا جاتا۔ لیکن فرانس کو بھلا کب یہ گوارا تھا کہ وہ جرمن کو طاقت ور بننے دیتا۔ غرضیکہ ملک اپنی اپنی خود غرضانہ خواہشونکو پورا کرنے کیلئے تیار تھا۔ انگلستان والے جرمنی کی نوآبادیون پر نظر رکھتے تھے۔ صرف امریکہ ہی ایک ایسا دعویدار تھا جو کہ اپنے لیے کسی قسم کا مفاد کا خیال رکھے بغیر صلح کی کانفرنس مین شامل تھا۔

اِن سوالات کے فیصلے مین فرانس اور امریکہ بہت دفعہ ایکدوسرے کے مخالف ہوگئے فرانس ظاہرا تو یہ چاہتا تھا کہ جرمنی کو پھر اتنی بڑی جنگ کرنیکے ناقابل بنا دیا جائے لیکن دراصل وہ اپنی ۱۸۷۰ء کی شکست کے لیے انتقام کا دعویٰ دار تھا۔ اس خواہش کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس نے پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ اصولونکو پس پشت ڈال دیا۔ باقی اتحادی کسی طرح سے فرانس کے دعوون کو رد نہین کر سکتے تھے۔ ایک تو وہ خود ایسے ہی خود غرضانہ اغراض کے پابند تھے۔ دوسرے وہ دوران جنگ کے عہدنامون سے بندھے پڑے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب جرمنی کے سامنے صلح نامہ کا مسودہ پیش کیا گیا تو دیانت داری سے جرمن مدبر یہ کہنے کی جرأت کرسکے کہ انہین دھوکا دیا گیا ہی اور اتحادی فاتحون نے اپنے ارادے فتح کے جوش مین آکر بدلے ہین آخرہ ۲۸۔ جون ۱۹۱۹ء کو صلحنامہ پر دستخط ہوگئے اور جرمنی اور اسکے ساتھ یورپ کے باقی سارے ممالک نے اپنے پاؤن پر آپ کلہاڑی مار لی۔

ورسیلز کے صلحنامے اور اسکے ساتھ دوسرے اور صلحنامون نے ایک نیا یورپ پیدا کر دیا ہے۔ جرمن ایک جمہوریت مین تبدیل ہوگئی ہی اور اسکی نئے سرے سے حد بندی کیگئی ہے۔ زار روس معہ اپنے خاندان کے تلوار کے گھاٹ اُتارے جاچکے ہین اور روس کی پرانی سلطنت کی جگہ پر کئی آزاد جمہوری ریاستین موجود ہین ان سب مین سے سب سے بڑی روس کی جمہوریت نئے اصولون پر حکومت کرنے کے تجربہ کر رہی ہے۔ آسٹریا اور ہنگری کی صدیون کی پرانی سلطنت کے حصے بخرے کیے جا چکے ہین۔ پولینڈ۔ لتھونیا۔ اور بوہیمیا کی پرانی سلطنتین اپنے جو ؤن آزاد ہوگئی ہین۔ سرویا ایک بڑی سلطنت بن چکی ہے۔ فن لینڈ۔

استھونیا۔ اور لیٹویا۔ آزاد ہو گئی ہیں۔ یورپین ٹرکی کے حصے یونان کی نذر ہو گئے ہوتے اگر کمال پاشا اپنی تلوار کے زور سے اور ہندوستانی اپنی جدوجہد کے زور سے برطانیہ کو عہدنامہ سیورے پر نظرثانی کرنے پر مجبور نہ کرتے۔ پرانی روایات ختم ہو چکی ہیں۔ انجمن الاقوام دنیا کی سلطنتوں میں امن قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے۔ چار سال کے تجربے نے ظاہر کر دیا ہے کہ یہ سب تبدیلیاں بے معنی ہیں جب تک لوگوں کے دلوں میں سے پرانے کینے دور نہ ہو جائیں اور پچھلے بغض نہ نکل جائیں +

سری رام شرما۔ ایم۔ اے

مایوسی روح کے لیے موت ہے۔

آرزو کا ترک کرنا ہی تونگری ہے۔

ایک دوسرے کے احترام ہی سے محبت باہمی کو استحکام ہوتا ہے۔

انسان کا پیٹ ہی اُس کا دشمن ہے۔

تحمل و بردباری سے علم کی زینت ہوتی ہے

راحت صرف اچھے کاموں میں ہے۔

باطل کی حکومت چند لمحوں تک قائم رہتی ہے۔ اور سچائی کی حکومت قیامت تک۔

(سوز و ساز) (ارشادات حضرت علی)

کون مقدّم ہے

قومی تحریک میں جن دشواریوں کا سامنا ہے انمیں سب سے زیادہ مہیب یہ اعتراض ہے کہ اسکی بنیاد کمزور ہے۔ کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ اس تحریک سے صرف تعلیم یافتہ جماعت کو دلچسپی ہے۔ یہ قول کہ عوام نے گاندھی جی کی تجاویز کو اہمیت دی ہمارے دعوے کی تردید نہیں کرتا کیونکہ کثرت رائے اسطرف ہے کہ عدم تعاون کے مذہبی نہ کہ سیاسی پہلو نے جمہور کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ولو نیز گاندھی "مہاتما" نہ کہ گاندھی "مدبر" کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ انکا اثر اُسی وقت گھٹنا شروع ہو گیا جب گاندھی سوراج جسکا وعدہ کیا گیا تھا خواب خیال ثابت ہوا۔ سب پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ جمہور نے تحریک عدم تعاون میں غیر معمولی جوش کا اظہار کیا اور حصہ لیا لیکن اسکا باعث مہاتما جی کی شخصیت تھی نہ کہ وہ کام جسکا انھوں نے بیڑا اُٹھایا تھا۔ بات یہ ہے کہ عوام کو سیاسی اُمور سے وقفیت یا دلچسپی نہیں صدیاں گذر گئیں کہ وہ اقتصادیات سے بے تعلق ہیں۔ مقامی انتظامات میں تو کچھ کچھ دخل رہا لیکن وسیع پیمانہ پر حکمرانی کا خیال اُنکے فہم سے خارج ہے وہ اُسے اپنے دائرۂ عمل سے باہر سمجھتے ہیں۔ انکی روایات کا یہ مقتضا ہے کہ اقتصادیات کو اُنھیں پر چھوڑ دیا جائے جنھیں پشتہا پشت سے اسکی استعداد چلی آتی ہے یعنی جو صاحب سیف یا اہل قلم ہیں۔ لہذا یہ امر غیر معمولی یا قابل تعجب نہیں کہ قومی تحریک کی عنان ایک مخصوص طبقہ کے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی تحریک میں بغیر عوام کی شرکت کے کامیابی نہیں ہوتی۔ آیا کوئی اُمید ہے کہ عوام الناس بحیثیت مجموعی مطالبہ حکومت خود اختیاری میں تعلیم یافتہ اصحاب کا ساتھ دینگے؟ اس سوال کا جواب خود تعلیم یافتہ گروہ دے سکتا ہے۔ کچھ عرصہ سے یہ ضرور ہے کہ اس خلیج کو پاٹنے کی بیحد کوشش کیجا رہی ہے جو تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ فرقوں کے درمیان حائل ہے۔ اس امر کا بھی ادعا کیا جاتا ہے کہ ہماری آواز جمہور کی آواز ہے۔ لیکن نگاہ غور سے دیکھنے پر یہ دعوے من وعن قابل قبول نہیں ٹھہرتا۔ ملک میں تعلیم یافتہ جماعت کا اثر ضرور ہے۔

لیکن دائرہ اثر محدود ہے۔ وہ عامۂ خلائق کو خوابِ غفلت سے بیدار اور خاص طریقون سے آمادہ کار کر سکتے ہین لیکن بارہا افسوسناک تجربے ہوئے ہین کہ عوام الناس عرصے تک اُنکی رہبری قبول نہین کرتے بلکہ بہت جلد آزاد ہو جاتے ہین۔ یہ ایسا واقعہ ہے جس سے لفظ "اشتعال" کا اطلاق کیا تحریکات پر درستی کو ناگوار ہے۔ حامیان تحریک قومی کا اثر کلی نہین بلکہ جزئی ہوتا ہے۔ جہانتک قتل غارت سے تعلق ہے اسکی قوت و حقیقت سے انکار نہین۔ لیکن ایسا نظام حکومت قایم کرنے مین جو قابلِ عمل ہو اسکا فعل بہت سست ہے۔ ہندوستانی لیڈرون کا جمہور پر اثر ہو تو ہو وہ جمہور کے مطالبات کے صحیح ترجمان نہین ہین۔ یہ لیڈر اوّل تو اپنے ہی طبقہ کے نمایندے ہوتے ہین جو ذی اثر و صاحب اقتدار ہے۔ مگر یہ طبقہ پورا ملک تو نہین۔ اور جب اسکے اور عوام کے مطالبات مین نقیض پیدا ہوتی ہے مثلاً مالی مسئلون پر تو ایسی صورت مین اپنے ہی طبقہ کے خیالات غالب آتے ہین جمہور اور مخصوص طبقون کے نقطہائے نظر جسقدر ہندوستان مین مختلف ہین اسکی مثال کسی مغربی ملک مین نہین ملتی یورپ اور امریکہ مین قسمت کی مساعدت یا دماغی قابلیت ایک مزدور کو سلطنت کا رکن بنا سکتی ہے سوسائٹی کے مختلف طبقون کا امتیاز اُن ممالک مین مالی اور اسوجہ سے زیادہ تر مصنوعی ہے۔ بخلاف اسکے ہندوستان مین یہ فرق موروثی، قطعی، اور ناقابل حذف ہے۔ یہی سبب ہے کہ جمہور کی ہر ایک ایسی تحریک سختی سے کچل جاتی ہے جس سے وہ طبقۂ اعلےٰ کیطرف بڑھ سکین حالانکہ مغربی ممالک مین یہی عام قاعدہ ترقی تمدن کا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ صرف طبقۂ اعلیٰ سے "قوم" بنائی جائے اور کیا بیرونی نظام (بیوروکریسی) کو نکالکر انکی جگہ اپنے ہم قوم رکھنے سے سوا چند خاص آدمیون کے عوام کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ کوئی منصف مزاج باور نہ کریگا کہ اسطرح جمہور کی حالت سُدھر سکے گی۔ تعلیم یافتہ حضرات کا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ وہ اپنے اہل ملک کی ضروریات کو سمجھتے ہین۔ اور اُنکی خواہش ہے کہ وہ ضروریات پوری کیجائین۔ مگر غیر برہمن خصوصاً طبقۂ ادنےٰ کے لوگ کیا کہتے ہین۔؟ انگریزی حکومت مین عیب ہون لیکن کم سے کم وہ ذات کی پیچیدگیون سے ایک بڑی حد تک آزاد ہے۔ بخلاف اُن لوگون کے جو اُسکی جگہ حکومت کے امیدوار ہین۔ سوراج کا کلمہ پڑھنے والون کو ثابت کرنا چاہیئے کہ اُن مین ہندوستان کی قدیم روایات کو پامال کرنے کی جرأت ہے۔ اور ذات پات کا خیال دل سے نکال کے ہر شخص کے ساتھ مساوی برتاؤ کر سکتے ہین۔ اگر ایسا نہ کیا تو سوراج ملنے پر بھی بجز چند افراد کے پورا ملک

مستقلیہ نہین ہوسکتا۔ مدبران ملک کو سوچنا چاہیے کہ "میرے دو نون بیٹے" اقتصادیات مین ایک خطرناک اصول ہے۔ اگر وہ باقاعدہ نظام حکومت قائم کرنا چاہتے ہین تو انکی سوسائٹی مین بہت ایسی باتین ہین جنہین پہلے قربان کرنا پڑیگا۔ جاپانیون نے ایسا ہی کیا اور ذات کی تفریق کو یک لخت اُٹھا دیا۔ ہمکو انکی ترقی پر رشک آتا ہے مگر انکی مثال پر عمل نہین کرتے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اصلاح قومی مقدم ہے اور حصول سوراج تک ملتوی نہین رہ سکتی۔ یہ کہنا کہ موجودہ حالت مین ذات کی تفریق مٹانے کی جد وجہد باعث نفاق ہے اور حصول مقاصد مین مخل اندازی ہوگی اخلاقی کمزوری کا اعتراف ہے۔

"صدائے غیب"

مختلف قومون مین مزاج پرسی کے فقرے

کیسے ہو۔ (انگریزی) تمہارا سایہ دراز ہو۔ (ایرانی)

کیسے گذرتی ہے۔ (فرانسیسی) تیری سلامتی ہو۔ (عربی)

کیونکر بسر ہوتی ہے۔ (جرمنی) تُنے خوب کھایا ہاضمہ تو درست ہے۔ (چینی)

خدا تمہین صبر عطا کرے۔ (روسی) تمہارے خاندان پر امن کا سایہ ہو۔ (عبرانی)

تمہاری عمر دراز ہو۔ (ہسپانی) تندرستی ہو۔ (افغانی)

آپکو پسینہ تو خوب آتا ہے (مصری) مزاج اچھا ہے۔ (ہندوستانی)

خوشیان مناتے نظر آؤ۔ (یونانی)

(پیام)

مطالعہ

کتابون کا بنی نوع انسان کے ساتھ وہی تعلق ہے جو حافظہ کا ایک ذات کے ساتھ۔ کتابون مین تاریخ انسانی کا بیان ہے، انہین ان لوگون کا تذکرہ بھی ہے جنھون نے بڑی محنت وکاوش سے بعض اشیاء کی ماہیت دریافت کی ہے، اور ہر زمانہ کے علم وفضل، وتجربہ کا بھی ذکر ہے، کتابین قدرت کی خوبصورت، وعجیب وغریب مناظر کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہین، زمانۂ مصائب مین ہماری امداد کرتی ہین، زمانۂ تکلیف وغم مین ہمین تسلی وتشفی دیتی ہین ہماری افسردگی کو خوشی کی گھڑیون سے بدلدیتی ہین، ہمارے دلون کو مالامال اور دل خوش کن خیالات سے معمور کر دیتی ہین اور ہمین عالم بیکسی وکس مپرسی سے عالم مسرت مین پہونچا دیتی ہین،

ایک مشہور مشرقی قصہ ہے کہ ایک بادشاہ ہر شب کو خواب مین دیکھتا تھا کہ وہ اس بادشاہی سے معزول ہو کر فقیر ہو گیا ہے، اور دوسرا شخص جو فقیر تھا ہر رات خواب مین بادشاہی کرتا تھا، اور عالیشان محل مین رہتا تھا، یہ تو مجھے معلوم نہین کہ آخرکار اُس کا نتیجہ کیا ہوا، آیا بادشاہ کا خواب سچا ثابت ہوا یا فقیر کا، ہر حال یہ سب تخئیل کا کرشمہ تھا اور تخئیل بعض اوقات اصلیت سے بہتر نظر آتی ہے، اگر ہان یہ حالت اسوقت ہو گی جب ہم کتابون کا مطالعہ کرینگے، ہم نہ صرف بادشاہ بنین گے اور عالیشان محلون مین ہین گے بلکہ کسی قسم کی تھکن اور خستگی محسوس کئے بغیر اور روپیہ خرچ کئے بغیر اپنے آپکو عالیشان پہاڑون پر اور دریا کے کنارے محو تماشا پائینگے، اور بہتیرن حصۂ زمین کی سیر وسیاحت کرین گے۔

فلسچر کہتا ہے "مجھے محفوظ ہونیکے لیے چھوڑ دو، اس جگہ میری کتابین ہین، یہ میری ہمدم ہین، مین ان فلاسفرون اور حکماء سے باتین کرتا ہون، پھر مین بادشاہون وشہنشاہون سے

ملاقات کرتا ہون اور انکی تجاویز کو جانچتا ہون، اگر انہون نے غیر منصفانہ طور پر فتح حاصل کی تھی تو میں انہیں ملامت کرتا ہون اور اپنے تصور مین انکی مورتون کو جو یادگار زمانہ ہین اُکھاڑ کر پھینکدیتا ہون کیا مین ایسی مسرت خیز چیزون کو شکوک اور خیالات باطل کے بدلے چھوڑ سکتا ہون نہیں۔ دولت فراہم کرنا تمہارا شعار ہے اور علم حاصل کرنا میرا کام ہے

بلاشبہ کتابین انیس خلوت ہین ہمارے بہترین اور پسندیدہ دوستون کو موت بے رحمی کے ساتھ ہم سے جدا کردیتی ہے، بخلاف اسکے خراب کتابون کو زمانہ مٹاتا ہے اور اچھی کتابون کی خودبخود قدر ہوتی ہے، بہت ایسے لوگ ہین جنھین دنیا کی بہترین خوشیان حاصل تھین وہ بھی آخرکار اعتراف کرتے ہین کہ انہین حقیقی خوشی کتابون سے حاصل ہوئی، "راسکام" ایک لیڈی مین گرے سے اپنی آخری ملاقات کا ایک دلگداز قصہ بیان کرتا ہے، اسنے دیکھا کہ لیڈی دریچہ مین بیٹھی ہوئی وہ مضمون دیکھ رہی ہے جس مین پلاٹو نے سقراط کے موت کا واقعہ بہترین پیرایہ مین بیان کیا تھا، اسکے مان باپ پارک مین شکار کھیلنے مین مشغول ہین، کتے شکار کے تعاقب مین زور زور سے چیخ رہے تھے، اور انکی آواز صاف طور پر کھلے دریچہ سے سنائی دے رہی تھی اسکو تعجب ہوا کہ لیڈی نے شکار مین کوئی دلچسپی نہ لی، اس نے جب اپنے تعجب کا اظہار کیا تو جواب مین جین نے کہا مین سمجھتی ہون کہ حقیقی خوشی شکار مین حاصل ہوتی ہو وہ اس خوشی کا محض ایک پرتو ہے جو مجھے پلاٹو کے بیان مین حاصل ہو رہی ہے:

میکالے کے پاس دولت تھی وہ صاحب عظمت، صاحب جاہ و منصب، اور ذی اقتدار تھا اس نے کافی شہرت بھی حاصل کرلی تھی تاہم وہ اپنی سوانح عمری مین لکھتا ہے "حقیقی خوشی مجھے اسوقت حاصل ہوتی تھی جب مین کتب بینی مین مشغول ہوتا تھا"، وہ ایک لڑکی کو ایک دلچسپ خط مین لکھتا ہے "تمہارے اس بے انتہا خوشنما خط کا شکریہ ادا کرتا ہون، مجھے اپنی چھوٹی لڑکی کو خوش کرنے مین ہمیشہ لطف آتا ہے، مگر کسی چیز سے مجھے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی کہ اسکی کتابون سے الفت دیکھکر حاصل ہوتی ہے، مین جانتا ہون کہ جب وہ میری عمر کو پہونچیگی تو اسے معلوم ہوگا کہ کتابین، میوہ جات، کیک، کھلونا، کھیل کود، وغیرہ سب سے بہتر ہین، اگر کوئی اس شرط پر کہ مین کتب بینی نہ کرون مجھے دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ بنانا چاہیئے، عالیشان محلات خوبصورت باغات، نفیس غذائین بہترین شراب، اور عمدہ فرنیچر، بیش قیمت پوشاک، اور ہزارہا

ملازم بھی سے تو میں ہرگز یہ بادشاہی پسند نہ کروں گا، میں اس بادشاہی پر اسکو ترجیح دونگا کہ ایک غریب آدمی رہوں اور ایک جھونپڑے میں کتابوں کے عمدہ ذخیرہ کیساتھ زندگی بسر کروں کتابیں ہی دلاویز، اور مسرت آمیز، خیالات انسانی دماغ کو عطا کرتی ہیں، بلکہ کتابیں ایک حد تک اصلی واقعات سے زیادہ روشن خیالات پیدا کرتی ہیں، جسطرح اکثر مرتبہ یہ دیکھا گیا ہے کہ عکس بہ نسبت اصل چیز کے زیادہ موزون و دلفریب ہوتا ہے،

جارج میکڈانلڈ لکھتا ہے "کہا جاتا ہے کہ آئینوں میں اپنی طرف توجہ منعطف کرنے کی خاصیت ہی مگر یہ نظم کا ادنیٰ کرشمہ ہے" اگر کسی کتاب کے مطالعہ سے دلچسپی نہ حاصل ہو تو اسکے معنی یہ نہیں کہ یہ کتاب کا ہی قصور ہے، بلکہ مطالعہ بھی ایک فن ہے، بغیر سمجھے بوجھے مطالعہ کرنا زیادہ مفید نہیں، اکثر لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں مگر بہت کم لوگ صحیح معنوں میں لکھنا پڑھنا جانتے ہیں کتاب کی عبارت پر سرسری نظر ڈالنا یا صرف ورق گردانی کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ کتاب کے ہر لفظ کے معنی سمجھ میں آئیں اور کتاب میں جو ذکر ہے اُس سے پوری واقفیت حاصل ہو، تاکہ تخئیل کی فضا میں اُنکی بہترین تصویر کھینچ سکیں" اسکام کہتا ہے کہ بیس سال کے تجربہ سے جتنا حاصل کر سکتے ہیں، علم اُس سے زیادہ ایک سال میں سکھا دیتا ہے، علم بہت سہولت کے ساتھ تعلیم دیتا ہے، تجربہ عقلمند کی حالت کو زبون کر دیتا ہے، وہی بدنصیب جہاز کا مالک ہوشیار و قابل خیال کیا جاتا ہے جس سے کئی جہاز نذر طوفان کئے ہوں، ایک بدبخت سوداگر دو چار بار دیوالہ نکالے بغیر مالدار اور عقلمند نہیں ہو سکتا۔ جو عقل تجربہ سے حاصل ہوتی ہے بہت قیمتی ہوتی ہے، ہمیں اسی تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدت دراز تک آوارہ پھرنے کے بعد ایک چھوٹا راستہ دریافت کرنا کسقدر تکلیف دہ ہی، جس شخص نے تلخ تجربات کے بعد عقل سیکھی ہو یقیناً وہ عقلمند و تیز فہم ہوگا، مگر اُس تیز دوڑنے والے کے مانند جو اپنا راستہ چھوڑکر دوسری طرف جانے کے لیے تیز بھاگتا ہے اور رات ہو جانے پر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہونچا، فی الواقع بہت کم لوگوں نے غیر ممکن الحصول تجربہ سے خوشی یا عقلمندی حاصل کی ہے، چند بزرگوں کی ابتدائی زندگی پر غور کرو خواہ وہ متقدمین ہوں، خواہ متاخرین ہیں، جنھوں نے بغیر علم کے ایک زمانہ کے تجربہ کے بعد کچھ عقل اور کسی قدر خوشی حاصل کی ہے، غور کرنے

پہ معلوم ہوگا کہ کس قدر بے حمالیت برداشت کرتے اور کن کن خطرون سے نجات پانے پر انہین یہ بات نصیب ہوئی اور جنمین سے اُنہیں تو انھین مصائب کا شکار ہوگئے، بس تمھین ٹھنڈے دل سے سوچو کیا تم اسے پسند کروگے کہ تمہارا بیٹا اس قسم کے تجربۂ تلخ کے بعد خوشی و عقل حاصل کرے،، کتابون کا انتخاب بھی اسی طرح مشکل ہے جس طرح دوستون کا جن کتابون کا ہم مطالعہ کرین اُن کے اسیطرح ذمہ دار ہین جسطرح اعمال کے ایک عمدہ کتاب ملٹن کے نقطۂ نظر سے ایسکے عظیم الشان الفاظ مین روح کا وہ گرانمایہ خون ہے جو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے لیے محفوظ اور جمع کیا گیا ہو رسکن تعلیم نسوان کے باب مین بہت خوب لکھتا ہو کہ ہمین اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ ایک لڑکی کے دامن مین کتابین اس طرح نہین جمع کی گئی ہین جس طرح ایک گردشی لائبریری مین جو کثرت استعمال سے اور لوگون کے انگوٹھون کے استعمال سے بوسیدہ ہوگئی ہین اور جو بیوقوفی کے چشمہ مین ڈوب کر نکلی ہین۔ ہمین چاہیے کہ کتابین ترقی و اصلاح کی غرض سے پڑھین، نہ تفریح طبع اور وقت کاٹنے کے لیے، آسان و دلچسپ کتابین جیسی ہوتی ہین ان کی مثال یہ ہو کہ جیسے شکر، کھانے کی ضروری و اہم اشیاء مین سے ہے خصوصاً بچون کے لیے، مگر اس سے زندگی بسر نہین ہوسکتی، بعض ناول بہت اچھے اور عمدہ ہوتے ہین مگر انہین مین زیادہ مستغرق رہنے سے اصلی لطف مین بڑی حد تک کمی ہوجاتی ہے جو مطالعہ سے حاصل ہونا چاہیئے۔

نیز بعض کتابین ایسی ہین جنھین کتاب کے نام سے موسوم کرنا بھی درست نہین انکا پڑھنا گویا بیکار وقت ضایع کرنا ہو، بعض ایسی خراب ہین جو انسان کو بگاڑ دیتی ہین، اور انسان مین شہوانی جذبات پیدا کرتی ہین ایسی کتابین سوسایٹی کے لیئے بے حد مضر ہین، ان کے مصنفون کا نام لینا بھی گناہ ہے، بعض مواقع پر جبکہ ہمین زندگی کی حوائج اور خطرات سے بچنے کے لیے آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے یہ کتابین ہماری خواہشون کو اور اشتعال دلاتی ہین، اور خطرات مین ڈالدیتی ہین، بس جو چیز ہمین برائی مین ڈالے وہ خود بری ہے،

بہت سی ایسی کتابین بھی ہین جنکا پڑھنا کسی طرح فائدہ سے خالی نہین، مفید لٹریچر سے ہمارا مطلب صرف انہین کتابون سے نہین ہو جو ہمیشہ دردون کی مدد کرین گو حقیقت مین یہ بھی کارآمد اور نتیجہ خیز ہین عمدہ کتابین وہ ہین جو ہمارے خیالات کو بلند کرتے ہوئے اُس بے غرضانہ خیالات کے نقطہ

میں پہونچاتی ہیں جہاں شخصی اغراض و مقاصد زائل اور دنیاوی تکالیف و افکار فراموش ہو جاتے ہیں مطالعہ کے وقت مخل ہونا بہت ظلم کرنا ہے جس کی مخالفت میں ہیمرٹن لکھتا ہے «فرض کرو ایک شخص اپنے مرغوب طبع مصنف کے تصنیف کے مطالعہ میں بالکل غرق ہے وہ مصنف جس نے ایک بالکل مختلف زمانہ میں زندگی بسر کی تھی جسنے ایک بالکل جداگانہ زمانۂ تہذیب میں آنکھ کھولی تھی مثلاً تم پلاٹو کا وہ معرکۃ الآرا مضمون جو تاریخ قلم کے مرقع میں سب سے زیادہ عبرتناک منظر ہے پڑھ رہے ہو، اسوقت تمام گذشتہ واقعات پیش نظر ہیں، پانچسو ایتھنز کے کرسی نشینان عدالت، وہ مخصوص عمارات، وہ ایتھنز کی جوشیلی پبلک، متنفر لیٹیس، دشمنان حاسد، نشۂ محبت سے سرشار گرویدگان تلامذہ و معتقدین کی جماعت جنکا نام ہمارے لیے باعث فخر ہے اور جنکا نام صفحۂ روزگار پر ہمیشہ قائم رہیگا، اور ان سب لوگوں کے بیچ میں ایک دبلی پتلی ہستی نظر آتی ہے یہ ایک غریب آدمی کے مانند ادران معمولی کپڑوں میں ملبوس ہے، جسکا لباس موسم گرما و سرما میں یکساں ہے، ایک صاف چہرہ نظر آتا ہے جو ہمت و استقلال و ضبط کی زندہ مورت ہے، سچائی پرست جانیوالا سچائی پر قربان ہوجانے والا، ملک و قوم کا فدائی و شیدائی، جو اس خشک زمین کو اپنے خون سے سینچنے والا ہے

تم اس تصویر کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہو، وا ہا اس کے ہونٹ ہلنے لگے، اب تم وہ دل ہلا دینیوالا مضمون شروع کرنیوالے ہو جہاں سقراط مقام پرٹینیم میں آرام و آسائش سے دن گذارنے پر اپنے اوپر لعنت کرتا ہے اور اپنے اہل وطن کے سامنے ایک آخری تقریر کرتا ہے جو پند و نصائح سے لبریز ہوتی ہے اور اس جملہ پر ختم کرتا ہے، اچھا۔ اب اے اہل وطن، رخصت میں اپنا راستہ لوں اور تم اپنا میرا راستہ موت کا ہے، اور تمہارا حیات کا۔ ان دونوں راستوں میں بہتر کون ہے، اسکا علم سوا خدا کے اور کسی کو نہیں، ایسی دلچسپ داستان کے دوران مطالعہ میں مداخلت ظلم ہے، اگر تم مداخلت سے ختم داستان تک محفوظ رہو تو اسوقت مسرت آمیز خوشگوار لمحوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہو۔ جو دماغی محنت و مشقت کا انعام ہے»، کوئی شخص ایک عمدہ دلچسپ کتاب صرف ایک گھنٹہ دیکھ بھی بغیر محظوظ اور لطف اندوز ہوئے نہیں پڑھ سکتا، یہ لطف فی الفور زائل نہیں ہو جاتا بلکہ باقی رہتا ہے عمدہ اندیاکیزہ خیالات کا خزانہ ہمارے سینہ میں منتقل ہو جاتا ہے اور جب کبھی ہمارا دل چاہے ہم اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں

(ترجمہ)　　محمد عبد المنعم (علیگ)

جواہرات عالم

کالے شہزادے کا لعل

لندن کے مشہور و معروف ٹاور مین انگلستان کے شاہی جواہرات کے ساتھ وہ شاہی تاج بھی رکھا ہے جو تاجپوشی کے وقت وارث تخت کو پہنایا جاتا ہے۔ اس تاج مین سرخ رنگ کا ایک بیش قیمت لعل جڑا ہوا ہے جسکو کالے شہزادے کا لعل کہتے ہین۔ کالا شہزادہ[۱] انگلستان کا ایک بہادر شہزادہ تھا اور یہ لعل اسی شہزادے کے نام سے منسوب ہے۔

۱۳۶۷ء کے گڈ فرائی ڈے کے موقع پر یہ بہادر شہزادہ ایفائے عہد کے جوش مین والئ کاسٹائل[۲] کے مدد کے لیے گیا تھا۔ انگریزی فوج کے علاوہ خود شاہزادے کی مخصوص فوج بھی اسکے ساتھ تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ شاہ پیڈرو[۳] والئ کاسٹائل کو اسکے بھائی ہنری نے تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا۔ اور کالے شہزادے کی خواہش تھی کہ شاہ پیڈرو کو تخت واپس دلا دے۔

شہزادے کو شاہ پیڈرو سے دلی ہمدردی نہ تھی کیونکہ یہ بادشاہ ایک درشت مزاج اور تند خو آدمی تھا۔ برخلاف اسکے اسکا بھائی ڈان ہنری[۴] نہایت خلیق اور بہادر شخص تھا۔ اسلیے شاہزادے کو شاہ پیڈرو سے نفرت اور اسکے بھائی ڈان ہنری سے دلی ہمدردی تھی۔ لیکن اپنے عہد و پیمان کی وجہ سے شاہ پیڈرو کی مدد کرنے پر مجبور تھا تاہم وہ اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ نہ رکھ سکا اور سب کو علم ہو گیا کہ کالا شہزادہ ڈان ہنری کا خیر خواہ ہے۔

یکم اپریل کو دونون فوجین بمقام نجارا[۵] نہایت جوش و خروش سے صف آرا ہوئین آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور ہتھیارون کی چمک دیکھنے والون کی نگاہون کو خیرہ کر رہی تھین۔ شاہزادہ

---

۱ BLACK PRINCE

۲ CASTILE

۳ DON PEDRO

۴ DON HENRY

۵ NAJARA

انگریزی سپاہیوں کے آگے تھا۔ اسکے سیاہ لباس اور مشکی گھوڑے سے اسکی امتیازی شان نمایاں تھی۔ اور اسی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اسکا نام کالا شاہزادہ مشہور ہوگیا تھا۔

شاہ پیڈرو بھی شاہزادے کے ساتھ تھا۔ اسکا زرق برق فوجی لباس اور نقرئی سازو سامان اسکے شاہانہ اقتدار کو نمایاں کر رہے تھے۔ لیکن در اصل وہ تیرہ باطن اور کود سواد آدمی تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کالے بادشاہ کا خطاب اسی کے لیے زیادہ موزون تھا اسکی سفید مخملی ٹوپی آفتاب کے شعاع بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ جسمین ایک سرخ رنگ کا لال نہایت آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔

دوسری طرف ہنری اور فرانسیسیون کی فوجین صف آرا تھین۔ بلبل جنگ بجھتے ہی دونون فوجین مل گئین اور معرکہ کا بازار گرم ہوگیا۔ شہزادے نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کی۔ اور شاہ پیڈرو کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ آج معلوم ہوجائیگا کہ آپکی سلطنت اس ملک کے کسی حصہ مین ہے یا نہین۔ خدا اور سینٹ جارج کے بھروسے پر قدم بڑھائیے چلو۔

گڈ فرائڈے کا پورا دن جنگ کی نذر ہوگیا، لڑائی زور شور سے جاری تھی۔ اور فتح و شکست کا اندازہ مشکل تھا۔ فرانسیسی اور انگریزی فوجین نہایت خوبی سے فرائض جنگ ادا کر رہی تھین۔ لیکن اسپین والے اس خونریز تماشے مین سُست ایکٹرون کی طرح کام کر رہے تھے۔ ڈان ہنری اگرچہ بڑی بہادری سے مقابلہ کرتا رہا لیکن شکست اُسکے مقدر مین تھی۔ آخر اسے میدان جنگ چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نآیا اور وہ اپنی ہزیمت خوردہ فوج کے ساتھ دریائے نجیرلا کو عبور کرنے پر مجبور ہوگیا۔ انگریزی فوج بھی تعاقب مین ساتھ ساتھ گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہنری کو وہان بھی دم لینا نصیب نہوا۔

شاہزادہ ولیعہد نے فتح کی خوشی مین برطانیہ کا جھنڈا بلند کیا اور اسکی فوج ہر طرف سے سمٹ کر جھنڈے کے نیچے آگئی۔

شاہ پیڈرو بھی اپنا جھنڈا لیے ہوئے وہان پہونچگیا، اور گھوڑے سے اُترکے شاہزادے کا شکریہ ادا کرنے لگا شاہزادے نے کہا، کہ فتح خدا کی مہربانیون پر منحصر ہے اسلیے حقیقی شکریۂ

کا حق خداے کریم ہے

بہرحال تماشہ پیڈرو اور شاہزادہ دونوں لب دریا کھڑے تھے دریا کا پانی مقتولین کے خون سے سرخ ہو رہا تھا سفیر سر دن نے اطلاع دی کہ قیدیون کی ایک بڑی تعداد انگریزی فوج کے قبضے میں ہے یہ سنکر شاہ پیڈرو کا سیاہ چہرہ غضبناک ہوکر اور بھی سیاہ ہوگیا۔ اُس نے شہزادے سے کہا کہ سارے قیدی میرے حوالے کردیے جائین تاکہ مین انھین اپنی مرضی کے مطابق قتل کراؤن۔

اس خونین درخواست پر ہر طرف سناٹا چھا گیا اور شاہزادہ سنجیدگی کیساتھ سنگدل پیڈرو کا منہ دیکھنے لگا۔

شاہزادہ کو یقین کامل تھا کہ پیڈرو جیسا بیرحم آدمی ایک قیدی کا زندہ رہنا بھی گوارا نہ کریگا اسلیے اُسنے نہایت جرارت سے کہا، جناب عالی! کیا آپ میری کوششون کو کسی معاوضے کے قابل سمجھتے ہین اگر سمجھتے ہین تو میری ایک گذارش ہے!

شاہ پیڈرو سوائے اسکے اور کیا کہہ سکتا تھا کہ "مین آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے مستعد ہون۔

شاہزادہ نے کہا، ان قیدیون کو معاف کر دیجیے یہی میری خواہش ہے!

تھوڑی دیر تک بیرحم پیڈرو خاموش رہا آخر بادل ناخواستہ قیدیون کی جان بخشی کر دی اور اپنے ٹوپی سے ایک بیش قیمت لعل نکالکر شاہزادے کے سامنے تحفتہً پیش کیا اور کہا کہ یہ اس زبردست فتح کی یادگار ہے۔ یہی لعل ہے جو کالے شاہزادے کے نام سے منسوب ہوکر کالے شہزادہ کا لعل بنگیا اور یہی پہلا موقع تھا کہ اسکو تاج انگلستان سے نسبت تقرب حاصل ہوئی۔

مشہور ہے کہ یہ لعل فتح و اقبال کا طلسم ہے جسکی بارہا آزمایش ہوچکی ہے۔ اِس واقعہ کے نصف صدی کے بعد شاہ ہنری پنجم کو سرزمین فرانس پر شاہ چارلس سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ انگریزی فوج تہک کر فتح سے ناامید ہوچکی تھی۔ صبح کیوقت شاہ ہنری گھوڑے پر سوار اپنی فوج کا معائنہ کررہا تھا۔ سپاہیون نے اسکی ٹوپی مین اِس خونی رنگ کے لعل کو دیکھکر شگون نیک خیال کیا اور آپس مین سرگوشیان کرنے لگے کہ شاہزادہ بلیک پرنس کا لعل ہمیشہ فتیاب رہا ہے! اِس خیال

سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتوں مین ایک تازہ روح آگئی اور بالآخر ایسی شاندار فتح نصیب ہوئی جو آجتک برٹش فوج کے کارنامون مین زرّین حروف سے تحریر ہے۔

بلیک پرنس کا فوجی لباس ابتک کنٹربری کتھڈرل مین محفوظ ہے۔ جسکو دیکھکر اس بہادر شاہزادے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

رام سرن نگم

تنہائی

از ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موجِ بیتابی — ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لؤلوئے لالاست در گریبانت — درون سینہ چو من گوہرِ دلے داری؟

تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت

بہ کوہ رفتم و پرسیدم "این چہ بیدردیست — رسد بہ گوش تو آہ و فغانِ غمزدئے!
اگر بہ سنگ تو لعلے ز قطرۂ خون ست — یکے در آ بہ سخن با منِ ستمزدئے"

بخود خزید و نفس درکشید و ہیچ نگفت

رہ دراز بریدم ز ماہ پرسیدم — سفر نصیب، نصیبِ تو منزلیست کہ نیست
جہان ز پرتوِ سیمائے تو سمن زارے — فروغِ داغِ تو از جلوۂ دلیست کہ نیست

سوئے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت

شدم بحضرتِ یزدان گذشتم از مہ و مہر — کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہان تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل — چمن خوش است ولے درخورِ نوایم نیست

تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نگفت

(اقبال)

(اردو)

فریب محبت

(گزشتہ سے پیوستہ)

"تم مجھے کیون ستا رہے ہو؟ تمہین دیا نہین آتی، بھلا ایک بیکس عورت کو برباد کرکے تمہین کیا ملجائیگا، مجھ سے کون ایسی خطا ہوگئی جسکی سزا مین تمنے میری خوشی چھین رکھی ہو! مین تم سے یہ نہین کہتی کہ تم موہنی کو چھوڑ دو، مجھے تو تم سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ تم نے مجھے کیون چھوڑ رکھا ہے؟ سوچو تو سہی جب تم ہی مجھے نظرون سے گراؤگے، تو پھر مین کسکی آنکھون مین سماؤنگی، تم جو کچھ کر رہے ہو مین اسے برا نہین کہونگی، پر تمہاری بدنامی مجھ سے سنی نہین جاتی۔ دیکھو ایسی دیشیائین کسی کی نہین ہوتین، بے شرمی انکا مان ہے اور دھن انکا ایمان۔ مین اپنے لیے نہین کہتی تمہارے بھلے کو کہتی ہون، یہ ہنسی دھوکا ہے اور آخر کار دھوکے جب پردہ اٹھتا ہے تو آدمی کو پچھتانا پڑتا ہے میری مانو، مین تمہارے چرن دھو دھو کر پینے کو تیار ہون، بس میری تم سے یہی پرارتھنا ہے کہ تم بچا مان، اور میرا جیون برباد نہ کرو"

شدت غم، ہجوم تمنا، اور جوش بیان مین قوت گویائی ایک حد تک سلب ہوجاتی ہے کامنی کی بھی یہی حالت تھی، وہ بات کر رہی تھی مگر الفاظ اوسکے گلے مین اٹک اٹک جاتے تھے کامنی کی سماجت سندر سنگھ کو نرم نہ کرسکی اُسنے جھلا کر کہا "مین نہ تمہاری نصیحت سننے کے لیے آیا ہون اور نہ ان باتونکا مجھ پر کوئی اثر ہوسکتا ہے۔ تم اپنی کوششون کو بیکار صرف نہ کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، تمہارے لیے گھر مین ہر قسم کا آرام موجود ہے"

کامنی کی آنکھون مین آنسو بھر آئے، اُس نے بھرائی ہوئی آواز مین کہا "اگر عورت کا یہی آرام ہے جو تمنے سمجھ رکھا ہے تو مجھے اپنے گھر کیا تکلیف تھی؟"

سندر سنگھ "کیون کیا میرے گھر مین تمہین کوئی تکلیف دیجاتی ہے؟"

کامنی: نہین تو، پر جب تم ہی میرے نہین ہو سکتے، تو مین آرام کو لیکر کیا کرونگی،، رہی تکلیف کی بات تو مجھے اس سے زیادہ اور تکلیف کیا ہو سکتی ہے کہ تم جو میرے آرام ہو مجھ سے چھنے جاتے ہو"

سندرسنگھ "میرے پاس تمہاری ان باتون کے سُننے کا وقت نہین، چابیان کہان رکھی ہین اپنے سنگاردان کی چابی مجھے دو، رات زیادہ ہوتی جاتی ہے، مجھے ابھی جانا ہے"

کامنی سندرسنگھ کے قدمون پر جھک گئی اور رکتی ہوئی آواز سے بولی "چابی مین نہین دیتی ہون پر آج باہر نہ جاؤ، اپنی داسی کی یہ پرارتھنا قبول کرلو،، اور سر اٹھا کر اسطرح سندرسنگھ کو دیکھنے لگی جسطرح ایک ناکردہ گناہ قتل کا ملزم فیصلہ سے پہلے جج کا منھ دیکھتا ہے،،

سنگدل شوہر نے جواب دیا "کیون ضد کر رہی ہو، مین ٹھہر نہین سکتا، ایک ضروری کام ہے، لاؤ چابی مجھے دیدو"

ساری کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کامنی نے کہا۔" تو کیا مین تمہاری کوئی نہین جو تم میری ایک ذرا سی بات نہین مانتے،،

سندرسنگھ ذرا سخت لہجہ مین بولا "تم مجھے ناحق پریشان کر رہی ہو، بتاؤ سنگاردان کی چابی کہان ہے"

کامنی۔ چابی تو مین تمھین دینے کہتی ہون"

سندرسنگھ۔ تو لاؤ!

کامنی۔ ہان دیتی ہون، لیکن تم یہ کہدو کہ مین اسوقت نہین جاؤنگا۔

سندرسنگھ۔ یعنی مین جاؤن تو تم مجھے چابی نہین دوگی، یہی بات ہے نا؟

کامنی۔ نہین یہ بات نہین،

سندرسنگھ۔ پھر اس ضد سے تمھارا کیا مطلب ہی؟

کامنی جسطرح یہ میرے سنگاردان کی چابی، اور میرا سب کچھ تمہارا ہے اسیطرح تم کیون نہین میرے ہوتے"

سندرسنگھ کی برہمی بڑھتی جاتی تھی، اگر بیش قیمت موتیون کا ہار موہنی کا مقصود خواہش نہ ہوتا تو شاید وہ غریب کامنی کو اس طرز گفتگو کا بھی مستحق نہ سمجھتا جسے وہ اپنے نزدیک حسن تعلق کی ایک بہتر مثال سمجھ رہا تھا، اُسکی طبیعت مین کچھ اشتعال پیدا ہوگیا اور اسنے سوچا "کیا عورت اس حد تک ضدی ہو سکتی ہی" پھر سخت لہجہ مین بولا "تم ضد کر رہی ہو اور مین نہین چاہتا کہ تمہارے ساتھ کسی سختی سے پیش آؤن"

کامنی۔ تم اس سے زیادہ سختی اور کیا کر سکتے ہو جو کر رہے ہو، لوگ کہتے ہین کہ موت کی سختی ناقابل برداشت ہوتی ہے، لیکن مین اوسے اسکے سامنے کچھ نہین سمجھتی، بلکہ روز اوسکی دعا کرتی ہون لیکن وہ نیا بہت بڑی ہے، انسان یہان جس چیز کی خواہش کرتا ہے وہ اس سے دور بھاگتی ہے، مجھ ابھاگن کو موت بھی تو نہین آتی،،

سندر سنگھ جسے ہر لمحہ شاق گذر رہا تھا، بولا " اچھا اب مین سب کچھ سن چکا مجھے چابی دیتی ہو یا نہین کامنی کے ہونٹون پر غم آمیز تبسم پیدا ہوا، اسنے کہا " مین اسطرح چابی نہین دیسکتی، جب تم میری بات نہین مانتے تو مین تمہاری بات کیون ماننے لگی،،

سندر سنگھ جھلا گیا اور خود کمرہ مین چارون طرف چابی تلاش کرنے لگا، بچھونے پر، الماری مین اوسکی کتابون والی میز کی دراز مین لیکن کہین پتہ نہ چلا۔ چابی ہاتھی دانت کے قلمدان مین رکھی ہوئی تھی، سندر سنگھ کے چہرہ پر شکنین پڑ رہی تھین، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہان آکر سخت مصیبت مین گرفتار ہو گیا ہے "

عورت مٹی کی کچی مورت ہے اور پھر ایک سنگین مجسمہ اسے جسطرف چاہو جھکا دو اور وہ کسی طرف نہین جھکائی جا سکتی، پریم کی بھوکی استری مٹی کی کچی مورت ہوتی ہے، ایک چھوٹی سی بات بھی اوسکے من کو ادھر سے اُدھر کر دیتی ہے۔ کامنی سے سندر سنگھ کی پریشانی دیکھی نہ گئی، وہ اگرچہ جانتی تھی کہ سندر سنگھ چابی لیکر کیا کریگا، تاہم اُس نے قلمدان کھول کر چابی نکالی، سنگاردان اُٹھا کر شوہر کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا " مین ہنس رہی تھی، سنگاردان موجود ہے چابی اور سنگاردان دونون لیتے جاؤ، اور میری جانب سے موہنی سے پوچھنا کیا وہ تمہین اس سے بڑھ سکتی ہے سندر سنگھ نے خاموشی کیساتھ چابی اُٹھائی، سنگاردان کھولا، بیش قیمت موتیون کا ہار نکال کر جیب مین ڈالا، سنگاردان بند کر دیا، اور چابی میز پر رکھکر چلنے کے لیے دروازہ کیطرف قدم اُٹھائے کامنی نے بیچین ہو کر کہا " ہار تو لیگیا، صبح ہی جا کر دیدینا، رات بھی زیادہ گذر گئی ہے۔ موہنی کیا اب جاگ رہی ہوگی ؟

سندر سنگھ نے اوسکا کچھ جواب نہ دیا، گویا وہ بہرا ہے، یا کامنی کی آواز اُسکے کانون تک نہین پہنچی وہ کمرہ کے دروازہ پر پہونچ چکا تھا کہ کامنی نے جھپٹ کر آہستہ سے اوسکا دامن پکڑ لیا اور بولی ایک

بات اور سُننے جاؤ، اسندر سنگھ نے دامن کو جھٹکا دیا اور اسطرح دروازہ سے نکلکر چلا گیا جسطرح طائر روح گرفتار قفس سے چھوٹ کر جاتا ہے۔ غریب کامنی دیکھتی رہگئی،

انسان کا دل آئینہ ہے اور امید اسکا جوہر، آئینہ کا جوہر اگر فنا کر دیا جائے تو آئینہ بیکار ہوجاتا ہے اسیطرح امید جب ٹوٹ جاتی ہے تو دل مردہ ہوجاتا ہے اور آدمی چاہتا ہے کہ اسے سینہ سے نکالکر پھینکدے انسان کی زندگی شراب ہے، اور آرزو اسکا خمار، شراب سے خمار اگر مٹا دیا جائے تو پھر وہ شراب نہیں رہتی اسیطرح اگر آرزوؤں کا خون ہو جائے تو زندگی بے کیف ہوجاتی ہے۔

کامنی کی اُمید ٹوٹ گئی تھی اور آرزو کا خون ہوچکا تھا، وہ دلمین کہہ رہی تھی

"پرماتما! مین اب زندہ کیون ہون،، عورت کی زندگی شوہر کی محبت ہے، جب یہ محبت مجھ سے چھن گئی تو مرا جینا نہ جینا برابر ہے،

آہ جسکے سہارے دنیا کے ساگر مین میرا بیڑا چھوڑدیا گیا اس ظالم نے کنارے ہی پر بیدردی کیساتھ مجھے ٹھکرا دیا۔ میرا جیون جسکی مسرتون کے چمن کو سیراب و شاداب کرنے کیلیے نذر کیا گیا تھا وہ چاہتا ہے کہ اوسے اپنے ظلم کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ مین جس گھر کو اپنا گھر سمجھی اوس کے رہنے والے مجھے لونڈی کے مان کا بھی مستحق نہین سمجھتے، مین نے اپنے مان باپ بھائی بہن چھوڑکر جنھین اپنا مان باپ بھائی بہن سمجھا، انھین میری صورت دیکھنا تک گوارا نہین، کیا سنسار مین میرے لیے دُکھ ہی دُکھ ہے یا صرف مین ہی ایسا گن دُکھ کے لیے بنائی گئی ہون، لیکن مین سمجھتی ہون کہ آدمی سنسار مین دُکھ سہنے کے لیے نہین بھیجا گیا ہے اگر ایسا ہوتا تو یہ آتما سکھ کی تلاش مین ڈانواڈول نہ رہتی۔

سچ ہے عورت کی انتہائی تذلیل اوسمین ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کردیتی ہے سکو کی بہو کی عورت نفس کی وساطت سے خارزار گناہ کی جانب بڑھی چلی جارہی تھی اوسکی کامنائین ایک سبز باغ تیار کررہی تھین، اور وہ گویا اوسمین گلاب کی روش پر بیٹھی ہوئی ایک خوشنما پھول کو چوم رہی ہے، اور کبھی کبھی چمن کے ایک گوشہ سے آنیوالی بانسری کی سُریلی آواز اوسکی سامعہ نوازی کررہی ہے اوسکے خیالات ایک دلفریب وادی مین چکر لگارہے تھے،

وہ بستر پر پڑی ہوئی رات بھر کروٹین بدلتی رہی اور بات کی چوٹ اور غم کے بارسے اوسکی

من مجروح و مضمحل ہو رہی تھی، صبح کو بستر سے اسطرح اُٹھی جسطرح مہینون کا بیمار، دیر تک وہ رات کی باتون کو سوچتی رہی، پھر دل ہی دل مین کہنے لگی:-"

آہ، مرد کا دل کیسا پتھر ہوتا ہے، اس بے عزتی کا بدلہ، اس بیدردی کا عوض، اگر مین نہین تو میرا پرماتما اُس ظالم سے ضرور لیگا۔

آہ! سنسار مسرت کے دریا مین کلیلین کر رہا ہی اور مین غم کے اتھاہ سمندر مین ڈوبی جارہی ہون،

وہ، موہنی، منوہر، اور جسے دیکھتی ہون سب دنیا کے سکھ بھوگ رہے ہین،........

منوہر کا خیال آتے ہی اسکا دل زخمی سانپ کیطرح پیچ و تاب کھانے لگا، اسکے پوشیدہ زخم مین ایک پُر لطف ٹیس اُٹھنے لگی، اب اسکے سارے خیالات سمٹ کر اسی مرکز پہ آگئے، اور ٹوٹا ہوا سلسلہ اسطرح سے شروع ہوا،

"ہان منوہر، وہ بھی سکھی ہی، جب مین نے اسکی طرف دیکھا تھا تو وہ بانسری کی دھن مین مگن تھا لیکن آہ میرے ٹوٹے ہوئے دلکے ترانے کو کون سُن سکتا ہے، ابتک منوہر کی ہنسی کی آواز میرے دل کو گدگدا رہی ہی، اسکی آواز سُنکر میری آتما کیسی سکھی ہوگئی تھی، کیا وہ سکھ راگ مین بھی سیکھ سکتی ہون، ہنسی کی آواز پریم رس مین ڈوبی ہوئی تھی، تو کیا پریم ملن سکھ ہے؟.... ضرور ہوگا، دنیا مین طلب عیش انسان کی جد و جہد حیات کا مرکز ہو، اور یہی انسان ایک وقت مین "پریم" کی دیوی پرجان نچھاور کر دیتا ہی، اسلیے ضرور یہ پریم دنیا کی ساری مسرتون کی جان ہوگی، پر مین ابھاگن اس لذت سے محروم ہون"

(۹)

کامنی ایک دن شام کیوقت کوٹھے پر کھڑی ہوئی غروب آفتاب کا تماشا دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہین شفق کی رنگینیون سے کھیل رہی تھین اور شفق کی سرخی اسکی سفید ریشمی ساری کے آنچل کو گلابی بنانے مین مصروف تھی کہ بنسی کی ایک دھیمی آواز اسکے کانون مین آئی وہ چونک پڑی اور اسطرح چارونطرف دیکھنے لگی جیسطرح ایک وحشی ہرنی تیر کی سنسناہٹ سے خوف زدہ ہوکر چارونطرف دیکھنے لگتی ہے، منوہر اپنے کوٹھے پر کھڑا ہوا موہنی کی محویت کا تماشا دیکھ رہا تھا، کامنی کی نظر جب اسپر گئی تو خود بخود اسکے ہونٹون پر ایک خفیف تبسم کی لہر دوڑ گئی اور شوخ نگاہین اداے شرم کا مرقع بنگئین

وہ بت بنی کھڑی تھی مگر اوس کا دل اس تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا گویا اوس نے ابھی ابھی کسی معصوم کو قتل کر دیا ہے، چند لمحے کے بعد منوہر نے پھر سیٹی بجائی، اور جس طرح ایک تیتری قفس کی تیلیوں کے باوجود صیاد کی آواز پر بولنے لگتی ہے بالکل اسی طرح کامنی کی جھکی ہوئی نگاہیں اسطرف اٹھ گئیں،

اگرچہ شرم عورت کی فطرت ہے لیکن جب نفس فریب کار غالب آجاتا ہے تو فطرت ایک عورت کے قلب سے اپنا اقتدار اٹھا لیتی ہے، کامنی کی حیا ہی منوہر کی جرأت کا سبب بن گئی، بیشک اگر عورت اپنے ہاتھوں فطرت کو مجروح نہ کرے تو صرف ایک مرد ہی نہیں دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت اوس کی معصومیت کو زائل نہیں کرسکتی،

منوہر نے جیب سے پنسل اور کاغذ نکالکر، کچھ لکھا اور کامنی کیطرف پھینکدیا، کاغذ آکر کامنی کے رخسارے پر لگا، منوہر ہنسا، وہ مسکرائی، اور کاغذ لیے ہوئے کمرے میں چلی آئی، اسمیں لکھا تھا،

"جان منوہر! تمہاری حالت مجھے سب معلوم ہے، میرا حال جاننا چاہتی ہو تو اپنی ان رسیلی اور ظالم آنکھوں سے پوچھو، جنھوں نے میرے دل پر خدا جانے کتنی بجلیاں گرائی ہیں، زہر اور امرت دونوں تمہاری نگاہوں میں ہیں، مار دو یا جلا دو"

خط پڑھتے ہی اسکا دل دھڑکنے لگا، چہرے کا رنگ بدلنے لگا، کبھی زعفرانی ہوتا تھا، کبھی گلابی، چند لمحوں تک یہی حالت رہی آخرکار نفس کا فریب غالب آیا، اور گلابی رنگ میں ایک چمک پیدا ہوگئی اس نے دوبارہ خط پڑھا، خط کو تمام کر کے کاغذ سامنے سے ہٹایا تو دیکھا کہ رمتا سامنے کھڑی ہنسی اسطرح گھور رہی ہے گویا وہ کاغذ پر لکھی ہوئی ساری عبارت پڑھ چکی ہے،

کامنی کی نگاہ اٹھتے ہی رمتا بولی "کیوں بہو آج پھر وہی بات، تمہارے ہاتھ میں یہ کیسا کاغذ ہے" چور کا دل ہی کتنا، کامنی سر سے پیر تک لرز گئی، لیکن فوراً ایک خیال اوسکے دماغ میں پیدا ہوا، اوسنے ترش روئی کیساتھ کہا "تم کون ہو جو ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ یہ خط میرے میکے سے آیا ہے" رمتا نے تنک کر جواب دیا، بہو میرے بال سفید ہوگئے ہیں، تم ابھی کل میرے سامنے ننگی پھرا کرتی تھیں آج مجھ ہی سے اڑتی ہو،

کامنی گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ رمتا! میں تجھ سے چال چل رہی ہوں؟

رمتا مجھ یہ چال نہیں آتی کیا ہے میں بڑی دیر سے تیرے پرکھری تماشے کرتی دیکھ رہی ہوں

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ کامنی کی بدنامی اسکے کانوں میں گونجنے لگی۔ غم زدہ اور بیکس عورت فرط غم سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رکتی ہوئی آواز سے بولی، رمتا! کیا سنسار کے ساتھ تم بھی میری دشمن ہے۔

چالاک عورت نے ذرا نرم لہجہ میں جواب دیا، پرماتما نہ کرے، دشمنی کیسی؟ اور ایک لمحہ سکوت کے بعد بولی۔

بہو! سنسار کی تری گت ہو رہی ہے، ہزاروں لاکھوں میں ایک ہو گی جو سب کچھ سہ کر تری کی طرح دکھ بھوگنا پسند کرے۔

بہو! کیا میں جانتی نہیں کہ بابو جی موہنی کے پریم جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جوانی اور دکھ ایک دوسرے کو کھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ دکھ تمہاری جوانی کو کھا رہا ہے۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب تم دلہن بنی اس گھر میں اتاری گئیں۔ بدن کی جوت سے گھر میں اجالا پھیل گیا تھا۔ آج تمہارا مکھ کینسے کا پھول ہو رہا ہے۔ کوئی دوسری استری ہوتی تو اب تک گھلا کر رکھی ہوتی بہو! تم نے اب تک جو کچھ کیا وہ اتنا ہے جسے آج سنسار کی لاکھوں عورتیں مل کر نہیں کر سکتیں۔

ہائے ایسے گھر کی تیری جہاں دھن برستا تھا۔ چاہتی تو راجہ مہاراجہ دہلیز پر گھٹنے ٹیکتے۔ پر قسمت کی بات ایسے گھر میں پہونچی جہاں کی کماریاں تک نندا کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ یہ سب پرماتما کے کھیل ہیں۔"

رمتا اپنی زبان سے ایسے آبحیات کی دھار بہا رہی ہے جس میں زہر ہلاہل کی آمیزش تھی۔ اور دکھ کی بھوکی۔ نفس کی فریب خوردہ کامنی اسکی ہمدردی کو اپنے دل میں جگہ دیتی جاتی تھی۔

رمتا چپ ہوئی۔ تو کامنی نے اپنے ہاتھ کا کنگن اتار کر اسے دیا اور کہا "بوا! ایشور کے لیے دنیا کی زبان سے بچانا۔ میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے!"

مکار بڑھیا کا مطلب ایک حد تک حل ہو گیا۔ خوبصورت سونے کے کنگن کی چمک دیکھتے ہوئے بولی "نہیں بہو! تمہارا بھید جان کے ساتھ ہے۔" پھر کہنے لگی "تم منوہر بابو کو جانتی ہو؟"

کامنی نے زبان سے تو کچھ کہا نہیں مگر دل دھڑکنے لگا۔

رمتا بولی، "وہ پٹنہ کے ایک سیٹھ کے لڑکے ہیں۔ تمہارے پڑوسی رام بابو کے رشتہ دار ہیں۔

ابھی پیدا نہین ہوا ہو صورت شکل کا کیا کہنا، تم انھین خود دیکھ چکی ہو،

تو جب تک کاسنی کے دکھ سُکھ ہی مین ہوتم بھی شریک ہو جاتین مگر دیس سے خبط کر کے کہا اچھا آؤ نیچے کہین بابو جی اس روز کی طرح بگڑ بیٹھے۔ یہ کہکر کاسنی ایک سرد آہ بھر کر کھڑی ہوئی، رنتا بھی اُٹھی اور دونون نیچے اتر آئین۔

(۱۰)

منوہر کے خط کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا، کاسنی اب پہلی کاسنی نہ تھی، نفس اوسے ایک ایسے ونفریب چمن کے دروازہ تک بہا چکا تھا جسمین قدم رکھتے ہی عورت عصمت کا بچہ نہین بچا سکا ملی اکثر منوہر کے خیال سے کھلا کرتا اور جوانی کی امنگین ابھار ابھار کے اُسے اس دلکش وادی کیطرف لیجانا چاہتی تھین جسکی فضا نفسانیت سے معمور ہے،

منوہر بھی محبت کا زخم کھا چکا تھا۔ اور محبت بھی ایسی محبت جسمین نفس کی شرکت ہوتی ہو، آٹھوین دن کاسنی کو دوسرا خط لکھا، مضمون یہ تھا،

مری جان، اب صبر کی طاقت نہین، پروانہ کب تک شمع سے دور رہ سکتا ہو، مرے ضبط کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے،

عورت جب بیباک ہو جاتی ہے تو وہ جرأت بھی اوسکیلیے بہت آسان ہو جاتی ہے جسکے خیال سے وہ کبھی کانپ اٹھی ہو، کاسنی نے خط پڑھا اور اوسکے جواب مین یہ دو جملہ لکھ کر منوہر کیطرف پھینک دیے"

"آپنے جو کچھ کہا سچ، اور تسلیم، لیکن مین کیا کر سکتی ہون"

تھوڑی دیر مین ایک دوسری تحریر اسکے پیرون کے پاس آکر گری،

"پیاری کاسنی! ایک تدبیر ہے اور صرف ایک، گھر چھوڑ دو، رنتا لی ہوئی ہو جاہے بنارس مین رہو یا کلکتہ مین"

جسطرح چوری کرتے وقت چور کا دل دھڑکنے لگتا ہو اسیطرح خط پڑھتے وقت کاسنی کا قلب بڑی تیزی کیساتھ حرکت کرنے لگا، اس مختصر تحریر کا ختم کرنا اوسے دشوار ہو گیا، پیر ڈگمگانے لگے بیٹھ گئی اور سوچنے لگی؛

کیا میں گھر کو چھوڑ دوں؟ پرماتما! میرے بھاگ میں کیا لکھا ہے؟ پت کا گھر چھوڑ کر اپنے دھرم پر داغ اور اسکے کل میں داغ لگاؤں؟ سنسار کیا کہے گا۔ آہ! کیا میں ہمیشہ دکھ سہنے کے لیے پیدا کی گئی تھی؟ کیا خوشی میری قسمت میں نہیں، لیکن دنیا اپنی خوشی پہلے ہے پھر میں اپنی خوشی کے لیے کیوں چھوڑ دوں، یہی نا کہ دنیا ہنسیگی، یہ ہنسی بھی ایک اعتباری چیز ہے، اس گھر کا ذرہ ذرہ میرا دشمن ہے اور منوہر مجھے پیار کرتا ہے، آخر اس نے خط کی پشت پر یہ جواب لکھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، پریم کی زنجیر میرے گلے میں ہے اور اوسکا سرا آپکے ہاتھ میں، جو چاہے کیجئے، جہاں مزاج میں آئے، لیجئے ...

خط لکھنے کے بعد کاغذ منوہر کی جانب پھینک دیا، کاغذ پھینک کر ایک لمحہ انتظار کیے بغیر کامنی نیچے اتر گئی،

منوہر کا فریب اپنا کام کر چکا تھا، کامنی مسحور ہو چکی تھی، دنیا اوسکے سامنے پھر ایک دفعہ اپنی تمام دلکشیوں کے ساتھ جلوہ افروز نظر آنے لگی، سکھ اور پریم کے نغمے اوسکے کانوں میں گونجنے لگے، اور عالم تخیل کا ہر ذرہ خواب حسرت سے بیدار ہو گیا، کامنی کوٹھے سے اتر کر اپنے کمرہ میں پہونچی وہ اسوقت ایسی مسرت محسوس کر رہی تھی گویا کوئی نیک کام کر چکی ہو اوسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منوہر کو محبت کی دستاویز لکھ کر اوس نے اپنے دل سے ایک پہاڑ ہٹا دیا ہے،

وہ سوچنے لگی یہ سکھ کا دروازہ اگر پریم سے کھولا جا سکتا ہے تو مجھے چابی مل گئی،

پرماتما! میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں کیا ایک دکھیا بھکارنی سے بدتر کامنی سکھ اور پریم کی رانی بن سکتی ہے،

جسطرح گلاب کے پھول کی طرف بڑھنے والا حریص ہاتھ نوک خار سے چھدنے سے فوراً واپس کھنچ آتا ہے اسیطرح یہاں پہونچکر کامنی کے سامنے سے طلسم خیال کا پردہ سرکنے لگا، کبھی نہیں آہ دھاتا کا کھیل، بازیگر کا تماشا نہیں ہے، کرم کا لکھا پتھر کی لکیر ہے، اور اسے برہما جی بھی مٹا نہیں سکتے مگر یہ کیفیت بسرعت زائل ہو گئی، اور کامنی کا حریص ہاتھ پھر گلاب کی طرف بڑھنے لگا، لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ پریم میرے دل کو شتبل کر رہا ہے، اور سکھ کے راگ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، دنیا! تجھ میں اگر سکھ اور پریم نہیں تو کچھ بھی نہیں، میں سکھ اور پریم کے لیے دنیا کو چھوڑتی ہوں،

کیونکہ پہنچنا چاہیں "

کامنی اب پختہ ارادہ کر چکی تھی کہ گھر چھوڑ کر اپنی مضطرب ہستی کو منوہر کی آغوش محبت میں ڈالدے
چنانچہ جب وہ منحوس رات آئی جسکی آغوش میں اوسکی حیات دوسرے کے ابتدائی لمحات پوشیدہ تھے
تو وہ انتہائی جراٴت و بیباکی کے ساتھ رشتا کی رہنمائی میں شوہر کے گھر سے نکل کھڑی ہوئی گویا وہ ایک ایسا
مقدس ترین فریضہ ادا کرنا چاہتی ہو جو حیات کا مقصد اولین ہو اور جسکے لیے دنیا بھر کی ملامت سے
چشم پوشی کیجا سکتی ہے

فضا خاموش تھی، چاروں طرف سناٹے کا عالم طاری تھا، مگر آسمان اور آسمان کا ہر ستارہ
زمین اور زمین کا ہر ذرہ، ہوا اور ہوا کی ہر موج، تاریکی اور تاریکی کا ہر منظر، سکوت اور سکوت
کا ہر لمحہ اوسپر لعنت بھیج رہا تھا، کامنی کو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا سندر سنگھ ایک طرف سے تیزی
کیساتھ آکر اوسکا ہاتھ پکڑ لینا چاہتا ہے، رشتا دیکھتی کہ پولیس کا ایک پہرہ دار سپاہی سامنے سے ٹھکرایا
لیے پیچھے چلا آرہا ہے، رشتا گھر سے جتنی ہی دور ہوتی جاتی، اوتنا ہی اسکا خوف کم ہوتا جاتا مگر
کامنی جتنا ہی آگے بڑھتی اوتنا ہی اوسکی دہشت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، جسطرح تیر کھائی ہوئی
ہرنی جب بھاگتی ہے تو ہر ہر قدم اوسکی وحشت بڑھتی جاتی تھی تاہم گناہ کی یہ دونوں متوالیاں
قدم اٹھائے بڑھی چلی جارہی تھیں،

کامنی کے حسن تخیل میں اوسکی منزل مقصود تو ایک ایسی پرفضا وادی تھی جہاں پہونچکر ایک
عورت کے لطیف ترین محسوسات بیدار ہو جاتے ہیں، اور وہ دنیا کو دنیا اور زندگی کو زندگی سمجھنے لگتی ہے
مگر اسوقت روح پر ایک ناقابل برداشت اضمحلال طاری تھا، اوسکی ہر سانس ایک داستان
افسردگی تھی اور قلب کی ہر حرکت ایک فسانۂ پژمردگی، لیکن حقیقت کا پالینا اوسکے لیے بہت
دشوار تھا، کیونکہ نفس کا فریب اسکے راستے میں اپنی مست خوشبو والے پھول بکھیرتا جارہا تھا،
جن سے روح پرور تخیل کی دنیا مہک رہی تھی،

تھوڑی دیر میں یہ دونوں عورتیں اوس جگہ پہونچ گئیں، جہاں گاڑی لیے ہوئے منوہر
اوسکا انتظار کر رہا تھا، یہ تینوں گنہگار گاڑی میں بیٹھکر اسٹیشن پر پہونچے، اور چوروں کی طرح
منھ چھپا کر ایک گوشے میں بیٹھ گئے،

کامنی کی حالت اپنے دونوں ساتھیوں سے جداگانہ اور ہی ترقی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوسکا دل بیٹھا جا رہا ہے، اوسکی روح میں ارتعاش ہے اور وہ شدت کرب کے نضائے بسیط میں تحلیل ہوتی جا رہی ہے، وہ سوچنے لگی کہ

"محبت جسکی تکمیل مسرت کی تکمیل ہو، اپنی ابتدائی منزل ہی میں اس درجہ روح فرسا ہوتی ہے کہ میں ہر لحظہ موت کی سختی محسوس کر رہی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں کہ جسکی تلاش میں جتنا ہی آگے بڑھ رہی ہوں اتنا ہی دور ہوتی معلوم ہوتی جاتی ہوں۔ کیا شکوہ میرے پیچھے چھوٹتا جا رہا ہے؟ کیا یہ راستہ مسرت کی منزل کی منزل کی طرف نہیں جاتا ——— پرماتما! میری مدد کر ——— کیا سچ سچ میں ایسا کسی فریب میں مبتلا ہوں۔

"فطرت بھی بہرہ رہتا ہے" ایک حساس عورت جب گر کر ابھرتی ہے تو وہ پوری طاقت سے روح کا دامن تھام لیتی ہے۔

کامنی کا سلسلۂ تخییل قائم ہے۔

"آہ سنسار دھوکے کا آشرم ہے، اوسکی فریب کاریاں جادو کا اثر رکھتی ہیں، میں بدنصیب جس چیز کو سونا سمجھ کر اوسکے پیچھے دوڑ رہی تھی، وہ اب پیتل نظر آ رہا ہے، یہ دنیا مجھے فریب دے رہی تھی منوہر نے مجھے پریم کا دھوکا دیا، بیشک دوسروں کی بہو بیٹیوں کو بھگانے والا کبھی سچا پریمی نہیں ہو سکتا۔

پرماتما! میں اب کیا کروں، کیا اپنے پتی کے گھر واپس جاؤں ——— نہیں، مجھ سے نہیں ہو سکتا جو لوگ پہلے ہی میری صورت دیکھنا نہیں چاہتے تھے، اونکے سامنے اب جانے سے مر جانا بہتر ہے، پھر ——— ! منوہر کا ساتھ دوں؟ ——— نہیں یہ بھی نہیں ہو سکتا ہے، یہ جو ایک عورت کی حقیقی زندگی ہے، جب منوہر کے پاس نہیں ہے تو اوسکا ساتھ دینا میری تمناؤں کی موت ہے، ———

پھر مجھے کیا کرنا چاہیے ———"

یہاں پہونچکر کامنی کا سلسلۂ تخییل ٹوٹ گیا، رمنا کامنی سے اوٹھنے کو کہہ رہی تھی، کیونکہ گاڑی پلیٹ فارم پر آ چکی تھی، کامنی اوٹھکر رمنا کے پیچھے اسطرح چلدی گویا دو اوسکے گلے میں زنجیر ڈالے ہوئے کھینچ رہی ہے۔ یہ وقت اوسکے لیے سخت ترین وقت تھا،

کامنی نے ریل میں بیٹھتے ہی اپنے سلسلۂ تخییل کو پھر قائم کیا،

"ہاں ایک خفیہ راستہ جو موت کے گھاٹ کی طرف جاتا ہے میرے لیے کھلا ہوا ہے، بس یہی ایک راستہ ہے جس پر چلکر میری آتما پریم اور سکھ حاصل کر سکتی ہے، پرماتما! اس راستے میں میری رہنمائی کر،

چند لمحوں کے بعد اوس نے سر اُٹھایا، اب اوسکے مرجھائے ہوئے چہرہ پر سرخی دوڑ رہی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوسکی روح ایک خاص کیف سے مخمور ہے اور اوسنے "پریم تیرتھ" کو دیکھ لیا ہے،

گاڑی گنگا ندی کے پل سے آہستہ آہستہ گزر رہی تھی، یکایک کھڑکی کا دروازہ کھلا اور کامنی دریا میں کود پڑی، لوگوں نے دیکھا، جسطرح کنول کا پھول اپنی آغوش شوق کھولکر پریم کے ساتھ بھونرے کو چھپا لیتا ہے اوسی طرح پانی کی موجوں نے جوش خلوص میں غم کی ماری عورت کو آغوش میں لے لیا، اور پھر دنیا اوسکی صورت دیکھنے کو ترس گئی، شاید اوسے سکھ مل گیا، اور پریم کی شانتی نصیب ہو گئی ——

گاڑی کامنی کا ماتم کرتی ہوئی پل سے گزر گئی، کلکتہ تک کامنی کی موت ریل کا فسانہ بنی رہی، دوسرے دن صبح آٹھ بجے اسٹیشن میں یہ خبر گشت لگا رہی تھی،،

"ایک عورت کی عبرتناک خودکشی"

منوہر اور رمنا کو سزا ہو گئی، سیٹھ کشن نراین اور انکی بیوی دونوں پہلے ہی کامنی کی بدنصیبی پر کڑھتے کڑھتے نیم جان ہو چکے تھے، یہ روح فرسا خبر سُنکر ایسے گرے کہ پھر جانبر نہ ہو سکے، کامنی کی بے درد ساس اس حادثہ کے دو ہفتہ بعد قلب کی حرکت ایکدم رُک جانے سے موت کا نشانہ بن گئی،

سندر سنگھ کی ساری دولت موہنی کے نذر ہو گئی، اور آخر وہ دو دن متواتر فاقہ کرنے کے بعد اپنے ایک پرانے ملازم کی دوکان میں قلیل تنخواہ پر کام کرنے لگا جو آج بھی قابل عبرت کس مپرسی کی حالت میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہے،

موہنی ہاں صرف موہنی ہی اس فسانہ کی ہستیوں کی واحد مالک رہی، آج کل بمبئی کی ممتاز اور دولتمند طوائفوں کی ملکہ سمجھی جا رہی ہے، شہر کے بڑے بڑے تاجر اور رئیس اس سے ملنا

فخر سمجھتے ہیں، طرفین اوسکی قسمت پر رشک کرتی ہیں اور حسن کے پرستار اوسکے رخسار ون کی دلفر
سُرخی پر اپنی جان نچھاور کرنا حاصل عبادت سمجھتے ہیں، مگر آہ! انمین سے کسی کو بھی یہ خبر نہین
کہ وہ سُرخی کم از کم پانچ اور خدا جانے کتنی بے گناہ حبشیون کے خون کی داستان رنگین ہے جسے دیکھکر
ایک آسمانی آواز کہہ رہی ہے ؎

قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتون کا خون کیونکر
جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکاریگا آستین کے

رسید کتب

سوانح عمر خیام، مولفہ جناب میان اکرام اللہ صاحب صدیقی پانی پتی، مع تاج الکلام ترجمہ رباعیات از حضرت توی امروہوی، مطبوعہ شاہجہانی پریس دہلی قیمت ۳

رباعیات سرمد، مع اردو ترجمہ جواہر منظوم مترجمہ جناب مولت لکھنوی، ومقدمہ نوشتہ مولانا ابوالکلام، مطبوعہ شاہجہانی پریس دہلی، قیمت ۱۲ر

دیوان حسرت، حصہ پنجم قیمت ۴ر حصہ ششم ۸ر حصہ ہفتم ۴ر حصہ ہشتم ۸ر حصہ نہم ۴ر مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ، ملنے کا پتہ بیگم حسرت موہانی محلہ توپخانہ بازار کانپور

مکاتیب امیر مینائی۔ مرتبہ مولوی احسن اللہ خانصاحب ثاقب مدیر رسالہ قند پارسی و پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار، مطبوعہ مطبع دائرہ ادبیہ لاٹوش روڈ لکھنؤ قیمت ۱۲ر

سیاسیات، مصنفہ محمد اجمل خان بی اے علیگ، مطبوعہ یونانی دواخانہ پریس الہ آباد ۱۲ر

جولیس سیزر، مترجمہ سید تفضل حسین ناظر مدارس مدرجہ اول ضلع کریم نگر حیدرآباد دکن، مطبوعہ اختر دکن پریس افضل گنج حیدرآباد قیمت ۱۲ر

تمون آف ایتھنس، (شکسپیر کے مشہور ڈرامے ہنری ہشتم کا ترجمہ) مترجمہ سید تفضل حسین ناظر مدارس حصہ اول کریم نگر، مطبوعہ اختر دکن پریس افضل گنج حیدرآباد، قیمت ۱۲ر

بزم ماتم

(از حضور نظام اخلد اللہ ملکہ)

سلام فارسی

کجا زبانِ جہان و کجا ثنائے حسینؑ　　زجان و دل شدہ ہر دو جہان فدائے حسینؑ
فروغ دیدۂ بینا و سرمۂ بینش　　بچشم اہل نظر ہست خاکپائے حسینؑ
وضو برائے دعائے نجاتِ اہل خطا　　بخون خویش کہ کرد است ماسوائے حسینؑ
چہ منصب است کہ از حق نخواست پیغمبرؐ　　بجز شفاعت امت بخون بہائے حسینؑ
بلائے جملہ جہان گر نہند در میزان　　گران بود ز ہمہ پلہ بلائے حسینؑ
علوئے مرتبہ منظور حضرت حق بود　　بر انس و جن و ملائک ز ابتلائے حسینؑ
ز دار دیگر قیامت رہا شود عثمان　　کسیکہ مست بود از مئے ولائے حسینؑ

سلام اردو

بہائے اشک جو چشم پر آب سے پہلے　　گہر میں آئے شہ کی جناب سے پہلے
علیؑ نبیؐ خود آتے ہیں لحد میں مرے　　فشار دے نہ مجھے بوتراب سے پہلے
ثنائے آل نبیؐ ہم نے کی ہے جب آغاز　　زبان دھوئی ہے برسوں گلاب سے پہلے
چلے حسینؑ جو میدان میں سر کٹانے کو　　سکینہؑ دوڑ کے لپٹی رکاب سے پہلے
زبان وہ خشک ہوئی آہ۔ روز عاشورہ　　جو تر ہوئی تھی نبیؐ کے لعاب سے پہلے
قضا پہنچتی تھی لینے کو سر لعینوں کے　　صفوں میں شاہؑ کی تیغ خوش آب سے پہلے
غم حسینؑ سے تشبیہ دے اگر عثمان　　تو داغ دور کرے ماہتاب سے پہلے

قطعہ

نمایاں رنگ عزا عثمان جو شبیرؑ کے غم سے　　چمن میں روز منہ دھوتی ہیں کلیاں اشک شبنم سے
ادھر آنکھوں کو مشغولی ادھر ہاتھوں کو مصروفی　　نہ فرصت انکو رونے سے نہ فرصت انکو ماتم سے

قیس

(عالمِ بیخودی میں)

قیس اک دیوانۂ الفت پرستارِ وفا — نجد کے جنگل میں ہے بے خانماں بیٹھا ہوا
وہ کبھی خاموش ہے اور ہے کبھی نغمہ سرا — ہمنشیں کوئی نہیں اُسکا بجز ذاتِ خدا

اِک سکونِ قلب دل محویت کامل میں ہے
شکلِ لیلیٰ ہے نظر میں یادِ لیلیٰ دل میں ہے

زورِ غم سے روح ہوجاتی ہے جب اندوہگیں — دفعتہً پُر شورش آجاتی ہے آہِ آتشیں
گو کہ ہے ایذا کشِ غم اس کا جسمِ نازنیں — لیکن اسکو راحت و غم کی ذرا پروا نہیں

اپنی دُھن میں مست ہے وہ رہ نوردِ عاشقی
حُسن کے جلووں میں دل ہے دل میں ہے صدعاشقی

اسکو کیا پروا کہ وہ محوِ خیالِ یار ہے — خوگرِ آلام ہے لذّت کشِ آزار ہے
بادۂ خمخانۂ الفت سے دل سرشار ہے — عشق کی مرہونِ منت اُسکی جانِ زار ہے

قلبِ مضطر اس کا ہے آئینہ دارِ آرزو
اور وہ خود ہے سراپا سوگوارِ آرزو

اسطرح ساکت ہے وہ دیوانۂ صبر آزما — خاک پر بیٹھا ہو جیسے کوئی پُتلا خاک کا
نجد اسکے دم سے ہے اک منظرِ حیرت فزا — خاک پر لکھا ہوا ہے نام لیلیٰ جابجا

روحِ مضطر اُسکی سوزِ عشق سے لبریز ہے
اُسکی ہر اک سانس اک برقِ تجلّی ریز ہے

[illegible] — [illegible] اُسکے ساتھ وہ دیوانہ وار

چاہتا ہے ہو تصدق اُسکے اوپر بار بار اک فریبِ شوق ہے اُسکے لیے گرد و غبار

جوشِ وحشت میں فریبِ شوق باطل ہو یہی
وہ سمجھتا ہے مری لیلیٰ کا محمل ہے یہی

جب کبھی کوئی مسافر آ نکلتا ہے اُدھر جوشِ وحشت سے قدم لیتا ہے اُسکے دوڑ کر
سر جھکا دیتا ہے اپنا پہلے اُس کے پاؤں پر پھر بیاں کرتا ہے رو کر قصۂ دردِ جگر

پوچھتا ہے حالِ لیلیٰ اُس سے پھر دیوانہ وار
چومنے لگتا ہے جذبِ شوق سے مستانہ وار

قافلوں کے ساتھ اکثر دُور تک جاتا ہے وہ منزلِ مقصود کا اپنی نشاں پاتا ہے وہ
نغمہ زن ہوتا ہے جسدم ہوش میں آتا ہے وہ قافلے والوں کو کیا کیا وجد میں لاتا ہے وہ

منزلوں کے بعد کم ہوتا ہے جب جوشِ جنوں
دشت میں پھر لوٹ کر آتا ہے با حالِ زبوں

سامنے آتی ہیں اُسکے جب کبھی کچھ ہرنیاں مشتعل ہوتی ہے دلمیں آتشِ سوزِ نہاں
یاد آتی ہیں کسی کی مست آنکھیں ناگہاں اُسکی چشمِ شوق سے ہوتے ہیں پھر آنسو رواں

دوڑتا ہے اِن کے پیچھے پیار کرنے کے لیے
اُنپہ قربان اپنی جانِ زار کرنے کے لیے

مطلعِ زریں سے جب ہوتا ہے طالع آفتاب اور بھی بڑھتا ہے اُسکے دلکا جوشِ اضطراب
اسطرح ہوتی ہے اُسکی روح وقفِ انقلاب مضطرب ہو رند جیسے دیکھکر جامِ شراب

وہ سمجھتا ہے کہ عکسِ چہرۂ لیلیٰ ہے یہ
بس اسی جلوے سے ساری روشنی پھیلی ہے یہ

یوں تو پیاری ہے اُسے دل سے اندھیری رات بھی وہ سمجھتا ہے کسی کی زلف ہے بکھری ہوئی
ماہ جب ہو جلوہ گر اور رات ہو تاروں بھری کوئی دیکھے تو سمجھ اسوقت اُسکی بیخودی

آسماں کو دیکھکر یوں دل سے کرتا ہے خطاب
دیکھ لے اے دل کہ ہے اسوقت لیلیٰ بے حجاب

جب گزر جاتا ہے حد سے اسکا جوشِ بیخودی | رنگ لاتا ہے نیا سوز و گداز عاشقی
چاک ہو جاتا ہے آخر پردۂ دیوانگی | یاد کھلتی ہے حقیقت بیخودی عشق کی

اپنی ہستی پر اسے ہوتا ہے لیلیٰ کا گمان
بول اٹھتا ہے "انا لیلیٰ" وہ سرمستِ فغان

دور ہو جاتا ہے دل سے اسکے سب رنج و ملال | اور ٹل جاتا ہے سر سے شام فرقت کا وبال
پھر نہیں رہتا اسے لیلیٰ کے محمل کا خیال | دیکھتا ہے دل میں وہ "لیلائے فطرت" کا جمال

ہاں فنا فی العشق ہو جانا مآلِ عشق ہے
اپنی ہستی کو مٹا دینا کمالِ عشق ہے

سید آزر چاندپوری

کلام حسرت

لطف و کرم کی راہ سے اے جانِ عاشقان | رہ جائیے تو آن کے مہمانِ عاشقان
ہر ہر قدم پہ راہ وفا میں ہے خوف جان | گر ہو نہ لطفِ یار نگہبانِ عاشقان
سچ پوچھئے تو حسن سے کچھ کم نہیں ہے عشق | یہ جانِ عاشقان ہے وہ جانانِ عاشقان
رنگینیِ سرشکِ محبت کے حسن سے | دامانِ عاشقان ہے گلستانِ عاشقان
خلق خدا ہے گوش بر آوازۂ جمال | مانیں گے اب بھی آپ نہ احسانِ عاشقان
ہم سے گرانہ جان کہ اے سرفرازِ ناز | افتادگی ہے شیوۂ شایانِ عاشقان
نورِ خیالِ یار سے روشن ہے سربسر | با وصف ظلمِ ہجر شبستانِ عاشقان
لیتے ہیں آرزو کا ہمیں آکے سب سبق | گویا ہے بزمِ یار دبستانِ عاشقان

لکھتا ہوں مرثیہ نہ قصیدہ نہ مثنوی
حسرت غزل ہے صرف مری جانِ عاشقان

(حسرت)

ردّ التجا

از رابندر ناتھ ٹیگور

سوال — محبوب دلربا مرے کر اعتبار عشق / ہو جاہے پاس غیر بھی انجام کار عشق
اے چارہ گر علاج دل درد مند کر / تو باب دلکو اپنے فی الفور بند کر
جواب — ممکن نہیں بر آئے کبھی مدعا ترا / آتا نہیں سمجھ میں کہ منشا ہے کیا ترا
سوال — کر تو مرا یقین، اگر اعتبار ہو / یہ دل اسی لیے ہے کہ تجھ پہ نثار ہو
ہے ایک میرے اشکوں کا قطرہ بھی اسکے ساتھ / اور ایک دلفریب سے نغمہ بھی اسکے ساتھ
جواب — ممکن نہیں بر آئے کبھی مدعا ترا / آتا نہیں سمجھ میں کہ منشا ہے کیا ترا
سوال — عمر نشاط زحمت برق و شرار ہے / ہستی کا اسکی وہم پہ دار و مدار ہے
جب گلشن جہاں میں تبسم نما ہوئی / شبنم صفت یہ چشم زدن میں فنا ہوئی
لیکن ہے دیرپا غم واندوہ کا قیام / اک نقش مستقل ہے یہ اس میں نہیں کلام
آنکھوں میں تیری جلوہ نما اضطراب ہو / بیدار اس میں الفت حسرت مآب ہو
جواب — ممکن نہیں بر آئے کبھی مدعا ترا / آتا نہیں سمجھ میں کیا منشا ہے کیا ترا
سوال — تنویر مہر کا ہوا مشرق سے جب نزول / ہر سو کھلے تھے صحن چمن میں کنول کے پھول
ذرا تپش سے حسن گران پایہ مٹ گیا / دم بھر میں انکی عمر کا سرمایہ لٹ گیا
جب زور و شور کہرے کا ہوگا قریب دور / کھل کر رہینگے موسم سرما میں پھر ضرور
جواب — ممکن نہیں بر آئے کبھی مدعا ترا / آتا نہیں سمجھ میں کہ منشا ہے کیا ترا

مترجمہ بشیشر پرشاد منوّر لکھنوی

گریۂ خونین

اس سال علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا کو جو جانکاہ حادثون کا سامنا کرنا پڑا ابھی کرنل عبیداللہ خان صاحب مرحوم کے ماتم سے فرصت نہ ملی تھی کہ ولیعہد سلطنت نواب سر نصراللہ خان صاحب بہادر رہگرائے عالم جاودانی ہوئے

ولیعہد مرحوم اپنی نیک نفسی اور خوش خلقی کی وجہ سے رعایائے بھوپال مین بہت ہردلعزیز تھے آج بھوپال کا ہر گھر ماتم کدہ اور ہر قلب بیت الحزن ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو جوار رحمت مین جگہ دے۔ اور علیا حضرت بیگم صاحبہ کو صبر جمیل عطا فرمائے

ذیل مین ہم خانبہادر سید محمد ہادی صاحب سابق ڈپٹی کمشنر صوبۂ متحدہ کی وہ پردرد نظم شائع کرتے ہین جو آپنے بطور مرثیہ لکھی ہے۔

ایڈیٹر

کئی دکھتے دلون کو اک نیا دکھ دیگا تو برسون
بہت سی خونفشان آنکھون سے برسیگا لہو برسون

کہان سے لائین لے نواب نصراللہ خان تجھ کو
یہ دو آنکھین تجھے ڈھونڈا کرینگی چارسو برسون

جگہ خالی رہے گی تیری اسلامی جماعت مین
نہ گردش دور کی پر کر سکے گی یہ خلا برسون

تصور کو تری صورت نہ بھولے گی نہ بھولے گی
نظر کو تیرے جلوے کی رہے گی جستجو برسون

زبانین کارنامے تیرے کامون کے سنائین گی
لبون پر تیری باتون کی رہے گی گفتگو برسون

فلک پہ جائیگی اس گل زمین سے باغ رضوان تک
صدائے نالہ ہائے بلبلان خوش گلو برسون

رہیگی رہ نورد نامرادی سعی لا حاصل
تجسس ٹھوکرین کھاتا پھرے گا کو بکو برسون

نہ پہنچے وقت پر اپنے کھلین گے ہان گلستانین
بیابان کے سبزۂ خوابیدہ کو چونکائیگا تو برسون

برس لے ابر مژگان جسقدر تجھ کو برسنا ہے
ہمین رکھنی ہے جاری چشم تر کی آب جو برسون

وہ کاری زخم ہے پیکانِ حرماں کا کہ اے ہمدم
نہ ہوگا سوزنِ مژگانِ تسکین سے رفو برسوں

پریشان خاطروں کو اب اسی انجمن میں رہنا ہے
مسلسل شکلِ زلفِ شاہدِ ژولیدہ مو برسوں

نہ ہاتھ آئیگا ہرگز اوج تیری بردباری کا
تحمل پر بشر کے کوئی باندھے باندھنو برسوں

ہمارے دل کی حالت گر کوئی دیکھے تو روشن ہے
یہ آئینہ کسی کا رہ چکا ہے روبرو برسوں

رہی اشکوں کی گر ایسی ہی روز افزوں فراوانی
بڑھے گی مردمانِ چشمِ تر کی آبرو برسوں

حقیقت میں تجھے نزدیک وہ چیزیں اچھوتی تھیں
کہاں گر چارہ سازوں سے لگا تو ان کو چھو برسوں

زبان پرہیز کی صبر آزما تھی ضرورت سے
رہی ناآشنائے ذوقِ نعمائے گلو برسوں

مرض کے سامنے احباب کی تدبیر کیا چلتی
جب اپنا کار پنہاں کر چکا تھا یہ عدو برسوں

قصور کار دل سرزد ہوا آخر اسی دل سے
رہا تھا عفو تقصیرات میں جس کو غلو برسوں

بہت کچھ اپنے میخانے میں ناکاموں کو گزرا ہے
مسلسل توڑنے میں شیشہ و جام و سبو برسوں

تمنا دل میں تھی اولاد کے عقدِ عروسی کی
رہی شیشے کے اندر بے گندھے سہرے کی بو برسوں

کرینگے بس دعا کس دعا میں تیری بخشش کی
نمازیں وہ پڑھیں گے جو کرتے تھے وضو برسوں

مشیت نیکئی ہادی کے سر سے تیرے سایہ کو
امیدیں تو یہ کہتی تھیں رہے گا ہم میں تو برسوں

لکھا ہاتف نے یہ شنجرف سے تخیل آتش کے
لحد پر دم بدم رویا کرے گی آرزو برسوں
۱۳۴۳ھ

بزم سخن

(انتخاب مشاعرہ نمائش بلند شہر منعقدہ ۲۰ فروری ۱۹۲۶ عیسوی)

جناب بابو رگھبیر پرشاد صاحب صفدر مختار عدالت بلند شہری

گرمی رگون مین کم جو ہوئی اضطراب کی ساحل پہ نبض چھوٹ گئی موج آب کی
اے موج ہو خبر نہ تیرے پیچ و تاب کی پھر آنکھ ایک پل نہ لگے گی حباب کی

قاضی حافظ الدین صاحب نشتر سکندر آبادی

اٹھی نقاب بند شین تو یہ ٹن حجاب کی تقدیر جاگی دیدۂ محروم خواب کی
اے میری نیکیون مین سمائے ہوئے غرور یہ کیا ہوا کہ بند ہین راہین ثواب کی
اے نیند جا کے دیدۂ دشمن مین لے پناہ آنکھین یہ جلوہ گاہ ہین اک مست خواب کی
وہ حسن گل کہ جس پہ ہے غش عندلیب زار اتری ہوئی بہار ہے تیرے شباب کی

مسٹر انور متعلم بی اے کلاس مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ذوق طلب نے جوش مین خود کو مٹا دیا تھین قلب کے نشیب مین راہین ثواب کی
انور خموش بیٹھے ہو کس کا خیال ہے آخر ملول کیون ہے طبیعت جناب کی

عبد الرحمٰن صاحب دلبر اورنگ آبادی

بحر فنا مین غرق ہوا کون بد نصیب ساحل سے سر پٹکتی ہے ہر موج آب کی
کیا چیز تھی کہ آ ای گئی ہو گئی دلبر یادش بخیر ہائے وہ دنیا شباب کی

منشی مہدی حسین صاحب شفق جہانگیر آبادی

حالت ہے وصل مین بھی وہی اضطراب کی اس دل نے آرزو کی بھی مٹی خراب کی
وہ پوچھتے ہین دل مین میرے داغ دیکھکر ہوتی نہین ہے رات بسر آفتاب کی

حکیم بھاگ ناتھ صاحب صبا خورجوی

بادل میں کوندکوندکے ہر بار بجلیاں   تصویر کھینچتی ہیں مرے اضطراب کی

منشی ضیاء الحسن صاحب ضیا خورجوی

جنبش ہوئی لبوں کو تو دو برگ گل کھلے   وہ مسکرائے کھل گئیں کلیاں گلاب کی
پرتو کسی کے رخ کا یہاں تک بڑھا گیا   ضو دل کے ذرہ ذرہ میں ہے آفتاب کی

منشی مشتاق احمد صاحب ندیم

اسکو چلا ہے ڈھونڈھنے جسکا نہیں نشان   ہمت تو دیکھئے دل خانہ خراب کی

سید محمد مظفر حسین صاحب ناصر بلندشہری

کیسی ہوائیں کس کا تلاطم کہاں کی موج   سب ہیچ ہیں نگاہ میں چشم حباب کی
شیشہ میں بند کرکے مئے لالہ فام کو   تصویر کھینچی ہے کسی کے شباب کی

منشی ساوتری پرشاد صاحب زار سکندرآبادی

دل مجھسے کہہ رہا ہے کہانی شباب کی   میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ باتیں ہیں خواب کی
نیرنگیاں عجیب ہیں دنیائے عشق میں   شام انقلاب کی ہے سحر انقلاب کی
کرتے ہیں فرض جان کے ہم اسکی بندگی   زاہد تجھے پڑی ہے ثواب و عذاب کی

حضرت راز بلندشہری

بچپن کی سادگی میں ہے شوخی شباب کی   تصویر ہے سکون میں اک انقلاب کی

مرحبا و شعلۂ آتش فشان داغ دل   ہوگیا کافور چھپا ہار مرہم کافور کا

جناب مولانا رضا لکھنوی

ہوجائینگے یہ دیکھتے ہی دیکھتے فنا   جھوٹے ہیں نقش ہستی بے اعتبار کے
اس بیکسی میں دل کا سلیقہ تو دیکھئے   مجبوریوں سے کام لئے اختیار کے

جناب آغا شاعر دہلوی

علمی خبرین اور نوٹ

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مجموعۂ کلام کی دنیائے ادب کو مدت سے آرزو تھی خوشی کی بات ہے کہ گذشتہ ماہ مین وہ مجموعہ "بانگ درا" کے نام سے خاص اہتمام کے ساتھ قریباً ۳۰۰ صفحون پر شایع ہوگیا۔
خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا سابق اڈیٹر مخزن نے اس مجموعہ کا دیباچہ لکھا ہے جسمین ڈاکٹر سر اقبال کی شاعرانہ قابلیت کو شرح وبسط کے ساتھ نمایان کیا۔ اس مجموعہ کے تین حصے کیے گئے ہین۔ پہلے حصہ مین ۱۹۰۵ء تک کا کلام دوسرے مین ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا کلام اور تیسرے حصہ مین ۱۹۰۸ء سے ابتک کا مطبوعہ وغیرمطبوعہ کلام درج ہے۔ آخر مین چند صفحات پر ظریفانہ کلام بھی درج ہے اس مجموعہ مین ۱۴۵ نظمین اور چند غزلیات ہین۔ اُردو کا کوئی کتب خانہ اس مجموعہ سے خالی نہ رہنا چاہیے۔ قیمت چار روپیہ ملنے کا پتہ لاہور۔

حال مین بنارس کے مشہور و معروف علم دوست رئیس بابو شیو پرشاد گپتا نے ہندی زبان کی ترقی اور قومی تعلیم کی توسیع کے لیے دس لاکھ کی جائداد وقف کی ہے۔ اس سے پہلے بھی موصوف "ودیاپیٹھ بنارس" کو عرصہ تک تقریباً پانچ ہزار روپیہ ماہانہ برابر عطا فرماتے رہے ہین۔ آپ نے بنارس کے ایک اعلیٰ درجہ کے ہندی روزانہ اخبار کی بھی امداد مین بیش بہا امداد دی ہے۔ آپ ہی کے دم سے بنارس کا گیان منڈل قایم ہے۔ اور اس منڈل کے ذریعے ہندی زبان کے مصنفین کی جو قدردانی ہوئی ہے۔ اسکا حال قدردانان ادب سے پوشیدہ نہین۔ یورپ کو اس قسم کی فیاضیون پر ناز ہے۔ شکر ہے کہ ہندوستان کے رؤسا مین بھی علمی قدردانی کا خیال پیدا ہو چلا ہے۔ اُردو زبان کے قدردانون کو بھی ان مثالون سے سبق لینا چاہیے۔

مولوی محبوب علی صاحب ناظم دائرۂ ادبیہ مژدہ سناتے ہیں کہ عنقریب وہ ایک ادبی و علمی رسالہ "لسان الملک" کے نام سے جاری کرنے والے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ ارادہ عملی صورت میں ظاہر ہو۔

الناظر بابت ماہ جولائی میں بسلسلۂ "نظرے خوش گذرے" "ایک عزیز" کے حوالے سے اڈیٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں، کہ

"رسالہ زمانہ بابت ماہ مئی ۱۹۲۳ء میں اعظمی صاحب نے جو تنقید حضرت احسن مارہروی کی کتاب "تحقیق" پر لکھی ہے اس میں ایک غلطی یہ کی ہے کہ کتاب کے شروع میں جو مقدمہ ہے اسکو بھی احسن صاحب کا نتیجۂ طبع سمجھا ہے، حالانکہ وہ جناب منشی امیر احمد علوی بی اے کاکوروی کا مضمون ہے جو گذری احسن صاحب کے رسالہ فصیح الملک میں شائع ہوا تھا"

اسکے جواب میں جناب اعظمی لکھتے ہیں۔

یہ غلط ہے کہ مقدمہ جناب احسن مارہروی کا نہیں، آٹھ صفحے تک تو خود جناب احسن کی تحریر ہے اس کے بعد جناب امیر احمد صاحب علوی بی اے کاکوروی کے مضمون کا اقتباس ہے، لیکن اقتباس بھی اس انداز سے مقدمہ میں شامل کیا گیا ہے کہ بادی النظر میں مقدمہ کا ایک جزو لاینفک معلوم ہوتا ہے۔ احسن صاحب کا فرض تھا کہ پورے مضمون کو اس طرح علامات اقتباس میں ظاہر کرتے کہ امیر احمد صاحب کے مضمون پر، احسن صاحب کے نتائج و افکار کا دھوکا نہ ہو سکتا۔ چونکہ مقدمہ کے شروع یا آخر میں کسی کا نام نہیں، اسلیے اگر ایک شخص یہ رائے قائم کرے کہ پورا مقدمہ احسن صاحب کا ہے تو بقول "اڈیٹر صاحب الناظر" زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ احسن صاحب کی طرز تحریر نے مجھے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا لیکن تنقید اب بھی اپنی جگہ پر قایم ہے، ہاں اب تنقید کا وہ مختصر حصہ جو امیر احمد صاحب کے مضمون سے متعلق ہے احسن صاحب سے متعلق نہ ہوگا۔

نواب سردار بہادر ناظم پٹنہ خانجات نے لارڈ ریڈنگ کی جو سوانح عمری انگریزی میں لکھکر دا ہت سے

چھپوائی ہے وہ شائع ہوگئی ہے۔

اُردو کی کس مپرسی کا رونا ہی کیا ہے؟ گو اہل قلم کے جوش خدمت کی بدولت نت نئے رسالے جاری ہوتے رہتے ہین لیکن ہندوستان بھر مین مشکل سے دو چار اُردو رسالے ہونگے جنکی اشاعت دو ہزار سے زائد ہو صوبہ آگرہ و اودھ مین پرانے علمی خادمون مین زمانہ۔ الناظر اور معارف خصوصیت سے قابل ذکر ہین۔ ان مین سے آخر الذکر پرچہ دار المصنفین اعظم گڈھ کا ماہوار علمی رسالہ ہے۔ جو چند والیان ریاست کی امداد سے قائم اور جاری ہے۔ زمانہ کو جاری ہوئے اکیس سال ہوگئے لیکن ابھی تک اسکی اشاعت ایسی نہین ہوئی کہ جسکے بدولت اسکے کارپرداز اپنے حوصلہ کے بموجب ملک کی علمی خدمت کرسکین۔ اول دس پندرہ برس تو بلا لحاظ آمد و خرچ رسالہ غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا مگر اس ناعاقبت اندیشی کا خمیازہ ابھی تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ابتدائی نقصانات کی تلافی درکنار آجتک انکا کچھ نہ کچھ سلسلہ چلا جاتا ہے۔ یعنی ابتک پندرہ سولہ ہزار سے زائد رقم نذر زمانہ ہو چکی ہے۔ خیر یہ داستان غم تو پارینہ ہوگئی۔ حال مین ہمکو بہت افسوس سے معلوم ہوا کہ ہمعصر الناظر بھی نقصان عظیم کے ساتھ جاری ہے۔ اسکے اڈیٹر ہمارے دوست مولانا ظفر الملک صاحب بھی اُردو کی ترقی کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے ہین اور گو موصوف تحریک عدم تعاون کی بدولت کچھ عرصہ تک قید فرنگ مین بھی رہے لیکن ان کی عدم موجودگی مین ان کی قابل بیگم صاحبہ نے جس طرح ہو سکا الناظر کی اشاعت جاری رکھی مگر مالی زیر باری سے مجبور ہو کر کچھ دنون کے لیے اسکی اشاعت معرض التوا مین پڑ گئی تھی لیکن مولانا ظفر الملک نے پھر ہمت و استقلال سے کام لیکر اسکو جاری کیا۔ اگر قدر دانان اُردو حوصلہ افزائی نکرینگے تو ظاہر ہے کہ الناظر کے اڈیٹر صاحب پر کیا منحصر ہے بڑے سے بڑے سرمایہ دار کی ہمت بھی پست ہو جائیگی۔ مولانا ظفر الملک صاحب نے حال مین ہمکو لکھا تھا کہ اگر الناظر کی اشاعت مین کافی توسیع نہوئی تو آخر ان کو رسالہ بند ہی کرنا پڑے گا۔ ہمارے دوست نے خریداران الناظر سے بھی اپیل کی تھی اور شکر ہے کہ ان مین سے بعض حضرات توسیع اشاعت پر متوجہ ہوئے ہین ہم کو امید ہے کہ اور اصحاب بھی جلد توجہ فرمائینگے۔ الناظر ایک ادبی رسالہ ہونے کے علاوہ مسلمانون کے اصلاح تمدن کا بھی زبردست حامی ہے۔ اور شاید اس حیثیت سے اُردو مین وہ

اپنے طرز کا ایک ہی رسالہ ہے خدا کرے اسکی کوششیں مقبول خاص و عام ہوں۔

نعمکدہ کے قدردانوں کو بھی توسیع اشاعت کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ نقصانات کے متعلق فی الحال ہم اسوقت اپنے ناظرین کو بے لطف نہیں کرنا چاہتے ہیں لیکن آئندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ رسالہ کی اشاعت موجودہ سے دوچند ہو جائے۔ ہم اپنی طرف سے زمانہ کو ہر حیثیت سے پیشتر سے بھی زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کی کوشش میں سرگرم ہیں۔ لیکن ہماری کوششیں ناظرین زمانہ کی امداد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ ہمارے عنایت فرماؤں میں بعض احباب آسانی سے زمانہ کے پانچ پانچ چھ چھ نئے خریدار بنا سکتے ہیں۔ اور ایک ایک دو دو خریدار تو قریب قریب سب ہی احباب دے سکتے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ زمانہ کی ترقی کے لیے ہر ادبی شخص کو امکانی کوشش سے دریغ نہ کرنا چاہئے امید ہے کہ ہماری درخواست بے اثر نہ رہے گی۔ اور ہمارے کرمفرما حضرات اپنے علم دوست احباب سے زمانہ کے خریداری کی سفارش فرما کر کارپردازان زمانہ کو مزید جوش کے ساتھ ملک کی علمی خدمت کرنے کا موقع دیجیے۔

ایک اخبار میں روسی اخبارات کے یکم اپریل ۱۹۲۳ء سے مارچ ۱۹۲۴ء تک کے حالات درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یکم اپریل کو روس میں جملہ روسی اخبارات کی روزانہ اشاعت ساڑھے انیس لاکھ تھی۔ گیارہ ماہ بعد یعنی یکم مارچ ۱۹۲۴ء کو ۲۲ لاکھ باون ہزار ہوگئی۔ اخباروں کی تعداد ۵۶۰ سے گھٹکر ۴۹۰ رہگئی۔ گویا زمانہ جنگ سے قبل کی تعداد کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے۔ سوویٹ گورنمنٹ کا ارادہ ہے کہ سال رواں کے اخیر تک روزانہ اخباروں کی اشاعت پچاس لاکھ ہو جائے۔

حکومت ترکی نے محل یلدز میں تیس ہزار کتابوں کا ذخیرہ پایا ہے جو مختلف علوم و فنون اور مختلف لغات پر مشتمل ہے، اب حکومت ترکی نے یہ طے کر لیا ہے کہ ان کتابوں کو ایک عجیب لائبریری کی شکل میں منتقل کر دیا جائے جس سے تمام اہل علم فائدہ اٹھا سکیں

ادبی رسالے

اُردو کے رسالون مین ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جتنے رسالے جاری ہوتے ہین اُتنی ترقی عام مذاق مین نہین ہو رہی ہے۔ تاہم علمی کوششین قابل قدر ہین۔ سال گذشتہ کے رسالون مین ڈھاکہ کا رسالہ جادو خاص طور پر قابل قدر ہے۔ یہ رسالہ ٹائپ مین چھپتا ہے اور اسکے ہر نمبر مین بعض مفید اور محققانہ مضامین ہوتے ہین ہمکو امید ہے کہ یہ رسالہ صوبۂ بنگال مین اُردو کی ترقی کا معاون ثابت ہوگا۔ کلکتہ سے اردو دان مستورات کے لیے بھی حور نامی ایک دلچسپ پرچہ جاری ہے۔

دفتر حور کو لوٹولہ کلکتہ سے ایک اور ادبی رسالہ جولائی سنہ حال سے نئی دنیا کے نام سے جاری ہوا ہے رسالے مین نظم و نثر کے دلچسپ مضامین شایع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور لکھائی چھپائی صاف ہے۔ قیمت فی پرچہ ۲ر مقرر ہے۔ بنگال سے ان رسالون کا اجرا اُردو کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے۔

کشاف چھوٹی تقطیع کا، یہ ادبی رسالہ امرتسر سے ایم محمد الدین صاحب غریب کی ادارت مین شایع ہوتا ہے ابتک اسکے تین نمبر ہماری نظر سے گذر چکے ہین۔ قیمت سالانہ عہ ر۔

اُردو معلّٰی دہلی سے ماہوار شایع ہو رہا ہے۔ اسکے اڈیٹر قربان علی صاحب بسمل ہین۔ ادبی حیثیت سے رسالہ قابل قدر ہے تقطیع ۲۲×۱۸/۸ حجم ۴۸ صفحات قیمت سالانہ عہ رشاہجہانی پریس دہلی سے طلب فرمایئے۔

الفلاح اسلامی رسالہ ہے۔ اسمین مفید اور دلچسپ مذہبی مضامین شایع ہوتے ہین۔ انجمن اشاعت اسلام جالندھر کی طرف سے مہینہ مین دو مرتبہ شایع ہوتا ہے اسکے اڈیٹر مولوی عبد الحق صاحب سہا ہین۔ چندہ سالانہ للعہ ر

بلاغ بھی مذہبی رسالہ ہے اور ۴۸ صفحات پر حکیم شہاب الدین صاحب امرتسری کے اڈیٹری مین امرتسر سے شایع ہوتا ہے عہ ر سالانہ قیمت پر برقی پریس امرتسر سے ملسکتا ہے۔


ہندو مسلم اتفاق ہے؟
گاؤکشی
شدھی



موجودہ وزارت فرانس :- اب تو ہم مستقل صلح کی کوشش کر رہے ہیں۔
فرانس :- مگر ان ہتھیاروں سے یہ مقصد حل نہ ہوگا۔



مادی سائنس کی ترقی اور آیندہ صدی کا انسان "ہالینڈ کے اخبار سے"



انگلستان اور ہندوستان (ایک روسی اخبار سے)



کانگریسی جدوجہد



[illegible]

بچوں کے لیے [illegible] کا احسان

[illegible]

کونین کی گولیاں

[illegible] کونین کا استعمال کرنا ہو تو [illegible]

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبرہ تاراچند دت اسٹریٹ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] उपन्यास है ॥)

तालिब और [illegible] ने [illegible] ।)

नवचरित्र [illegible] के [illegible] ॥)

तारीख़रात हिन्द भारत [illegible] की रचनाओं का [illegible] में है ।)

पृथ्वीराज चौहान १७वार मोहम्मद ग़ोरी का भारत पर आक्रमण संयोगिता हरण [illegible] वृत्तान्त इसमें है ।)

हिन्दी उर्दू कोष हिन्दी उर्दू की डिक्शनरी ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible] ।)

[illegible]

[illegible] ॥)

[illegible] वैद्यक में [illegible] ।)

[illegible] भैरवी चक्र [illegible] न भाषा टीका सहित है ॥)

यन्त्रादि साधन [illegible] रति [illegible] भाषा टीका ।≡)

[illegible] भूमिगत [illegible] साधन [illegible] में है ॥)

बाल चिकित्सा [illegible] बालकों के रोगों की चिकित्सा [illegible] ।)

[illegible] यन्त्रों का [illegible] है ॥)

भजनसंग्रह [illegible] ॥)

[illegible] ॥)

[illegible]